تاثرات
مُلّا واحدی
مُرتبہ
حکیم محمد سعید
ہمدرد اکیڈمی، کراچی

ناشر: ہمدرد اکیڈمی، کراچی ۱۸

طابع: انجمن پریس، کراچی ۳

اشاعتِ اوّل: ۱۹۷۰ شمسی

قیمت: [illegible]

انتساب

آج سے پہلے میں نے اپنی کسی کتاب کو کسی کے نام سے منسوب نہیں کیا

لیکن

یہ کتاب تاثرات

جناب حمید نظامی کی روح کی نذر کرتا ہوں

حمید نظامی مرحوم، اللہ تعالےٰ اُن پر اپنی رحمت کے مینہ برسائے، مجھے

ہمت نہ دلاتے تو اس کتاب کا وجود شاید نہ ہوتا۔ ویسے تو جو کچھ ہے،

حقیقتاً سب اللہ تعالےٰ کی مہربانی سے ہے

عبدہٗ

واحدی

مُلّا واحدی کی قلمی تحریر

۱۹۶۳ش کے ماہنامہ "فیض الاسلام" راولپنڈی میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک طویل خط چھپا تھا۔ اُس خط کی چند باتیں اپنے الفاظ میں درج ذیل کرتا ہوں۔ یہی خط میرے "تاثرات" کی بنیاد ہے۔ اِسی محور کے گرد میرے تاثرات گردش کر رہے ہیں۔ لیکن اِس خط کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیاوی علوم حاصل نہ کئے جائیں۔ خط غور سے اور سمجھ کر پڑھئے۔

امام غزالیؒ لکھتے ہیں :- اپنا علم بڑھاتے رہو۔ مگر کون سا علم؟ میرا اشارہ اُس علم کی طرف ہے، جو فرض کفایہ نہیں ہے۔ فرض عین ہے۔ اِس علم کا پتہ یوں چل سکتا ہے، اور اِس علم کا انتخاب یوں ہو سکتا ہے کہ اگر تمہیں بتادیا جائے کہ تمہاری موت کے وقوع میں صرف ایک ہفتہ باقی ہے، تو سوچو، اُس وقت تم کس علم کا مطالعہ کرو گے۔ کیا اُس وقت کسی بھی دلچسپ سے دلچسپ علم میں تمہارا دل لگے گا۔ بس اُس وقت جس علم میں انسان کا دل لگ سکتا ہے، اُسی علم کے بڑھانے کے لئے میں کہتا ہوں۔ وہ علم ہے اپنے دل کا حال جاننا اور اپنی خامیاں پہچاننا۔ خامیاں مرتے وقت خود بخود سامنے آئیں گی۔ یہ علم مرنے کے وقت سے قبل، جس قدر جلدی اور جتنا زیادہ حاصل ہو جائے، اچھا ہے۔ مرنے کے وقت اور مرنے کے بعد یہی علم فائدہ پہنچائے گا۔ دوسرے علوم فائدہ نہیں پہنچائیں گے۔

واحدی

فہرست

تاثرات

آج کل پاکستان اور ہندستان کے درمیان خطوط کے سوا ہر قسم کی ڈاک کی آمد و رفت بند ہے۔ تاثرات کا ایک ایک فرمہ لفافوں میں رکھ رکھ کر جناب مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی کو بھیجا جا رہا ہے۔ لفافے انھیں بخیر و عافیت پہنچ گئے تو انشاء اللہ وہ تاثرات پر ضرور کچھ لکھیں گے اور ان کا مضمون ۳۸۵ سے شروع ہوگا۔ مضمون درج نہ ملے تو سمجھ لیجیے کہ لفافے نہیں پہنچے۔

ملّا واحدی، سید محمد ارتضیٰ

"تاثرات" پر کچھ تاثرات

حکیم محمد سعید دہلوی

حضرت مُلّا واحدی دہلوی کے "تاثرات" کا پہلا حصہ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ میں اپنے لیے اس کو ایک سعادت سمجھتا ہوں۔ عرصے سے میری خواہش تھی کہ ان بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک لڑی میں پرو دیا جائے آج اس خواہش کی تکمیل ہو رہی ہے اور مجھے مسرت کے ساتھ اطمینان کا احساس ہو رہا ہے۔

حضرت مُلّا واحدی تعارف و تعریف دونوں سے بے نیاز ہیں لیکن اظہارِ حقیقت اور خراجِ عقیدت کے طور پر چند جملے لکھ رہا ہوں۔

اپنے اکابر سے ہماری بے نیازی اور ان کی زندگی میں ناقدری اب اتنی مسلّم ہو چکی ہے کہ اس کے اظہار و اعادے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ ہم اپنے اعاظم رجال کو اس وقت سمجھتے ہیں جب وہ ہمارے درمیان نہیں رہتے۔ ایک طرف ہم ماضی سے اپنا رشتہ توڑتے جا رہے ہیں اور ماضی کی زندہ روایات کو چھوڑتے جا رہے ہیں دوسری جانب ماضی پرستی کا یہ حال ہے کہ جب تک کوئی شخصیت ماضی نہیں بن جاتی ہم اس کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ یہ زندگی کی علامت نہیں ہے، بلکہ خود فراموشی کی ایک قسم ہے۔

حضرت مُلّا واحدی ان عظیم انسانوں میں سے ہیں جن کا وجود روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کو جس نے بھی قریب سے دیکھا ہے وہ میرے الفاظ کو مبالغہ نہیں کہے گا۔ عالم، ادیب، صحافی، ناشر اور تاجر بہت ہوئے ہیں بہت ہیں اور بہت ہوں گے لیکن حضرت مُلّا واحدی کی بڑائی ان کے کردار میں پوشیدہ ہے۔ ان کے کردار کی بلندی کا سب سے بڑا ثبوت ان کے قول و عمل کی ہم آہنگی ہے۔ آج کل آپ اکثر بڑے لوگوں کے قول و عمل کو مصلحت کے بھینٹ چڑھتا ہوا دیکھتے ہیں۔ لیکن جو حضرات واحدی صاحب

نے سالہا سال سے واقف ہیں اور جنھوں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا بلکہ برتا بھی ہے وہ بتائیں گے کہ واحدی صاحب زبان کے کتنے سچے ہیں۔ مصلحت اور سود و زیاں کا خیال ان کو سچائی اور صاف گوئی سے کبھی نہیں روک سکتا۔ غیبت، شکایت، وعدہ خلافی، غلط بیانی کا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ انکساری، کم گوئی اور کم آمیزی جس کو وہ خود "اکل کھرا پن" کہتے ہیں ان کی عادت ہے اگر اکل کھرا پن اس کو کہتے ہیں کہ آدمی تملق اور چاپلوسی سے گریز کرے، خوشامد کرنے اور خوشامد کرانے سے بچے، غیبت اور لُترے پن سے بھاگے تو یہ اکل کھرا پن بڑا مستحسن ہے اور ہر ایک کو اس کی تمنا کرنی چاہیے۔ حضرت ملّا واحدی کی جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ ان کا حُسنِ ظن ہے۔ وہ ہر چیز کا خصوصاً ہر شخص کا اچھا پہلو دیکھتے ہیں۔ یہ ان کی عادت ہے۔ ایسے شخص میں بھی جس میں عام نظر کوئی خُوبی نہیں دیکھتی وہ اچھائی کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ ہر شخص میں چاہے وہ عام طور پر کتنا ہی بدنام ہو کوئی نہ کوئی خُوبی ضرور ہوتی ہے۔ واحدی صاحب کو وہ خوبی بڑی آسانی سے نظر آجاتی ہے وہ اس خوبی کو اپنی گفتگو اور اپنی تحریر میں نمایاں کرتے ہیں۔ خود نیک آدمی ہیں اور ان کی نیکی کی سب سے بڑی دلیل بھی میرے نزدیک یہی ہے کہ وہ دوسروں میں بھی نیکیاں ہی تلاش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ان کی تحریروں میں انسان اور انسانیت کو چلتا پھرتا دیکھتے ہیں۔

جب کبھی آپ کو انسانیت کی طرف سے مایوسی ہو اور شر و فساد کا غلبہ نظر آئے آپ واحدی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جائیے یا کم سے کم ان کی تحریروں کا مطالعہ کر لیجیے مجھے یقین ہے کہ آپ کی مایوسی دم توڑ دے گی اور زندگی کا عزم جاگ اُٹھے گا۔

واحدی صاحب ۶۷ سال سے لکھ رہے ہیں اس عرصے میں ہزاروں صفحات اور سینکڑوں مضمون اُنھوں نے لکھے، دسیوں رسالے نکالے اور کئی کتابیں لکھیں۔ لیکن شاید نہیں یقیناً ان کے قلم سے کبھی کوئی لفظ کسی کی بُرائی میں نہیں نکلا۔ یہ آسان بات نہیں ہے بہت مشکل اور بہت بڑی بات ہے۔ قلم کی طاقت ایک ایسی طاقت ہے جس کا نشہ آدمی کو بڑی آسانی سے بہکا دیتا ہے۔ توازن قائم رکھنا بڑا مشکل ہوتا ہے لیکن توازن اور احتیاط کی جو مثال واحدی صاحب نے اپنی قلم کاری کی زندگی میں پیش کی ہے وہ دوسری جگہ ملنی مشکل ہے۔ توازن کی کیفیت یہ ہے کہ واحدی صاحب نے اپنی تحریروں میں سیکڑوں اشخاص

کا ذکر کیا ہے اور اچھائی کے ساتھ کیا ہے لیکن وہ خلاف واقعہ نہیں۔ ہم جب کسی کی تعریف کرنا چاہتے ہیں تو جتنی خوبیاں اور جتنے اچھے اوصاف ہمیں یاد ہوتے ہیں سب اس کے سر تھوپ دیتے ہیں کیوں کہ اس میں محنت کم صرف ہوتی ہے اور زورِ بیان آسانی سے پیدا ہو جاتا ہے لیکن کسی کی حقیقی تعریف کرنا بڑا مشکل کام ہے ایسی تعریف کے لیے اس شخص سے سچی ہمدردی اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔

واحدی صاحب کبھی کسی کی غلط تعریف نہیں کرتے جس شخص کے کردار میں جو خوبی دیکھتے ہیں اُس کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ نیکیوں پر آمادہ کرنے اور برائی سے روکنے کا یہی طریقہ ہے۔

واحدی صاحب کے تاثرات میں دین کی حکمت کے موتی بڑی کثرت سے ملتے ہیں۔ لیکن وہ وعظ و نصیحت کا رنگ اختیار نہیں کرتے، دھیمے دھیمے لہجے میں دین کی باتیں قاری کے دل میں ڈال دیتے ہیں۔ ان کی زبان اتنی سادہ، اتنی دل کش اور اتنی فصیح ہوتی ہے کہ قاری بلا تامل ان کے استدلال کو قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ ان کے تاثرات دین و دانش کا مجموعہ اور تاریخ تہذیب اور اخلاق کے انمول خزانے ہیں۔

میں نے واحدی صاحب کی خصوصیات کے متعلق مختصراً جو کچھ عرض کیا یہی ان کے نقطۂ نظر اور طرزِ زندگی کا خلاصہ اور یہی ان کے اسلوبِ تحریر کا جوہر ہے۔ واحدی صاحب کی زندگی اور ان کی تحریریں ہمارے لیے قابلِ تقلید ہیں خصوصاً ہمارے نوجوان ادیبوں کو بات کہنے کا انداز اور لکھنے کا ڈھنگ واحدی صاحب سے سیکھنا چاہیے۔

"تاثرات" دراصل چھوٹے چھوٹے پارے ہیں۔ اب تک واحدی صاحب نے ہزاروں تاثرات لکھے ہوں گے۔ ہر تاثر اپنی جگہ مکمل اور مستقل مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کتاب "تاثرات" کا پہلا حصہ ہے۔ واحدی صاحب تاثرات کے عنوان قائم نہیں کرتے اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ کتاب کے لیے عنوانات ضروری تھے اس لیے ہر تاثر کے مضمون کے مطابق عنوان قائم کر دیا گیا ہے۔ ان تاثرات میں برِصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی تہذیب خصوصاً دہلی کی تہذیب محفوظ ہو گئی ہے۔

تاثرات سے پہلے واحدی صاحب کا ایک تازہ مضمون "میری قلم کاری کی مختصر سی کہانی" شامل کر دیا گیا ہے۔ اس مضمون میں جو اُنھوں نے ہمدرد صحت ڈائجسٹ کے لیے

اسی ماہ نکھا ہے اختصار کے ساتھ واحدی صاحب کی زندگی اور ان کے ادبی کاموں کی تفصیل آگئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے عہد کی صحافت اور صحافیوں کی جھلک بھی ہے۔

حکیم محمد سعید
ہمدرد منزل، کراچی

کراچی
جمعہ ۱۸ شعبان ۱۳۸۹ ہجری
۳۱ اکتوبر ۱۹۶۹ شمسی

پیش لفظ

رسالہ نظام المشایخ کراچی آنے سے قبل ہی بوڑھا ہو چکا تھا کراچی پہنچ کر اُسے اس لیے جاری رکھا گیا تھا کہ ایک تو میری صحافی زندگی کا وہ نقش اوّل تھا دوسرے میرے اور سیدی خواجہ حسن نظامی رح کے تعلق کی یادگار۔ میں نے اور خواجہ صاحب نے صرف نظام المشایخ شرکت سے نکالا تھا، اور رسالوں اخباروں میں میری اُن کی شرکت نہیں رہی۔

تیسری وجہ نظام المشایخ کو جاری رکھنے کی یہ تھی کہ نظام المشایخ میری کتابوں کی تیاری کا ذریعہ تھا۔ حیات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تینوں جلدیں اور "میرے زمانے کی دلی" وغیرہ کتابیں نظام المشایخ ہی میں سولہ سولہ صفحے کر کے شایع ہوئی تھیں۔

حکومت پاکستان نے ۱۹۶۰ء میں اخباروں اور رسالوں کی چھانٹی کی تو نظام المشایخ بھی بند کر دیا اور "تاثرات" کا جو سلسلہ اُس میں چلا تھا وہ رک گیا۔ اس کی خبر خدا جانے کیوں کر جناب حمید نظامی ایڈیٹر روزنامہ نوائے وقت لاہور کو لگی تو انھوں نے مجھے مندرجہ ذیل خط بھیجا:

۳ر مارچ ۱۹۶۱ء

مخدومی و مشفقی! اسلام مسنون۔

نظام المشایخ کے تازہ پرچے میں "تاثرات" کے عنوان سے آپ کا مضمون نظر سے گزرا۔ میں اسے پڑھ کر بہت متاثر ہوا۔ ہے تو گستاخی، مگر میں ہمت کر کے درخواست کرتا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ہفتے میں ایک دو مرتبہ اس طرح کا کالم "نوائے وقت" میں لکھ دیا کریں۔

ہماری نئی پود اپنے دین اور اپنی ثقافت سے بالکل بے گانہ ہوتی جا رہی ہے۔ آپ کے مضمون (تاثرات) میں ایسی بات نظر آئی جس کا مطالعہ نوجوانوں کے لیے سود مند ہوگا۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کو یہ سلیقہ دیا ہے کہ نصیحت ایسے دل نشین انداز میں لکھ جاتے ہیں کہ نصیحت نہیں معلوم ہوتی۔

مخلص

حمید نظامی

نظام المشایخ کا اور میرا باون سال سے ساتھ تھا علاوہ ازیں میری تصانیف کی اشاعت کا وہی ذریعہ تھا میں مضمحل ہو رہا تھا لیکن حمید نظامی صاحب کے خط نے اضمحلال دُور کر دیا۔ خدا خود میر سامان است ارباب توکل را۔ میں اللہ کا شکر کرنے لگا کہ اللہ نے مجھ سے نظام المشایخ بند نہیں کروایا۔ میں نظام المشایخ کے ساتھ وضع توڑنے کا مُجرم نہیں بنا ۔۔۔ اور پھر اللہ نے تاثرات کی اشاعت کا کیسا فوری اور اچھا انتظام فرما دیا۔

میں نے تاثرات حمید نظامی صاحب کی خدمت میں روانہ کرنے شروع کیے۔

۵ ارمارچ ۱۹۶۱ء کو حمید نظامی صاحب کا دوسرا خط موصول ہُوا کہ:۔

"احباب نے یہ کالم پسند کیا ہے اور اس کی تعریف کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دیگر قارئین بھی نہ صرف اسے پسند کریں گے، اس سے اچھا اثر لیں گے۔ یہی میرا اصل مقصد ہے۔ کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے میری درخواست منظور فرمائی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھیں۔"

۲۴ مارچ کو تیسرا خط آیا کہ

"الحمد للہ کہ یہ سلسلہ مقبول ہُوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ نے چاہا تو نوجوانوں کو آپ کی تحریروں سے ہدایت نصیب ہوگی اور تھوڑا سا ثواب مجھے بھی مل جائے گا۔"

حمید نظامی صاحب کے ہمت افزا خطوط نے مجھ بوڑھے کے قلم میں جان پیدا کر دی۔ تحریک ہمیشہ اپنے دل و دماغ کے اندر ہی سے نہیں ہوتی باہر سے اور ادھر اُدھر سے بھی ہوتی ہے اور انسان کا ہر کام تحریک کا محتاج ہے۔

دلّی میں آل انڈیا ریڈیو کی جب بنیاد پڑی ہے تو مسٹر زیڈ اے۔ بخاری اس کے اُردو پروگراموں کے انچارج تھے (بخاری صاحب ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل کے عہدے

تک پہنچ کر ریٹائر ہوتے ہیں)

میں ایک شب دلّی میں تقریر نشر کرکے کمرے سے نکل رہا تھا۔ دیکھتا کیا ہوں، بخاری صاحب دروازے کے پاس منتظر کھڑے ہیں کہنے لگے "واحدی صاحب، ہم نے آپ سے ایسے ایسے عنوانوں پر تقریریں کرالیں جنھیں آپ خود شاید کبھی نہ سوچتے آج ہی کا عنوان لے لیجیے۔ بتائیے آپ کا ادھر خیال جاتا"

حمید نظامی، اور ان کے بعد مجید نظامی ستارۂ قائدِ اعظم نیز حکیم محمد سعید ستارۂ امتیاز اور مسٹر اکرم قمر ایڈیٹر ہلال، راولپنڈی ہتّی کو اُکساتے نہ رہتے تو نظام المشائخ کے ساتھ تاثرات کا چراغ بجھ ہی چکا تھا۔

خیر یہ کتاب میری اور قارئین کی ملاقات کا ذریعہ ہے۔ خط و کتابت کو لوگ نصف ملاقات کہا کرتے ہیں۔ لہٰذا تصنیف و تالیف کو دو ثُلث ملاقات کہنا چاہیے۔ کتاب ہذا آپ یہی تصور کرکے پڑھیے کہ گویا میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں اور آپ سے باتیں کر رہا ہوں، بلکہ باتیں میں ایسی نہیں کرسکتا۔ مجھے بول کر سوچنے کی مشق کم ہے، لکھنے میں تھوڑا بہت سوچ لیتا ہوں۔

کتاب ملاقات کا بڑا اچھا ذریعہ ہے۔ کتاب کے ذریعے مصنف سے اس کی حیات ہی میں نہیں بعد ممات بھی ملاقات کی جاسکتی ہے۔

میرے تاثرات تمام کے تمام ایک رنگ کے نہیں ہیں جس وقت جیسی کیفیت طاری ہوئی ہے قلم بند کردی ہے ؎

گہے من طائرِ بالا نشینم
گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

آج ۱۶ر شعبان ہے اور سنہ ۱۳۸۹ ہجری۔ میں ۱۷ر رمضان سنہ ۱۳۰۵ ہجری کو پیدا ہوا تھا۔ چوراسی سال پورے کرنے میں صرف ایک مہینہ باقی ہے۔ چوراسی سال کی عمر اور پونے چار سال سے فالج زدہ، ہر وقت موت کا منتظر ہوں۔ ویسے موت کے لیے نہ عمر کے حساب کی ضرورت ہے اور نہ بیماریاں موت لاتی ہیں۔ انسان وجود بھی اللہ کے حکم سے پاتا ہے، جینا بھی اللہ کے حکم سے ہے اور مرنا بھی اللہ کے حکم سے ہے۔ تاہم موت کا خیال جوانی میں کیا جاتا تو بہت ہی اچھا تھا، کم از کم بڑھاپے اور اتنے بڑھاپے میں

تو موت سے غفلت نہیں برتنی چاہیے۔

قارئین کرام سے ایک درخواست ہے کہ میں زندہ ہوں یا مردہ وہ دونوں صورتوں میں میری مغفرت کی دُعا کریں۔ مرنے کے بعد خالی تعریف بھی مفید ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا ہے کہ جس مسلمان کی مرنے کے بعد چالیس یا ستّر مسلمان (صحیح الفاظ یاد نہیں ہیں) تعریف کر دیں وہ جنتی ہے مگر میں آپ سے دعائے مغفرت کا بھی طلب گار ہوں۔ (زندہ رہنے کی صورت میں بھی۔)

اگر آپ نے دعائے مغفرت کی تو میں آپ کو اپنا محسن اور مخلص سمجھوں گا اور اپنے محسنوں اور مخلصوں کے واسطے میں ہمیشہ دعا کیا کرتا ہوں کہ الٰہی میرے محسنوں اور مخلصوں کو دین و دنیا کی نعمتیں دے۔ یہ دعا مر کر بھی جاری رکھوں گا۔ میں نہیں مروں گا، میرا جسم مرے گا۔ دعا جاری رہ سکتی ہے۔

عبدہٗ

واحدی

۱۶ر شعبان ۱۳۸۹ ہجری

۲۹ر اکتوبر ۱۹۶۹ شمسی

میری قلم کاری کی مختصر کہانی

ملا واحدی

شبیر قوال کا نام آپ نے ممکن ہے سنا ہو۔ وہ میرا ہم محلہ تھا۔ بچپن سے اسے گانے کا شوق تھا۔ آواز پھیکی پھیکی سی تھی لیکن گائے جاتا تھا۔ آخر گاتے گاتے کلاونت ہو گیا۔ ریڈیو والے بلانے لگے اور ریکارڈ بھرنے والے ریکارڈ بھرنے لگے۔ دلی میں اس نے خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔ کراچی میں اس کی چوکی کا خاصا ڈنکا بجا۔

میں بھی شبیر مرحوم کی طرح لکھتے لکھتے کچھ کچھ لکھ لینے کے قابل ہوا ہوں۔ میرے ایک قریبی عزیز تھے خواجہ فضل احمد شیدا صاحب۔ ہر چیز سینت کر اور حفاظت سے رکھنے کے عادی تھے۔ تقسیم ملک کے بعد لاہور میں قیام تھا۔ میرا بیٹا علی مقتدیٰ واحدی لاہور گیا تو خواجہ فضل احمد شیدا صاحب نے اسے دو خط بطور تحفہ دیے۔ ایک میرا اور ایک میرے والد کا۔ میرے والد کی تاریخ وفات ۳۱ ر دسمبر ۱۹۰۱ء ہے۔ مرحوم نے ۱۹۰۰ یا ۱۸۹۹ء میں خواجہ فضل احمد شیدا صاحب کو لکھا تھا کہ "محمد ارتضیٰؒ کی اردو کمزور ہے تم ذرا ٹھیک کراؤ۔" میرا خط غالباً ۱۸۹۸ یا ۱۸۹۹ء کا ہے۔ خواجہ فضل احمد شیدا صاحب دلی سے باہر تھے۔ میں نے انہیں محلے کے بھورا کہار کے مرنے کی اطلاع دی تھی۔ میں اس وقت بارہ تیرہ برس کا تھا۔ لیکن خدا کی شان والد ماجد کے رحلت فرماتے ہی میری توجہ نصاب کی کتابوں سے زیادہ اردو کی طرف ہو گئی۔ ڈپٹی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی نعمانی کی کتابیں پڑھنے لگا۔ علوم جدیدہ کی ڈگری اور علوم دین کی دستار فضیلت سے تو محروم رہا مگر چوراسی سال کی عمر تک طالب علم ہوں۔ اخباروں رسالوں میں لکھتا ۱۹۰۳ء سے ہوں۔ سنہ یوں یاد ہے کہ ۱۹۰۴ء میں میری والدہ نے اپنے انتقال سے چند ماہ قبل میرے پھوپی زاد بھائی قاری سرفراز حسین صاحب

عزمی مصنف "شاہد رعنا" کو ماسٹر فضل الدین صاحب ہیڈ ماسٹر اینگلو عربک ہائی اسکول کے پاس بھیجا تھا کہ "ذرا پوچھو تو ازتضی پڑھتا ہے یا نہیں" اور ماسٹر صاحب نے مسکرا کر کہا تھا "پڑھتے تو ہیں لیکن آوارہ ہوتے جاتے ہیں۔ اخباروں میں نام چھپوانے کی آوارگی میں مبتلا ہیں۔" لہٰذا ۱۹۰۳ء سے قلم کاری شروع کرنی یقینی ہے۔

میں ادیب یا انشاپرداز کہلانے کا مستحق اپنے تئیں نہیں سمجھتا۔ قلم کار کا لفظ بھی بہ تامل استعمال کیا ہے۔ قلم گھسائی لکھنا چاہیے تھا۔ البتہ سترسٹھ سال قلم گھسائی میرے زمانے میں اور کسی نے نہیں کی اور مجھے فخر ہے کہ میرا کوئی مضمون اوّل دن سے ردّی کی ٹوکری میں نہیں پھینکا گیا۔ ابتدا ہمت بندھانے اور حوصلہ بڑھانے کی مولوی انشاء اللہ خاں (ایڈیٹر ہفتہ وار وطن لاہور) مولوی محبوب عالم (ایڈیٹر روزانہ پیسہ اخبار لاہور) اور مولوی غلام محمد (مالک سہ روزہ وکیل امرتسر) نے کی تھی۔ ۱۹۰۸ء میں مولانا راشد الخیری نے ماہ نامہ "عصمت" جاری کیا تو اس میں انھوں نے میرے مضامین شائع کیے اور جینیشور پرشاد مائل نے ماہنامہ "زبان" نکالا تو اس میں انھوں نے میرے مضامین کو نمایاں جگہ دی۔ ہمت نہ بندھائی جاتی اور حوصلہ نہ بڑھایا جاتا تو ٹھپ ہو کر رہ جاتا۔

۱۹۰۹ء میں خواجہ حسن نظامی کے ساتھ خود ماہ نامہ نظام المشائخ کی بنیاد ڈال دی۔ نظام المشائخ اللہ کے فضل سے ایسا چلا کہ پہلا پرچہ تو ہم نے اپنے خرچ سے ضرور چھپوایا تھا۔ پھر اس پر دھیلا خرچ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ نظام المشائخ اکبر اور اقبال کی نظموں اور منشی ذکاء اللہ، مولانا شبلی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ناصر نذیر فراق، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اور مولوی سید احمد، مؤلف فرہنگِ آصفیہ کے مضامین سے آراستہ ہوتا تھا۔ جناب اکبر الہ آبادی نے تو نظام المشائخ کے لیے اتنا لکھا کہ ان کے کلیات میں ایک باب ہے: "نظام المشائخ کے لیے۔" یہ شرف تنہا نظام المشائخ کو ملا ہے۔ ماہ نامہ "مخزن" کے تمام ہی مضمون نگار نظام المشائخ کے مضمون نگار تھے، اور علما و مشائخ اہلِ قلم الگ۔

۱۹۱۱ء میں خواجہ حسن نظامی صاحب بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کرنے گئے اور ان کی عدم موجودگی کا نظام المشائخ پر برا اثر نہیں پڑا تو خواجہ صاحب نے کہا "اب تم جانو اور تمھارا نظام المشائخ جانے۔ تم تنہا اسے سنبھال سکتے ہو میں شرکت سے دست بردار ہوتا ہوں۔" نظام المشائخ چل چکا تھا۔ اسے آگے بڑھانا واقعی دشوار نہیں رہا تھا اور خواجہ صاحب

نے نظام المشایخ کی ملکیت اور ایڈیٹری چھوڑ دی تھی سرپرستی نہیں ترک کی تھی۔

۱۹۱۲ء میں نظام المشایخ کی کامیابی دیکھ کر حکیم اجمل خاں صاحب نے مجھے ہفتہ وار طبی اخبار جاری کرنے کی دعوت دی۔ چناں چہ جنوری ۱۹۱۳ء سے نظام المشایخ کے ساتھ ساتھ "طبیب" بھی نکلنے لگا۔ اخبار طبیب پر حکیم اجمل خاں صاحب کا نام بحیثیت سرپرست لکھا جاتا تھا اور طبیب آل انڈیا ویدک اینڈ طبی کانفرنس کا آرگن تھا۔

۱۹۱۴ء میں ہفتہ وار خطیب جاری کیا جو مولانا ابوالکلام کے الہلال کا مثنیٰ تھا۔ ادبی پیمانے پر دوسرا الہلال۔ نیاز فتح پوری اور عارف ہسوی اس کے ممتاز اور مستقل قلمی معاون تھے۔ پھر منشی عبدالحمید ایڈیٹر مولوی کی شرکت میں ہفت روزہ "درویش" اور مسٹر فصیح الدین ایم۔ اے کی شرکت میں ماہ نامہ "ادیب" عارف صاحب کی زیرادارت ہفت روزہ "انقلاب" اور خواجہ بانو صاحبہ (اہلیہ خواجہ حسن نظامی صاحب) کی زیرادارت رسالہ "استانی" اور نیاز صاحب کی زیرادارت روزانہ "رعیت" متعدد پرچے جاری کیے۔ ۱۹۱۸ء و ۱۹۱۹ء میں میری ادارت اور نگرانی میں نو پرچے نکل رہے تھے۔ چار ماہ نامے چار ہفت نامے ایک روزنامہ۔ بقول سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاستؔ کوچہ چیلان کو رسالوں اور اخباروں کا قبرستان بنا کر کراچی بھاگا ہوں"

ایک واقعہ لکھنا بھول گیا۔ درویش کے اجرا کا ارادہ نظام المشائخ کی کامیابی کے دو ہی سال بعد ہوا تھا۔ اس کی اطلاع میر جالب صاحب کو پہنچی تو انھوں نے مجھے تحریر فرمایا کہ پیسہ اخبار ساٹھ روپے ماہوار دے رہا ہے تم اگر چالیس دو تو قبول کر لوں گا کیونکہ دلّی میں رہنے کے لیے جی بے چین ہے۔

میں نے دیکھا کہ میر جالب صاحب جیسا اخبار نویس ساری عمر اخبار نویسی کر کے ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ پاتا ہے تو میرا رخ لکھنے سے لکھوانے کی طرف مڑ گیا۔ چناں چہ پھر لکھا کم لکھوایا زیادہ چار ماہ ناموں چار ہفت ناموں اور ایک روزنامے کے واسطے لکھوانا تھوڑا کام نہ تھا۔ دوسروں کی تحریر کا ایک ایک لفظ پڑھنا ذمہ دار مسئول اور قانونی ذمہ دار پر لازم ہے۔ پھر نو پرچوں کے علاوہ کتابوں کی اشاعت۔ مولانا راشد الخیری صبح زندگی لکھ کر چپ ہو گئے تھے۔ انھیں جھنجھوڑا اور شامِ زندگی اور سات آٹھ کتابیں لکھوائیں[1]۔ میں خود کچھ بھی نہ لکھتا تو میرے لیے یہی بہت تھا کہ

[1] جالب صاحب کو ۱۹۱۲ء میں مولانا محمد علی جوہر نے ڈھائی سو روپے ماہوار تنخواہ پر روزانہ "ہمدرد" کا چیف ایڈیٹر مقرر کر دیا تھا اور ہمدرد بند ہو گیا تو لکھنؤ جا کر انھوں نے کافی ترقی کی۔ (واحدی)

میں نے بے شمار اہل قلم کے علاوہ دو ایسے شخصوں کو کتابیں تصنیف کرنے پر آمادہ کیا جن کی
دھاک بیٹھ گئی۔ ایک خواجہ حسن نظامی دوسرے مولانا راشد الخیری۔

۱۹۳۴ سے ۱۹۴۶ تک میونسپل کمیٹی کی ممبری چمٹی رہی۔ مسلسل بارہ برس میونسپلٹی میں
بھاڑ جھونکا۔

المختصر ۱۹۴۷ء کے اکتوبر میں دلّی سے بھاگا تو نو پرچوں کے فائل اور تین تصنیفات
چھوڑ کر بھاگا تھا۔ ایک جام اسپ نامہ ایک بزم فرید (بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے
ملفوظات کا ترجمہ) ایک مجموعہ مضامین واحدی۔ گھر کے سارے سامان کی طرح یہ ذخیرہ
بھی نذر انقلاب ۱۹۴۷ء ہو گیا۔ مجموعہ مضامین کی ضخامت $\frac{20 \times 30}{8}$ سائز کے قریباً پانچ سو
صفحے تھی اور اس کے متعلق مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے تحریر فرمایا تھا کہ "میں لکھنے
والا پڑھنے والا بن کر رہ گیا۔ کتاب ختم کیے بغیر ہاتھ سے نہیں چھٹی۔ کاش اکبر الٰہ آبادی زندہ ہوتے تو
وہ اس مجموعے کی داد دیتے۔"

دہلوی سے کراچوی بنا تو ساٹھ باسٹھ برس کا بوڑھا تھا۔ خان بہادر شیخ حبیب الرحمٰن
صاحب او۔ بی۔ ای صدر میونسپل کمیٹی دلّی بھی کراچی آ گئے تھے۔ انھوں نے مجھے جوان کرنا چاہا
اور مجھ سے ماہ نامہ فردوس جاری کرایا اور اس پر چھے ہزار رُپے کے قریب کھوئے اور اور
کھونے کو تیار تھے لیکن میری طبیعت بھر گئی اور صرف نو پرچے شائع کر کے اسے بند کیا۔ میں
فردوس کو مرتب کرنے میں پیچھا نہیں رہا۔ مگر کاروباری صلاحیت بالکل ختم ہو چکی تھی۔ ایک دور
وہ تھا کہ ایک اشتہار سے جو صرف خطیب میں دیا گیا تھا شام زندگی کی پانچ سو جلدیں بیچ لی تھیں
۱۹۴۸ء میں نو مہینے ہاتھ پاؤں مارے اور فردوس کے آٹھ سو خریدار بھی فراہم نہ کر سکا۔ پہلے
دور میں اس نوع کی باتیں سوجھ جاتی تھیں۔ اخبار انقلاب نکالنے سے پہلے اشتہار دیا تو اشتہار
کا عنوان رکھا "آنے والا انقلاب"۔ انقلاب نکل آیا تو اعلان کیا "انقلاب آگیا"۔

ماہ نامہ فردوس نے یہ احساس کرا دیا کہ اب بس سیدھا سادہ لکھ سکتا ہوں۔ کراچی
میں لکھنے پڑھنے کی پوری فرصت مل گئی۔ کتابیں تصنیف کرنی شروع کیں اور نظام المشائخ
کو مضامین کی اشاعت کی بجائے کتابوں کی اشاعت کا ذریعہ بنا دیا۔ کتاب "میرے زمانے
کی دلّی" بالاقساط نظام المشائخ میں چھپی۔ "حیات سرور کائنات" کے تین حصے نظام المشائخ
کے ذریعے مکمل ہوئے۔ البتہ سوانح عمری خواجہ حسن نظامی کو خواجہ حسن ثانی نظامی نے کتابی

صورت میں چھاپنے کا اہتمام کیا اور میں نے بھی کراچی میں اسے بصورت کتاب شائع کر دیا۔
"مقالات انشائیے اور شخصیتیں" کے نام سے بھی ایک ضخیم کتاب کا ذخیرہ موجود ہے۔
میری کتاب "حیات اکبر الٰہ آبادی" چودھری نذیر احمد صاحب سابق وزیر صنعت کی قائم کردہ بزمِ اکبر نے شائع کی۔

نظام المشائخ میں کتاب "تاثرات" کا آغاز تھا کہ حکومتِ پاکستان نے ۱۹۵۹ یا ۱۹۶۰ میں تمام اخباروں اور رسالوں سے نئے ڈکلریشن مانگے۔ نظام المشائخ کا ڈکلریشن داخل ہوا مگر منظور نہیں ہوا۔ نظام المشائخ سیاسی پرچہ تو تھا نہیں نامنظوری کی وجہ شاید یہ ہوگی کہ ڈکلریشن منظور کرنے نہ کرنے جو صاحب بیٹھے تھے ان کے ذوق نے اسے گوارا نہیں فرمایا کہ ایسا رسالہ نکلتا رہے کہ مضامین تو چھپتا نہیں کتابوں کی اشاعت کا ذریعہ بن گیا ہے۔ رسالہ رونق دار بھی نہیں تھا۔

میں نے خواجہ حسن نظامی اور اپنے تعلق کی یادگار اور اپنی صحافتی زندگی کے آغاز کی یادگار کو زندہ رکھنے کی پچاس برس کوشش کی۔ وہ میرے ہاتھوں نہیں مرا، جس کے ہاتھوں مرنا مقدر تھا اس کے ہاتھوں مرا لیکن اس کے مرنے سے کتاب "تاثرات" الحمدللہ نہیں مری۔ حمید نظامی مرحوم نے بڑے چاؤ سے کہا کہ تاثرات روزنامہ نوائے وقت چھاپے گا۔ تاثرات نویسی کی رفتار آٹھ گنی بڑھ گئی۔ نظام المشائخ میں جتنے تاثرات ہر مہینے چھپتے اس سے آٹھ گنے زیادہ نوائے وقت میں چھپنے لگے۔

حمید نظامی مرحوم نے تاثرات کی اتنی قدر کی اور زندہ دلان پنجاب سے اتنی قدر کرائی کہ میں ان کا احسان فراموش نہیں کر سکتا۔ کتاب "تاثرات" ان کے نام معنون اور ان کی رُوح کی نذر کی گئی ہے۔ اکرام قمر صاحب فوجی ہفت روزہ "ہلال" کے ایڈیٹر نوائے وقت ہی کے ذریعے "تاثرات" سے واقف ہوئے "ہلال" جس دن سے نکلا ہے اس میں میرے تاثرات ہفتہ وار درج کیے جاتے ہیں۔ حمید نظامی صاحب کے بھائی مجید نظامی "ستارۂ قائدِ اعظم" نے بھی بھائی کی وضع کو نبھایا۔ اہل پنجاب قدر کرنے میں بخیل نہیں ہوتے۔ اہل دہلی کا فرض کفایہ حکیم محمد سعید صاحب "ستارۂ امتیاز" ادا کر رہے ہیں۔ تاثرات ہمدرد صحت ڈائجسٹ میں چھاپنے کے علاوہ انہیں کتابی صورت بھی حکیم صاحب محترم ہی دے رہے ہیں۔ بائیس برس سے میں نے دو مضمون اپنے واسطے مختص

کر رکھے ہیں۔ ایک "دلی"، دوسرا "اسلام"، دلی کے متعلق میرے زمانے کی دلی" کے علاوہ "ناقابل فراموش لوگ اور ناقابل فراموش باتیں" مرتب شدہ اور ٹائپ شدہ چھپنے کی منتظر ہے۔
میرے تاثرات میں اسلامی رنگ ہوتا ہے۔ کسی تاثر میں ہلکا کسی تاثر میں گہرا۔ عموماً قرآن مجید کی آیات تاثر کو ابھارتی ہیں۔ آیات مضمون کو جنم دیتی ہیں۔ آیت پڑھتے پڑھتے ایسا مضمون دماغ میں آجاتا ہے کہ اسے لکھ کر آیت شامل کر دیتا ہوں۔ مضمون سے آیت کا جاندار مطلب سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔ اور آیت مضمون کو چمکا دیتی ہے۔ کبھی کبھی ویسے بھی مضمون لکھتا ہوں اور اس کی تائید آیت سے کراتا ہوں۔ اسی فی صد تاثرات اس نوع کے ہیں۔ یہاں بطور تحدیث نعمت رب و رفیق الاعلیٰ اتنا ذکر کردوں تو امید ہے بے محل نہ سمجھا جائے گا کہ ایک دفعہ جناب محمد ایوب قادری سابق رکن ہسٹاریکل سوسائٹی و حال لیکچرار اردو کالج نے میری پردادی کے والد میر نجف علی اور بھائی میر عبدالرزاق کی بابت لکھا تھا کہ "میر عبدالرزاق ابن میر نجف علی المعروف بہ فوجدار خاں نے ۱۲۷۲ ہجری میں مطبع نقشبندی سے تفسیر رفیعی طبع کرائی تھی۔ اس میں میر عبدالرزاق رقمطراز ہیں کہ: میرے والد ماجد حضرت شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ سے ترجمہ قرآن کریم پڑھا کرتے تھے اور ان کی اجازت سے ترجمہ قلم بند کرتے رہتے تھے جب قرآن ختم ہوا تو سارا ترجمہ شاہ صاحب کو دکھایا۔ اس طرح شاہ صاحب کا ترجمہ قرآن مکمل کیا گیا اور شائع کیا گیا۔ تفسیر رفیعی مطبوعہ مطبع نقشبندی انجمن ترقی اردو کراچی کی لائبریری میں موجود ہے"۔ مجھے جو قرآن مجید سے تھوڑا بہت لگاؤ ہے اس کی نزدیک ترین وجہ یہ ہے کہ میرے خاندان کو کل تک خاندان ولی اللٰہی سے قرب کی خوش نصیبی حاصل تھی۔ نیز میرے والد شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے مرید تھے۔ میں نے شاہ فضل الرحمٰن کی مخلصانہ دعائیں لی ہیں۔

قرآن مجید پر غور کرنے کی عادت مجھے مولانا محمد ایوب صاحب کی تقریریں سننے سے پڑی ہے۔ ان کی تقریر اتوار کے اتوار تیس بتیس سال سنی ہے۔ سادہ زبان کا لکھنا خواجہ حسن نظامی صاحب کی صحبت میں سیکھا۔ یوں بھی قلعہ معلیٰ سے متصل کوچہ چیلان کا باشندہ ہوں اور قلعہ معلیٰ سے نکلے ہوئے اور اردو ئے معلیٰ بولتے والے شاہزادوں کا پڑوسی ہوں۔ میں دینی مضامین سیدھی سادی ہلکی پھلکی عام فہم زبان میں لکھ لیتا ہوں۔

بہر حال "تاثرات" میری ستر سالہ مشق تحریر اور عمر بھر کی طالب علمی کا ما حصل

ہیں۔ اللہ تعالیٰ یہ تاثرات قبول فرمالے تو کیا عجب ہے یہی اس کے سایۂ رحمت میں جگہ دلادیں۔
میرا جسم بڑھاپے کی انتہائی منازل سے گزر رہا ہے لیکن یہ تاثرات روح کے ساتھ ساتھ جسم کو بھی اس کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ جتنی دیر جاگتا ہوں لکھتا پڑھتا اور یہی باتیں سوچتا رہتا ہوں۔ فالج زدگی، اپاہج پن اور چوراسی سال کی عمر کی طرف دھیان نہیں جاتا۔ اس سے صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ الحمد للہ میرا ذہن تا ایں دم توانا ہے۔ فالج سے قلب کسی قدر سست ہوگیا ہے۔ دماغ سست نہیں ہوا۔ بائیں جانب کا فالج خطرناک کہا جاتا ہے کیوں کہ بائیں جانب دل ہے، دائیں طرف کے فالج کا دماغ پر اثر ہو جاتا ہے۔ اللہ کا کرم تھا کہ میرا دماغ بچ گیا اور اس نے آدھے مردہ جسم کو زندگی پاتے مشاہدہ کیا۔ فالج گرنے اور آنکھیں بننے کے انتظار نے مجھے سال بھر معطل رکھا اور کامل آرام (COMPLETE REST) سے متنفر کر دیا۔ ادھر آنکھ بنی ادھر میں نے قلم سنبھالا۔ جینے کا لطف مشغول اور منہمک رہنے میں ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ ط بلاشبہ ہم نے انسان کو ایسا بنایا ہے کہ اس کی زندگی مشقتوں سے گھری ہوئی ہے۔ ما زندہ ازینیم کہ آرام نہ گیریم۔
دنیا میں تاثرات کا کافی صلہ ملا ہے دعا کیجیے کہ عقبیٰ میں بھی صلہ ملے اور علامہ شبلی علیہ الرحمۃ کا مصرع صادق آجائے۔

خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

اس سے مسرت اور اطمینان ہے کہ میرا قلم اللہ تعالیٰ کی منشا کے خلاف مدت العمر نہیں بہکا۔ میرے قلم نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہمیشہ ملحوظ رکھی۔ یہی میری متاع آخرت ہے۔ قلم کاری کے سوا اور کوئی کام پیش کرنے کے لائق میں نہیں کر سکا۔ گھمنڈ صالح قلم کاری پر بھی نہیں ہے اور اللہ کے حضور پیش قلم کاری بھی نہیں کروں گا۔ جو کچھ بھی ہوا اسی کے فضل و کرم سے ہوا۔ لہٰذا پیش کرنے کا سوال ہی کیا ہے۔ آس فقط رحمت باری تعالےٰ سے بندھی ہے۔ میرے زمانے کی دلّی کے اور میرے ہم محلہ ناخواندہ شاعر مرزا فخرو کہہ گئے ہیں ؎

میں سر جھکا کے سوئے جہنم چلا ہی تھا
کچھ رحم آگیا مرے پروردگار کو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاثرات

کارندے کی گردن جھک گئی
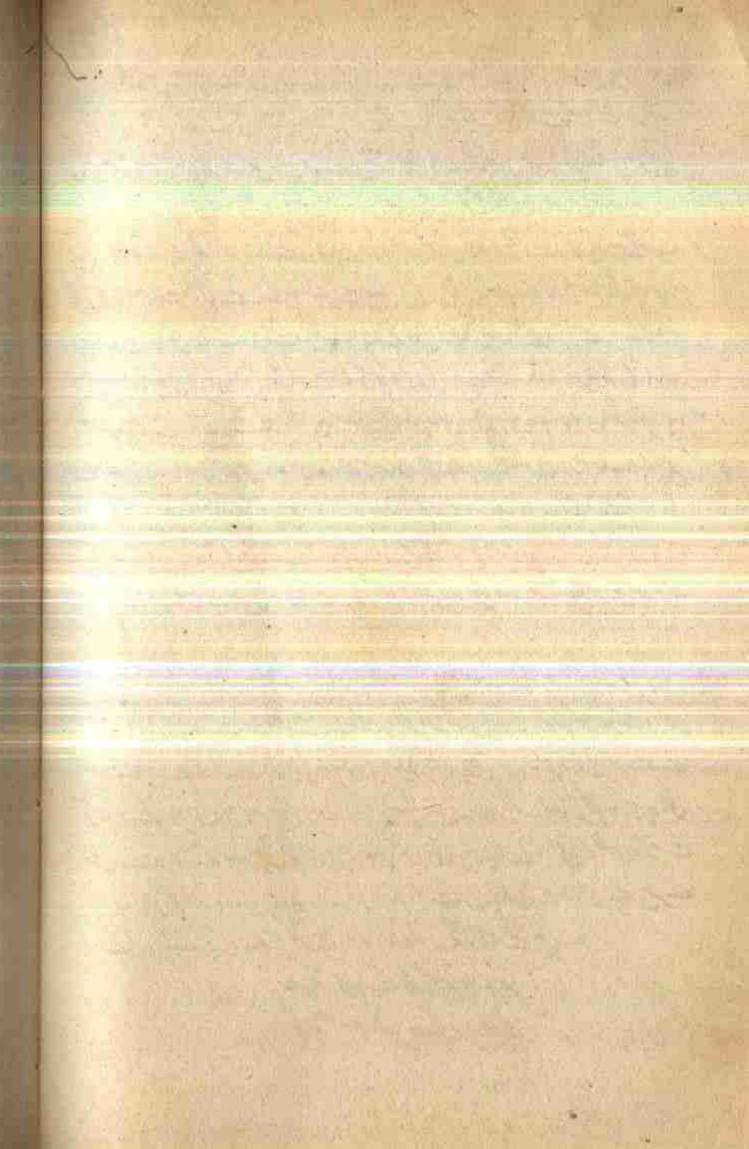
آج تھوڑے سے وہ واقعات پڑھیے جن کی وجہ سے ہم اپنے مطلق العنان بادشاہوں کو بھی بنظرِ محبت دیکھتے ہیں۔ یہ واقعات مولانا سید مناظر احسن گیلانی علیہ الرحمۃ کی کتاب "حضرت امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی" میں مفصل موجود ہیں۔ میں نے اپنی زبان میں ان کا خلاصہ لے لیا ہے۔

(۱) معتصم باللہ عباسی کے زمانے میں ایک بڑا ممتاز جنرل تھا۔ بغا اس کا نام تھا۔ اس کے بیٹے موسیٰ کا مقدمہ قاضی احمد بن بدیل کے سامنے پیش ہوا۔ موسیٰ کوئی جائداد خریدنی چاہتا تھا۔ جائداد کے مالکوں میں ایک یتیم بھی تھا۔ موسیٰ کے کارندے نے محسوس کیا کہ قاضی احمد یتیم کی طرف جھک رہے ہیں۔ انھیں توجہ دلائی گئی کہ معاملہ موسیٰ ابن بغا کا ہے۔ اِنَّہٗ مُوسیٰ بنُ بغَا۔ قاضی احمد نے بے دھڑک اور برجستہ جواب دیا۔ اَعَزَّکَ اللہ اِنَّہٗ تبارکَ وَتعَالیٰ۔ اللہ تمھاری عزت برقرار رکھے۔ دوسرے رخ پر بھی نظر ڈالو معاملہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ہے۔ کارندہ راوی ہے کہ اس جواب سے میری گردن نیچے جھک گئی اور میں نے موسیٰ کو یہ جواب سنایا تو موسیٰ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

پاسداری نہیں کر سکتے

(۲) قاضی عافیہ اودی ہارون الرشید کے زمانے میں بغداد کے قاضی تھے۔ کسی امیر نے ہارون سے اُن کی شکایت کی کہ فلاں مقدمے میں پاسداری کر رہے ہیں۔ ہارون نے بلا بھیجا۔ ابھی بلانے کا مقصد نہیں کھلا تھا کہ ہارون چھینکا اور دربار یَرحَمُکَ اللہ یَرحَمُکَ اللہ کی دعاؤں سے گونج اٹھا۔ مگر قاضی عافیہ نے یَرحَمُکَ اللہ نہیں کہا

اور ہارون نے وجہ پوچھی تو قاضی عافیہ نے جواب دیا یَرْحَمُکَ اللّٰہ جب کہا جاتا ہے کہ چھینکنے والا اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہے۔ آپ نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کب کہا تھا جو میں یَرْحَمُکَ اللّٰہ کہتا۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہی تھا حضور یَرْحَمُکَ اللّٰہ نہیں کہا کرتے تھے اگر چھینکنے والا اَلْحَمْدُ لِلّٰہ نہیں کہتا تھا۔ ہارون بولا، آپ کے خلاف پاسداری کی شکایت کی گئی تھی۔ آپ میری رعایت نہیں کرتے تو اور کی پاسداری کیا کریں گے۔ جائیے، تشریف لے جائیے۔

شہادت مردود تھی

(۳) ایک مقدمے میں قاضی ابو یوسف نے ہارون کے وزیر کو مردود الشہادت قرار دے دیا اور فرمایا آپ کی شہادت قبول نہیں کی جا سکتی۔ وزیر نے ہارون سے شکایت کر دی۔ قاضی ابو یوسف طلب کیے گئے اور پوچھا گیا کہ یہ آپ نے کیا کیا۔ قاضی ابو یوسف نے جواب دیا۔ وزیر صاحب اپنے تئیں آپ کا عبد کہتے ہیں۔ میں ان کا فقرہ خود سن چکا ہوں۔ علاوہ ازیں وزیر صاحب جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے۔ ہارون دم سادھ گیا اور قاضی ابو یوسف چلے گئے تو وزیر سے کہا، مکان کے احاطے میں مسجد بنوا لو اور وہاں جماعت سے نماز پڑھا کرو۔

ہارون رشید کی قسم

(۴) ایک بوڑھے کسان نے خاص ہارون پر قاضی ابو یوسف کی عدالت میں دعویٰ کر دیا کہ فلاں باغ میرا ہے اور خلیفہ نے اُسے ہتھیا لیا ہے۔ اتفاق سے دعویٰ اُس دن دائر کیا گیا جس دن مقدمات ہارون کے روبرو پیش ہونے تھے۔ ہارون نے اس کام کے لیے بھی دن مقرر کر رکھا تھا۔ مقدمات دن کے دن پیش کر دیے جاتے تھے۔ قاضی ابو یوسف نے کہا، اجازت ہو تو مدعی کو آواز دلواؤں۔ ہارون نے اجازت دے دی۔ بوڑھا آیا تو قاضی ابو یوسف نے پوچھا، تم اپنے دعوے کا گواہ دے سکتے ہو؟ بوڑھے نے کہا، گواہ کی ضرورت نہیں ہے۔ امیر المؤمنین قسم کھا لیں کہ یہ باغ اُن کا ہے۔ قاضی ابو یوسف نے ہارون سے کہا، آپ کو قسم کھانی چاہیے۔ ہارون نے قسم کھا کر کہا، میرے والد نے یہ باغ مجھے عطا

فرمایا تھا۔ بوڑھا بولا، یوں قسم کھالی جیسے ستو غٹ غٹ پی جاتے ہیں۔ ہارون کا چہرہ غصّے سے لال ہوگیا۔ لیکن یحییٰ بن خالد نے فوراً غصّے کو ٹھنڈا کیا۔ کہا، ابو یوسف دیکھتے ہو امیر المومنین کا انصاف۔ ابو یوسف نے جواب دیا، انصاف کے سوا چارہ بھی کیا تھا یحییٰ نے کہا، فاروق ہی سے اس قسم کے انصاف کی توقع کی جا سکتی ہے۔ دونوں کی باتوں نے ہارون کے دل کا بوجھ اُتار دیا اور غصّہ دُور کر دیا۔

قاضی ابو یوسف کہا کرتے تھے کہ مجھ سے کوتاہی رہ گئی۔ میں نے امیر المؤمنین کو کسان کے برابر کھڑا نہیں کیا۔ میں عرض کرتا تو امیر المؤمنین اسلامی مساوات کا قطعی لحاظ کرتے۔

قاضی حفص کا فیصلہ

(۵) ہارون ہی کے زمانے میں بغداد کے ایک قاضی حفص بن غیاث بھی تھے۔ زبیدہ (ملکہ ہارون) کی جاگیر کا گماشتہ اُن کی عدالت میں پیش ہُوا۔ گماشتے کے خلاف کسی نے دعویٰ کیا تھا کہ تیس ہزار درم اُس کے ذمّے ہیں، ادائیگی نہیں کرتا۔ دعویٰ سچا تھا۔ قاضی حفص نے حکم دیا کہ رقم ادا کر دو، ورنہ جیل جاؤ۔ گماشتہ جیل چلا گیا۔ ملکہ کو خبر لگی۔ اُس نے داروغہ جیل کے پاس آدمی بھیج کر گماشتے کی رہائی کرالی۔ قاضی حفص نے کہا، گماشتہ جیل واپس بھیجا جائے ورنہ میں استعفےٰ دیتا ہوں۔ جو آدمی رہائی کرانے گیا تھا وہ گھبرایا کہ امیر المؤمنین ملکہ سے تو کچھ کہیں گے نہیں، میں مارا جاؤں گا۔ اُس نے ملکہ کے سامنے رونا شروع کر دیا کہ خدارا فی الحال قاضی حفص کا کہنا کر دیجیے۔ پھر میں سمجھا بجھا کر رہائی دلادوں گا۔ ملکہ نے گماشتے کو جیل واپس بھیج دیا، لیکن ہارون سے شکایت بھی کر دی۔ زبیدہ ہارون کی بھتیجی ملکہ تھی۔ ہارون نے قاضی حفص کو فرمان لکھا کہ گماشتے کے معاملے میں سختی نہ برتیں۔ اِدھر ہارون فرمان لکھوا رہا تھا اُدھر قاضی حفص کو خبر پہنچ گئی کہ ایسا ایسا فرمان آرہا ہے۔ قاضی حفص نے فوراً گماشتے کا مقدمہ لے لیا اور مقدّمے کی تکمیل کر کے فیصلہ پر مہر لگا دی۔ ہارون کا قاصد مُہر لگنے سے پہلے آگیا تھا، مگر قاضی حفص نے کہا، جو کام ہاتھ میں ہے وہ ختم کر لوں۔ قاصد بار بار توجہ دلاتا تھا کہ خلیفہ کا فرمان لایا ہوں اور قاضی حفص ہر بار کہتے تھے کہ ہاتھ کا کام ختم کر لینے دو۔ چناں چہ مُہر لگا کر قاضی حفص نے فرمان وصُول کیا اور قاصد سے فرمایا۔ امیر المؤمنین کی خدمت میں میرا اسلام عرض کرنا اور کہنا کہ فرمان

پڑھنے سے پہلے فیصلہ کیا جاچکا تھا۔ قاصد بولا، میں بر وقت آ گیا تھا۔ آپ نے فیصلے کی تکمیل سے پہلے فرمان قصداً نہیں لیا۔ مجھے یہ بھی عرض کرنا پڑے گا۔ قاضی حفصؒ نے جواب دیا، یہ بھی عرض کر دینا۔ قاصد نے سارا ماجرا جا سنایا لیکن ہارون بالکل نہیں بگڑا۔ ملکہ کے اصرار پر قاضی حفص کو بس بغداد سے دوسری جگہ بدل دیا۔ ملکہ کی خواہش تھی کہ موقوف کر دیا جائے۔

علم بڑا یا وزیر؟

(۶۱) مامون الرشید ابن ہارون الرشید کے زمانے میں ابراہیم بن رستم ایک عالم تھے۔ شہر مرو میں دباغوں (چمڑا کمانے والوں) کی اولاد کو پڑھاتے تھے۔ ابن مرو آیا تو اُس نے اُنھیں بلایا اور قاضی کا عہدہ پیش کیا۔ اُنھوں نے فرمایا، مجھے درس و تدریس کا شغل مرغوب ہے۔ میں کوئی اور شغل اختیار نہیں کر سکتا۔ پھر مامون کا وزیر فضل پہنچا۔ فضل برامکی خلیفہ کے بعد مملکت کا سب سے بڑا آدمی تھا، مگر ابراہیم فضل کی تعظیم کے لیے نہیں کھڑے ہوئے۔ وہ بھی بیٹھے رہے اور طلبہ بھی بیٹھے رہے۔ فضل کے ایک ساتھی نے کہا، ابراہیم! تعجب ہے، وزیر صاحب تم سے ملنے تشریف لائے ہیں اور تم چمڑا پکانے والوں میں ایسے مستغرق ہو کہ تعظیم کے لیے بھی نہیں اُٹھتے۔ ابراہیم کی بجائے ایک طالب علم نے جواب دیا، ہم اب چمڑا نہیں پکاتے۔ ہم اُس دین پختہ کر رہے ہیں جس نے ابراہیم کا یہ رتبہ کیا ہے کہ وزیر صاحب اُن سے ملنے تشریف لائے ہیں۔

قاضی، علم اور مسلمان

جن قاضیوں کے واقعات اوپر بیان کیے گئے ہیں وہ حکومت سے تعاون کرنے والے اور تنخواہیں لینے والے قاضی تھے، لیکن حکومت نے اُن کی خودداری اور اُن کے دین کو ٹھیس نہیں لگائی۔ دین کا اقتدار امویوں کے زمانے میں جاتا رہا تھا اور عباسیوں کے ابتدائی زمانے تک بگڑا رہا، مگر ہارون الرشید کے زمانے میں شعبہ عدالت بالکل اہل دین کے ہاتھ میں آ گیا۔ حضرت امام ابو یوسف قاضی القضاۃ تھے اور قاضیوں کا تقرر خلیفہ نہیں کرتا تھا قاضی القضاۃ کرتا تھا۔

امام ابو یوسف کو اتنا چڑھا دینے پر چرچا غم بھی ہوئی لیکن ہارون الرشید نے

کہا، "میں نے جو کچھ کیا ہے جان بُوجھ کر کیا ہے۔ ابو یوسف کا دین آلودگیوں سے پاک ہے۔ جس باب میں ابو یوسف کو جانچا گیا، کامل پایا۔"

دین کی طرف متوجہ ہو جانے کی بنیاد تو مہدی عباسی کے زمانے میں پڑ گئی تھی، ہادی نے اُسے ترقی دی۔ ہارون خود عالم تھا اور علم کی قدر جانتا تھا۔ پھر مامون کو اُس نے اتنا پڑھوایا لکھوایا کہ مامون خلیفہ اور امیر المؤمنین نہ ہوتا تو فقیہ اور امام المسلمین ہوتا۔

مسلمان بادشاہوں کی دل چسپی حکومت اور فتوحات تک محدود نہیں تھی، ذہنی سرگرمیوں پر بھی اُن کی نظر رہتی تھی۔ اسلام سے پہلے عرب میں حروف شناس اکّا دکّا تھے۔ اسلام کے بعد مسلمان بادشاہوں کی توجّہ سے وہاں علوم و فنون کے دریا بہہ گئے۔ مدارس بغداد، مدارس اندلس، مدارس دہلی، مدارس لکھنؤ، مدارس جونپور، مدارس ضلع سہارن پور، مدارس احمد آباد گجرات، مدارس بہار، مدارسِ مدراس اور مدارس سندھ کس کس کو صفحۂ تاریخ سے مٹایا جا سکتا ہے۔

تعلیم کے ساتھ تربیت کا الگ انتظام تھا۔ تعلیم کے لیے مدارس تھے، تربیت کے لیے خانقاہیں تھیں۔ مدارس میں علوم و فنون سکھائے جاتے تھے، خانقاہوں میں تہذیب اخلاق، تزکیہ نفس اور ترقی روحانی کا درس دیا جاتا تھا۔ موجودہ سوسائٹی اُن خانقاہوں کا مُنھ چڑاتی ہے۔

ایجاد و اختراع کی بھی مسلمان بادشاہوں نے سرپرستی کی۔ آلات ہندسہ، آلات جرِّ ثقیل، آلات ہیئت اور آلات کیمیا دی اور خدا معلوم کیا کیا چیزیں مسلمانوں نے مسلمان بادشاہوں کی حوصلہ افزائی سے بنا ڈالیں۔ اسلام کے بالکل ابتدائی دَور میں امیر معاویہ نے بارہ سَو جہازوں کا بیڑہ تیار کیا تھا جو اُس وقت دُنیا کا عظیم ترین بیڑہ تھا۔

بچپن کی تعلیم کا اثر

میں نے اپنے پوتے سے کہا، "بیٹا! چیونٹیوں کو مت مارو، یہ بھی تمھاری طرح جان رکھتی ہیں۔ اللہ چاہتا تو تمھیں چیونٹی بنا دیتا اور تمھاری بجائے کسی چیونٹی کو انسان کر دیتا۔" میرے اس پوتے کی عمر ڈیڑھ سال سے کچھ اوپر ہے۔ آپ شاید ہنسیں کہ اتنا سا بچہ یہ بات کیا سمجھے گا، لیکن نہیں اُس نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔ بظاہر سمجھتا نظر نہیں آتا، حقیقتاً سمجھ رہا ہے۔ آخر انسان زبان اسی طرح سیکھتا ہے یا نہیں؟ دیکھیے گا میرا پوتا کیسی سلیس اُردو بولتا ہے اور

ٹھیٹ قدیم دلی کے لہجے میں بولتا ہے، حالاں کہ پیدا کراچی میں ہوا ہے، مگر ننھیال ددھیال دونوں چوں کہ دلی کی ہیں، اردو سیکھنے کے لیے مدرسے کا محتاج نہیں ہے۔ بچّہ اور باتیں بھی ماں کی گود میں خوب سیکھتا ہے اور بڑی جلدی سیکھتا ہے اور اس زمانے کی سیکھی ہوئی باتیں پھر بھلائے نہیں بھولتیں۔ اس زمانے کے نقوش مٹائے نہیں مٹتے۔ بڑے بچّوں میں بھی سیکھنے اور قبول کرنے کا مادّہ بڑوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ اکتیس بتّیس برس کا ہو جانے کے بعد یہ مادّہ دوسری شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اُس وقت غلط کو غلط بہتر طریقے پر کہنا آ جاتا ہے، لیکن بچپن میں جو غلط بات جم جائے اُسے دل سے نکالنا مشکل ہے۔ میرے ایک دوست تھے جنھیں ماں باپ نے بہت کم عمری میں انگلستان بھیج دیا تھا، وہیں پلے بڑھے وہیں تعلیم و تربیت پائی، بالکل انگریز تھے۔ مگر کہا کرتے تھے کہ ماں سے کبھی سُن لیا تھا کہ تیسری تاریخ کا چاند دیکھنا نحوس ہے، یہ خیال ایسا جما ہے کہ اتفاق سے تیسری تاریخ کا چاند دیکھ لیتا ہوں تو پورے مہینے واقعی پریشان رہتا ہوں۔ حالاں کہ سب کے نزدیک یہ لغو خیال ہے۔ (الحمدللہ میرے اس پوتے سیّد محمد علی واحدی سلمہ نے میرا قیاس سچّا کر دکھایا ہے۔)

صُورت، سیرت اور خیالات

انسان پیدا ہونے اور مرنے میں بے بس ہے۔ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے۔ صورت و سیرت بھی انسان اللہ کے ہاں سے ساتھ لاتا ہے، مگر صورت و سیرت کو سنوارنا انسان کے اختیار میں ہے۔ پیدا ہونے سے مرتے دم تک کے جن کاموں میں انسان بااختیار رہے اُن میں اُستاد اور مساعدت حالات کی ضرورت پڑتی ہے۔ اُستاد اور حالات انسان کو اُلٹتے پلٹتے اور ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔

صورت اور سیرت کا چولی دامن جیسا ساتھ ہے۔ صورت پر جس طرح مفلسی اور دولت مندی، بیماری اور تن درستی برستی ہے اُسی طرح بلکہ اُس سے زیادہ سیرت جھلکتی ہے۔ صورت کو کریم اور پاؤڈر سے زیادہ اچھے عمل اور اچھے کردار سے سنوارا جا سکتا ہے۔ اچھا عمل اور اچھا کردار صورت پر سے مفلسی اور بیماری کا اثر زائل کر دیتا ہے اور دولت مندی و تن درستی کی ترنگ کو قابو میں رکھتا ہے۔ صورت دیکھ کر آپ پہچان سکتے ہیں کہ فلاں شخص کس سیرت کا ہے۔ خیالات بد صورت چہرے کو خوب صورت اور خوب صورت

چہرے کو بدصورت کر دیتے ہیں۔ اچھے خیالات چہرے کو نکھار دیتے ہیں اور چمکا دیتے ہیں اور برُے خیالات چہرے کو بگاڑ دیتے اور مسخ کر دیتے ہیں۔ چہرے کا حسُن و جمال اچھی غذا اور اچھی معاشرت سے بڑھ کر اچھے خیالات اور اچھے تصورات کا محتاج ہے۔

طبیعت اور فطرت اللہ تعالیٰ ہر انسان کو مومنانہ عطا فرماتا ہے، لیکن برُے ماں باپ، برُے اُستاد اور برُے حالات طبیعت اور فطرت کا ناس کر دیتے ہیں۔ بھلے چنگے مومن دماغ میں کفر بھر دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ طبیعت اور فطرت کے ساتھ ساتھ اُستاد اور ہادی بھی مہیا کرتا ہے۔ ہمیں سب سے اعلیٰ ہادی ملا تھا، تمام ہادیوں کی صفات کا جامع، ہم اُسے ہادی مانتے ہیں، اُس کے ہادی ہونے پر ہمارا ایمان ہے، مگر اُس سے ہم سیکھتے کچھ نہیں، سیکھتے اُس کے دشمنوں سے ہیں، پیروی اُس کے بیریوں کی کرتے ہیں۔

ہمارے ہادی نے برُے حالات کو اچھے حالات سے بدل دیا تھا اور ہم برُے حالات کو خود دعوت دیتے ہیں۔ اُس نے کہا تھا، "زمانے کی شکایت مت کرتے رہا کرو۔" لیکن آجکل کے مسلمانوں سے تو زمانے کو شکایت ہونی چاہیے۔ ہم اپنے ہادی کی تعلیم سے دُور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اپنے ہادی کے راستے کے برعکس دوڑ رہے ہیں لیکن اُسے اپنا ہادی ضرور کہتے ہیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے۔ ہم اُس کے راستے پر چلتے تو کیا ایسے ہی ہوتے جیسے کہ اس وقت ہیں۔ دنیا بھر سے پھسڈی۔ پسماندگی کی صفِ آخر سے بھی آگے۔ اُس کے راستے پر چل کر تو اُونٹ اور بکریاں چرانے والے اور لہو و لعب کے دلدادہ چند سال کے اندر آدھی دنیا کے بادشاہ اور رہنما ہو گئے تھے۔ ہمارے ہادی نے تو ایک ایک شاگرد کو جینیس (GENIUS) بنا دیا تھا۔ وہ معجزہ آج بھی دیکھا جا سکتا ہے، لیکن ہم معجزہ دیکھنے پر آمادہ تو ہوں۔

محاسن اور معائب

ایسے آدمی ہزاروں میں نہیں، لاکھوں میں دو چار نکلیں گے، جو اپنے معائب پر نظر رکھتے ہوں اور اپنے محاسن پر گھمنڈ نہ کرتے ہوں، حالاں کہ گھمنڈ محاسن کو خاک میں ملا دیتا ہے۔

کہتے ہیں، قیامت کے دن اللہ تعالےٰ انسان کے محاسن کی وجہ سے اُس کے معایب کو نظر انداز کر دے گا۔ اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّئَاتِ۔ لیکن گھمنڈ وہ عیب ہے کہ گھمنڈ کی موجودگی میں محاسن محاسن ہی نہیں رہتے۔ گھمنڈی آدمی کی عادت ہوتی ہے کہ جس حسن کو اپنے اندر دیکھتا ہے، اُسے اگر دوسرے میں نہیں پاتا، یا کم پاتا ہے تو اس کی تحقیر کرنے لگتا ہے، اُس کا مذاق اُڑاتا ہے۔ مثلاً اہلِ عقل کم عقلوں کی تحقیر کرتے ہیں اور اہلِ علم کم علموں کی، اور اہلِ دول کا تو کہنا ہی کیا، وہ تو کم مایہ لوگوں کو ہم جنس نہیں سمجھتے، اہلِ عقل اور اہلِ علم بھی اُن کے نزدیک ہیچ ہیں، جب تک عقل اور علم کے ساتھ دولت نہ ہو۔

پھر نیکوکاری کا گھمنڈ تو بہت ہی بُری حرکت ہے۔ ایک حدیث ہے کہ بنی اسرائیل کے کسی شخص نے کسی شخص کی نسبت کہا کہ وہ اتنا بڑا گناہگار ہے کہ اللہ کی قسم اللہ اُسے نہیں بخشے گا۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا، اِسے میری قسم کھانے اور میری بابت فیصلہ دینے کا کیا حق تھا، میں گناہگار کو بخشوں گا اور عبادت کا زعم رکھنے والے کو جہنم میں بھیجوں گا۔

کوئی بدکار آدمی نیک کردار آدمی کا مذاق اڑائے، یہ بات عقل میں آسکتی ہے۔ بدکار اپنی بدکاری میں تھوڑا سا اضافہ کر لیتا ہے، لیکن کوئی نیک کردار بدکردار کا مذاق اُڑائے یہ بڑی نادانی ہے۔ نیک کردار کو تو بدکردار پر ترس کھانا چاہیے۔ مریض پر ترس کھایا جاتا ہے، مریض کا مذاق نہیں اُڑایا جاتا۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم فرماتے ہیں:۔ میرا سینہ کھوٹ کپٹ سے پاک ہے، جو مجھ سے محبت کرتا ہے وہ بھی سینے کو کھوٹ کپٹ سے پاک رکھے۔ اس ارشاد میں حضورؐ نے ہدایت کی ہے کہ بُرے سے بُرے آدمی کے لیے بُرے جذبات نہ اُبھرنے دیے جائیں۔ بُرائی کی اصلاح اور بُرائی کا دُور کرنا اور چیز ہے اور بُرے جذبات اپنے اندر پیدا ہونے دینا اور چیز۔ دوسروں کے خلاف بُرے جذبات پیدا ہو جانے کے بعد اُن کی اصلاح ممکن نہیں رہتی۔

ایک تفسیر

دلی کے رسالہ آستانہ میں قرآن پاک کی ایک نئی تفسیر چھپنی شروع ہوئی ہے۔ آج اُس کا تھوڑا سا اقتباس پڑھیے۔ سورہ فاتحہ کا مضمون بیان کر رہے ہیں اور رحمٰن

اور رب العالمین کا مطلب بتا رہے ہیں، اور سمجھا رہے ہیں کہ مستحق حمد و ثنا بھلا اللہ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

زمین، روئیدگی اور اعتدال

"پودوں، پھلوں، پھولوں اور تمام نباتات و اشجار کی روئیدگی کے لیے سب سے پہلے زمین کا مرحلہ سامنے آتا ہے۔ اچھّی زمین جو روئیدگی و پرورش کا سامان اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے، اس میں اللہ تعالےٰ کی ربوبیت کاملہ و رحمت تامّہ ان چار چیزوں کو مناسب مقدار اور حدِ اعتدال میں پیدا کرتی ہے: چُونا، چکنی مٹّی، ریت اور کھاد۔

چُونے کے بغیر زمین میں روئیدگی کی صلاحیّت پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ چُونے ہی کا فعل ہے جس سے زمین کی تیزابیت کی شدّت کم ہوتی ہے اور زمین میں مٹھاس پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر چُونا ضرورت اور مقدار سے کم ہو جائے تو زمین میں تیزابی مادّہ کی شدّت کسی بیج کا بار آور ہونا محال کر دے گی اور اگر چونا مناسب مقدار سے زیادہ ہو جائے تو زمین میں فولاد کا جزو بے اثر ہو جائے گی۔

چکنی مٹّی ٹھنڈی اور بھاری ہوتی ہے اور پانی کی نمی اور رطوبت کو اپنے اندر جذب کرنے اور اُسے دیر تک اپنے پاس باقی رکھنے کی قوّت رکھتی ہے۔

ریت پیاسا اور خُشک ہوتا ہے اور زمین میں جو بھاری پن اور سختی ہے اُسے ضروری اور مناسب مقدار میں دُور کر کے زمین کو ہلکا بنا دیتا ہے اور یہ استعداد پیدا کر دیتا ہے کہ زمین کی اندرونی سطح کی گرمی پودوں کی جڑوں تک بہ آسانی پہنچ سکے۔ اگر ریت کے ذریعے زمین کی سختی دُور نہ کی جائے اور اس طرح زمین ہلکی نہ ہو جائے تو زمین کی اندرونی گیس کی وجہ سے پودے زندہ نہیں رہ سکتے۔

چوتھی چیز کھاد ہے۔ خزاں کے موسم میں پتّے درختوں سے گر جاتے ہیں اور اُن کی کافی مقدار زمین میں جذب ہو جاتی ہے۔ یہ خزاں رسیدہ پتّے زمین میں پہنچ کر کھاد بن جاتے ہیں۔ خود چوں کہ بوڑھے ہو گئے تھے اس لیے اللہ اُن پر موت طاری فرماتا ہے۔ وہ درخت کی دنیا سے علاحدہ کر دیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کی ربوبیت کاملہ و رحمتِ تامّہ نے اپنے عام اصول کے مطابق اِن خزاں رسیدہ مُردہ پتّوں کو نئے پودوں، ننھے پتّوں اور نباتات

کی نئی نسل کے لیے بنیاد بنا دیا اور ان کی کھاد سے زمین کو وہ توانائی بخش دی کہ وہ نباتات کی نئی نسل پیدا کرے۔ کھاد کی اس جنس کے علاوہ پودوں کی غذا کے لیے بہت سی معدنیات کا ایک مرکب چاہیے ہوتا ہے جس کا انتظام اللہ تعالیٰ موسم خزاں کے بعد کرتا ہے۔

المختصر زمین میں روئیدگی کے واسطے مندرجہ بالا چار چیزوں کا اعتدال اور تناسب لازمی ہے۔ ان میں سے کسی کی مقدار متناسب نہ رہے، چونا، چکنی مٹی، ریت اور کھاد میں سے کوئی جزو بھی زیادہ یا کم ہو جائے تو زمین میں سے روئیدگی کی صلاحیت جاتی رہے گی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کاملہ و رحمت تامہ کا فیضان اور احسان ہے کہ ان چاروں اجزا کی ترکیب، مناسبت کے ساتھ، انتہائی اعتدال سے وجود پذیر کی جاتی ہے، اور ان کی مناسب اور مقررہ مقدار کی ترکیب ہی سے ایک پودے کے نمودار ہونے اور پرورش پانے کا امکان ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کاملہ اور رحمت تامہ زمین کو اس طرح روئیدگی کے واسطے تیار کر کے اس میں ایک بیج پہنچاتی ہے۔ بیج ایک چھوٹا سا دانہ ہوتا ہے، جس کے اندر ہمیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ہم اسے معمولی ٹھوس چیز سمجھتے ہیں لیکن قدرت الٰہیہ نے اس چھوٹے سے بیج میں چار چیزوں کی بنیادیں چھپا رکھی ہیں۔ دو گرہیں ہوتی ہیں، ایک گرہ جڑ بن کر زمین میں پیوست ہو جاتی ہے، دوسری گرہ شاخ بن کر زمین سے ابھر آتی ہے۔ اس ٹوٹے سے بیج میں دو جڑے ہوئے پتے بھی پوشیدہ ہوتے ہیں اور چوتھی چیز بیج کے ننھے سے جسم میں یہ ہوتی ہے کہ زمین میں جمنے سے پہلے، چند دن جو گزریں گے، ان چند دنوں کے لیے اس کی غذا اسی کے اندر محفوظ کر دی جاتی ہے۔ ہر بیج میں یہ چاروں چیزیں جمع ہوتی ہیں اور پھر قدرتِ الٰہیہ کا نظام محکم بیج کے اس ننھے سے جسم کو زمین کے حوالے کر دیتا ہے۔ گیہوں اور چنے کا بڑا بیج ہی اپنے اندر یہ چاروں چیزیں نہیں رکھتا خشخاش کا نہایت چھوٹا بیج بھی چاروں چیزیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ خشخاش کے بیج میں بھی چاروں چیزوں کی یہ کائنات مخفی ہوتی ہے اور خشخاش سے چھوٹے بیج بھی ہیں، انھیں بھی ربوبیت الٰہیہ اور رحمتِ خداوندی اِن چار چیزوں کا خزانہ رکھ کر زمین کے حوالے کرتی ہے، تاکہ وہ دنیا میں فیضان و افادہ اور حسن و جمال کا نو بہ نو عالم پیدا کر دیں۔

بارہا خشخاش کا دانہ آپ کے ہاتھ میں آیا ہوگا، لیکن اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کاملہ اور رحمتِ تامہ کے اس فیضان و احسان پر آپ کی توجہ منعطف نہ ہو سکی ہوگی، اس ننھے

سے بیج میں ایک مفید اور حسین پودا پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالےٰ نے کیا کیا چیزیں چھپا دی ہیں، وہ جب زمین میں جاتا ہے تو کس طرح ایک مسکراتا ہوا پودا، لہلہاتی ہوئی پتیاں اور خوش نما پھول اور لذیذ پھل ہماری دنیا کو حسن و جمال اور آسودگی سے مالا مال کر دیتے ہیں۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔

یہ سارا عمل بیج کو ضروری سامان سے آراستہ کر کے زمین کے اندرونی حصے میں پہنچانے تک کے وقفے کے واسطے تھا۔ اب آپ غور کیجیے کہ اگر زمین میں اُس کی وہ چاروں چیزیں مناسب مقدار میں نہ ہوں تو زمین سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ قدرتِ الٰہیہ و ربوبیت خداوندی نے زمین کو اس طرح تیار کیا اور پھر بیج کی ننھی سی دنیا میں ضروری سامان رکھ کر زمین کے حوالے کر دیا۔

بیج نے اپنا سامان زمین کو دیا اور زمین اپنی صلاحیت و استعداد کے ساتھ پودا پیدا کرنے پر آمادہ ہے لیکن ان تمام کارفرمائیوں کے بعد ربوبیت الٰہی اور رحمتِ خداوندی کتنے ہی اور مرحلے طے کرے گی تب وہ پودا ہماری نگاہوں کے سامنے آئے گا۔

بیج کو زمین میں جگہ بنانے کے واسطے پانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ پانی کے علاوہ چند معدنی چیزیں درکار ہوتی ہیں جن کا ہر جگہ فراہم ہونا آسان نہیں ہے، ربوبیتِ الٰہیہ نے اُن چیزوں کی فراہمی کا یہ بندوبست کیا ہے کہ پہاڑوں پر برف جمتی ہے، جو گرمی کے موسم میں پگھلتی ہے اور دریاؤں میں مل جاتی ہے۔ دریا نہروں میں منقسم ہو کر اپنا پانی کھیتوں میں پہنچاتے ہیں اور یوں وہ سب چیزیں جو روئیدگی کے لیے شرط و بنیاد ہیں آسانی سے فراہم ہو جاتی ہیں۔ اگر قدرتِ خداوندی یہ انتظامات نہ کرتی تو زمین کی روئیدگی کی وہ صلاحیت کیسے حاصل ہوتی جس کا انحصار ان چیزوں کی فراہمی پر ہے۔ غور فرمائیے، پہاڑوں کی نعمتیں کیوں کر خود بخود ہمارے میدانوں میں آپہنچتی ہیں، کیا یہ رحمٰن و رحیم، اللہ کی ربوبیت اور رحمت نہیں ہے اور ان میں ہر بات کیا یہی تقاضا نہیں کرتی کہ ہم صرف اللہ رب العٰلمین الرحمٰن الرحیم ہی کی حمد کریں اور تعریفوں، عزتوں اور عظمتوں کے ترانے اُسی کے حضور بلند کریں۔

پہاڑوں سے معدنیات کے خزانے لے کر آنے والے دریا اور اُن کی نہریں ایک پودا پیدا کرنے کی پوری ضرورت کے مطابق پانی فراہم نہیں کر سکتیں مزید پانی کا بھی قدرتِ الٰہیہ انتظام کرتی ہے۔ سمندروں سے پانی بخارات بن کر ہواؤں کے دوش پر اوپر اُٹھتا

ہے اور اللہ رب العالمین کی کارسازی و کارفرمائی اُن ہواؤں کو پیاسی زمینوں کی طرف لاتی ہے اور وہ بخاراتِ آبی قطرہ قطرہ ہو کر زمین پر گرتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کی ربوبیتِ کاملہ و رحمتِ تامہ زمین کا ہر تشنہ گوشہ تلاش کر لیتی ہے اور بارش کے خوانِ کرم سے زمین سیراب اور شادکام ہو جاتی ہے۔

تشنہ زمین کو پانی کی شادابی ملتی ہے تو بیج میں اہتزاز پیدا ہوتا ہے اور ایک گرہ جڑ بن کر زمین میں جم جاتی ہے اور دوسری گرہ شاخ بن کر زمین سے باہر اُبھرتی ہے۔ رنگ ریز مادہ (CHLOROPHYLL) سورج کی روشنی سے اثر لیتا ہے اور قدرتِ الٰہیہ کے خزانے سے پودے کو سبز رنگ کی جاذبیت و دل کشی کی دولت و نعمت عطا کر دی جاتی ہے اور پودے کی نشو و نما شروع ہو جاتی ہے۔

اُلٹی کششِ ثقل

اس مرحلے پر ایک دل چسپ اور حیرت انگیز بات سامنے آتی ہے کہ پودا خواہ زمین کی اندرونی سطح سے پانی اور نمی حاصل کرے یا دریاؤں اور نہروں اور بارش کا پانی اسے سرسبز اور شاداب بنائے، پانی بہر صورت پودے کی جڑ سے اوپر کی طرف چڑھتا ہے حالاں کہ کششِ ارضی (GRAVITY) کے تحت پانی ہمیشہ نیچے کی طرف جایا کرتا ہے۔ مگر پودا جو پانی اپنے لیے حاصل کرتا ہے وہ نیچے سے اوپر جاتا ہے اور آم، برگد اور یوکلپٹس جیسے درختوں کی پرورش میں پانی سطحِ زمین سے تیرہ تیرہ اور چودہ چودہ فیٹ بلندی تک چڑھ جاتا ہے۔

پیغمبر اور پیرو

کسی پیغمبر نے یہ دعوا نہیں کیا کہ میرا خدا کی خدائی میں ساجھا ہے، یا دخل ہے، میں کائنات کو زیر و زبر کر سکتا ہوں، مگر پیغمبروں کی وفات کے بعد اُن کے نام لیواؤں نے اُنھیں عموماً خدائی کا شریک بنا دیا۔ قدیم پیغمبروں کی اصلی تعلیمات محفوظ نہیں ہیں جو حوالہ دے کر یہ بات ثابت کی جائے کہ قدیم پیغمبروں نے اس قسم کے دعوے نہیں کیے تھے۔ لیکن ہمارے پیغمبر کی تعلیم محفوظ ہے۔ اس میں صاف صاف موجود ہے کہ خدا خدا ہے اور پیغمبر پیغمبر ہے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ اللہ کے سوا اِلٰہ اور کوئی نہیں ہے محمد صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلّم کو اللہ مت سمجھ لینا، جیسا کہ عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السّلام کو سمجھ لیا ہے، محمد اللہ کے رسول ہیں۔ مسلمانوں کا صرف کلمہ مسلمانوں کا عقیدہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔ سات لفظوں میں ساری تعلیم اسلام سمائی ہوئی ہے۔ بڑا جامع کلمہ ہے۔ اوروں کے پاس ایسے کلمے نہیں ہیں۔ ہمارے پاس یہ ایک دولت ہے، ایک نعمت ہے۔ صرف اس کلمے کے مضمون سے ہمارے دین کی صداقت کا پتہ چل جاتا ہے۔ کلمے کے بعد قرآن مجید کی ان آیات پر بھی ذرا غور کیجیے: کہہ دو کہ میں تمھاری طرح کا ایک آدمی ہوں (البتہ) مجھ پر وحی کی جاتی ہے، اور کہہ دو کہ میرا اپنا نفع اور نقصان تک میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اللہ کی مشیت اور مرضی پر منحصر ہے۔ میں (علم غیب بھی نہیں جانتا) علم غیب جانتا ہوتا تو اپنا بہت بھلا کر لیتا اور گزند تو مجھے پہنچتا ہی نہیں۔ (لوگو!) میں تو انھیں جو ماننے کی صلاحیت رکھتے ہیں بس (اللہ کا) خوف دلانے والا اور (اللہ کی طرف سے) خوش خبریاں سنانے والا ہوں۔

اسلامی توحید میں ہیر پھیر نہیں ہیں کہ اللہ تو ایک ہی ہے لیکن فلاں فلاں اُس کے اوتار ہیں اور اُن کے مجسّمے اور بت ہمیں اللہ کی یاد دلاتے ہیں۔ اس لیے ہم انھیں پوجتے ہیں۔ اللہ تو ایک ہی ہے لیکن فلاں فلاں پیغمبر اللہ کے بیٹے تھے۔ اللہ تک پہنچنے کے لیے ہم اللہ کے بیٹوں کی پرستش کرتے ہیں۔ اسلام نے توحید پر اتنا زور دیا ہے کہ توحید اور نبوت مشتبہ نہیں ہوتیں۔ بے علمی اور بے خبری، یا شرک کرنے کی عادت غلط راستے پر ڈال دے تو یہ دوسری بات ہے۔ اس کا علاج پیغمبروں کے بس میں بھی نہیں تھا ہم آپ اس کا علاج کیا کر سکتے ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہ

کہنے کی زبان نہیں پکڑی جا سکتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے متعلق روایت ہے کہ ایک دفعہ دعا کی۔ بار الٰہا! مجھے لوگوں کی زبان سے بچا۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا، زبان تو لوگوں کی میں نے اپنے لیے بند نہیں کی، تمھارے لیے کیا بند کروں گا۔

بُرا گھانس پھونس قسم کے آدمیوں کو نہیں کہا جاتا، بڑے آدمیوں کو کہا جاتا ہے۔ ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں۔ یہ بھی گویا اچھائی اور بڑائی کی علامت ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے چار صحابیوں (انس بن مالک۔ عبداللہ بن ابی اوفیٰ،

سہل بن سعد الساعدی اور ابوالطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہم) کو دیکھا تھا۔ اس حساب سے وہ تابعی تھے۔ لیکن اچھوں کو بُرا کہنے والے تابعیوں کے زمانے میں کیا، صحابہ کے زمانے میں بھی رہے ہیں اور خود حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں کیا ابوجہل نہیں تھا۔

بُرا عموماً رشک وحسد کی وجہ سے کہا جاتا ہے لیکن کبھی کبھی غلط فہمی بھی بُرا کہوا دیتی ہے۔

عبداللہ بن مبارک لکھتے ہیں: میں شام میں تھا۔ وہاں امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے پوچھا، یہ ابوحنیفہ کوفے میں کون شخص ہے۔ بڑا بدعتی ہے۔ میں اپنی قیام گاہ واپس آیا اور تین دن پیہم امام ابوحنیفہ کے اعلا اعلا اجتہاد چھانٹتا رہا اور تیسرے دن امام اوزاعی کے سامنے وہ اجتہاد لاکر رکھ دیئے۔ اُن پر میں نے ابوحنیفہ نہیں لکھا تھا۔ ابوحنیفہ کا نام لکھا تھا کہ نعمان یوں فرماتے ہیں۔ امام اوزاعی نے اجتہاد پڑھے تو فرمایا۔ نعمان بلند پایہ شیخ ہیں تم جاؤ اور ان سے اور علم سیکھو۔ میں نے عرض کیا۔ حضور! یہ وہی ابوحنیفہ ہیں جن کی بابت پرسوں اترسوں آپ نے استفسار فرمایا تھا۔ ابوحنیفہ اُن کی کنیت ہے۔ نام نعمان ہے۔ امام اوزاعی نے کہا، لوگ بھی کیسی بے پر کی اُڑا دیتے ہیں۔

جعفر بن الحسنؒ کا بیان ہے کہ میں نے ابوحنیفہ کو خواب میں دیکھا اور دریافت کیا۔ کہیے کیسی گزری۔ فرمایا بخشش ہوگئی۔ پوچھا، خدمتِ علم کے صلے میں۔ فرمایا، نہیں بھائی! فتوے تو مفتی کے لیے نہایت ذمہ داری کی چیز رہے ہے۔ پوچھا، پھر نجات کیسے ملی۔ فرمایا، لوگوں کا سب وشتم کام آگیا لوگ مجھ پر غلط نکتہ چینیاں کیا کرتے تھے اور میں انھیں صبر وضبط کے ساتھ برداشت کرتا رہتا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے میری اس بات کو پسند فرمالیا۔

اب تو مسلمانوں کے اضمحلال کا باعث ہی یہ بتایا جاتا ہے کہ اجتہاد کا جو دروازہ امام ابوحنیفہ نے کھولا تھا وہ کھلا نہیں رہا۔ وہ پھر کھلنا چاہیے لیکن امام ابوحنیفہ نے جب اجتہاد کا دروازہ کھولا ہے اور آئینِ شریعت کی ترتیب وتشکیل کا پہلا قدم اٹھایا ہے تو اُن کی سخت مخالفت ہوئی تھی۔

امام ابوحنیفہ پہلے عالم ہیں، جنھوں نے قرآن وحدیث سے مسائل کے استنباط کا باضابطہ اہتمام کیا تھا۔

آصف علی کی یاد

مسٹر آصف علی، بیرسٹر، ہندستان اور پاکستان کی حکومتیں بننے سے پہلے کانگریس

کی ہائی کمانڈ میں شامل تھے۔ حکومتیں بننے کے بعد وہ ہندستان کے وزیر رہے، سفیر رہے اور گورنر رہے۔ لیکن آصف علی زرے سیاسی آدمی نہیں تھے۔ شعر و شاعری کا بھی انھیں شوق تھا۔ نثر بھی اچھی لکھتے تھے اور بات چیت میں تو بڑے بڑے ادیبوں پر چھا جاتے تھے جب سیاست سے جی اکتا تا یا سیاسی زندگی میں ناکامی کی جھلک نظر آتی تو آصف صاحب ترکِ سیاست بلکہ ترکِ دُنیا پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ تصوّف اور ویدانت کی گفتگوئیں کرنے لگتے تھے۔ سیاست کے ساتھ وکالت کو بھی ٹھکرا دیتے تھے۔

آصف صاحب کی زندگی میں مدّ وجزر بہت آتا رہتا تھا۔ طبیعت تو تھی شاعرانہ اور رئیسانہ، اختیار کر لیا جیل کا جانا، پھر آج بیرو حکم ٹال رہے ہیں، کل رہنما مشورہ نہیں مانتے کبھی روپیہ ہے تو بہ افراط، کبھی روپیہ نہیں ہے تو مطلق نہیں۔ آصف صاحب کی والدہ سیر چشم ہوی تھیں، آصف صاحب کو بھی انھوں نے شاہ خرچ بنا دیا تھا۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں آصف صاحب بحیثیت وکیل کراچی تشریف لائے اور مہینہ بھر میں پینتالیس ہزار رُپے کمائے اور پینتالیس ہزار رُپے کراچی ہی میں برابر کر گئے۔ آصف صاحب کی زندگی میں اعتدال نہیں تھا۔ آصف صاحب کی زندگی کا نتا لگا پھول تھی۔

آصف صاحب کی جس بات کا ہر شخص معترف تھا وہ اُن کی مشرقیت تھی۔ آصف صاحب الیف۔ اے کر کے انگلستان گئے تھے۔ انگلستان جاتے وقت تک لباس ترکی ٹوپی، شیروانی اور چھے سات گرہ چکلے پائچوں کا پاجامہ تھا، انگلستان سے لوٹے تو انگریزی لباس میں لوٹے، مگر دیسی لباس بھی باقی تھا، بلکہ اس میں اور اضافہ ہوا۔ آڑا پاجامہ، انگرکھا اور دوپلّی ٹوپی پہننے لگے۔ گھر کی آراستگی بھی وزیر بننے سے پہلے اور وزیر بننے کے بعد دونوں طرح کی تھی، مغربی بھی اور مشرقی بھی۔

جوں جوں عمر بڑھتی گئی آصف صاحب کی مشرقیت اُبھرتی گئی۔ دماغ پر مغربی تعلیم کا اثر ضرور تھا لیکن دل بالکل مشرقی تھا۔ عید کے دن دلّی کے کوچہ چیلان میں کسی گھر سے ڈومنیوں کے گانے کی آواز آتی تھی تو وہ صرف آصف صاحب کا گھر تھا۔

دلّی میں ایک بڑے میاں سرود ہاتھ میں لیے پھرا کرتے تھے۔ کوئی کہتا تو سرود بجا کر سُنا دیتے ورنہ خاموش گزرے چلے جاتے۔ کسی سے بولتے ہوئے انھیں کبھی نہیں دیکھا۔ اُن کی ادائیں، آصف صاحب کو پسند تھیں۔ بڑے میاں سرود پر حضرت ابو ظفر بہادر شاہ

کی غزلیں گاتے تھے اور سماں باندھ دیتے تھے۔ ریڈیو نکلا تو آصف صاحب انھیں دِلّی ریڈیو اسٹیشن لے گئے اور ریڈیو سننے والوں سے اُن کا تعارف کرایا۔

آصف صاحب دلّی کی تہذیب اور شائستگی کا نمونہ تھے۔ اللہ تعالےٰ نے ذہانت و طباعی، متانت و سنجیدگی اور علم و فضل ہی سے سرفراز نہیں فرمایا تھا، حُسنِ صورت اور حُسنِ سیرت، خوش گفتاری اور خوش ذوقی بھی دی تھی۔ دلّی کے شرفا میں غصّے کا اظہار معیوب سمجھا جاتا تھا۔ آصف صاحب غصّے کو ضبط نہ کر سکتے تو اُردو بولتے بولتے انگریزی بولنی شروع کر دیتے تھے، یعنی دلّی کی زبان کو غصّے کی کرختگی سے بچا جاتے تھے۔ جیسے بعض الفاظ اور فقرے ہیں، جنھیں اُردو میں کہتے ہوئے ہم شرماتے ہیں اور عربی، فارسی اور انگریزی میں انھیں بے تکلف بولتے ہیں۔

اُردو میں انگریزی الفاظ استعمال کرنا آصف صاحب کی چِڑ تھی، وہ اُردو بولتے تھے تو ٹھیٹ اُردو بولتے تھے، میرے زمانے میں دلّی نے دو مقرّر پیدا کیے۔ ایک مولانا احمد سعید، دوسرے مسٹر آصف علی۔ مقرّر اور بہتیرے تھے لیکن ان دونوں کو نہیں پہنچے۔

اَب دِلّی آباد نہیں

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ختم ہونے پر دلّی والوں کی اکثریت دِلّی واپس آگئی تھی، ۱۹۴۷ء کی طرح نہیں ہُوا تھا کہ دِلّی سے نکل کر پھر دلّی جا ہی نہ سکے، لیکن دوبارہ بس جانے کے باوجود، ۱۸۵۷ء کے ہندو مسلمان دلّی والے دلّی کو غیر آباد سمجھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا کوئی ذکر کرتے تو کہتے شہر آبادی میں یہ تھا اور شہر آبادی میں وہ تھا، گویا اب دلّی آباد نہیں ہے۔ اُجڑی پڑی ہے اور برباد ہے۔ ۱۹۱۱ء میں جب انگریزوں نے دلّی کو دارالسلطنت بنایا اور باہر کے لوگوں کی تعداد دلّی میں بڑھی، اُس وقت سے یہ محاورہ مفقود ہُوا، علاوہ ازیں وہ بوڑھے ہندو مسلمان مر گئے جو دلّی کی داستانیں سناتے رہتے تھے اور جنھیں ۱۸۵۷ء کے بعد کی دلّی دلّی نہیں معلوم ہوتی تھی۔

۱۸۵۷ء سے پہلے کی دلّی کو آباد نہ سمجھنا اور ۱۸۵۷ء کے بعد دلّی کے ساتھ مرحوم کا لفظ استعمال کرنا، یہ بھی ایک دلّی والا پن تھا۔ ۱۹۱۱ء سے ردّ و بدل اور تغیّر کے ایسے پر لگے کہ ہر دلّی والا پن مٹتا چلا گیا۔ قدیم دلّی والوں کے نزدیک ۱۹۴۷ء کی دلّی، دِلّی نہیں تھی، کچھ

اور چیز تھی۔

۱۹۱۱ء سے پہلے دلی والے اپنی تمام ضروریات ملکی مصنوعات سے پوری کیا کرتے تھے۔ دلی صنعت وحرفت کا مرکز تھی۔ ہر نوع کا صاحب فن، صاحب ہنر اور صاحب کمال دلی میں موجود تھا۔ ۱۹۱۱ء سے دلی کے دست کار گرنے شروع ہوئے۔ ۱۹۱۱ء تک دلی کے دست کار اتنے خوش حال تھے کہ اس سے اُن کی ۱۸۵۷ء سے پہلے کی خوش حالی کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔

صرف کارخانہ دار خوش حال نہیں تھے، کاری گر خوش حال تھے۔ کارخانہ داروں کی خوش حالی تو آج اُس زمانے کی نسبت سینکڑوں گُنی بلکہ ہزاروں گُنی زیادہ ہے، لیکن کاریگر خوش حال نہیں ہیں۔ اُس زمانے میں دست کاری کارخانہ داری پر غالب تھی۔ دست کاری کی قدر کی جاتی تھی۔ عام وخاص سب دست کاری کے قدردان تھے۔ بادشاہ اور بادشاہ کا خاندان قدر کرتا تھا۔ دلی غیر آباد اِن معنوں میں ہوگئی تھی کہ دست کاریوں کے قدر دان اور سرپرست چن چن کر سُولی چڑھا دیے گئے تھے اور جو بچ نکلے تھے اور دوبارہ آ بسے تھے، اُن کی جیبیں ۱۸۵۷ء کی لوٹ نے خالی کر دی تھیں۔ پھر مشینوں کے رواج نے دست کاری کو بالکل مٹا ڈالا۔ دست کار رہے ہی نہیں، معمولی مزدور رہ گئے۔ ملک اور شہر خوشحال اُسی وقت کہلاتے ہیں جس وقت وہاں کی کثیر آبادی اور وہاں کے عوام خوش حال ہوں۔ چند آدمیوں اور چند خاندانوں کے خوش حال ہونے سے ملک اور شہر خوش نہیں کہلا سکتا۔ اُس کی آبادی اِسی قابل ہوتی ہے کہ اُسے غیر آباد اور برباد سمجھا جاتے۔

حضرت سید احمد بریلوی کا حکم

میں آجکل مولانا غلام رسول صاحب مہر کی لکھی ہوئی حیات حضرت سید احمد بریلوی پڑھ رہا ہوں۔ اس کی مندرجہ ذیل سطریں آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ سبق آموز واقعہ ہے

"اسی زمانے کا ذکر ہے کہ مولوی سید مظہر علی صاحب عظیم آبادی نے سید صاحب سے بیعت کی اور اپنے ہاں وعظ و تذکیر کے ذریعے سے مسلمانوں کو اتباع سنت پر آمادہ کرنے لگے۔ ایک موقع پر تعزیہ داری کو روک رہے تھے۔ خدا جانے کیا واقعات پیش آئے کہ اُن پر تعزیہ شکنی کا الزام لگا۔ مقدمہ قایم ہوگیا اور گرفتار ہوئے۔ ایک دوست

شیخ عبدا نے ضمانت دے کر رہا کرایا۔ مولوی صاحب رہائی پاتے ہی وطن سے بھاگے اور گورکھپور پہنچ گئے اور سید صاحب سے ملنے کے لیے آئے۔ آپ نے حالات سُنے تو سخت ناراض ہوئے۔ مولوی صاحب سمجھتے تھے کہ میں نے بڑا ایثار کیا ہے۔ عشقِ دین میں وطن چھوڑا ہے۔ اس لیے ثواب کا مستحق ہوں۔ سیّد صاحب نے فرمایا، آپ ثوابِ ہجرت کے امیدوار ہیں؟ حالاں کہ آپ کی بیعت بھی ٹوٹ گئی۔ آپ کے جسم کو خفیف سی تکلیف بھی نہیں پہنچی اور دوسرے نیک مسلمانوں کو مصیبت میں اُلجھا کر نکل آئے۔ دوبارہ بیعت کیجیے اور فوراً واپس جائیے۔ وہاں جو کچھ پیش آئے اسے صبر و خوش دلی کے ساتھ برداشت کیجیے۔ چناں چہ مولوی صاحب واپس گئے۔ حسنِ اتفاق سے اُن کے خلاف مقدمہ ثابت نہ ہو سکا اور وہ بری ہو گئے۔

یہی تربیت تھی جس نے تھوڑی ہی مدت میں سیّد صاحب کے پاس انسانیت کے وہ گرانمایہ گوہر جمع کر دیے تھے، جن کی مثالیں اسلامی تاریخ کی اکثر صدیوں میں شاید ہی مل سکیں۔

علامہ شبلیؒ کی یاد

علامہ شبلی نعمانیؒ ایک دفعہ دلّی تشریف لائے اور خواجہ حسن نظامیؒ کے ہاں مہینہ بھر ٹھہرے۔ خواجہ صاحبؒ اس زمانے میں نواب بدھن کے کمرے میں رہتے تھے، جو اعظم خاں کی حویلی (دہلی) کے سامنے تھا۔ کمرہ کیا، پورا دیوان خانہ تھا۔ کمرے سے متصل نواب بدھن کی محلسرا تھی۔ نواب غلام نصیر الدین عرف نواب بدھن، رئیس شیخوپورہ برناوہ ضلع میرٹھ نے کمرہ اور محلسرا دونوں خواجہ صاحب کے سپرد کر رکھے تھے۔ رسالہ نظام المشائخ کی ابتدا اُسی کمرے سے ہوئی تھی، جو میں نے اور خواجہ صاحب نے جاری کیا تھا۔

خیر یہ ۱۹۰۸ء کی بات ہے، نظام المشائخ کے اجرا سے سوا سال قبل کی۔ مگر میں اُس کمرے اور محلسرا میں آنے جانے لگا تھا۔ میں نے دیکھا کہ علامہ شبلیؒ صرف صبح آٹھ بجے سے دس بجے تک لکھنے کا کام کرتے ہیں، اور دس بجے کے بعد یا اخبار، رسالے اور کتابیں پڑھتے ہیں یا لوگوں سے ملتے جلتے ہیں۔ آٹھ سے دس تک کے لیے ہدایت تھی: "کوئی آئے مت آنے دو، اور کچھ ہو جائے مت خبر کرو۔"

دوسری دفعہ غالباً ۱۹۱۳ء میں علامہ شبلی دلی پھر تشریف لائے اور حکیم اجمل خاں کے ہاں قیام فرمایا۔ وہاں بھی آٹھ سے دس تک وہ تخلیہ کرتے تھے اور اُن کے قریب پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔

علامہ شبلی کی تمام معرکتہ الآرا تصانیف دو گھنٹے روزانہ لکھنے کی کرامات ہیں۔ دو گھنٹے سے زیادہ لکھنا اُن کے نزدیک حرام تھا اور دو گھنٹے پابندی سے لکھنا فرض۔ اسے وہ سفر و حضر میں نباہتے تھے۔ باقی اوقات میں کبھی کبھی کھانا بھی پکا لیتے تھے۔ پکانے کا غالباً شوق تھا اور کھانا کھانا جانتے تھے

راشد الخیری کیسے لکھتے تھے؟

دوسرے لکھنے والے مولانا راشد الخیری ہیں، جن کے طریقۂ تحریر کا مجھے علم ہے۔ وہ صبح سے شام تک لکھتے رہتے تھے مگر اس طرح کہ پندرہ منٹ لکھا اور گھر سے باہر آ گئے۔ گھر کے سامنے تانگوں کا اڈا تھا۔ تانگہ ڈرائیوروں کی خیر سلا پوچھی اور واپس چلے گئے۔ پھر پندرہ منٹ لکھا اور میرے ہاں آ گئے۔ پندرہ منٹ سے زیادہ مولانا راشد الخیری کوئی کام کر ہی نہیں سکتے تھے۔ میرا گھر بالکل نزدیک تھا۔ پھیروں کی گنتی نہ تھی مگر کیا مجال جو گھڑی دو گھڑی جم کر بیٹھ جائیں۔ اصرار کیا جاتا تھا تو کم از کم کرسی ہی بدل لیتے تھے۔ فقط شامِ زندگی میں نے مولانا سے دو گھنٹے روزانہ کے حساب سے زبردستی لکھوائی تھی۔ قلم، دوات، کاغذ رکھ کر بند کر دیا جاتا تھا کہ لکھیے چاہے نہ لکھیے، دو گھنٹے سے پہلے دروازہ نہیں کھلے گا۔ مولانا بگڑتے تھے اور کہتے تھے کل سے شکل نہیں دکھاؤں گا لیکن شکل دکھاتے تھے اور لکھتے تھے اور ایسا لکھتے تھے کہ شامِ زندگی اُن کا شہکار اور ماسٹر پیس ہے۔ مولانا کی باقی کتابیں وہی پندرہ پندرہ منٹ کر کے لکھی گئی ہیں۔

خواجہ حسن نظامیؒ کے لکھنے کا طریقہ

تیسرے لکھنے والے خواجہ حسن نظامی تھے۔ خواجہ صاحب کا اور میرا نصف صدی مسلسل ساتھ رہا۔ مولانا راشد الخیری کو لکھنے کے سوا دنیا کے اور کسی کام سے غرض نہیں تھی، خواجہ صاحب دنیا کے ہر کام میں دخیل تھے۔ بہرحال خواجہ صاحب کے لکھنے کا طریقہ

قریباً چالیس سال یہ رہا کہ رات کے تین بجے سے پانچ بجے صبح تک تو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اور پانچ بجے کے بعد دوسروں سے لکھواتے تھے۔ گاؤ تکیے سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئے اور آنکھیں بند کر لیں اور بولنا شروع کر دیا۔ خطوط جمع ہیں تو خطوط کے جواب لکھوا ڈالے۔ خطوط ختم ہو گئے تو کسی کتاب کے ایک دو جزو لکھوا دیے۔ پانچ سے ساڑھے بارہ بج گئے اور لکھنے والے نے اپنی انگلیاں دبائیں تو حاضرین کو اس پر ترس آیا اور کسی نے کہہ دیا کہ حضرت اب بس کیجیے۔ کھانا کھائیے۔ خواجہ صاحب آنکھیں کھولتے اور مسکرا کر فرماتے "اچھا"۔ اس کے بعد رات کے دس بجے تک دوسرے کام کرتے تھے، لکھتے یا لکھواتے نہیں تھے۔

خواجہ صاحب کی خواہش تو ضرور ہوتی تھی کہ تحریر کے وقت تخلیہ رہے مگر تخلیہ رہتا نہیں تھا۔ باہر سے پیغام پہنچتے کہ فلاں صاحب ملاقات کے منتظر ہیں تو بعض کو ٹال دیتے تھے، بعض کو بلا لیتے تھے، لوگوں کا ہجوم لکھوانے میں حارج نہیں ہوتا تھا۔ حاضرین سے بھی باتیں کرتے جاتے تھے اور ٹیلیفون پر بھی باتیں کرتے جاتے تھے اور لکھواتے بھی جاتے تھے۔

علما اور تحریکِ آزادی

حضرت سید احمد بریلویؒ کے پیر و مرشد حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کے دیکھنے والوں کو میں نے دیکھا ہے اور حضرت سید احمد سے میاں نذیر حسین محدث دہلوی اپنی جوانی میں پٹنے جا کر ملے ہیں۔ میاں نذیر حسین کو دیکھنے والے تو ابھی بہت زندہ ہوں گے۔ حضرت سید احمد بریلوی کی شہادت میری پیدائش سے ساٹھ سال قبل، پینتالیس سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ دو پشت نہ سہی، تین پشت پہلے حضرت شاہ عبدالعزیز اور حضرت سید احمد کا زمانہ تھا۔ اتنے قریبی زمانے کی بات ہے کہ ہم میں شاہ صاحب اور سید صاحب جیسے لوگ موجود تھے، جن کے حالات پڑھ کر صحابہ کرام کا دور یاد آجاتا ہے اور ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کا زوال ہو رہا تھا۔ بداعمالیوں نے حکام کو حکومت کا اہل نہ رکھا تھا۔ محکوموں پر بھی اس کا اثر تھا۔ جیسا راجہ ویسی پرجا۔ سکھ اُٹھ رہے تھے۔ مرہٹے بڑھتے چلے جاتے تھے۔ انگریزوں کی چالیں سب کو ہرائے دیتی تھیں، لیکن مسلمان حکام اور مسلمان عوام کو "نفسی نفسی" اور "این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ" سے فرصت نہیں تھی۔ ادینہ بیگ، گورنر پنجاب سکھوں کی سرپرستی کر رہا تھا اور عماد الملک، مرہٹوں کو بڑھا رہا تھا۔ ان حالات

میں حضرت سید احمد نے جنم لیا اور قدرت نے اُنھیں ایسے بزرگوں کے پاس پہنچایا، یا جنھیں زبونی حالات کا احساس ہو چکا تھا۔

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ حضرت مولانا شاہ عبد العزیز کے والد ماجد، اورنگ زیب عالمگیر کے دَور کی جھلک کسی قدر دیکھ چکے تھے، اورنگ زیب کی رحلت کے بعد اُس دَور دَورے کا مِٹنا حضرت شاہ ولی اللہ نے خوب اچھی طرح، آنکھیں کھول کر دیکھا۔ حضرت شاہ صاحب کے دیکھتے دیکھتے زوال کے آثار اُبھرے اور نمایاں ہو گئے۔ حضرت شاہ صاحب اوّل شخص ہیں، جنھوں نے اِسے محسوس کیا اور زوال کو روکنے کے لیے کام کیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ اپنے ہر ملنے والے کو احساس کراتے رہے اور اپنے ہر شاگرد اور پیرو میں یہ جذبہ بھرتے رہے کہ زوال و انحطاط کا مقابلہ مذہباً فرض ہے۔ دیوبندی علما جو انگریزوں کے دشمن تھے اُس کی وجہ حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات تھی۔ دیوبندی علما حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبد العزیز کے شاگردوں کے شاگرد ہیں۔

گاندھی جی وغیرہ ہندوؤں اور انگریزی داں مسلمانوں میں انگریزوں کی مخالفت کا خیال دیوبندی علما سے زیادہ پُرانا نہیں تھا، انگریزی داں ہندو مسلمانوں نے تو انگریزوں کی مخالفت بھی انگریزوں ہی سے سیکھی ہے لیکن علمائے دیوبند کو انگریز دشمنی ورثے میں ملی تھی۔

حضرت سیّد احمد بریلوی

حضرت شاہ عبد العزیز کے ایماء سے حضرت سیّد احمد بریلوی نواب امیر خاں کے لشکر میں بحیثیت سپاہی بھرتی ہوئے اور سات برس امیر خاں کے ساتھ رہے اور سپاہی سے امیر خاں کے مشیر اعلا بن گئے۔

امیر خاں کو پنڈارہ غلط کہا جاتا ہے۔ امیر خاں پنڈارہ نہیں تھا۔ اُس نے ایک دفعہ پنڈاروں کی تھوڑی سی مدد کر دی تھی، لوگوں نے اُسے پنڈارہ مشہور کر دیا۔ امیر خاں، سلطان حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے درجے کا آدمی تھا۔ شجاعت کی طرح اِن حضرات میں انگریزوں کی چالیں سمجھنے کی قابلیت بھی ہوتی تو یہ حضرات ہندستان کا نہیں، دُنیا کا نقشہ بدل ڈالتے۔

انگریزوں کی چالوں نے امیر خاں کو انگریزوں سے معاہدہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا' لیکن حضرت سیّد احمد نے آخر وقت تک معاہدے کی مخالفت کی۔ امیر خاں نہ مانا تو سیّد صاحب اُس سے الگ ہو گئے اور براہ راست جہاد کی تیاری کرنے لگے۔

سیّد صاحب نے امیر خاں کے ہاں کے قیام میں جہاد بھی کیے تھے اور مجاہدے کر کر کے تزکیہ نفس بھی اتنا کر لیا تھا کہ شاہ عبد العزیز صاحب اپنے عزیزوں سے کہہ دیتے تھے کہ جاؤ سیّد احمد سے اکتساب فیض کرو۔

ایک روز حضرت شاہ عبد العزیز کے بھانجے اور داماد، مولانا عبد الحئی رح نے اسرار صلوٰۃ اور حضوریٔ قلب کے متعلق حضرت شاہ عبد العزیز سے چند باتیں پوچھیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا، سیّد احمد سے پوچھو۔ حضرت سیّد احمد نے بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھایا۔ مگر مولانا عبد الحئی قابو میں نہ آئے۔ حضرت سیّد احمد بولے، اچھا۔ وضو کرو اور میرے پیچھے کھڑے ہو جاؤ اور دو رکعت نماز پڑھو۔ مولانا عبد الحئیؒ کا بیان ہے کہ ان دو رکعتوں میں مجھے وہ نعمتیں ملیں جو پوری عمر میں نہیں ملی تھیں۔ مولانا عبد الحئی نے سیّد صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور سارا ماجرا حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل (حضرت شاہ عبد العزیز کے بھتیجے) کو سنایا۔ حضرت اسمٰعیل نے بھی سیّد صاحب سے رجوع کیا۔ چناں چہ انھیں بھی دو رکعتیں پڑھوائی گئیں اور نعمتوں سے مالا مال کرا دیا گیا۔ وہ بھی بیعت ہو گئے۔ شاہ اسمٰعیل کے بعد شاہ عبد العزیز کے نواسے شاہ اسحٰق نے بیعت کی۔ حضرت سیّد احمد ان مریدوں کے برابر پڑھے لکھے نہیں تھے۔ اکابر علما کی بیعت سے حضرت سیّد احمد کا ڈنکا بج گیا۔ دُور دُور کے مشتاقانِ حق آ آ کر حضرت سیّد احمد سے بیعت ہونے لگے اور جگہ جگہ انھیں بلایا جانے لگا کہ تشریف لائیے۔ اتنی خلقت بیعت کرے گی کہ اتنی خلقت کا دلّی حاضر ہونا محال ہے[۱]۔

حضرت سیّد احمد جس سے بیعت لیتے تھے اُسے مجاہدے اور جہاد دونوں کے لیے تیار کرتے تھے۔ اللہ کے واسطے جان دینے پر آمادہ کر لینا کل منازل کو طے کرا دینا ہے۔ حضرت شاہ عبد العزیز کے سول (CIVIL) کے محکمے کو حضرت کے برادر خرد شاہ عبد القادر نے سنبھال رکھا تھا اور ملٹری (MILITARY) کے محکمے کے انچارج (INCHARGE)

---

[۱] آج کے شذرات میں جتنی معلومات ہے وہ بیشتر مولانا غلام رسول مہر صاحب کی کتاب حیات حضرت سیّد احمد بریلوی سے ماخوذ ہے۔ (واحدی)

سید صاحب تھے۔ سید صاحب ہی جیسا انسان اس محکمے کا انچارج ہو سکتا ہے۔ حضرت سید احمد بریلوی غیر معمولی عزم اور ہمّت کے انسان تھے۔ اُن کی ظاہری زندگی عام درویشوں کی سی تھی، لیکن عام درویشوں میں اُن کے سے اوصاف بھلا کہاں۔

رسُول اللہ کی معاشی زندگی

اگر کوئی شخص ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے، روزی کمانے کی فکر نہیں کرتا اور اُسے فاقہ ہو جاتا ہے تو یہ کون سی عجیب بات ہے۔ کھانا تو ہاتھ پاؤں ہلانے سے ملتا ہے۔ بھارت میں جن لوگوں کے پاس باپ دادا کی پیدا کردہ جائدادیں تھیں اور وہ بس اُن کا کرایہ کھاتے تھے، خود کچھ نہیں کماتے تھے، اُنھیں پاکستان آ کر بڑی بڑی مصیبتوں سے سابقہ پڑا۔

لیکن ہمارے ہادی و پیشوا صلّے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ایسے وقت فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی ہے جب کہ حضورؐ پورے ملک عرب کے فرماں روا تھے۔ حضورؐ سے زیادہ ہاتھ پاؤں ہلانے والا اور کام کرنے والا اور کون ہوگا، حضورؐ نے تئیس سال کے قلیل عرصے میں عرب کے علاوہ شام سے لے کر عدن تک مسلمانوں کی حکومت قایم کر دی تھی اور دُور دُور اسلام کا پیغام پہنچا دیا۔ اتنا عظیم الشّان کام ہاتھ پر ہاتھ دھرے رکھنے سے انجام نہیں پا سکتا تھا، مگر حضورؐ کا کمال دیکھیے کہ اس قدر محنت کے بعد جو اقتدار حاصل ہُوا اُس سے اپنے آپ مطلق فائدہ نہیں اٹھایا، بلکہ جُوں جُوں اقتدار بڑھا تُوں تُوں حضورؐ فقر کی طرف بڑھتے چلے گئے ؎

سلام اُس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

اقتدار مدینے میں حاصل ہُوا تھا، مکّے میں تو حالت اتنی کمزور تھی کہ وہاں سے ہجرت کرنی پڑی تھی، لیکن مکّے میں فاقے نہیں گزرتے تھے۔ فاقوں کا زمانہ مدینے کا زمانہ ہے، یعنی اقتدار کا زمانہ۔

حکومت کی آمدنی تمام کی تمام، روز کے روز مسلمانوں پر اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کر دی جاتی تھی۔ حضورؐ اپنے واسطے اکثر ایک حبّہ نہیں بچاتے تھے اور خود بھی فاقہ کرتے تھے اور متعلقین کو بھی فاقے کراتے تھے، رات کا کھانا عموماً نہیں ملتا تھا

اور حضورؐ اور حضورؐ کے اہل و عیال بھوکے سوتے تھے، یہاں تک کہ ایک دفعہ ازواجِ مطہرات نے کہہ بھی دیا کہ اُمتیوں کے ہاں تو لہر بہر ہوتی جاتی ہے اور پیشوا کے ہاں یہ حال ہے۔ اِس کا جواب اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نازل فرمایا کہ لہر بہر چاہتی ہو تو نبی سے بے تعلقی کرلو اور دوسرے گھر بساؤ۔ نبی کے گھر میں لہر بہر کی توقع مت رکھو۔

حضورؐ کے پاس کپڑوں کا ایک سے دوسرا جوڑا نہیں تھا۔ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ کے کپڑوں کو تہہ کرنے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ ایک جوڑا ہونے کی صورت میں تہہ کرنے کا امکان کہاں تھا، اُسی کو دھوتے تھے اور پہن لیتے تھے۔

دو دو مہینے گھر میں آگ نہیں سُلگتی تھی۔ خالی کھجوروں سے پیٹ بھرا جاتا تھا حضرت عائشہ رضی ہی کی ایک اور روایت ہے کہ مدینے میں ابتدائے قیام سے وفات تک حضورؐ نے متواتر دو وقت سیر ہو کر کھانا کبھی نہیں کھایا۔

حضرت جویریہؓ کے بھائی عمرو بن الحارث کی روایت ہے کہ وفات کے وقت حضورؐ نے نہ درہم چھوڑے نہ دینار، نہ بکری نہ اونٹ، نہ غلام نہ لونڈی۔ ایک سفید خچر اور چند اسلحۂ جنگ تھے اور تھوڑی سی زمینیں تھیں جنھیں وفات سے قبل صدقہ کر دیا تھا۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ ہم انبیا کا وارث نہیں ہوتا۔ عام مسلمان ہماری چیزوں کے حق دار ہیں۔

اسلام خوش حالی اور آسائش کی زندگی بسر کرنے سے نہیں روکتا، لیکن اتنا ضرور چاہتا ہے کہ خوش حالی اور آسائش عام ہو۔ گنتی کے خاص خاص آدمیوں کی خوش حالی اور آسائش اسلام کو ہرگز پسند نہیں ہے۔ اسلامی مملکت کا ایک ایک مسلم اور غیر مسلم پیٹ بھر کر سونے لگے تب اسلامی مملکت کا فرماں روا پیٹ بھر کر سو سکتا ہے، ورنہ فرماں روا کو بھوکا سونا چاہیے۔ ماں باپ کیسے پیٹ بھر سکتے ہیں اگر بچے بھوکے ہوں۔ عوام کی ضروریات کو ذاتی ضروریات پر ترجیح دینا اُن حضرات کا مقدم اور خصوصی فرض ہے جن کے قبضے میں اسلامی مملکت کی عنان ہو۔

ظاہر ہے کہ اِس قسم کے معاشرے اور اِس قسم کے نظام سے عوام کتنے خوش رہ سکتے ہیں۔ خلفائے راشدین نے حضورؐ کے جملہ اعمال کی طرح اس عمل کا بھی اتباع کیا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اُن کے زمانے میں آدھی دنیا مسلمانوں کے زیرِ نگیں آگئی تھی اور اسلام اور اسلام کا اقتدار ساری دنیا پر چھا گیا تھا۔ حضور کا یہ عمل حضورؐ کے ساتھ مخصوص نہیں تھا بلکہ مسلمان

فرماں رواؤں کے واسطے نمونہ اور اُسوہ تھا۔

قرآنی احکام پر عمل

قرآن مجید کو آپ سمجھ کر پڑھیے اور اُس پر غور کیجیے۔ ایسا معلوم ہوگا جیسے طبیب مریض کی حالت کے مطابق نسخوں پر نسخے دے رہا ہے۔ کہیں یہ مطلب نہ لیجیے گا کہ پہلا نسخہ غلط تھا اور دوسرا نسخہ صحیح۔ نہیں پہلا نسخہ مریض کی پہلی حالت کے مطابق تھا اور دوسرا مریض کی دوسری حالت کے مطابق۔ مریض کی جیسی حالت ہو اُسے ویسی دوا ملنی چاہیے مثلاً "کفار" کسی جگہ مسلمانوں کے پیچھے پڑ گئے ہیں، لیکن مسلمانوں کے لیے اچھا یہ ہے کہ ضبط سے کام لیں اور جو اذیت پہنچے اسے سہیں تو اس کی ہدایت بھی قرآن میں موجود ہے اور کفار کی زیادتیاں حد سے گزر جائیں اور کفار مسلمانوں پر ہتھیار اٹھالیں تو پھر نامردوں کی موت مرنے کی اجازت نہیں ہے۔ فرض قرار دے دیا ہے کہ اُن سے لڑو اور ایسا لڑو کہ دماغ درست کردو۔ اب کوئی استعمال کرانے والا دوسرا نسخہ پہلی حالت میں اور پہلا نسخہ دوسری حالت میں استعمال کرائے تو اس کا ذمہ دار اُسے ٹھہراؤ، قرآن مجید کو مت ٹھہراؤ۔ یہ بالکل نامناسب ہے کہ دوسرا نسخہ مل جانے کے بعد پہلے نسخے کی بابت خیال کرنے لگو کہ پہلا نسخہ بے کار تھا۔ نہیں نہیں ضبط سے کام لینا اور اذیتوں پر صبر کرلینا منسوخ نہیں ہُوا ہے۔ کبھی کبھی ایسا کیا کرتے ہیں کہ بہت سے نسخے پلا کر پھر پہلا نسخہ پلاتے ہیں ——

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب کے ایک حصے (یا نسخے) پر اور ایک حصے (یا نسخے) کا انکار کرتے ہو۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ تو (کچھ خبر بھی ہے) جو شخص تم میں سے ایسا کرے گا (یعنی مناسب حال نسخہ نہیں استعمال کرے گا) اُس کی سزا کیا ہے۔ دنیا کی زندگی میں رسوائی کے سوا (اور کیا ہو سکتی ہے) اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو بڑا سخت عذاب (الگ) دیا جائے گا۔ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۔ اور تم جو بھی کرتے ہو اللہ اُس سے غافل نہیں ہے۔

مرحوم دِلّی کی یاد میں

ساٹھ برس پہلے تک دلّی میں رات، رات ہی ہوتی تھی۔ رات آئی اور لوگ باگ گھروں کو چلے۔ دن کام کے لیے تھا، رات آرام کے لیے۔ زیادہ سے زیادہ دکانیں بند ہونے تک باہر رونق رہتی تھی پھر رونق گھروں کی بڑھ جاتی تھی۔ رات کے وقت باہر پھرنا معیوب تھا، یا یہ سمجھا جاتا تھا کہ کوئی اُفتاد پڑی ہے۔ آج کل تجربوں کے بعد آٹھ بجے اور نو بجے دکانیں بند کرنے کے احکام جاری کیے جاتے ہیں، ساٹھ برس پہلے احکام کی ضرورت نہیں تھی۔ گلیوں میں اور سڑکوں پر اندھیرا ہوتا تھا تاکہ فضول سٹرگشت نہ کی جائے، گھر کے اندر بیٹھا جائے۔

۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء میں ہم دو چار ہم عمر رات کے تین بجے تھیٹر سے لوٹتے تھے تو دلّی کی بڑی سڑکوں پر بہت دُور دُور مٹّی کے تیل کی لالٹینیں ٹمٹماتی ملتی تھیں۔ گلیوں میں اللہ کا نام تھا۔ آہٹ سُن کر کتّے بھونکتے تھے۔

مٹّی کے تیل کی لالٹینیں بھی انگریزوں کے زمانے میں نصب کی گئی تھیں، اوّل اوّل چاندنی چوک میں لگیں، پھر دوسرے اہم بازاروں میں، پھر چھوٹے چھوٹے بازاروں میں۔ جب اسی ترتیب سے سڑکوں پر بجلی کی بتّیاں لگنے لگیں تو مٹّی کے تیل کی لالٹینیں گلیوں میں پہنچ گئیں۔

بجلی کی روشنی کی ابتدا ۱۹۰۵ء میں ٹاؤن ہال اور ٹاؤن ہال کے اردگرد کے تھوڑے سے حصّے سے ہوئی تھی۔ جس قسم کے بلب پہلے پہل وہاں لگائے گئے تھے، وہ اب کہیں نظر نہیں آتے۔ اُن کی روشنی اتنی تیز تھی کہ آنکھیں اُسے برداشت نہ کر سکتی تھیں۔ ناگوار تیزی تھی، اس لیے انھیں جلد ترک کر دیا گیا۔

دلّی میونسپلٹی کے قیام، یعنی ۱۸۶۳ء سے قبل دلّی کے بازاروں میں تو روشنی نہیں کی جاتی تھی لیکن دلّی دروازے اور درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے درمیان جگہ جگہ نیچے نیچے منارے بنے ہوئے تھے، اُن پر طشتریوں میں بنولے جلتے تھے۔ درگاہ شریف کے قریب مسافروں کا آخری پڑاؤ تھا، وہاں سے مسافر اگر ایسے وقت چلتا تھا کہ فصیل کے دروازے بند ہوتے ہوتے شہر پہنچ جائے تو بنولوں کی روشنی رہنمائی کرتی تھی۔ فصیل ثابت تھی اور اُس کے دروازے بند کیے جاتے تھے۔

میونسپل کمیٹی دلی نے شہر میں بھی ہنڈولوں اور کڑوے تیل ہی سے روشنی کا آغاز کیا تھا۔ گھروں میں بھی کڑوا تیل استعمال ہوتا تھا۔ جھاڑ چھتوں میں لٹکے رہتے تھے اور فانوس دیواروں پر ٹنگتے تھے۔ جھاڑوں اور فانوسوں میں موم بتیاں جلتی تھیں۔ دیوالی وغیرہ خاص خاص تہواروں اور موقعوں پر شہر کے بازاروں میں بھی چراغاں ہو جاتا تھا۔

ایک دوسرے کی مدد

کچھ خبر ہے، اللہ تعالٰے نے آپ کے لیے کتنے خادم مقرر فرما رکھے ہیں۔ جمادات، نباتات اور حیوان نہیں، انسان۔ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا اندازہ ہے کہ قریباً ایک ہزار آدمی کام میں مصروف رہتے ہیں، تب جا کر ایک آدمی زندگی بسر کرتا ہے۔ کسان اناج نہ بوئے، تاجر اناج نہ خریدیں، مزدور اناج نہ ڈھوئیں۔ علیٰ ہذا سوت کتنے اور کپڑا بُنے جانے کا حال ہے۔ موچی، بڑھئی، لوہار، معمار —— غرضکہ حضرت امام غزالی کے اندازے کے مطابق قریباً ایک ہزار پیشہ ور ہیں، جو اگر نہ ہوں تو آپ چوبیس گھنٹے نہیں گزار سکتے۔

اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا میں کسی کا مستقل قیام نہیں ہوتا۔ دنیا مسافر خانہ ہے۔ مسافرت کے موقع پر لوگوں کے اندر یہ جذبہ اُبھر آیا کرتا ہے کہ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔ ایک دوسرے کو مدد دیں۔ یہی جذبہ دنیا کے پورے سفر میں کار فرما ہو جائے تو کیسا اچھا ہے، مگر کون ہے جو خلق اللہ کو فایدہ پہنچانے کی نیت سے پیشہ کرتا ہے! در کون ہے جسے خیال آتا ہے کہ اتنے پیشہ ور میری خدمت میں مصروف ہیں، میں بھی ایسا پیشہ اختیار کروں، جس سے خلق اللہ فایدہ اُٹھائے۔ ذرا سا خیال کر لینے سے مسلمان کی دنیا، مسلمان کا دین بن جاتی ہے۔

ایک حدیث کا مفہوم

ایک حدیث کا مفہوم پڑھیے۔ حضورِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا: ۔ ایسا زمانہ بھی آنے والا ہے کہ جس قدر احتیاط تم کرتے ہو اس کا دسواں حصہ احتیاط کسی نے کی تو وہ ثواب عظیم پائے گا۔ صحابہؓ نے پوچھا: یہ کیوں؟ حضور نے فرمایا: اس لیے کہ تمھیں نیکی کرنا آسان ہے۔ تمھیں نیکیاں کرنے میں اپنے ساتھیوں سے مدد ملتی

ہے۔ تمھیں مددگار میسر ہیں۔ اُن کا زمانہ غفلت کا زمانہ ہوگا۔ (اُس زمانے میں نیک آدمی کی حوصلہ افزائی نہیں کی جائے گی، لہذا) اُس زمانے میں جو جتنا کرلے غنیمت ہے۔

حضورؐ نے فرمایا، یہ بات میں نے اس لیے بتا دی ہے کہ آنے والے زمانے کے لوگ مایوس نہ ہو جائیں اور سوچ میں نہ پڑ جائیں کہ اتنی احتیاط آجکل کی فضا میں کیسے کی جا سکتی ہے۔

انھیں اتنا اور بتا دوں کہ جو شخص آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتا ہے وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ ملک و مال کے حصول کی خاطر انسان کون سی مصیبت نہیں اٹھا لیتا۔ اسی طرح اگر آخرت کی دل میں اہمیت ہے تو آخرت کی نعمتوں کی خاطر مصیبت گوارا کرنا ناممکن نہیں ہے۔

ہمارے سماجی معاملات

زبانوں کے کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں، جنھیں پوری قوم بولتی ہے اور کچھ ایسے جو قوم کے طبقات میں محدود رہتے ہیں یا انھیں دُوسرے طبقے کا آدمی تب ہی جان سکتا ہے کہ اُس طبقے کے ساتھ اُٹھے بیٹھے۔ مثلاً میں غریب یا اوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہوں، مجھے ہیرے جواہرات سے کبھی سابقہ نہیں پڑا، ہیرے جواہرات کے الفاظ تو خیر عام ہیں، لیکن ہیرے جواہرات کی طرح کے اور جتنے قیمتی قیمتی پتھر ہیں وہ میرے علم میں کیسے آ سکتے ہیں، حالاں کہ بے پڑھے لکھے امرا کو ان پتھروں کے نام ازبر ہوں گے۔ یا گالیاں بھی زبان کا ایک جزو ہیں۔ ہمارا بہت بڑا طبقہ یہ زبان بے تکلف استعمال کرتا ہے لیکن مفتی کفایت اللہ اور حکیم اجمل خاں کی قسم کے متین علمائے عظام زبان کے اس جزو سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ علیٰ ہذا بے پڑھے لکھے کاریگروں اور دست کاروں کے اکثر محاوروں کو پڑھے لکھے لوگ نہیں سمجھتے۔

یہی حال ہر معاملے کا ہے۔ کسی معاملے کو بھی انسان نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ اُس معاملے میں پڑے نہیں۔ ڈاکٹر وہی ہوتا ہے جو ڈاکٹری پڑھتا ہے اور انجنیئر وہی ہوتا ہے جو انجنیئری پڑھتا ہے۔ صرف سیاست اور مذہب دو معاملے ایسے ہیں کہ خواہ اِن سے عمر بھر دُور کا واسطہ نہ رہا ہو مگر لوگ اپنے تئیں ان دونوں کا ماہر خیال کرتے ہیں۔

پُرانی دِلّی کی وضعداری

انگلش میڈ (ENGLISH MADE) ہندوؤں اور انگلش میڈ مسلمانوں سے پہلے

ان دونوں قوموں میں کس قسم کے تعلقات تھے، اُس کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے:
۱۸۵۷ء میں سونی پت کے ایک مسلمان، میر فیض الحسن دلی کے کوتوال تھے جس بنیے کے ہاں سے میر صاحب کے ہاں آٹا دال آتا تھا اُس کا نام چھنّا مل تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد مسلمانوں کی جائدادیں نیلام ہوئیں تو میر صاحب نے بہت سی جائداد کوڑیوں کے مول چھنّا مل کو خرید وا دی اور چھنّا مل امیر کبیر بن گیا۔
چھنّا مل کا خاندان اب دلی کا سب سے بڑا مالدار خاندان ہے۔ میں نے چھنّا مل کے بیٹے رائے بہادر لالہ رام کشن داس اور چھنّا مل کے پوتے رائے بہادر شیو پرشاد سی۔ آئی۔ ای کی شان دیکھی ہے۔ دلی کا کوئی محلّہ نہیں ہے جہاں چھنّا مل کی جائداد نہ ہو۔ جس دکان یا مکان پر سی۔ ایس (C.S) لکھا دیکھو، سمجھ لو کہ چھنّا مل سالگ رام والوں کی ملکیت ہے۔ سالگ رام چھنّا مل کا باپ تھا۔
میر فیض الحسن جب کوتوال نہیں رہے تب بھی چھنّا مل نے میر صاحب کے احسان کو یاد رکھا اور مرتے وقت اولاد سے کہہ گیا کہ میر صاحب کے خاندان کے ساتھ اس طرح ملنا جلنا جس طرح اپنے کنبے سے ملتے جلتے ہیں۔
میر فیض الحسن کے خاندان میں بچّہ پیدا ہوتا تو سونی پت سے دلی خبر آتی اور چھنّا مل والوں کی کوٹھی سے رقم بھیجی جاتی اور رقم کے ساتھ کوٹھی کی طرف سے بچّے کا نام بھی بھیجا جاتا۔ جسے وہ لوگ بطور عرف کے استعمال کرتے تھے۔ شادی بیاہ کے موقع کے لیے چھنّا مل کافی بڑی رقم مقرّر کر گئے تھے۔ میر فیض الحسن کے پوتے میر سراج الحسن میرے خاندان میں بیاہے ہوئے تھے۔ اُن کا چھنّا ملی عرف موتی تھا اور اُن کے چھوٹے بھائی میر شمس الحسن کا عرف پنّا تھا۔
میں سُنّی ہوں۔ میر سراج الحسن شیعہ تھے۔ جس زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفرقہ نہیں تھا اُس زمانے میں سنّیوں اور شیعوں کی رشتہ داری کون سی عجیب بات ہے۔ میری ننھیال اور ددھیال دونوں میں بیس فی صدی شیعہ ہیں۔ کیا کہوں، لمبی کہانی ہے۔ کیا تھا، کیا ہو گیا۔ انقلاب زندہ باد۔

شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ

یہ دور بغاوت کا ہے۔ انگریز مختصر سے زمانے کی حکومت میں بہت کچھ سکھا

گئے ہیں۔ بغاوت کا سبق بھی اُنھوں نے سکھایا تھا۔

بغاوت سے مراد وہ ذہنیت ہے جو انگریز حکومت نے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ہمارے ہاں پیدا کی۔ اس ذہنیت کو انگریز اپنے ہاں نشو ونما نہیں دیتے۔ مشرق صرف روحانیت اور اخلاق کے اعتبار سے مغرب پر فائق رہ گیا تھا موقع پاکر مغرب نے ہماری اس فوقیت کا خاتمہ کر دیا۔ اب مغربی قومیں اس اعتبار سے بھی مشرق سے آگے ہیں، خصوصاً انگریز۔ انگریز باوجود کمزور پڑ جانے کے آجکل کا بہترین انسان ہے۔

سات آٹھ سال قبل کی بات ہے، اخباروں میں چھپا تھا کہ گیارہ بارہ برس کا ایک لڑکا لکھنؤ کے قریب ملا ہے، جسے گھٹنیوں چلنے کی عمر سے بارہ برس کی عمر تک بھیڑیوں نے پالا ہے۔ اُسے ماہر انگریز ڈاکٹروں کے سپرد کر دیا گیا تھا، لیکن وہ مایوس ہیں۔ ہزار تدبیروں کے باوجود لڑکا سیدھا ہو کر نہیں چلتا۔ پکا کھانا کھانے سے جان چُراتا ہے۔ کچا گوشت شوق سے کھاتا ہے۔ غرض گیارہ بارہ برس کی حیوانی تربیت نے لڑکے کو انسان نہیں رہنے دیا، لیکن لڑکا بھیڑیا بھی نہیں بنا۔

اسی طرح بالکل خاص قماش کا نصابِ تعلیم ہمارے لیے مقرر کیا گیا، اُس نصابِ تعلیم سے قطعی مختلف جو انگلستان میں رائج ہے، اُس کی برکت سے ہم نہ مشرقی رہے اور نہ مغربی بن سکے۔

صدرِ امریکا کے متعلق اور خود ملکہ برطانیہ کے متعلق آپ پڑھتے ہوں گے کہ اُن کا گرجا کا جانا نہیں چھُٹا۔ لیکن ہمارا معمولی کلرک مسجد اور مندر میں قدم رکھنا خلافِ شان سمجھتا ہے۔ خدا سے بغاوت اس وقت مشرق میں مغرب سے زیادہ ہے۔

مجھے معلوم نہیں ہندوؤں نے کبھی انگریزوں کے زیرِ تربیت آنے کی مخالفت کی تھی یا نہیں، لیکن ہندستان کے مسلمانوں کی مخالفت کا حال میں جانتا ہوں۔ پھر مسلمانوں میں انگریزی تعلیم و تربیت کا بیج میرے سامنے پھوٹا۔ اُس بیج کا درخت بننا اور پھول پھل لانا میں نے ازابتدا تا انتہا دیکھا ہے۔ اس لیے فرق جتنا میں محسوس کرتا ہوں، مجھ سے کم عمر والے محسوس نہیں کر سکتے۔ اُستاد کا مقصد باغیانہ ذہنیت پیدا کرنا تھا۔ اُستاد جانتا تھا کہ میری اُستادی کا زمانہ تو محدود ہے، شاگردوں کی باغیانہ ذہنیت مجھے کیا ضرر پہنچائے گی۔ اس ذہنیت کا زہر خود انھیں مار ڈالے گا۔ خدا سے بغاوت کے بعد یہاں باپ سے بغاوت

کریں گے۔ بیوی میاں سے بغاوت کرے گی، میاں بیوی سے بغاوت کرے گا۔ دوست دوست سے بغاوت کریں گے۔ ایشیائی قومیں ایشیائی قوموں سے بغاوت کریں گی، حتیٰ کہ ایشیائی حاکم محکوموں سے بغاوت کریں گے۔

مغربی سیاست کاری

انگریز یا مغرب کی اور قومیں ایشیا پر حاکم رہیں یا نہ رہیں، حکومت تو اسی طرح عارضی شے ہے جس طرح سکول اور کالج کے اُستادوں کا پڑھانا عارضی ہوتا ہے۔ اس عارضیت کو مستقل یوں کیا جا سکتا ہے کہ ایشیائی ہمیشہ بے چین رہیں اور مغرب سے برابر پوچھے جائیں کہ اے اُستاد! حل بتا۔ حکومتوں کے ختم ہونے سے مغرب کا کیا بگڑتا ہے۔ مغرب کا اقتدار ختم نہ ہونا چاہیے۔

حضرت اکبر الٰہ آبادی نے کس قدر صحیح فرمایا تھا ؎

یوں قتل کی بچّوں کے پڑتی نہ ضرورت
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سُوجھی

فرعون سے نجومیوں نے کہا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے۔ اس کے ہاتھوں تیری موت لکھی ہے۔ فرعون نے یہ کیا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہوتا اُسے قتل کرا دیتا۔ اس واقعے کی طرف حضرت اکبر نے اشارہ کیا ہے کہ فرعون نے بچّوں کو قتل ناحق کرایا۔ تعلیم اور تربیت سے جیسے انسان چاہتا ڈھال لیتا۔

اب ہندو بھی انگلش میڈ (ENGLISH MADE) ہیں اور مسلمان بھی انگلش میڈ ہیں۔ ہندوؤں کا دل مسلمانوں سے اور مسلمانوں کا دل ہندوؤں سے ایسا پھٹا ہے کہ اللہ کوئی معجزہ ہی دکھائے گا تو دل جڑیں گے۔

ایک محلّہ ایک گھر، دلّی میں

میرے بزرگ بھائی خواجہ فضل احمد شیدا ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: "آج سے ساٹھ پینسٹھ سال قبل تک مالدار ہندو، زوال کے مارے مسلمان شرفا کا احترام کرتے تھے۔ میرے والد کے انتقال کو تہتّر برس ہونے کو آئے، اُن کے نانا کا ذاتی مکان روشن پورہ

میں نئی سڑک[1] کے پاس تھا۔ جب میں نے والد کے انتقال کے بعد دلّی آ کر وہ مکان دیکھا تو اُس وقت اُس محلّہ میں ہندو ہی ہندو تھے۔ مسلمانوں کا صرف ایک ہمارا گھر رہ گیا تھا۔ غدر سے پہلے وہاں بہت مسلمان آباد تھے۔ ذوق کے اُستاد، شاہ نصیر اسی محلّے کے باشندے تھے۔ ایک شعر یاد آ گیا ؎

بعد اُن سب کے میر صاحب نے
خُوب روشن کیا روشن پورہ

کہنے کی بات یہ ہے کہ تہتّر برس قبل گرد و پیش، آمنے سامنے، ہندوؤں کے بلند اور مرتفع مکان تھے، لیکن کیا مجال جو دن میں اُن مکانوں کی چھتوں پر کوئی مرد چڑھ جائے۔ وہ یوں کہ میاں صاحب کے ہاں کا سامنا ہو گا۔ اگر آیا گیا، نووارد کبھی چڑھ جاتا تو میاں صاحب کے ہاں سے آواز پڑتی کہ سامنا ہو رہا ہے، اُتر جاؤ۔ اِدھر آواز پڑی، اُدھر وہ نیچے اُترا اور مالک مکان معافی مانگنے آئے کہ مہمان تھا، اُسے خبر نہیں تھی۔"

کچھ حضرت ابوذرؓ کے بارے میں

امیر معاویہؓ اور ابوذر غفاریؓ دونوں ممتاز صحابی ہیں، لیکن دونوں کی طبیعت اور ذہنیت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ دولت کی ریل پیل ہوئی تو کچھ حاکم مسلمانوں نے عامۃ المسلمین کی نسبت اپنا معیارِ زندگی بلند کرنا شروع کیا۔ اُن میں امیر معاویہ بھی تھے، مگر حضرت ابوذر کو انفرادی ملکیت اور جاگیرداری سے اختلاف تھا۔ اُن کی رائے تھی کہ اسلام انفرادی ملکیت اور جاگیرداری پسند نہیں کرتا۔ دولت ساری قوم اور سارے ملک پر خرچ ہونی چاہیے، جیسا کہ حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کیا کرتے تھے، حضور ہمیشہ سونے سے پہلے سونا چاندی ضرورت مندوں میں تقسیم فرما دیتے تھے اور خالی ہاتھ ہو کر سوتے تھے۔

ایک دن امیر معاویہ نے سوچا کہ ابوذرؓ کا امتحان لیا جائے۔ شام کے وقت امیر معاویہ کا قاصد حضرت ابوذر کے پاس پہنچا کہ یہ ہزار اشرفیاں آپ کی نذر ہیں۔ حضرت ابوذر نے کہا۔ رکھ دو۔ رات گزر گئی تو علی الصباح قاصد پھر آیا اور بولا۔ وہ اشرفیاں کسی اور کے لیے تھیں، میں

---

[1] دلّی کی مشہور سڑک ہے۔

غلطی سے آپ کی خدمت میں پیش کر گیا۔ اشرفیاں واپس دے دیجیے۔ امیر معاویہ سمجھتے تھے کہ اتنی کثیر رقم دیکھ کر ابوذر پر طمع غالب آجائے گی اور وہ اُسے واپس کرنے سے ہچکچائیں گے اور واپس کر بھی دیں تو ہمیں یہ پوچھنے کا موقع تو مل ہی گیا کہ دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں کہ سونا چاندی رات بھر روکنا حرام ہے۔ تم نے ہزار اشرفیاں رات بھر کیوں روکیں مگر حضرت امیر معاویہ کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب قاصد اشرفیوں کی بجائے حضرت ابوذر کا جواب لایا کہ بھائی امیں نے تو انھیں اُسی وقت مستحقین میں بانٹ دیا تھا۔ امیر معاویہ کی زبان سے بے اختیار نکلا: ابوذر جو کہتا ہے، اس کے مطابق عمل کرتا ہے۔ بڑا سچّا انسان ہے۔

اُسوۂ خلفاء

حکام اور عوام میں دلی تعاون ہو تو تمام کام آسانی سے چلتے رہتے ہیں۔ اسلامی حکومت میں حاکم باپ کی جگہ ہوتا ہے اور عوام اولاد کی جگہ ہوتے ہیں۔ اولاد اپنی کمائی باپ کو دے دیتی ہے اور باپ اولاد کی پوری طرح کفالت کرتا ہے۔ اولاد کمائی میں سے اپنے واسطے بچاتی بھی ہے تو اُسی قدر جس کی اللہ، رسول اور باپ اجازت دیتے ہیں اور وہ بچائی ہوئی کمائی باپ اور بھائیوں کی امانت سمجھی جاتی ہے۔ حضرت عثمان الغنی رضؓ کے دورِ خلافت میں بعض حکام نے معیارِ زندگی بدل لیا اور اپنا رہن سہن عامتہ المسلمین سے اونچا کر لیا اور وہ پھر اونچا ہی ہوتا رہا۔ ورنہ اسلامی حکومت کے ایک سفیر حضرت معاذ بن جبل رضؓ نے تو دربارِ روم کا کرّ و فر دیکھ کر یہ فرمایا تھا کہ "ہمارا خلیفہ ہم جیسا انسان ہوتا ہے۔ اُس میں اور دوسرے مسلمانوں میں فرق نہیں کیا جاتا۔ چوری کرے تو اُس کا بھی ہاتھ کٹے گا۔ زنا کرے تو سنگسار کیا جائے گا قتل کرے تو قصاص لیا جائے گا۔ ہمارا خلیفہ حویلیوں اور قلعوں میں چھُپ کر نہیں بیٹھتا۔ وہ غرور و تکبّر نہیں کرتا۔ وہ کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ کا پیرو ہے۔ پیروی چھوڑ دے تو ہم اُسے مسندِ خلافت سے اُتار دیں۔

حضرت ابوبکر صدیق کے سامنے دسترخوان پر تھوڑا سا حلوا آگیا۔ حضرت نے اہلیہ سے دریافت کیا۔ یہ حلوا کیسا ہے۔ کہا۔ ماہانہ رقم جو بیت المال سے ملتی ہے، اس میں سے کفایت کر کے کچھ پیسے بچا لیے تھے، اُن پیسوں سے یہ حلوا پکا ہے۔ حضرت ابوبکر نے بقدر اُن پیسوں کے ماہانہ رقم کم کر دی۔

حضرت عمر فاروق رضؓ کی اہلیہ بیت المال کا مشک تول رہی تھیں۔ تول چکیں تو خوشبو بسے ہاتھ چادر پر مل لیے۔ حضرت عمر نے چادر نہیں اوڑھنے دی، جب تک دھو کر خوشبو کا اثر زایل نہ کر دیا۔

حضرت علی مرتضیٰ سے اصرار کیا گیا کہ "امیر المومنین! ذرا تو بہتر مکان میں رہیے۔" حضرت علی نے منظور نہیں فرمایا۔

حضرت عثمان غنی رضؓ کے پاس مسلمان ہونے سے قبل کی دولت بہ افراط تھی۔ اسلام کے لیے کافی روپیہ خرچ کرنے کے باوجود اُن کے پاس روپیہ موجود تھا، لیکن مسندِ خلافت پر متمکن ہوتے ہی اُنھوں نے بہت سادہ معاشرت اختیار کر لی تھی اور بیت المال کے پیسے کو تو چھوا ہی نہیں۔

اعلا حکّام ایسے تھے تو ماتحت حکّام کیسے ہوں گے۔ اس شان کے حکّام کا مرتبہ اسلام میں دوسرے سب طبقوں سے افضل مانا گیا ہے۔ عوام اور حکّام میں کتنا تعاون تھا، اس کا اندازہ اُن فتوحات سے لگایا جا سکتا ہے جو ان حکّام کے زمانے میں مسلمانوں نے حاصل کی تھیں۔ اُن کے زمانے کی مسلمان قوم وہ قوم تھی جس کی مثل قوم چشم فلک نے نہیں دیکھی۔ حضرت عثمان رضؓ کے زمانہ خلافت میں بعض حکّام نے معیار زندگی بدلا تھا حضرت عثمان رضؓ نے نہیں بدلا تھا یا بدلا تھا تو نیچا کیا تھا، اُونچا نہیں کیا تھا۔

حضرت ابوذر رضؓ کی وفات

حضرت امیر معاویہ، گورنر شام، دمشق میں اپنے لیے محل "الخضرا" تعمیر کرا رہے تھے۔ حضرت ابوذر غفاری نے فرمایا۔ اتنے بڑے مکان کی کیا ضرورت ہے۔ ذاتی روپے سے بناؤ تو یہ اسراف ہے اور اللہ کے مال میں سے خرچ کرو تو خیانت۔ اموال فے تو سب مسلمانوں کا حق ہیں۔ انھیں خدم وحشم اور شان وشوکت دکھانے کے کام میں نہیں لانا چاہیے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ حکّام کو اور امرا کو بہت ٹوکتے اور تنبیہہ کرتے رہتے تھے۔ امیر معاویہ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ انھیں میرے صوبے سے بلا لیجیے، اپنے پاس رکھیے۔ دوسرے حکّام اور امرا بھی حضرت ابوذر کے شاکی تھے۔ حضرت عثمان نے شکایتیں ختم کرنے کے خیال سے حضرت ابوذر کو حکم دیا کہ یہاں آجاؤ اور ربذہ میں جا کر قیام کرو۔

ربذہ چھوٹی سی بستی تھی۔ حج کا زمانہ آیا تو وہاں حضرت ابوذر اور ان کی بیوی اور لڑکی کے سوا کوئی باقی نہ رہا۔ ادھر بستی بالکل خالی ہوگئی، اِدھر حضرت ابوذر سخت بیمار پڑ گئے اور موت کے آثار نظر آنے لگے۔ بیوی ایک دن اس سوچ میں بیٹھی تھیں کہ تجہیز و تکفین کیسے کی جائے گی، کپڑا نہیں ہے اور دفن کون کرے گا، بستی والے تو سب چلے گئے۔ حضرت ابوذر نے کہا، فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کے متعلق، میں جس میں شامل تھا، پیشین گوئی فرمائی تھی کہ تم میں سے ایک شخص سُنسان اور اُجاڑ جگہ مرے گا، لیکن مسلمان وہاں اتفاقاً پہنچ جائیں گے اور اُس کے کفن دفن کا انتظام کردیں گے۔ اس جماعت کا ایک ایک فرد آباد جگہوں میں مرچکا ہے۔ فقط میں رہ گیا ہوں اور سنسان اور اجاڑ جگہ مر رہا ہوں۔ لہٰذا وہ پیشین گوئی میری بابت تھی۔ تم خیمے کے باہر جاکر بیٹھو اور اُن مسلمانوں کا انتظار کرو جن کے ذمّے میرا کفن دفن ہے۔ بیوی خیمے سے باہر چلی گئیں اور انتظار کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں ایک قافلہ اُن کے قریب پہنچ کر رکا اور قافلے والوں نے پوچھا۔ اماں! تم اس طرح اکیلی یہاں کیوں کھڑی ہو۔ انھوں نے جواب دیا۔ میرے شوہر کا آخری وقت ہے اور غالباً اُن کا کفن دفن تمھارے لیے مقدّر ہے۔ قافلے والوں نے پوچھا، تمھارے شوہر کا کیا نام ہے۔ جواب دیا۔ ابوذر۔ حضرت ابوذر کا نام سُن کر قافلے والے خیمے کے اندر داخل ہوئے۔ حضرت ابوذر کو حضور سرورِ کائنات کے ارشاد پر اتنا اطمینان تھا کہ بیوی کو راستے پر کھڑا کرنے سے پہلے ہی گوشت کی پتیلی چولھے پر چڑھوا دی تھی کہ تجہیز و تکفین کرنے والے مہمانوں کو بغیر کھانا کھلائے مت جانے دینا۔ اہلِ قافلہ نے جب خیمے میں قدم رکھے تو حضرت ابوذر اُس وقت زندہ تھے۔ حضرت ابوذر نے اہلِ قافلہ سے سوال کیا۔ تم میں سے کوئی حکومت کا ملازم تو نہیں ہے۔ ایک شخص کے سوا سب حکومت کے ملازم تھے۔ اُس شخص نے کہا۔ میں حکومت کا ملازم نہیں ہوں۔ حضرت ابوذر نے فرمایا۔ تم ہی میرے حقیقی رفیق ہو۔ میرا جنازہ راستے پر رکھ دینا اور اب جو قافلہ اس راستے سے گزرے اُس سے کہنا کہ تم بھی نماز اور تدفین میں شریک ہوجاؤ۔ چناں چہ حج کو جانے والا ایک قافلہ وارد ہُوا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس قافلے کے امیر تھے، انھوں نے حضرت ابُوذر کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔

حضرت ابوذر کے خیالات

حضرت ابوذر غفاری وہ صحابی ہیں، جنھوں نے سب سے پہلے محسوس کیا تھا کہ مسلمانوں میں بھی تخت منبر سے الگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسلام کے برق رفتاری کے ساتھ پھیلنے اور چھا جانے کی بڑی وجہ یہی تھی کہ اسلام دنیا اور دین کو ایک کہتا ہے۔ اسلام کے نزدیک دنیا اور دین مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ دنیا کو اللہ کے احکام کے مطابق برتنا ہی دین ہے۔ حضرت ابوذر غفاری پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے سمجھا کہ دنیا اور دین کی تفریق کر دی گئی تو اسلام کی رفتار سست پڑ جائے گی۔ رفتار ترقی گم ہو جائے گی۔ مسلمانوں پر زوال آجائے گا۔ اسلام کا کام تو یہ ہی یہ بتانا کہ دنیا اور دین کی تفریق غلط ہے۔ دنیادار اور دین دار کے الفاظ اسلام کی لغت میں کہیں نہیں ملتے۔

حضرت ابوذر کا خدشہ بالکل صحیح نکلا۔ مسلمانوں کی تباہی کا بنیادی سبب حقیقتاً صرف یہ ہے کہ انھوں نے غیر مسلموں کی طرح دنیا اور دین کو الگ الگ کر دیا ہے کسی نے راہبانہ زندگی اختیار کر لی ہے اور کوئی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور تلاوت قرآن سے بھی بے نیاز ہے۔ عیسائیوں کی طرح ہم نے چرچ اور اسٹیٹ کو دو چیزیں قرار دے لیا ہے۔ ہم دو بادشاہوں کی رعایا بن گئے ہیں۔ اللہ کا حصہ اللہ کو دیتے ہیں اور قیصر کا حصہ قیصر کو دیتے ہیں۔ ہم صنعت و تجارت اور حکومت و سلطنت وغیرہ کو دنیا تصور کرنے لگے ہیں اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کو دین، حالاں کہ نیت بخیر ہو تو صنعت و تجارت اور حکومت و سلطنت دین ہے اور نیت بخیر نہ ہو تو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ دنیا ہے۔

حرفِ آخر

کسی مغربی مفکر کا قول ہے کہ ہمیں اپنی سوچی ہوئی یا تحقیق کی ہوئی باتوں کے متعلق یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ صحیح ہی ہیں۔ اس مفکر کی رائے ہے کہ حرفِ آخر تو وہ ہوگا جو آخری انسان کہے گا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ آخری انسان بھی حقائق کی انتہا تک نہیں پہنچ سکے گا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا ...... وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا۔

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم (دنیا کے لوگوں سے) کہہ دو کہ میرے پروردگار کی

باتوں (کو لکھنے) کے لیے سمندر (کا پانی) روشنائی بن جائے تو میرے پروردگار کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر (کا پانی) ختم ہو جائے گا اور اگر ہم اُس سمندر جیسا (اور سمندر بھی) مدد کو لے آئیں (تو اللہ کی باتیں احاطۂ تحریر میں نہیں آسکیں گی۔) (سورہ ۱۸۔ آیت ۱۰۹)

اس کا منشا یہ نہیں ہے کہ اللہ کی باتوں پر غور نہ کیا جائے۔ غور کرنے کی تاکید میں تو قرآن مجید بھرا پڑا ہے۔ قرآن اپنی آیتوں پر غور کرنے کی بھی دعوت دیتا ہے اور آیات کائنات پر غور کرنے کی بھی۔ اللہ کے اقوال اور افعال پر غور کیے بغیر آپ اللہ کو نہیں پا سکتے۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ اللہ کے بندوں میں اللہ سے وہی لوگ ڈرتے (اور اُس کی قدرت، اُس کی عظمت اور اُس کی سطوت و جبروت کو وہی پہچان سکتے) ہیں جو (اللہ کے اقوال و افعال پر اللہ کو پہچاننے کی نیت[1] سے غور کرتے ہیں اور اللہ کے اقوال و افعال کے) جاننے والے ہیں۔ (سورہ ۳۵۔ آیت ۲۸)

کہنا بس اتنا ہے کہ غور ضرور کیجیے، مگر اپنے غور کو حرف آخر مت سمجھیے۔

اقبال کی یادیں

علامہ اقبال کا نام میں اُس وقت سے جانتا تھا، جب اُن کی ایک نظم تیسری یا چوتھی جماعت کے کورس میں شامل کی گئی تھی اور دلی کے لڑکے اُسے مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ نظم کا پہلا شعر تھا ؎

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ جھاڑیاں چمن کی، وہ میرا آشیانہ

نظم کی شمولیت میرے لیے نئی سی بات تھی۔ اب تک اُردو کورسوں پر میر، مومن، غالب و حالی، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد وغیرہ کا قبضہ تھا۔ خیال نہیں گزرتا تھا کہ ان کی جگہ کوئی اور لے سکے گا۔

---

[1] اللہ کے اقوال و افعال پر اللہ سے بغاوت کرنے کے لیے بھی غور کیا جاتا ہے۔ دلی میں ایک صاحب رام چندر تھے۔ انھیں قرآن مجید پر خاصا عبور تھا، لیکن وہ ہمیشہ قرآن کے خلاف زہر ہی اُگلا کرتے تھے۔ اور اللہ کے افعال پر غور کرنے والوں سائنس دانوں کا حال جو کچھ ہے اُسے کون نہیں جانتا۔ اسی لیے میں نے نیت کی شرط لگائی ہے۔

پھر شیخ عبدالقادر صاحب کے رسالہ مخزن میں اُن کا کلام متواتر چھپنے لگا۔
علامہ اقبال بھی شیخ عبدالقادر کی طرح شروع شروع صرف شیخ محمد اقبال کہلاتے تھے اور خواجہ حسن نظامی صاحب شیخ عبدالقادر اور شیخ محمد اقبال کو لاہور کے شیخین کہا کرتے تھے۔
رسالہ مخزن نے شیخ محمد اقبال کی شہرت اسکولوں سے آگے پہنچا دی۔ اقبال کا عبدالقادر، میر نیرنگ، عبدالعزیز فلک پیما، خوشی محمد (گورنر کشمیر) حسن نظامی، راشد الخیری، سب بام شہرت پر رسالہ مخزن کے ذریعے آئے تھے۔ مخزن ان کی نظم و نثر سے چمکتا تھا اور یہ مخزن کی مقبولیت سے چمکتے تھے۔

رسالہ مخزن کے بعد رسالہ نظام المشایخ کا نمبر تھا، جس میں علامہ اقبال نے بہت لکھا۔ رسالہ نظام المشایخ کے اجرا کے وقت علامہ اقبال رسالوں سے بے نیاز ہو چکے تھے اور مستقل تصانیف کی طرف توجہ منعطف کر چکے تھے، لیکن خواجہ حسن نظامی کی خاطر سے نظام المشایخ انھیں اتنا یاد رہتا تھا کہ شکوہ جیسی نظم پہلی بار نظام المشایخ میں چھپی تھی۔

نظام المشایخ نے مجھے بھی علامہ اقبال سے قریب کر دیا تھا، مگر بس اس قدر کہ اُن کے حقیقی مقرب زندہ ہوتے تو مجھے قربت کا ادعا زیب نہ دیتا۔ تاہم مولائے روم کی صف کے انسان کے ساتھ تھوڑی سی قربت بھی میرے لیے موجب فخر ہے۔

نظام المشایخ کے ابتدائی پانچ سال میں نے اور خواجہ حسن نظامی صاحب نے بالکل یک جا بسر کیے تھے۔ خواجہ صاحب نے بستی نظام الدین کی سکونت چھوڑ دی تھی اور دِلّی کوچہ چیلان میں میرے ہاں رہنے لگے تھے۔ اُن سے جو ملنے آتا تھا، وہ لازماً مجھ سے ملتا تھا۔ اُن سے ملنے والوں میں علامہ اقبال بھی تھے۔ خواجہ صاحب کے اس زمانے کے ملنے والوں کو ایک ایک کر کے قضا لے گئی۔ خود خواجہ صاحب رخصت ہو گئے۔ علامہ اقبال کا قیام بیشتر حکیم اجمل خاں کے ہاں ہوتا تھا لیکن جب میرے ہاں تشریف لاتے تھے تو گھنٹوں بیٹھتے تھے۔ علامہ اقبال کی بہت سی باتیں ذہن میں محفوظ ہیں۔

ایک دفعہ علامہ اقبال نے مجھے نصیحت فرمائی کہ انگریزی لٹریچر کا مطالعہ کرو۔ انگریزی زبان میں ایسا علمی ذخیرہ جمع ہے کہ پڑھ کر تمھیں محسوس ہوگا کہ پڑھنے میں دیر ناحق کی تھی۔

ایک دفعہ میں اور خواجہ حسن نظامی علامہ اقبال کو ریلوے اسٹیشن لینے گئے۔ اس دفعہ انھیں میرے ہی ہاں قیام کرنا تھا۔ ریلوے قلیوں کی گفت گو سن کر علامہ اقبال جھوم اُٹھے۔

اُس زمانے میں دِلّی کے اسٹیشن پر دلّی سے باہر کے قلی نہیں تھے۔ علامہ اقبال نے ہنس کر کہا، واحدی صاحب! آپ میری یہاں شادی کرا دیجیے۔ دلّی کے قلیوں کی زبان یہ ہے تو دلّی کی شریف زادیوں کی زبان کے تو کیا کہنے ہیں۔

محبوبِ الٰہیؒ کے دربار میں

ایک دفعہ میں، خواجہ صاحب اور علامہ اقبال عصر و مغرب کے درمیان بستی حضرت نظام الدین سے مقبرہ ہمایوں جا رہے تھے۔ یہ راستہ اب بھی سنسان ہے۔ علامہ اقبال نے فرمایا۔ مجھے اللہ اس سناٹے میں نظر آتا ہے، خصوصاً عصر و مغرب کے درمیان کے سناٹے میں۔

سلطان المشایخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ سے علامہ اقبال کو بڑی عقیدت تھی۔ ۱۹۰۵ء میں جب بیرسٹری پاس کرنے انگلستان گئے ہیں تو حضرت سلطان المشایخ کے مزار پر حاضری دے کر گئے تھے۔ شیخ محمد اکرام (معاون مدیر مخزن) نے لاہور سے اور میر غلام بھیک نیرنگ نے انبالے سے دلّی تک مشایعت کی۔ خواجہ حسن نظامی اور منشی نذر محمد (ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز، دہلی) نے استقبال کیا۔ علامہ اقبال تنہا مزار حضرت سلطان المشایخ کے سرہانے جا بیٹھے اور ایک نظم پڑھی۔ ساتھی، خواجہ صاحب سمیت کُل کے کُل باہر رہے۔ پھر ساتھیوں کی خواہش پر صحن میں مزار مبارک کے سامنے کھڑے ہو کر نظم کو دوبارہ پڑھا۔ علامہ اقبال کی آواز میں درد اور لہجہ میں رقت تھی، جس نے ساتھیوں اور جملہ سامعین پر کیفیت طاری کر دی۔

غالب کی قبر پر

درگاہ شریف سے علامہ اقبال خواجہ صاحب کے گھر پہنچے۔ گھر کا اور لنگر کا کھانا کھایا۔ ولایت خاں ایک نوعمر، خوش گلو اور ذہین قوال موجود تھا، وہ گاتا رہا۔ واپسی ہوئی تو خاتم الشعرا مرزا اسد اللہ خاں غالب کی تربت پر پارٹی رکی۔ میر نیرنگ مرزا غالب کے ایک طرف بیٹھے اور علامہ اقبال دوسری طرف۔ باقی ساتھیوں نے مزار کے گرد حلقہ سا باندھ لیا۔ دن کے دو بجے تھے اور دن ستمبر کا تھا۔ دھوپ بے حد تیز تھی اور

ہوا بند تھی، مگر گرمی کا کسی کو خیال نہ تھا۔ ولایت خاں کو بر محل سوجھی۔ بولا حضور! اجازت ہو تو مرزا صاحب کی غزل عرض کروں۔ یہاں کسے انکار تھا۔ سرود بہ مستاں یاد دہانید۔ اُس نے غزل چھیڑی:

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اِک ادا میں رضامند کر گئی

اور غزل کے ان دو شعروں نے ہل چل مچا دی:

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا، ہوسِ بال و پر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

ہوش بجا ہوئے تو پارٹی اُٹھی۔ علامہ اقبال نے مرزا صاحب کی لوحِ تربت کو بوسہ دیا اور دلّی کی راہ لی۔

۱۹۱۰ یا ۱۹۱۱ میں اسلامیہ ہائی سکول، انبالہ کا افتتاحی جلسہ ہوا۔ میر نیرنگ صاحب نے خواجہ صاحب کو اور مجھے مدعو کیا۔ علامہ اقبال پٹیالے میں نواب سر ذوالفقار علی خاں (چیف منسٹر پٹیالہ) کے مہمان تھے۔ وہ پٹیالے سے تشریف لائے اور جلسے سے فراغت پا کر خواجہ صاحب کو اور مجھے پٹیالے لے گئے۔ مجھے اپنے چھوٹے بھائی بہن کے گارڈین (ولی) کی حیثیت سے ڈسٹرکٹ جج دہلی کی عدالت میں جائداد کا سالانہ حساب پیش کرنا تھا۔ میں نے عذر کیا۔ لیکن علامہ اقبال نے ڈسٹرکٹ جج کو جوابی تار بھیج کر تاریخ پیشی بدلوا دی۔ سات آٹھ روز چوبیس گھنٹے یک جا رہنے کا موقع ملا۔ سات آٹھ روز میں علامہ اقبال نے مجھے خاصا گستاخ بنا لیا۔ علامہ اقبال نہایت سادہ اور بے تکلف انسان تھے۔ ایک روز میں نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب! آپ لکھتے ہیں تو صحیح اُردو لکھتے ہیں، مگر بولنے میں ــــــ میری بات کاٹ کر فرمایا۔ میاں ہر وقت زبان کا دھیان رکھوں تو مر نہ جاؤں۔ لکھتے وقت تو میں نگینے تراشتا ہوں۔

خواجہ حسن نظامی سے علامہ اقبال کے تعلقات مخلصانہ تھے۔ خواجہ صاحب کے نام کے ساتھ خواجہ کا لفظ ابتداءً علامہ اقبال ہی نے استعمال کیا تھا۔ یورپ جانے سے پہلے اور

آنے کے بعد تعلقات کا رنگ یکساں رہا۔ ان دونوں کا ملنا میں نے دیکھا ہے اور ان کے خطوط چھپ چکے ہیں اُن سے تعلقات کا ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے۔ علامہ اقبال کی کتاب اسرارِ خودی شایع ہوئی تو اخلاص اور تعلق میں تھوڑا سا رخنہ ضرور پڑا تھا، مگر رخنہ عارضی تھا۔ چناں چہ جب علامہ اقبال پتھری کی تکلیف میں مبتلا ہوئے ہیں تو خواجہ صاحب ہی نے دلی بلاکر حکیم نابینا صاحب سے علاج کرایا تھا۔

علامہ اقبال نے خواجہ صاحب کو اطلاع دی کہ گُردے کا اپریشن کرانے سری نگر (کشمیر) جارہا ہوں۔ پنجاب کا سب سے بڑا انگریز سرجن آجکل سری نگر میں ہے۔ سر سکندر حیات نے اُس سے میری سفارش کی ہے۔" سر سکندر حیات اس وقت پنجاب کے ایکٹنگ گورنر تھے۔ خواجہ صاحب نے علامہ اقبال کو جواب دیا کہ ذرا حکیم نابینا کا تجربہ کرتے جائیے۔ علامہ اقبال دلی تشریف لائے۔ خواجہ صاحب نے اُنھیں بیگم کے باغ کے پاس ایک ہوٹل میں ٹھہرایا اور حکیم نابینا صاحب کو لاکر دکھایا۔ ناقابلِ بیانِ تکلیف تھی۔ کسی کروٹ چین نہیں تھا۔ حکیم نابینا صاحب نے دوا دی۔ اللہ کے فضل سے تین دن میں تکلیف جاتی رہی۔ پتھری ریزہ ریزہ ہوکر نکل گئی۔ آٹھویں دن حکیم نابینا صاحب نے فرمایا۔ اب آپ لاہور جائیے، دوا لاہور پہنچتی رہے گی۔

پتھری نکالنے کی دوا مفرد تھی۔ کسی جڑ یا بُوٹی کا سفوف تھا۔ لاہور مرکب دوائیں جاتی تھیں۔ میں حکیم صاحب سے دوائیں منگاتا تھا اور بھیجتا تھا۔ ڈیڑھ مہینے مرکب دواؤں کا سلسلہ جاری رہا۔ علامہ اقبال نے پتھری کی شکایت پھر کبھی نہیں کی اور علامہ اقبال وقتِ آخر تک حکیم نابینا صاحب اور خواجہ صاحب کے شکر گزار رہے۔

دِلّی میں بھِک منگوں کی برادری

بھک منگوں کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک وہ جو گھر گھر جاکر اور ڈیوڑھیوں پر کھڑے ہوکر صدائیں لگاتے ہیں یا نعتیں اور مُناجاتیں پڑھتے ہیں، دوسرے وہ جو بازاروں میں راہ چلتوں سے بھیک مانگتے ہیں۔ تیسرے وہ جو سڑکوں کے کنارے اس طرح پڑے رہتے ہیں کہ خدا ترس اور نرم دل لوگ اُنھیں کچھ دیئے بغیر قدم آگے نہیں بڑھا سکتے۔

دلّی میں پہلی قسم کے بھِک منگوں کی برادری سی تھی۔ اُن سے ہمیشہ پوچھا جاتا تھا تو

بھیک مانگنا پیشہ بتاتے تھے۔ یہ اپنی آبادیاں الگ بساتے تھے۔ ان کی برادری کا چودھری بھی ہوتا تھا، اور بالکل برادریوں کا سا اِن کا نظام تھا یہ نسلاً بعد نسلٍ بھیک مانگنے کا پیشہ کرتے چلے آئے تھے، خدا معلوم کب سے۔ دلی میں انھوں نے محلے بانٹ رکھے تھے۔ بچپن سے بڑھاپے تک ایک ہی محلے کے ساتھ وضع نباہ دیتے تھے۔ عورتیں انھیں پہچاننے لگتی تھیں، کوئی دو تین ہفتے نہ آتا تو کہتیں "ہے ہے، سائیں جی شاید بیمار ہو گئے"۔ پچاس ساٹھ برس پہلے کمانے والوں کی کمائی میں سائیں جی کا ساجھا سمجھا جاتا تھا۔

دوسری قسم کے بھک منگوں میں اوّل تو یہی پہلی قسم کے بھک منگے ہیں، جنھوں نے اب گھروں کی بھیک سے مایوس ہو کر بازاروں کی بھیک کو اختیار کر لیا ہے۔ کھوٹے سے نئے شامل ہو گئے ہیں۔ بازاروں میں یہ گانے نہیں گاتے اور صدائیں نہیں لگاتے، بلکہ راہ چلتوں کو خاصا زچ کر کے پیسے وصول کرتے ہیں۔ دکان پر ایک شخص صاف ستھرا سوٹ پہنے کھڑا سودا خرید رہا ہے۔ انھوں نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ متوجہ نہ ہُوا تو میلے اور غلیظ ہاتھوں سے اس کی پتلون کی شکن مسل ڈالی۔ یا گنجا ہے تو گنجے ہاتھ کو کوٹ کے دامن سے ملنا شروع کر دیا۔ ان میں اکثر کی ذہنیت مجرمانہ ہوتی ہے۔

تیسری قسم کے بھک منگے زبان سے نہیں بولتے، زبانِ حال سے بولتے ہیں۔ پہلی قسم کے بھک منگوں کے ساتھ وضع داری کا معاملہ تھا، دوسری قسم کے بھک منگے شریفوں کی شرافت سے فایدہ اُٹھاتے ہیں، لیکن تیسری قسم کے بھک منگوں پر خالص رحم کھایا جاتا ہے، اگرچہ سب رحم کے مستحق نہیں ہوتے، اکثر محض ڈھونگ بناتے ہیں اور اکثر سے اُن کے عزیز ظاہری معذوری کی تجارت کرتے ہیں، تاہم اِن میں حقیقی محتاج بھی ضرور مل سکتے ہیں، لیکن محتاج ہوں یا محتاج نہ ہوں، بھیک مانگنا تو بُری ہی بات ہے اور بڑی ذلت کی بات ہے۔ ذلت کی بات بھیک مانگنے والوں کے لیے نہیں، ملک اور قوم کے لیے، بھیک دینے والوں کے لیے۔ بھیک مانگنے والے ذلت کا احساس کر سکتے تو بھیک کیوں مانگتے۔ اُن کا یہ احساس مر جاتا ہے اور مردہ احساس کو زندہ کرنا محال ہے۔ اس کی کوشش ہمیشہ رائگاں جائے گی۔ البتہ بھیک دینے والوں کا احساس مُردہ نہیں، خفتہ ہے۔ خفتہ کو بیدار کیا جا سکتا ہے۔

بھیک کی ذلت

بھیک کی ذلت کا احساس مجھے تو اس تصوّر سے ہوا کرتا ہے کہ میں خود بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاؤں تو میرا کیا حال ہو ہیں مالدار آدمی نہیں ہوں، تاہم میرے لیے یہ تصوّر اپنے متعلقین کی موت سے زیادہ جاں گسل ہے، تو جو حضرات مالدار ہیں، وہ اگر یہ تصوّر کریں تو اُنھیں بھیک کی ذلت کا مجھ سے کہیں زیادہ اندازہ ہونا چاہیے۔ وہ اپنی بابت تصوّر نہ کریں، دُور پرے کے عزیزوں اور رشتہ داروں کی بابت تصوّر کریں۔ بھیک مانگنے والے بھی ہمارے رشتہ دار ہیں۔ ڈوہ لگائی جا سکے تو نزدیک ہی ایک بزرگ مل جائیں گے جو ہمارے اور بھیک مانگنے والوں کے جد ہوں گے۔ جنھیں اگر اچھی حالت والوں کی اچھی حالت سے خوشی ہو رہی ہوگی تو بھیک مانگنے والوں کی ذلیل حالت کا صدمہ ہوگا اور جو چاہتے ہوں گے کہ خوش حال اولاد بدحال اولاد کو سنبھالے۔

سگے بھائیوں میں بھی کچھ بھائی امیر اور کچھ غریب ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ امیر بھائی کبھی پسند نہیں کرتے کہ اُن کے غریب بھائی بھیک مانگتے پھریں، لیکن غریب بھائیوں کو بھیک مانگنے سے روکنے کے واسطے امیر بھائیوں کو انتظام کرنا پڑتا ہے۔ وہ اُنھیں کام پر لگانے کی فکر کرتے ہیں۔ اُنھیں رُپے سے مدد دیتے ہیں۔ امیر بھائی غریب بھائیوں کے بھیک مانگنے کو اپنی ذلت سمجھتے ہیں۔

اگر اس کیفیت کی آدھی بلکہ پاؤ کیفیت ہمارے دل میں تمام بھک منگوں کے لیے پیدا ہو جائے تو بھیک مانگنے کی لعنت ٹھہر نہیں سکتی۔ آدھی پاؤ نہیں، اتنی کیفیت پیدا ہو جائے جتنی ہمیں بھک منگوں سے نسبت ہے، جتنا ہمارا اور بھک منگوں کا رشتہ ہے۔ ہمیں فقط اتنا محسوس ہو جائے کہ بھیک مانگنے والے اور بھیک نہ مانگنے والے سب ایک ملک اور ایک قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ سب کا گوشت پوست ایک ہے، سب میں ایک خون دوڑ رہا ہے۔

سگا بھائی بھی بھائی کی اِس حد تک مدد کرتا ہے جس حد تک اُس کی اپنی عزت محفوظ ہو جائے، برابر کا حصہ دار نہیں بناتا۔ دوسری قومیں، جنھیں عزت و ذلت کی تمیز آج ہم سے زیادہ ہے، وہ بھی ساری قوم کو ایک سطح پر نہیں لاتیں۔ اُن قوموں کے

ممتاز افراد بس قوم کی عزت محفوظ رکھنے کی حد تک ہی ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اُن قوموں کے بڑے نہیں چاہتے کہ ان کی قوم کا کوئی آدمی ایسی حرکت کرے جسے وہ بُرا سمجھتے ہیں، یا ان کی قوم کے کسی آدمی کی ایسی حالت ہو جسے دیکھ کر لوگ اُن کی قوم کو ذلیل سمجھنے لگیں۔ ہمارے عزت دار چاہیں تو ہمارے ہاں بھی بھیک مانگنا رُک سکتا ہے۔ انھیں ایسا بندوبست کرنا پڑے گا کہ بھکاری یہ نہ کہہ سکے کہ میں کام کرنے کو تیار ہوں، مجھے کام نہیں ملتا۔ لاوارث بڈھوں، بیماروں اور اپاہجوں کے کھانے، کپڑے اور رہنے کا بندوبست الگ کیا جائے اور تندرست اور مضبوط آدمیوں کو کام پر لگانے کا بندوبست الگ۔

کام میں عزت ہے

سنا ہے یورپ میں لنگڑوں اور لُولوں سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ اس طرح کہ سینے کی مشین پر ایک طرف لنگڑا بیٹھ گیا اور دوسری طرف لُولا۔ لُولے نے پیروں سے مشین چلائی اور لنگڑے نے ہاتھوں سے سینا شروع کیا۔ گویا ایک کے ہاتھوں اور دوسرے کے پیروں نے مل کر ایک دوسرے کی لاچاری دور کر دی۔ سلیقہ مند لوگ مٹی کے ٹھیکروں کو کارآمد بنا لیتے ہیں، بے کار انسانوں کو کارآمد بنانا کیا مشکل ہے۔ لنگڑوں، لُولوں، اندھوں، بہروں، گونگوں، سب کو کام پر لگایا جا سکتا ہے، اور جو کام کے قابل نہیں رہے ہیں انھیں آرام پہنچانا ہمارا فرض ہے۔ اُن کے ورثا نہیں ہیں یا ورثا اُن کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتے تو ساری قوم اور سارے ملک کو ان کا وارث بننا چاہیے۔

کم از کم بڑے شہروں میں اس قسم کے انتظامات اشد ضروری ہیں۔ میونسپلٹیاں انتظام کریں تو میرا خیال ہے کہ معززین شہر میونسپلٹیوں کا ہاتھ بٹائیں گے۔ ہمارے معززین شہر میں عام طور پر یہ احساس تو نہیں ہے کہ اُن کے بھائیوں کے بھیک مانگنے سے اُن کی ذلت ہوتی ہے، لیکن جب سے گھروں کی بجائے بازاروں پر بھکاریوں نے ہلّہ بولا ہے، دکاندار بھی پریشان ہیں اور گاہک بھی بھنّاتے ہیں۔ یہ دکاندار اور گاہک خوشی خوشی ایسے اداروں کو مدد دیں گے جو اُن کا پیچھا ان بھک منگوں سے چھڑائیں۔

خیرات کا نتیجہ

ہم خیرات کرنے سے نہیں گھبراتے۔ خیرات کرنا تو ہماری معاشرت کا جزو ہے، بلکہ

ہمارے خیرات کرنے کے غیر معمولی جذبے ہی نے آبادیوں کی آبادیوں کو بھیک مانگنے اور مفت کی روٹیاں کھانے کا مزا لگا دیا ہے۔ اگر کوئی منظم طریقہ خیرات کے جاری رکھنے کا ہمارے سامنے آئے گا تو ہم اُسے قطعی قبول کریں گے، لیکن کوئی طریقہ سامنے آنا لازمی ہے، اور میونسپلٹیوں سے زیادہ ذمّہ داری کے ساتھ اس طریقے کو رواج دینا کسی اور کے بس کا نہیں ہے۔ کام نہ ملنے کی وجہ سے جو بھیک مانگتے ہیں میونسپلٹیاں اُن کے واسطے کارخانے بنائیں، محتاج خانے کا لفظ میں پسند نہیں کرتا، کارخانے بنانے چاہئیں۔ اہلِ شہر اُن کارخانوں کو مالی امداد دینا ثواب جانیں اور پھر بھی کوئی بھیک مانگنا ترک نہ کرے تو اُسے جیل بھجوائیں۔ بھک منگے کی جگہ کارخانہ ہو یا قید خانہ، لیکن قید خانے بھجوانے سے قبل کارخانہ اور آرام خانہ بنوانا ہوگا۔ کارخانہ تندرست اور مضبوط بھک منگوں کے واسطے اور آرام خانہ ضعیفوں اور بیمار بھک منگوں کے واسطے۔

ایسے بھی اللہ کے بندے ہیں جو کڑکڑاتے جاڑے کی راتیں سڑک کی پٹڑیوں اور معابد کی سیڑھیوں پر بسر کرتے ہیں، جن کے پاس تن ڈھکنے کو کپڑا واقعی نہیں ہوتا، کوڑا کرکٹ جلا کر اپنے گرد گرمی پیدا کرتے ہیں۔ بھیک مانگنا فن بن گیا ہے، جنھیں یہ فن آتا ہے وہ اچھے پڑھے لکھوں سے زیادہ کما لیتے ہیں، لیکن جو اس کو نہیں جانتے۔ ان کی حالت بڑی دردناک ہے۔

دِلّی کا ایک واقعہ

دلّی میں ایک روز میں صبح کے وقت اروِن ہسپتال کے آگے سے گزر رہا تھا، چند حضرات نے مجھے روکا اور کہا کہ تیرہ چودہ برس کا ایک لڑکا ہسپتال کے بڑے دروازے کے پاس پڑا ہے غالباً مرہم پٹّی کر کے ہسپتال والوں نے اُسے باہر نکال دیا ہے۔ چل پھر نہیں سکتا۔ خدا معلوم کب سے بھوکا تھا۔ ہم نے دُودھ پلایا ہے تو ہوش آیا ہے۔ میں نے لڑکے کو دیکھا۔ عقل کام نہیں کرتی تھی کہ اُسے کہاں پہنچایا جائے۔ ہسپتال رکھ سکتا تو پہلے ہی کیوں نکالتا۔ لڑکا ہندو تھا اور دکھانے والے بھی ہندو تھے۔ میں نے کہا، کسی ہندو یتیم خانے میں پہنچا دو۔ وہ بولے۔ یتیم خانے ایسے لڑکوں کو قبول نہیں کیا کرتے۔ اتفاق سے میرے محلّے کا ایک نوجوان سائیکل پر جاتا دکھائی دیا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ تم تانگہ کر کے اِسے جمنا کے کنارے چھوڑ آؤ۔ جمنا کے کنارے ہندو ننگوں کی بستی ہے۔ اُس کے سوا کوئی جگہ نہیں تھی جہاں اُسے بھیجا جا سکتا۔

امدادی ادارے

غرضیکہ ایسے اداروں کی ہر شہر میں ضرورت ہے جو اس طبقے کے لیے جائے پناہ ہوں اور جن کی موجودگی میں بھیک مانگنے والے یہ نہ کہہ سکیں کہ صاحب! بھیک نہ مانگیں تو کیا کریں۔ ایسے ادارے کھلنے سے بھیک مانگنا ہی موقوف نہیں ہوجائے گا بے حیائی اور بدکاری کے انسداد میں بھی اس قسم کے ادارے مددگار ثابت ہوں گے اور دوسرے جرائم پر بھی ان کا اچھا اثر پڑے گا۔

گرے ہوؤں کو اُٹھانا اور نیچوں کو اونچا کرنا اونچوں کا فرض ہے، جو اونچے اپنا یہ فرض نہیں بجا لاتے، قدرت تیسری، چوتھی پشت میں اُن سے بدلہ لے لیتی ہے، ان کی اولاد کو نیچے پھینک دیتی ہے۔ گرے ہوؤں کو اُٹھانے اور نیچوں کو اونچا کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بھکاری آپ سے بھیک مانگے تو آپ اُسے دو چار پیسے دے دیں اور خوش ہو جائیں کہ اللہ نے آپ کو خیرات کرنے کے لائق کیا ہے، گرے ہوؤں کو اٹھانا اور نیچوں کو اونچا کرنا یہ ہے کہ نیچوں سے بری عادتیں چھڑوائیے۔ نیچوں کا اخلاق سُدھاریے۔ نیچوں کو اور نیچوں کے بچوں کو تعلیم و تربیت دلوائیے اور نیچوں کو ایسے راستے پر ڈال دیجیے کہ وہ یا اُن کے بیٹا بیٹی آپ جیسے ہو جائیں۔ ناتوانوں کی دست گیری اس طرح کیجیے کہ ناتواں ناتواں نہ رہے اور نیم جانوں کی دعائیں اس طرح خریدیے کہ آپ کے گھر میں حقیقی بہار آجائے۔

عقلِ انسانی

ہر عاقل و بالغ انسان اِس منزل سے گزر چکا ہے کہ ماں باپ اُسے کچھ بتاتے تھے اور بات اُس کے پلّے نہیں پڑتی تھی۔ ایک زمانے تک یہی رہا کہ بات سمجھ میں نہیں آئی اور ٹکر ٹکر دیکھا کیے۔ پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ بات سمجھ گئے لیکن بات کی مصلحت نہیں سمجھے۔ ماں باپ کی باتیں اور مصلحتیں سمجھنے میں انسان کا یہ حال ہے اور جب انسان بہت بوڑھا ہو جاتا ہے، تو وہ اولاد کی باتیں اور مصلحتیں نہیں سمجھتا، اولاد اُسے عقل سکھاتی ہے، مگر اُس کے حواس اس قابل نہیں رہتے کہ عقل اور غیر عقل میں تمیز کر سکے۔ لہٰذا کبھی اگر اللہ کی کوئی بات ہماری عقل میں نہ بیٹھے تو ہمیں تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ عام انسانوں کی عقل کیا شے ہے،

جلیل القدر انبیاء بھی اتنا ہی سمجھ سکتے تھے جتنا اللہ انھیں سمجھانا چاہتا تھا اور جب ہی سمجھ سکتے تھے جب اللہ سمجھانا چاہتا تھا۔

حضرت موسیٰؑ و خضرؑ

قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کا قصہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے حضرت خضرؑ سے کہا، "مجھے وہ علم تھوڑا سا سکھا دو جو اللہ نے تمھیں سکھایا ہے۔ میں (چند دن) تمھارے ساتھ رہوں گا۔" حضرت خضر نے فرمایا، تم میرے ساتھ رہ کر صبر و ضبط سے کام نہیں لے سکو گے۔ جس بات کو نہ سمجھو گے اس پر صبر و ضبط کرنا تمھارے لیے بھلا کیسے ممکن ہے۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا، (نہیں) تم مجھے صابر و ضابط پاؤ گے۔ میں تمھاری ہدایت کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔ حضرت خضر نے کہا۔ (اچھا) میرے ساتھ رہنا ہی ہے تو (دیکھو) تاوقتیکہ میں نہ بتاؤں مجھ سے پوچھنا مت کہ فلاں بات کیوں کی اور فلاں بات کیوں نہیں کی۔ (خیر قول و قرار ہو گئے) تو دونوں چلے۔ (راستے میں دریا پڑا اور دونوں کشتی میں سوار ہوئے) کشتی پر سوار ہو کر حضرت خضر نے (کیا کیا) اُسے توڑ دیا (اُس کا تختہ نکال پھینکا) حضرت موسیٰ بولے، ہیں کشتی کو ڈبوؤ گے۔ تم نے کشتی توڑ ڈالی۔ یہ تو تمھاری بڑی خطرناک حرکت ہے۔ حضرت خضر نے فرمایا، میں نہ کہتا تھا کہ میرے ساتھ رہ کر صبر و ضبط نہیں کر سکو گے۔ حضرت موسیٰ نے معذرت چاہی اور (دوبارہ) وعدہ کیا کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔

طویل قصہ ہے۔ کئی کام حضرت خضر نے اسی قسم کے کیے کہ حضرت موسیٰ اُن کی لم نہیں سمجھ سکے اور ہر دفعہ صبر و ضبط کھو بیٹھے۔ آخر حضرت خضر نے کہا۔ بس جناب! هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ۔ اپنے اعتراضوں کے جواب سُنیے اور تشریف لے جائیے۔ میرا آپ کا ساتھ ممکن نہیں ہے۔

اس قصے کو بیان کرنے سے اللہ کا یہ منشا معلوم ہوتا ہے کہ اُن باتوں پر عقل خرچ کیا کرو جن پر عقل خرچ کرنے سے فایدہ ہو، ایسی بحثوں میں پھنسنا جنھیں بڑے بڑے اہلِ علم نہیں سلجھا سکتے ہم عوام کے لیے مضر ہے۔ حضرت موسیٰ کو تو حضرت خضر کے ذریعے سمجھا دیا گیا تھا کہ آپ اپنی لائن کی باتوں سے غرض رکھیے۔ ہمیں حضرت خضر کا واقعہ پڑھ کر جان لینا چاہیے کہ ہر شخص ہر بات کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا، حتیٰ کہ حضرت موسیٰ جیسے جلیل القدر

رسول حضرت خضر کی لاجک کی باتیں نہیں سمجھے تھے۔

قرآن پر ایمان لانے سے پہلے جتنا غور و خوض کرنا ہو کر لیجیے، اور قرآن پر ایمان لانے کے بعد بھی قرآن غور و خوض کی دعوت دیتا ہے، لیکن اپنی عقل کی بابت زیادہ خوش گمانی مت کیجیے۔ انسانی عقل ہمیشہ یکساں نہیں رہتی۔ ذرا سا بخار چڑھ جاتا ہے تو دماغ کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ بعض اوقات انسان غور پر غور کرتا ہے اور عقدہ حل نہیں ہوتا۔

زندگی کیسے گزاریں

انسان تھوڑا سا اختیار پا کر اپنے آپ کو بالکل مختار سمجھنے لگا ہے۔ یہ مختار ہے کتنی بات میں۔ اسے فقط اتنا اختیار ملا ہے کہ دنیا کی جو چند روزہ زندگی ہے اس کو چاہے اللہ کے منشا کے مطابق گزارے، چاہے اللہ کی منشا کے خلاف گزارے۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔ زندگی بخشتے وقت انسان سے مشورہ نہیں مانگا جاتا کہ تجھے زندگی دیں یا نہ دیں اور زندگی ختم کرتے وقت بھی نہیں پوچھا جاتا کہ بتا تیری روح قبض کریں یا قبض نہ کریں۔ انسان پیدائش کے اعتبار سے اللہ کا اسی طرح تابعدار ہے جس طرح جماد، نبات اور حیوان تابعدار ہیں۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور موت کے معاملے میں بھی بڑا بڑا فرعون اور شداد كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ کا مصداق بن جاتا ہے۔ یوں تعمیل حکم کرتا ہے جیسے منھ بند مشکیزہ وہیں پانی ڈالتا ہے جہاں پانی ڈالنا ہوتا ہے۔ حیات مستعار میں نظام حیات کے ساتھ جتنی چاہے مشق سرکشی کر لیجیے اور حیات مستعار میں بھی بے شمار چیزیں ہیں جن پر انسان کا قابو نہیں ہے، مثلاً سونا، جاگنا۔ کھانا، پینا، پیشاب، پاخانہ۔

تھوڑا سا اختیار پا کر انسان عجیب مخمصے میں پھنس گیا ہے۔ اختیار کی نعمت سے فایدہ کم انسان اٹھاتے ہیں، زیادہ انسانوں نے اس نعمت کو زحمت سے بدل لیا ہے۔

انسان میں اور باقی مخلوقات میں ایک تو اختیار اور بے اختیاری کا فرق ہے، دوسرا فرق یہ ہے کہ تمام مخلوقات سیکھی سکھائی جنم لیتی ہے اور انسان جو کچھ سیکھتا ہے جنم لینے کے بعد سیکھتا ہے۔ دودھ پینے والے جانور پیدا ہوتے ہی ماں کے تھنوں کی طرف لپکتے ہیں۔ بکری گوشت کے قریب نہیں جاتی۔ بلی گھاس نہیں کھاتی۔ خشکی کے جانور خشکی میں غذا تلاش کرتے ہیں اور پانی کے جانور پانی میں غذا ڈھونڈتے ہیں۔ انسان کا منھ ماں کی چھاتی

کے پاس لے جایا جاتا ہے۔ انسان سے کہا جاتا ہے کہ "چاقو رکھ دو، ہاتھ کٹ جائے گا۔" "جھکو نہیں، گر پڑو گے۔" "آگ سے دُور رہو، جل جاؤ گے۔" بغیر کہے اور بغیر بتائے انسان خیر و شر میں تمیز نہیں کر سکتا۔ جانوروں میں خیر و شر کا احساس ہے، لیکن انسانی فطرت کی نشوونما ہدایتیں دے کر کی جاتی ہے۔ انسان کی ذہنیت ہدایتوں پر عمل کرنے اور نہ کرنے سے ڈھلتی ہے۔ بے اختیار مخلوق کو سکھانے کا طریقہ اور ہے اور ذی اختیار انسان کو سکھانے کا طریقہ اور۔ خاک کے ذرّوں کو انسانی شکل دینے سے قبل اور طریقے سے راہ طے کرائی جاتی ہے اور انسانی شکل دینے کے بعد اور طریقے سے۔ تربیت بہر حال خاک کے ذرّوں کی بھی اللہ کرتا ہے اور انسان کی بھی اللہ کرتا ہے۔ اللہ جس طرح گھن کھائے بیج کو بیج کی منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا اُسی طرح اگر انسان اختیار کا غلط اور اندھا دُھند استعمال کر کے اپنے اندر گھن لگا لیتا ہے تو انسان منزلِ مقصود سے محروم رہ جاتا ہے۔

بیج بھی برباد انسان کے ہاتھوں ہوتا ہے اور اپنے آپ کو برباد کرنے کا ذمہ دار بھی انسان ہے۔ انسان بیج کو بوئے نہیں، یا بوئے اور پانی، ہوا، سورج کی روشنی اور سورج کی تمازت متناسب اور متوازن نہ پہنچائے تو بیج گھنیا کر یا گل سڑ کر مٹی میں مٹی ہو جائے گا۔ علیٰ ہذا انسان اللہ کے ضابطوں قاعدوں کے مطابق مراحل حیات طے نہ کرے تو انسان کی بربادی یقینی ہے۔ جس طرح گھن کھایا اور گلا سڑا بیج پھل پھول نہیں لا سکتا اسی طرح گھن کھایا اور گلا سڑا انسان پھل پھول نہیں لاتا۔ انسان کو تناسب اور توازن کی بیج سے بڑھ کر ضرورت ہے۔ تناسب اور توازن اسلام ہے اور عدم تناسب اور عدم توازن خلاف اسلام۔ انسانیت تناسب اور توازن ہی سے نکھر سکتی ہے اور بلندی کی طرف جا سکتی ہے۔ اسلام کا خدا ذِی المَعَارِج ہے، بلندی کی طرف لے جانے والی سیڑھیوں کا مالک۔ خدا عمل صالح کرنے والوں کو بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ۔ یعنی انسان کو سربلندی عملِ صالح کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔

کسی کو بغیر مقصد کے نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ ہر شے کی پیدائش کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے اور ہر شے کی کوئی نہ کوئی منزل ہے جہاں اُسے پہنچنا ہے۔ گھن کھایا بیج اس لیے ہے کہ مٹی میں مل کر مٹی ہو جائے۔ اچھا بیج اس لیے ہے کہ پھل پھول لائے۔ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ کائنات کی دوسری چیزیں تو بلا مقصد اور بلا منزل نہ ہوں اور انسان بلا مقصد اور

بلا منزل ہو اسے عقل نہیں مانتی ۔ جماد ۔ نبات اور حیوان اپنی اپنی صلاحیتوں سے کام لے سکیں اور اپنی اپنی منازل پر پہنچ سکیں اور انسان کی صلاحیتوں کے ابھارنے اور ترقی دینے کا ربِّ کائنات بند و بست نہ فرمائے، اسے کیوں کر مان لیا جائے ۔ اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَ اِنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَۃ ۔ اے انسانو! دنیا کی ہر شے کا مقصد پیدائش یہ ہے کہ تمھارے کام آئے اور تمھارا مقصد پیدائش حیات آخرت ہے ۔ تم دنیا میں مٹ مٹا کر نہیں رہ جاؤ گے ۔ تمہیں مر کر مستقل زندگی ملے گی، اور تم نے اگر دنیا میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ اللہ کے احکام کے مطابق عمر بسر کی ہے تو اللہ تعالیٰ تمھارے درجات عالمِ آخرت میں اونچے فرمائے گا، اور تم طاغوتی نظاموں کے ماتحت اپنے ہم جنسوں کو کچلتے رہے ہو تو تمھارا حشر فرعون اور شداد جیسا ہوگا ۔

ایک آیت اور نماز

نماز کتنی ضروری اور اہم عبادت ہے، میدانِ جنگ میں بھی تو معاف نہیں کی گئی ۔ ارشاد ہے :- (اے رسول! میدان جنگ میں) جب تم مسلمانوں کے ساتھ ہو اور انھیں نماز پڑھانے لگو تو (یہ چاہیے کہ) ایک جماعت مسلمانوں کی تمھارے پیچھے (نماز پڑھنے) کھڑی ہو جائے اور (نماز پڑھنے والے نماز پڑھتے وقت اپنے ہتھیار پاس رکھیں ۔ پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو تمھارے پیچھے سے ہٹ جائیں اور دوسری جماعت (اُن کی جگہ) آ جائے (یعنی وہ) جنھوں نے نماز نہیں پڑھی ہے ۔ (اب) وہ تمھارے پیچھے نماز ادا کریں اور اپنے بچاؤ کے سامان اور اپنے ہتھیار پاس رکھیں ۔ کافر چاہتے ہیں کہ تم ہتھیاروں اور سازوسامان سے غفلت کرو تو تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں ۔ (سورہ ۴ - آیت ۱۰۲)

ایسے خطرناک موقع پر بھی نماز نہیں چھوڑی جا سکتی ۔ روزہ رکھنا بھی میدانِ جنگ میں فرض ہے ۔ لیکن میدانِ جنگ میں روزہ رکھنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا نماز پڑھنا مشکل ہے ۔ اس سے نماز کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے ۔

عوام کا فیصلہ

سیٹھ جگت نرائن اور مسٹر سہراب مودی میں ایک سودا ہو رہا تھا جگت نراین کا دلّی

میں سینما ہے جہاں فلم دکھائے جاتے ہیں اور سہراب مودی بھارت کے مشہور فلم ساز ہیں۔ جگت نراین کسی پکچر کے سوا لاکھ رُپے دینے چاہتے تھے اور سہراب مودی دو لاکھ مانگ رہے تھے۔ سودا نہیں نپٹتا تھا۔ آخر سہراب مودی نے فیصلہ کیا کہ پکچر میں خود دکھاؤں گا۔ پہلا شو شروع ہوا۔ جگت نراین اور سہراب مودی برابر بیٹھے تھے۔ یکایک سہراب مودی اُٹھے اور منھ پر کپڑا لپیٹ کر چار آنے والے درجے میں جا بیٹھے۔ شو کے بعد جگت نراین نے کہا، مجھے دو لاکھ دینے منظور ہیں۔ سہراب بولے، اب تین لاکھ لوں گا۔ جگت نراین نے پوچھا، یہ کیوں؟ جواب دیا، چار آنے والوں نے اُسے پاس کر دیا ہے۔

حکومتوں کی کامیابی اور ناکامیابی بھی چار آنے والوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کسی حکومت کے متعلق ادنیٰ طبقے کی رائے اچھی ہے تو اُسے کوئی نہیں ہلا سکتا اور ادنیٰ طبقہ جس حکومت سے بیزار ہے اُسے کوئی باقی نہیں رکھ سکتا۔

اورنگ زیبؒ کے جانشین

حضرت اورنگ زیب علیہ الرحمۃ کے جانشین عیش و عشرت میں پڑ گئے تھے اور ملک کا دولت مند طبقہ بادشاہوں کی تقلید اور نقل کر رہا تھا[1]۔ اور زوال سر کے اوپر منڈلا رہا تھا، لیکن زوال تیزی سے نہیں ہوا۔ اتنے عرصے تک مسلمان یہاں حکومت کیسے کرتے رہے اور پھر مسلمان حکومت کے زوال کی رفتار سست کیوں تھی، وجہ یہی ہے کہ مسلمان حکومت سے غربا کا طبقہ کبھی اور کہیں بیزار نہیں رہا۔

زوال کے دَور میں بھی بعض مسلمان حاکم ایسے تھے جیسے سلطان حیدر علی اور ٹیپو سلطان اور مظفر شاہ حلیم۔

سلطان حیدر علی اور ٹیپو سلطان کو آپ جانتے ہیں، مظفر شاہ حلیم کا نام ممکن ہے نہ جانتے ہوں۔ مظفر شاہ حلیم گجرات کا حکمراں تھا، اس کا صرف ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیے:

---

[1] دولت مند بادشاہوں کی تقلید اور نقل ہی کیا کرتے ہیں، بادشاہوں کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ تکلیف اور بے چینی ہمیشہ غربا کا طبقہ محسوس کرتا ہے۔

گجرات کا ایک حکمران

صوبہ گجرات اور صوبہ مالوہ دونوں مسلمانوں کے زیر نگیں تھے۔ لیکن دونوں کی بنتی نہیں تھی۔ مالوے والے عموماً گجرات پر چڑھ دوڑتے تھے۔ لیکن ایک وقت آیا کہ مالوہ کمزور ہو گیا۔ مالوے کے ہندو وزیر نے مسلمان بادشاہ کو الگ بٹھایا اور ہندو گردی کرنے لگا۔ مظفر شاہ حلیم اُس وقت گجرات کا بادشاہ تھا۔ مالوے میں اسلامی شعائر کے مٹنے اور کفریہ رسموں کے فروغ پانے کی اطلاع اسے پہنچی تو اس سے نہ رہا گیا، گجرات کے مسلمان بادشاہ کو ہندو وزیر کے پنجے سے چھڑانے روانہ ہو گیا۔ ہندو وزیر نے راجہ رانا سانگھا کو پکارا کہ میری مدد کو آؤ۔ رانا سانگھا راستے ہی میں تھا کہ مظفر شاہ حلیم نے پہلے اس کی خبر لی اور پھر مالوے پہنچا اور مالوہ فتح کر لیا۔

مالوہ کی حکومت کے پاس دولت بے تحاشا تھی۔ جب مظفر شاہ حلیم اور اس کے ساتھی قلعہ کے اندر گھسے تو وہ دولت نظر آئی۔ ساتھیوں نے مظفر شاہ حلیم سے عرض کیا: حضور! یہ نہ کیجیے گا کہ ہندو وزیر کو ہٹا کر واپس چلے جائیں۔ اتنا سرسبز و شاداب ملک چھوڑنا نہیں چاہیے۔ مظفر شاہ حلیم فوراً قلعہ سے باہر آگیا اور بادشاہ مالوہ کو کہلا بھیجا کہ اس قسم کا انتظام کر دو کہ میرے ساتھی قلعہ کے اندر قدم نہ دھر سکیں۔ بادشاہِ مالوہ نے درخواست کی کہ آپ تو قلعہ میں تشریف لا کر آرام کریجیے۔ فرمایا میں نے تمہاری مدد اللہ کی خوشنودی کے لیے کی ہے، قلعہ کے کرّ و فر سے کہیں میری نیّت نہ بگڑ جائے، میں باہر ہی آرام کر دوں گا۔

ہمارے مطلق العنان، فرماں رواؤں کا اس قسم کا کیرکٹر تھا، غربا اس قسم کا کیرکٹر دیکھ کر اُن فرماں رواؤں کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔

ایک راجہ کا انصاف

میرے ایک دوست ہیں، پیرزادہ لطیف الرحمٰن صدیقی۔ بہت دن ریاست کوٹہ بوندی میں رہے ہیں۔ اکثر ریاست کے واقعات سنایا کرتے ہیں۔ آج مالدہ اور مرشد آباد سے مسلمانوں کے بھاگ بھاگ کر پاکستان آنے کا ذکر چھڑا تو صدیقی صاحب

نے ریاست کی مندرجہ ذیل داستان بیان کی۔ وہ وہاں سب اوورسیر تھے۔ کہنے لگے۔
مہاراجہ اُمید سنگھ نے حکم دیا کہ فلاں پہاڑ پر ایسی سڑک نکالی جائے کہ ہم اِدھر سے اُدھر بآسانی جاسکیں۔ دوسری طرف سیرگاہ تھی، جہاں بڑا چکر کھا کر جایا جاتا تھا۔ سڑک تیار ہوگئی تو مہاراج اور اُن کے مصاحب اُس جگہ آئے جس جگہ میں نے سڑک بنوانے کے زمانے میں اپنا ڈیرہ کھڑا کر رکھا تھا۔ بولے۔ بابو! تو بھی ساتھ چل۔ شوفر نے فوراً دروازہ کھولا اور میں شوفر کے برابر جا بیٹھا۔ خیر سیرگاہ میں جو جشن ہوا، اُس کا بیان مقصود نہیں ہے، بتانا یہ ہے کہ راجہ نواب جو اتنے بدنام تھے، انھیں اپنی رعایا کے دُکھ کی خبر ہو جاتی تھی تو پھر اُن کا عمل کیا ہوتا تھا۔ مہاراجہ سیرگاہ سے جب واپس ہونے والے تھے تو انھوں نے دیکھا، دور کوئی گنوار ہاتھ جوڑے کھڑا ہے اور چیخ رہا ہے "حجور! تیرے سپاہی مجھے تیرے کریب نہیں پہنچنے دیتے۔" مہاراجہ نے بلا کر پوچھا۔ کیا بات ہے۔ اس نے عرض کیا۔ میری عورت کو فلاں شخص لے بھاگا ہے۔ سال بھر سے تھانہ، تحصیل سب کچھ کر رہا ہوں۔ کہیں سنوائی نہیں ہوتی۔ آج تیرے راج کا اندھیر تجھ پر ظاہر کر کے میں تیری ریاست سے جا رہا ہوں اب تیری ریاست کا پانی بھی نہیں پیوں گا۔

پہاڑ کے دوسری طرف سیرگاہ سے ذرا آگے ریاست کوٹہ بوندی کی سرحد تھی۔
مہاراجہ نے فرمایا۔ جہاں سال بھر صبر کیا ہے تین دن اور صبر کر۔ ہم تین دن میں تیری عورت تجھے نہ دلائیں تو چلا جائیو۔

گنوار نے مہاراجہ کو تین دن کی مہلت دے دی۔ مہاراجہ نے صدیقی صاحب کو حکم دیا۔ بابو! اسے اپنے ہاں رکھ۔ جانے نہ پائے۔ مہاراجہ کو اُن تمام افسروں کے نام معلوم ہو ہی چکے تھے جن سے گنوار نے مدد مانگی تھی اور مدد نہیں ملی تھی اور اس شخص کا نام پتہ بھی معلوم ہو چکا تھا جس نے اُس کی بیوی کو بھگایا تھا۔ مہاراج نے دن رات ایک کر دیا، افسروں کو جامنوں کی طرح ہلا ڈالا اور تیسرے دن عورت کو لے کر صدیقی صاحب کے ڈیرے پر آموجود ہوئے۔ گنوار سے کہا۔ پہچان یہی ہے تیری عورت۔ اُس نے عرض کیا۔ ہاں جی، یہی ہے۔ اس کے بعد مہاراج نے عورت سے کہا۔ بول، تو اِس کے ساتھ رہنا چاہتی ہے یا دوسرے مرد کے ساتھ۔ ہم نے تیرے مرد سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا ہو گیا، لیکن رہنا نہ رہنا تیرے اختیار میں ہے۔ ہم عورت کو اُس کی مرضی کے

خلاف مجبور نہیں کر سکتے۔

عورت نے کہا۔ مہاراج! میں اس کے ساتھ رہوں گی۔ مہاراج نے مرد سے فرمایا۔ تیری عورت یوں بھاگی تھی کہ تو اسے مارتا تھا۔ آیندہ مار یو مت۔ لے یہ تھوڑے سے رُپے ہیں۔ ان سے اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کر۔ پھر مہاراجہ نے صدیقی صاحب سے کہا۔ اس کا کہنا کہ تیرے راج میں اندھیر ہے اور تیری ریاست کا پانی نہیں پیوں گا۔ مجھے بے حد چُبھا تھا۔ میں تین رات سویا نہیں، مگر آج بہت خوش اور بشاش ہوں۔

چلتی پھرتی چھاؤں

دلّی کی خواتین کہا کرتی تھیں کہ انسان مُردے کو بیٹھ کر روتا ہے اور پیسے کو کھڑا ہو کر۔ یعنی کھاتے پیتے انسان پر تنگ دستی آجاتی ہے تو اُس کا پیمانہ صبر چھلک جاتا ہے اور اس کا صدمہ چھپا نہیں رہتا۔ مگر میں نے متعدد آدمی دیکھے ہیں جو میرے دیکھتے دیکھتے کہیں سے کہیں پہنچے اور پھر مفلس ہو گئے تو انھوں نے اس کی پرواہ نہیں کی۔

ایک صاحب تھے۔ نام بھول گیا ہوں۔ خواجہ حسن نظامی صاحب کے ہاں اُن کی زیارت ہوتی رہتی تھی۔ پھر وہ بمبئی چلے گئے۔ وہاں اُنھوں نے کس طرح ترقی پائی۔ یہ قصہ خاصا دلچسپ ہے۔

باشندے پنجاب کے تھے، مگر بالکل غیر وجیہہ۔ قد معمولی۔ صورت شکل یوں ہی سی۔ بے پڑھے لکھے تھے۔ کسی اعتبار سے اچھے نہیں تھے۔ لیکن ملاحظہ فرمائیے، اللہ نے انھیں طبیعت اور قسمت کیسی دی تھی۔ انھیں دھندے کی تلاش ہوئی، وطن میں دھندا نہ ملا تو بمبئی کا رُخ کیا۔ بمبئی کی بابت سُنا تھا کہ وہاں کام ضرور مل جاتا ہے، مگر بد قسمتی سے وہ وہاں بھی مدتوں ڈھونڈاتے پھرے۔ حتیٰ کہ سو پچاس رُپے جو لے گئے تھے ختم ہوئے اور جیب میں فقط دو آنے رہ گئے۔ ٹھہرنے کا ٹھکانا نہیں تھا، دن بھر اِدھر اُدھر کا گشت لگاتے تھے اور رات کو پٹڑی پر سو جاتے تھے۔

جس دن دو آنے باقی تھے اُس دن اُن کا جی چاہا کہ کھیرا کھاؤں، لیکن اللہ تعالےٰ نے فوراً سمجھایا کہ سارے رُپے ختم کر چکے ہو، دو آنوں کو بھی نیگ لگا دیا تو بھیک کا پیالہ ہاتھ میں لینا پڑے گا۔ تمھیں پتنگ بنانی آتی ہے، دو آنے کا کاغذ خرید داور کھپچیاں جنگل

سے چنے لاؤ، اور پتنگیں بنا کر بیچو۔ چناں چہ اُن صاحب نے یہی کیا اور اللہ نے اُن کی جیب میں دو آنے کے بدلے دس آنے کر دیے۔ اب انھوں نے سب سے پہلے دو آنے کے کھیرے کھائے اور باقی کھانے پینے کی اُس دن چھٹی کی، اور آٹھ آنے کا کاغذ خریدا۔ اور یہ سلسلہ چل پڑا، یہاں تک کہ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو جیب میں اتنا روپیہ تھا کہ ٹاٹ کی بوریاں فراہم کرنے کا ٹھیکہ لے لیا۔ اُس کے بعد دوسری چیز کا ٹھیکہ، پھر تیسری کا، پھر چوتھی کا۔ کاروبار اس قدر بڑھا کہ اُن کے کارندے دلی کے سب سے بڑے ہوٹل (میڈنز) میں ٹھہرتے تھے اور ٹھیکے دینے والوں کی خاطر مدارات میں لاکھوں روپے ماہوار خرچ کرتے تھے۔ بیگم بھوپال حمید اللہ خاں کو بھوپال کی گدی دلوانے لندن گئی ہیں تو اُن صاحب کے ایک کارندے بیگم صاحبہ کے ساتھ تھے تاکہ وہ بھی اپنے اثر و رسوخ سے مدد دیں، لیکن اُن صاحب نے اپنی زندگی نہیں بدلی۔ دفتر کے باہر دسیوں موٹر کاریں حاضر رہتی تھیں کہ جس کارندے کو کسی جگہ بھیجنے کی ضرورت ہو اُسے موٹر میں بھیجیں مگر وہ صاحب خود پیدل پھرتے تھے۔ فرش پر چٹائی بچھا کر سوتے تھے۔ موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے تھے اور معمولی کھانا کھاتے تھے۔ اللہ کے بھید اللہ ہی جانے۔ اُدھر جنگ ختم ہوئی، اِدھر کارندوں نے اُن کا دیوالہ نکلوا دیا۔ دوسری جنگِ عالمگیر کے زمانے میں اُن صاحب نے میرے مکان کے قریب چھوٹا سا کھنڈر لے رکھا تھا اور قطعی بے کار تھے۔ پیسہ نہ رہنے کا اُنھیں مطلق ملال نہیں تھا۔ وہ اِسے سوچتے ہی نہیں تھے کہ میں کبھی عظیم دولت کا مالک رہا ہوں، اور کیا تھا کیا ہو گیا۔ جیسے جاگتے میں نہیں، خواب میں دولت مند رہے ہوں، یا ڈرامے میں دولتمند کا پارٹ ادا کیا ہو —— یہ بھی میں کہتا ہوں، وہ نہیں کہتے تھے۔ اُن کا دماغ اب بھی کاروباری نکتے پیدا کرتا تھا، لیکن دوبارہ کاروبار جمانے کا ارادہ نہیں تھا۔

میرا خیال ہے، اُن کے اطمینان کی وجہ فقط اتنی تھی کہ انھوں نے دولت کے آنے کا اثر نہیں لیا تھا، لہٰذا دولت کے جانے کا بھی اثر نہیں لیا۔ وہ دیندار مسلمان تھے اور بے پڑھے ہونے کے باوجود انھیں حضرت خالد بن ولید کا واقعہ معلوم تھا کہ حضرت عمر فاروق رضؓ نے سپہ سالار سے ادنیٰ سپاہی بنا دیا لیکن حضرت خالدؓ کے جوشِ جہاد میں فرق نہیں پڑا۔ اُنھیں اس واقعے کا بھی علم تھا کہ حضرت کعب رضؓ سے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے حکم کی تعمیل میں تمام صحابہ نے بولنا چھوڑ دیا۔ اُن کی بیوی تک میکے چلی

گئیں۔ اس کی خبر حاکم غسان کو پہنچی تو اُس نے حضرت کعب کو خط لکھا کہ "مسلمان تم سے عدم تعاون کر رہے ہیں۔ تم یہاں آ جاؤ، یہاں تمہارے ساتھ عزت کا سلوک کیا جائے گا۔" حضرت کعب نے خط قاصد کے سامنے ہی نذرِ آتش کر دیا، اور فرمایا، عیسائی کی مہربانی سے میرے آقا کی خفگی بہتر ہے۔

اُن صاحب نے دولت پانے کے بعد عیش و عشرت کی زندگی اختیار کر لی ہوتی تو وہ بھی مفلس ہو جانے کو برداشت نہ کرتے اور اس ٹائپ کا اُن کا کیرکٹر ہو جاتا کہ حاکم ہیں تو ملک سے بھی دلچسپی ہے اور قوم سے بھی دلچسپی ہے، اور حاکم نہ رہے تو یورپ میں جا بسے، یا ملک میں ٹھہرے تو ملک و قوم کی جڑیں کاٹنے لگے۔ اُن صاحب نے عیش و عشرت کا مزا نہیں چکھا تھا، اُن کے مُنھ کو یہ خون نہیں لگا تھا۔

افتراق اور مرکز

آجکل ساری قومیں مسلمانوں سے زیادہ متحد ہیں، اتحاد نہیں ہے تو صرف مسلمانوں میں نہیں ہے، حالاں کہ اتحاد کی تعلیم جتنی مسلمانوں کو دی گئی ہے اتنی کسی اور قوم کے ہاں نظر نہیں آتی۔ قرآن مجید صاف صاف کہتا ہے: "جھگڑے مت اُٹھاؤ، جھگڑے اُٹھاؤ گے تو بزدل ہو جاؤ گے اور تمھاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔" ہوا جب قائم رہ سکتی ہے جب قوم کسی مرکز سے وابستہ رہے۔ نماز میں خانہ کعبہ کی طرف مُنھ کرنے کا حکم دے کر اللہ تعالیٰ نے فوراً فرمایا: "یہ (کوئی اہم اور) نیکی (کی بات) نہیں ہے کہ تم نے (نماز میں) اپنا مُنھ مشرق کی طرف کر لیا یا مغرب کی طرف کر لیا (کیوں کہ اللہ تو ہر طرف موجود ہے) جدھر تمھارا مُنھ ہوگا اُدھر اللہ ہوگا۔ مشرق بھی اللہ کا ہے اور مغرب بھی اللہ کا ہے۔" حقیقی مقصد و منشا یہ تھا کہ خانہ کعبہ حکومتِ الٰہیہ کا مرکز بنے، اور اسلامی نظام اُس مرکز کے گرد گھومے۔ چند چیزیں جو ایک قوم کو دوسری قوم سے ممیّز کرتی ہیں، اُن میں اہم ترین چیز قوم کا مرکز ہے۔ جس طرح قوموں کے جھنڈے مختلف الانواع ہوتے ہیں اُسی طرح قوموں کے مرکز الگ الگ ہوتے ہیں۔ خانہ کعبہ کو مسلمانوں کا مرکز مکّے کے قیام کے زمانے میں مقرّر نہیں کیا گیا تھا۔ اُس وقت وہ مشرکین کا مرکز تھا، مشرکوں سے مشابہت کیسے کی جاتی، لیکن مدینے میں مشرکوں کی مشابہت کا سوال نہیں رہا، یہودیوں کی مشابہت

سامنے آگئی، اس لیے مدینے پہنچنے کے بعد یہودیوں کی مشابہت ترک کی اور بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کو مرکز قرار دے دیا۔ مرکز کی اہمیت کیا ہے، اسے آپ خلافتِ ترکی کے خاتمے سے بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ قسطنطنیہ کی مرکزیت بالکل بے جان اور برائے نام تھی، اُسے مکۂ معظمہ کی مرکزیتِ قدیم سے ایک بٹے لاکھ کی نسبت بھی نہیں تھی، تاہم قابو یافتہ قوموں کو وہ بھی گوارا نہ ہوئی اور قابو یافتہ قوموں نے ترکوں کو مجبور کر دیا کہ خلافت اور مرکزیت کا خاتمہ کر دیں۔

مولانا محمد علی مرحوم نے ایک دفعہ کہا تھا: "کعبۃ اللہ کی حفاظت ہمارا سب سے بڑا اور آخری فرض ہے۔ اس کے بچانے کے لیے ہمیں اپنی جانیں قربان کرنی ہیں۔ جب ہمارے مرکز پر حملے کی تیاری ہے اور ہمارا قبلہ ہی خطرے میں پڑ رہا ہے تو ہم یہاں سے ہجرت کر کے گرتے پڑتے اُس کی حفاظت کو جا پہنچیں گے۔ اپنے گھر ویران کر دیں گے تاکہ اللہ کا گھر محفوظ رہے۔ یہاں کی مسجدوں میں تالے ڈال جائیں گے تاکہ مسجدِ اعظم کی رونق اور بہار میں فرق نہ پڑنے پائے۔"

اسد ملتانی مرحوم کا شعر ہے ؎

وجود ہی نہیں رہ سکتا ایسی ملّت کا
جو اپنے مرکزِ اصلی سے انحراف کرے

آج بھی مسلمانوں کی سلطنتیں اگر مرکز کی اہمیت کو سمجھ لیں تو اُن کی قوت کہیں سے کہیں پہنچ سکتی ہے، لیکن جُوں جُوں مسلمان بادشاہوں کی تعداد بڑھ رہی ہے وُوں وُوں مسلمانوں کی قوت گھٹتی جاتی ہے اور مسلمان تتر بتر ہوتے جاتے ہیں۔

مسلمانوں کو روزانہ پانچ بار یہ سبق دوہروایا جاتا ہے کہ امیر اور غریب کا امتیاز بھول جاؤ اور کھوے سے کھوا ملا کر کھڑے ہو، ایک دوسرے کے درمیان خلا نہ چھوڑو، صفیں سیدھی رکھو اور سیسہ پلائی دیوار بن جاؤ۔ حج کا لباس ایک ہے۔ اس واحد لباس کے پہنے بغیر حج نہیں ہو سکتا۔ نماز، حج اور احرام سے بڑھ کر اور کون سے ثبوت چاہئیں، جن سے یقین آئے کہ اللہ مسلمانوں کو متحد الوضع اور متحد العمل دیکھنا چاہتا ہے۔ قرآنی احکام اس قسم کے ہیں کہ مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو اُن میں صلح کرا دو، اور جو جماعت صلح پر آمادہ نہ ہو اور دوسری جماعت سے برسرِ پیکار رہے اُسے بزورِ شمشیر ٹھیک کر دو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کے آگے جھک جائے پھر دونوں جماعتوں میں

منصفانہ صلح کراؤ۔ گویا جھگڑالو مسلمان اُس سلوک کے مستحق ہیں جو اللہ کی حکومت میں روڑے اٹکانے والے کفار سے کیا جاتا ہے۔

مذہب بیر رکھنا ہرگز نہیں سکھاتا، جتنا بیر آپ پالتے ہیں، یہ نفسانیت کا کرشمہ ہے مذہب نے تو مسلمانوں پر مسلمانوں سے اتحاد رکھنا فرض کیا ہے اور متفرق و منتشر ہو کر اور فرقوں میں بنٹ کر اتحاد اور یک جہتی کھو دینے کو مثل شرک کہا ہے، یعنی ناقابلِ معافی گناہ۔ ارشاد ہے: (اے مسلمانو!) تم کہیں مشرکوں جیسے نہ ہو جانا جنھوں نے اپنے دین کو ذاتی خواہشات کی خاطر پسِ پُشت ڈال دیا اور ہوس پرستی میں دین کے پرخچے اُڑا دیے اور گروہ گروہ ہو گئے۔

آپ شاید کہیں کہ پھر اسلام میں اتنے فرقے کیسے ہیں، اور حضورؐ کا ارشاد بھی تو ہے کہ میری امت تہتّر فرقوں میں بنٹ جائے گی، تو جناب! کم از کم مذہبی فرقوں کے متعلق میرا ایمان ہے کہ جن بزرگوں سے مذہبی فرقے منسوب ہیں، اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی اُمّت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ سوچنے اور غور کرنے میں اختلاف ہوا کرتا ہے، ایسا اختلاف تو رحمت ہے۔ اس اختلاف کو مخالفت کی شکل اہلِ غرض نے دے دی ہے، ورنہ فروعی اختلافات میں مخالفت کا کیا کام، اور اصولی اختلافات ہیں ہی نہیں۔

خلیفہ ہارون الرشید عبّاسی امام مالکؒ کا متبع اور مقلد تھا اس نے ارادہ کیا کہ فقہ مالکی کی اتباع اور تقلید پوری مملکت پر لازم کر دے۔ حضرت امام مالک زندہ تھے۔ انھوں نے اُسے روکا اور فرمایا "خبردار، ایسا ہرگز مت کرنا!"

پھر تہتّر فرقوں والی حدیث یا پیشین گوئی میں یہ بھی تو ہے کہ سوائے ایک کے تمام فرقے جہنم میں جائیں گے یعنی اس افتراق کی سزا ملے گی۔ کُلُّھُمْ فِی النَّارِ عربی زبان کا محاورہ ہے جو شے کے غلط اور ناقابلِ قبول ہونے کی صورت میں بولا جاتا ہے، جیسے اُردو زبان کا محاورہ ہے "چولھے میں جھونکو"۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ایک کے سوا تمام فرقے مستقل طور سے جہنمی ہوں گے۔ مولانا شاہ عبدالعزیزؒ نے امام غزالیؒ کا بیان نقل کیا ہے کہ فرقہ ناجیہ کے ساتھ یہ امتیازی سلوک ہوگا کہ اُسے اَدنےٰ سے اَدنےٰ عذاب بھی نہیں دیا جائے گا۔ برخلاف اس کے باقی فرقے عذاب بھگت کر جنت میں

پہنچیں گے۔ جنّت سے محروم کسی فرقے کا مسلمان نہیں رہے گا۔

آج ہر فرقہ صرف اپنے آپ کو ناجی اور جنتی سمجھتا ہے اور باقیوں کو جہنمی بتاتا ہے، لیکن صحابہؓ کرام نے اختلاف رکھنے والے صحابہ کو جہنمی کبھی نہیں کہا، اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تو فرماتے ہیں کہ "صحابہ اختلاف نہ کرتے تو دین میں تنگی محسوس ہوتی۔ صحابہ نے عمل کی متعدد راہیں کھول دی ہیں، اُن میں سے جس کی پیروی کرو جائز ہے۔"

بعض علمائے سلف کے نزدیک ادنیٰ سے ادنیٰ عذاب کے بغیر جنت پانے والے فرقے سے مراد کوئی واحد فرقہ نہیں ہے، بلکہ واحد ذہنیت ہے۔ یہ ذہنیت کسی ایک فرقے کی ہے تو وہ ناجی ہوگا، اور یہ ذہنیت افراد کی ہے تو وہ ناجی ہوں گے۔ افراد اس فرقے کے ہوں یا اُس فرقے کے، اور افراد اپنی جماعت بنائے ہوئے ہوں یا جماعت نہ بنائے ہوئے ہوں اُنھیں فرقہ ناجی قرار دیا جائے گا۔ ذہنیت کیا ہے۔ یہ کہ مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کو گناہ عظیم مانتا ہو، اور جس فرقے کو اختیار کرے نفسانیت سے اختیار نہ کرے اور اللہ کی خوشنودی کا ہمہ وقت خیال رکھے اور اللہ سے صراطِ مستقیم پہ چلانے کا دل سے طلب گار رہے۔

امام غزالیؒ نے تو حق کی ایسی حمایت سے بھی منع کیا ہے جس سے انسان ناحق جماعت کے ساتھ نفرت اور حقارت کا برتاؤ کرنے لگے۔ امام غزالیؒ لکھتے ہیں:
باطل فرقوں کی نمایاں علامت تعصّب ہے۔ جو افتراق کو ہوا دے اور قوم کے شیرازے کو بکھیرے وہ اہل باطل ہے اور جو اس نوع کا اختلاف کرے کہ اُس سے افتراق نہ ہو اور قوم کا شیرازہ نہ بکھرے وہ اہل حق ہے۔

اسلام میں جتنے فرقے بن چکے ہیں، اُنھیں مٹایا نہیں جا سکتا، اور نہ اُن کا مٹانا ضروری ہے۔ لہٰذا تمام فرقوں کو انگیز نا چاہیے اور تمام فرقوں کو مکاتب خیال (Schools of Thoughts) تصور کرنا چاہیے۔ کسی کو ہم خیال بنانا چاہو تو دوستوں اور بھائیوں کی طرح بناؤ۔

حرم پاک میں عنقریب تمام فرقوں اور تمام ملکوں کے مسلمان جمع ہونے والے ہیں۔ اُن کے پیشِ نظر حج کے وقت ضرور اسلام ہوگا، فرقہ اور ملک نہیں ہوگا۔ اسی کیفیت کی پرورش کرنی چاہیے، اسی کیفیت کو دوام ملنا چاہیے۔ فرقہ اور ملک یقیناً محبوب

چیزیں ہیں، لیکن اسلام سے فایق نہیں ہیں۔

تمام ارکان اسلام پکار پکار کر اتحاد کی تاکید کر رہے ہیں۔ ارکان اسلام یہی ہیں تاکہ اللہ کو واحد ماننے میں سب متحد ہو جاؤ۔ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی رسالت کے ماننے میں سب متحد ہو جاؤ۔ پانچ وقت نماز پڑھنے قریب کی مسجد میں جمع ہو۔ جمعہ کی نماز کے لیے اور زیادہ تعداد میں عیدگاہ پہنچو۔ اور حج کے وقت مختلف ممالک، مختلف رسوم و عادات اور مختلف ذوق کے مسلمان یک جا ہوں۔ زکوٰۃ امیرِ ملّت کو دو جو اُسے ساری ملّت کی فلاح و بہبود پر خرچ کرے۔ رمضان کے روزے رکھ کر کھانے پینے کے اوقات میں متحد ہو جاؤ۔ مگر افسوس ان تاکیدوں کی طرف مسلمان دھیان نہیں دیتے۔

حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

نعمتیں اور عذاب

ذرا غور تو کیجیے، قرآن پاک کی یہ آیت ہماری آجکل کی حالت پر کچھ صادق آتی ہے:

تم سے قبل جو اُمتیں گزری ہیں، اُن کے پاس بھی ہم نے پیغمبر بھیجے تھے، اور جب اُنھوں نے پیغمبروں کا کہا نہ مانا تو اُنھیں سختی اور صعوبت میں مبتلا کر دیا تاکہ (سختی اور صعوبت سے گھبرا کر ہی) وہ ہمارے سامنے گڑگڑائیں۔ جب ہمارا عذاب آیا تھا تو کیوں نہ گڑگڑائے کہ ہم عذاب کو دفع کر دیتے۔ اس وجہ سے نہیں گڑگڑائے کہ دل پتھر کے ہو گئے تھے اور جو بداعمالیاں کرتے تھے، شیطان نے اُن کی نظروں میں اُنھیں آراستہ کر دکھایا تھا۔ غرض جس مصیبت کو بھیج کر اُنھیں ہوشیار کیا گیا تھا اُسے وہ فراموش کر بیٹھے تو ہم نے مغالطے میں ڈالنے کے لیے اُن پر ہر نوع کی دنیاوی نعمتوں کا مینہ برسا دیا۔ حتےٰ کہ جو نعمتیں اُنھیں ملیں اُن سے وہ مست ہو گئے اور یکایک ہم نے عذاب میں دھر پکڑا۔ عذاب کا آنا تھا کہ بے آس ہو کر رہ گئے۔

مولانا حسن الدین خاموش

مولانا حسن الدین خاموش کا نام عرصہ دراز سے نہیں سُنا۔ خدا معلوم جیتے بھی ہیں۔

آخری مرتبہ جب دیکھا ہے تو ستر کے قریب عمر تھی۔ اس بات کو غالباً تیس برس ہو چکے۔

خاموش صاحب کا اصل وطن تو فتح پور ہسوہ تھا، لیکن کسی وجہ سے بھوپال میں رہنے لگے تھے۔ وہاں بالکل جنگل میں "خاموش بسیرا" بنا لیا تھا۔

عبدالنعیم خاں صاحب، مینیجر تاج کمپنی، ڈھاکہ بیان کرتے ہیں: میں ایک دفعہ مولانا سے خاموش بسیرے ملنے گیا۔ موجود نہیں تھے۔ کوئی بچہ نکلا۔ اس نے کہا۔ مولانا آجکل فتحپور میں ہیں۔ نعیم صاحب نے پوچھا۔ کب تک آجائیں گے۔ بچے نے کہا۔ پرسوں۔ نعیم صاحب نے مزید اطمینان کے لیے پوچھا۔ کیا پرسوں آنا یقینی ہے؟ بچے نے معصومیت سے کہا۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ آپ پرسوں شام کو تشریف لائیے۔

چناں چہ نعیم صاحب تیسرے دن شام کے وقت پہنچے۔ مولانا خاموش بیٹھے تھے۔

اس روایت سے آپ کی رُوح نے کچھ تازگی پائی؟

مولانا حسن الدین خاموش ایک زمانے میں خاصے مشہور اہلِ قلم تھے، اور جس طرح مولانا حسرت موہانی کا اہلِ سیاست میں خاص کیرکٹر تھا، اُسی طرح مولانا خاموش کا اہلِ قلم میں خاص کیرکٹر تھا۔

آجکل بازار میں اِس جنس کی مانگ نہیں ہے لیکن پچاس ساٹھ برس پہلے ہر شہر اور قصبے میں دو چار آدمی ایسے دکھائی دے جاتے تھے جو خیر القرون کی یاد تازہ کر دیتے تھے۔

نعیم صاحب نے یہ ۱۹۴۲ء کا واقعہ سنایا تھا "وہ جھوٹ نہیں بولتے"، کہنے والا بچہ اب خوب جوان ہو گا۔ اُمید ہے اُس نے مولانا خاموش کی تربیت کا ضرور اثر لیا ہو گا۔

خدا کے حکم کی تعمیل کرو

مسلمانوں کے ہاں ہر کام اللہ کا نام لے کر شروع کیا جاتا ہے، اور وہ جب اللہ کا نام لیتے ہیں اور بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کہتے ہیں تو اس سے پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بھی پڑھتے ہیں۔ یعنی راندۂ درگاہ شیطان سے بچانے کی درخواست پیش کرتے ہیں کہ الٰہی! ہمیں شیطان کے بہکائے سکھائے میں نہ آنے دیجو۔ کسی کے دل کے اندر شیطانی حرکتوں سے بچنے کا جذبہ نہ ہو تو اُسے اللہ راہِ ہدایت نہیں دکھاتا۔ میں اللہ کی بجائے غیر اللہ کا غلام بنا رہوں اور اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ

— اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ رٹتے جاؤں تو یہ متضاد اور مضحکہ خیز بات ہوگی۔ صراط مستقیم اِس طرح نہیں مل سکتی۔

بے شک قرآن مجید صراط مستقیم بتانے والی اور راہِ ہدایت دکھانے والی کتاب ہے ذَالِکَ الْکِتٰبُ لَارَیْبَ فِیْہِ۔ مگر قرآن مجید سے وہی فایدہ اُٹھا سکتے ہیں جو شیطانی حرکات کرنے سے خوف کھائیں اور نیکی کی طرف جن کی طبیعتیں رجوع ہوں۔ قرآن مجید ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ہے۔ قرآن مجید انھیں راہ ہدایت دکھاتا ہے جنھیں ہدایت قبول کرنا آتا ہے۔ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ کا مطلب ہے کہ اے اللہ! ہمیں ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت دے۔

دل سے اگر اس صلاحیت کے حصول کی خواہش کی جائے تو اللہ تعالےٰ ضرور عطا فرماتا ہے۔ اُس کا وعدہ ہے: وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔ جن میں ہم تک پہنچنے کی واقعی چینک ہو اُنھیں ہم اپنا راستہ ضرور دکھا دیتے ہیں۔

جس طرح کوئی شخص بہ یک وقت دو کشتیوں پر سوار نہیں ہوسکتا اسی طرح کوئی شخص بہ یک وقت دو بادشاہوں یا دو حاکموں کا حکم بردار نہیں رہ سکتا۔ میں زبان سے تو کہے جاؤں کہ مخلوق کے لیے زندگی گزارنے کے ضابطے قاعدے خالق ہی بنا سکتا ہے لیکن پابندی کروں مخلوق کے بنائے ہوئے ضابطوں قاعدوں کی، یوں مجھے کبھی فلاح اور کام یابی میسّر نہیں آئے گی۔ اور یہ اور بھی بُرا ہے کہ بعض معاملوں میں خالق کا حکم مانوں اور کثیر معاملوں میں مخلوق کا۔ اس سے تو ایک طرف ہو جانا اچّھا ہے۔ خالق کے ضابطوں قاعدوں کو اختیار کرنے کی خالی ذہنیت رکھ کر مسلمان اگر ہزار برس دنیا پر چھائے رہے تو اپنے ضابطوں قاعدوں سے سوڈیڑھ سو برس انگریزوں نے بھی ڈنکا بجالیا۔ وہ ایک طرف ہو گئے، اور ہم خالق و مخلوق دونوں کے ضابطوں قاعدوں سے آزاد ہو جانا چاہتے ہیں۔ یہ بہت خراب بات ہے۔ خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃ۔ سچّے مسلمان وہی ہیں جو صرف خالق کے احکام کی تعمیل کریں۔

احکام کی تعمیل

میں حکومت اور اقتدار کے نشے میں فرد واحد پر بھی اگر دھونس جماتا ہوں تو مجھے نمرود اور فرعون کی صف کا آدمی خیال کرنا چاہیے، لیکن فرد واحد مجھے پیٹھ پیچھے بُرا بھلا

کہتا ہے، جیسا کہ اہلِ حکومت اور اہلِ اقتدار کو عموماً کہا جاتا ہے تو اس کا شمار بھی بھائی کا خون پینے والوں کے ساتھ ہو گا۔

دونوں گناہوں کا فرق تو لیے نہیں۔ گناہ بہرحال دونوں ہیں۔ ہاں جس نے پہل کی ہے وہ بے شک بڑا ظالم ہے۔ اَلْبَادِیُٔ اَظْلَمُ۔ ظلم کی ابتدا کرنے والا زیادہ ظالم ہوتا ہے۔ اُس نے خود ہی گناہ نہیں کیا، دوسرے کو بھی گناہ کرنے کی تحریک کی۔

مجھے حق نہیں ہے کہ حکومت و اقتدار کے نشے میں آپ کی انفرادیت کو ٹھیس لگاؤں، اسی طرح آپ کو بھی اجازت نہیں ہے کہ میری غیبت کرتے پھریں۔ اسلام انفرادیت کا حامی ہے لیکن فقط آپ کی انفرادیت اسلام کے پیشِ نظر نہیں ہے، میری انفرادیت کا بھی اسلام تحفظ چاہتا ہے۔ اسلام ہمیں اس امر کی تعلیم دیتا ہے کہ میں آپ کی انفرادیت کو ٹھیس نہ لگاؤں اور آپ میری انفرادیت کو ٹھیس نہ لگائیں۔ میں اگر اس حیثیت میں ہوں کہ اللہ کے قانون کی آپ سے پیروی کراؤں تو میں اللہ ہی کے قانون کی پابندی کراؤں گا، اپنی نفسانیت اللہ کے قانون کے ساتھ نہیں ملاؤں گا، آپ کا بھی فرض ہے کہ اپنی نفسانیت کو نہ ابھرنے دیں۔ میری گرفت اسی وقت کریں جب میں اللہ کے حکم کے خلاف کوئی حکم دوں۔ اُس وقت بھی غیبت نہ کیجیے، میرے مُنھ در مُنھ کہیے کہ تم نے فلاں فلاں حکم اللہ کے حکم کے مطابق نہیں دیا ہے۔ میں کیا چیز ہوں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ "میں اچھے کام کروں تو میری اعانت کرو اور غلط کام کرنے لگوں تو مجھے متنبہ کر دو۔ میں اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے احکام کا مطیع رہوں تو تم میری اطاعت کرو اور اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام کی خلاف ورزی کروں تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں ہے۔"

حضرت خبابؓ کی زندگی

حضرت خبّاب بن اَرَت رضی اللہ عنہ اُن صحابہ میں ہیں جن کے لیے اَلسّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْن کا خطاب آیا تھا۔ حضرت سے پہلے کے مسلمان صرف پانچ ہیں۔ حضرت چھٹے نمبر پر ایمان لائے تھے۔ حضرت سادس الاسلام کہلاتے ہیں۔ حضرت نے اسلام کی خاطر بڑی بڑی اذیتیں برداشت کی تھیں۔ حضرت ایک مُشرک عورت اُمِ انمار کے غلام تھے۔ حضرت کو کبھی لوہے کی زرہ پہنا کر دھوپ میں لٹایا جاتا اور کبھی پیٹھ ننگی کر کے انگاروں پر، اور پھر اوپر بھاری

پتھر رکھ دیا جاتا۔ اُم انمار تپتے لوہے سے حضرت کا سر بھی داغا کرتی تھی، مگر کیا مجال جو ایمان نے ذرا لغزش کھائی ہو۔ اُس وقت کے تمام ہی مسلمانوں کا ایمان ایسا تھا۔ قومیں اُبھرتی اور بڑھتی اسی شان کے ایمان سے ہیں۔ یہی وہ ایمان ہے جس کے لیے علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے یقین محکم کی اصطلاح استعمال فرمائی ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ حضرت خبّاب کی پیٹھ دیکھی اور فرمایا کہ میری نظر سے ایسی پیٹھ نہیں گزری۔ حضرت خبّاب نے بتایا کہ آگ پر اتنی دیر لٹایا جاتا تھا کہ پیٹھ کی چربی بہہ نکلتی تھی اور اس قدر بہتی تھی کہ اُس سے آگ بجھ جاتی تھی۔

حضرت خبّاب جیسے ایمان والے برگزیدہ بزرگ کا ایک فقرہ سنانا چاہتا ہوں جو انھوں نے موت کے وقت کہا تھا۔ کچھ صحابی اُن کی عیادت کرنے تشریف لائے اور کہنے لگے: ابو عبداللہ! خوش ہو جیے کہ آپ کل اپنے ساتھیوں سے جا ملیں گے۔ ابو عبداللہ خبّاب کی کنیت ہے۔ حضرت خبّاب نے فرمایا: آہ! تم نے کن کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ مسلمانوں کی مالی حالت درست ہونے سے پہلے وفات پا گئے تھے اور میں اُن کے بعد بہت عرصے زندہ رہا اور دنیاوی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوا۔ مجھے ڈر ہے کہ یہی نعمتیں کہیں میری پچھلی اذیتوں کا بدلہ نہ قرار دے دی جائیں۔

حضرت خبّاب نے جب انتقال کیا ہے تو پوری قوم مالا مال تھی اور پوری قوم ایک سی زندگی بسر کر رہی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ کوئی کروڑپتی ہے اور کوئی پیسے پیسے کو ترستا ہے۔ جو معیار زندگی امیر المؤمنین کا تھا، اُس سے بڑھ کر ہر مومن کا تھا، لیکن حضرت پھر بھی خائف تھے کہ "میری پچھلی اذیتوں کا بدلہ کہیں یہی نعمتیں نہ قرار دے دی جائیں۔"

دولت مندی کے متعلق اسی قسم کا تصور تھا جس نے ساری قوم کو دولت مند بنا دیا تھا۔ کوئی مسلمان رُپے سے محبت نہیں کرتا تھا اور دولت کی تقسیم اتنی صحیح رہتی تھی کہ آجکل کا کمیونزم اُس کا جواب نہیں دے سکتا۔

وقت کی پابندی

جو کام پابندی کے ساتھ کیا جاتا ہے، اس کا نتیجہ اچھا نکلتا ہے اور پھل لاتا ہے۔ کبھی کبھار کی دھواں دھار بارش وہ اثر نہیں دکھاتی جو روزانہ ٹپکنے والے قطرے دکھا دیتے ہیں

بارش کا پانی بہہ جاتا ہے اور قطرے پتھر کا سینہ چیر ڈالتے ہیں۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دن رات نمازیں نہیں پڑھتے رہتے تھے اور بارہ مہینے روزے نہیں رکھتے تھے، لیکن جتنی عبادت کرتے تھے، پابندی سے کرتے تھے۔ حضورؐ جو کام بھی اختیار فرما لیتے تھے اسے پھر چھوڑتے نہیں تھے۔ حضورؐ کے ہر کام میں استقلال تھا۔ جس کام کا جو وقت مقرر کر لیا جاتا تھا اُسے اُسی وقت کیا جاتا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے دن رات کے تین حصے کر رکھے تھے۔ ایک حصہ خالص اللہ کے لیے تھا۔ ایک اللہ کے بندوں کے لیے۔ ایک اپنی ذات کے لیے۔

سونے جاگنے کے اوقات مقرر تھے۔ ملنے جلنے کے انداز میں بھی پابندی تھی۔ ایک صحابی ہیں، حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ، حضورؐ انھیں جب دیکھتے تھے تو ازراہِ شفقت مسکرا دیتے تھے۔ اس مسکراہٹ میں تا دمِ آخر فرق نہیں آیا۔ حضورؐ کی حدیث ہے کہ اللہ کے نزدیک محبوب ترین عمل وہ ہے جسے پابندی کے ساتھ انجام دیا جاتا ہے۔

دوستی خدا کی خاطر

کھانے پینے، شادی بیاہ، کسب و تجارت اور ہر بات کی طرح مسلمان کا لوگوں سے ملنا جلنا بھی اللہ کے لیے ہونا چاہیے۔ کسی سے ملے تو اللہ کے لیے ملے اور کسی سے دُور رہے تو اللہ کے لیے دُور رہے۔ اَلْحُبُّ لِلّٰہِ وَالْبُغْضُ لِلّٰہِ۔ اسلام نے فقط غیر اللہ کی پرستش چھڑا کر اللہ کو سجدہ کرا لینے پر اکتفا نہیں کیا ہے، وہ یہ بھی دیکھنا چاہتا ہے کہ تم اچھے میاں بیوی، اچھے ماں باپ، اچھی اولاد، اچھے بھائی بہن، اچھے دوست اور اچھے ہمسایہ بھی بنے یا نہیں۔ اللہ کا بندہ اور پرستار بننے کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے ایک ایک شعبے میں اللہ کی خوشنودی پیشِ نظر رکھی جائے۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج بھی اللہ کے حکم ہی کی تعمیل تک عبادتیں ہیں۔ نماز سورج کے نکلتے وقت، یا زوال کے وقت، یا عصر مغرب کے درمیان پڑھیے تو عبادت نہیں ہوگی۔ علیٰ ہذا عید کے دن کا روزہ اور سال میں ایک کی بجائے دو حج حرام ہیں، اور زکوٰۃ بھی چند قیود کے ساتھ صرف کی جا سکتی ہے۔ بندے اور مخلوق کا فرض آقا اور خالق کی اطاعت کرنا ہے اور بس۔

اسلام میں آپس کے تعلقات کی بہت اہمیت ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: دینی بھائیوں کی مثال ایسی ہے جیسے دو ہاتھ، ایک ہاتھ دوسرے

ہاتھ کو دھوتا ہے اور ایک دینی بھائی دوسرے دینی بھائی کے کام آتا ہے۔ اور فرماتے ہیں: اللہ تعالے جس کی بہتری کرنی چاہتا ہے اُسے دوست عطا کرتا ہے تاکہ وہ کبھی اللہ تعالے کو بھولنے لگے تو دوست یاد دلادے اور جب وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرے تو دوست اس کا ساتھی بنے۔ اور فرماتے ہیں: جو شخص اللہ تعالے کے لیے دوستی کرتا ہے اُسے بہشت میں اتنا رفیع درجہ ملے گا کہ اور اعمال سے اتنا رفیع درجہ نہیں ملے گا اور فرماتے ہیں:۔ دوستوں میں جو زیادہ محبت کرنے والا ہوتا ہے وہ اللہ کو زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ اور فرماتے ہیں: اللہ تعالے کہتا ہے، میری دوستی اُن لوگوں کا حق ہے جو میری خاطر آپس میں ملتے جُلتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں: قیامت کے دن اللہ تعالے کہے گا، وہ کہاں ہیں جنھوں نے میرے لیے ایک دوسرے کو دوست بنایا تھا، آج جب کہ کہیں پناہ نہیں ہے میں انھیں اپنی رحمت کے سائے میں پناہ دوں گا اور فرماتے ہیں: اللہ تعالے کے لیے دوستی اور دشمنی کرنا ایمان کی مضبوطی کی دستاویز ہے۔ اور فرماتے ہیں: اللہ کے لیے دوستی کرنے والوں کے چہرے بہشت میں اس قدر چمکیں گے کہ چہروں کی روشنی اہل بہشت پر پڑے گی۔ اور فرماتے ہیں: جب تم میں سے کوئی کسی سے دوستی کرے تو اُسے بتادے کہ میں تیرے رنج و راحت کا شریک ہوں۔ اخلاص کے اظہار سے محبت بڑھتی ہے۔

اِسلام کے ارکان

مسلمانوں کے ہاں جس طرح ہفتہ بھر کے سات دنوں میں جمعہ کا دن اہم سمجھا جاتا ہے، جمعہ عید المومنین کہلاتا ہے، اسی طرح سال بھر کے قمری حساب سے جتنے دن بنیں، اُتنے دنوں میں حج کا دن بے حد اہم ہے، اور سال جس طرح ہفتے سے بڑا ہے اسی طرح حج کا دن جمعہ کے دن سے بڑا ہے۔ یوم حج اعظم الایام ہے۔ جمعہ کے دن کی اہمیت ہو یا حج کے دن کی اہمیت، اس اہمیت کا راز ان دنوں کی اجتماعیت میں پوشیدہ ہے۔ اسلام اجتماعی دین ہے۔ اسلام کے پانچ رکن ہیں۔ پانچ ستونوں پر اسلام کی عمارت کھڑی ہے (۱) کلمۂ توحید (۲) نماز (۳) زکوٰۃ (۴) روزہ (۵) حج۔ سب کی اہمیت کا راز اجتماعیت میں پنہاں ہے۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ

مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی قابل بندگی و اطاعت نہیں ہے ۔ وہ واحد ہے اور یکتا ہے ۔ کسی اور کو اُس کی ہمسری کا حق نہیں پہنچتا ۔ اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم) اللہ کے بندے اور رسول ہیں ۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے احکام ہمارے پاس لائے ۔ حضورؐ نے ان احکام کے مطابق ہمیں عمل کرنا سکھایا ۔ مزید احکام اب نہیں آئیں گے ۔ حضور خاتم الانبیا تھے ۔ لیکن اُن کے لائے ہوئے احکام پر عمل کرانے والے ہوتے رہیں گے ۔ جو بھی ہم سے اللہ کے احکام کی تعمیل کرائے گا ، اُس کی بات ہم مانیں گے ۔ اُس کی بات ماننا درحقیقت اللہ کی بات ماننا ہے ۔ کلمۂ توحید کا اِن تاثرات کے ساتھ دل اور زبان سے کہنا اسلام کا دروازہ کھول کر اسلام میں داخل ہوجانا ہے ۔ کلمۂ توحید کہنے کا اصلی لطف جب ہی ہے کہ جب زیادہ سے زیادہ تعداد اُسے سمجھے اور کہے ، سب مل کر اللہ کا دامن تھامیں ، سب مل کر اللہ کی رسّی پکڑیں ؎

نام ہے اللہ واحد کا برائے اتحاد

دوسرا رکن نماز ہے ۔ نماز گھروں میں مسجد کی نسبت خضوع وخشوع سے پڑھی جاتی ہے ، مگر مسجد کی باجماعت نماز کے سامنے گھروں کی نماز کا کوئی درجہ نہیں ہے ۔ فرض نمازوں کا بغیر عذرِ شرعی گھر میں پڑھ لینا اور مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا نہ کرنا ایسا قصور ہے جس کا جواب طلب کیا جائے گا ۔

تیسرا رکن زکوٰۃ ہے ۔ خیر خیرات تھوڑی بہت حسبِ استطاعت عموماً کی جاتی ہے ۔ خیرات نہ کی جائے تو یہ فقط عیب ہے مگر زکوٰۃ نہ دی جائے تو یہ جرم ہے ۔ خیرات کرنا انفرادی نیکی ہے اور زکوٰۃ دینا اجتماعی نیکی ۔

چوتھا رکن روزہ ہے ۔ روزے بہت سے مسلمان رمضان کے علاوہ بھی رکھتے ہیں ، لیکن جو فضا رمضان میں مسلمانوں کے ایک ساتھ روزے رکھنے سے نمودار ہوجاتی ہے اُسے آپ اس گئے گزرے زمانے میں ہر سال اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ۔ ایک ساتھ روزے رکھنے سے رونق اور برکت کی لہر دوڑ جاتی ہے ۔

رہا پانچواں اور آخری رکن حج ، سو حج کی اجتماعیت تو عیاں ہے ۔ حج ہمارا بین الاقوامی اجتماع ہے ۔ اقوام کا لفظ میں غلط لکھ گیا ۔ ہم تو ایک قوم ہیں ، حج پوری قوم کا اجتماع ہے ۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے ایک دفعہ صحابہ سے فرمایا، کیا میں تمھیں ایسی بات بتاؤں جو نماز، روزہ، صدقہ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر سب پر فایق اور غالب ہے۔ صحابہ نے عرض کیا، حضور ضرور بتایئے۔ فرمایا۔ آپس میں مِل جُل کر رہنا۔ مل جل کر نہ رہنے سے ہلاکت آجاتی ہے۔ میری مراد جسمانی ہلاکت نہیں ہے، بلکہ دینی ہلاکت ہے۔

حج حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قایم کیا تھا۔ حج کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ پیغمبروں کے جدِّ اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ کی ابتلاو آزمایش کی یادگار ہے۔ حضرت ابراہیم کی ساری عمر امتحانوں میں کٹی تھی۔ ایک امتحان یہ لیا گیا کہ انھیں اپنی بیوی ہاجرہ اور دودھ پیتے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو ایسی جگہ بسانا پڑا جہاں انسان کا نام و نشان نہیں تھا، جہاں انسان بس ہی نہ سکتا تھا، کیوں کہ پانی نایاب تھا اور سبزہ نابود۔ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کو حضرت ابراہیم نے اللہ کے حکم کی تعمیل میں وہاں چھوڑا تھا اور اللہ سے عرض کیا تھا کہ "اے میرے رب! میں نے اپنی کچھ ذریت اس میدان میں بسادی ہے، جس میدان میں گھاس کی پتی تک نہیں ہے یہی جگہ اب مکہ معظمہ اور مرکز اسلام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی بیابان میں حضرت اسمٰعیل کو پروان چڑھایا۔ ان کے ایڑیاں رگڑنے سے چشمہ پھوٹ نکلا اور پانی لوگوں کو یہاں کھینچ لایا۔ حضرت ابراہیمؑ پھیرا کرتے رہتے تھے حضرت اسمٰعیل ہوشیار ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ نے اُن کو ساتھ لے کر اور اللہ کے حکم سے یہاں اللہ کا پہلا معبد تعمیر فرمایا اور لوگوں کو اُسے آباد کرنے کی دعوت دی۔ اُس وقت سے حج ہوتا چلا آتا تھا۔ حتیٰ کہ اُمتِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ورثہ عطا ہو گیا۔ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا۔ اللہ کا حق ہے لوگوں پر کہ اللہ کے گھر پہنچنے کی استطاعت رکھنے والے اللہ کے گھر کا حج کریں۔

حج حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کے جنگل بیابان میں چھوڑے جانے کی یادگار ہے۔ حج میں جو ارکان ادا کیے جاتے ہیں وہ سب ان بزرگوں پر بیتے ہوئے واقعات ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کا شیطان پر سنگ باری کرنا، حضرت ہاجرہ کا پانی کی تلاش میں دوڑنا۔ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ۔ صفا اور مروہ اللہ کی نشانیاں ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں: "مسلمان اللہ کی الٰہیت اور رسول کی رسالت کو سمجھیں اور نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج اُسی سپرٹ (SPIRIT) سے ادا کریں، جو اللہ اور اس کے رسول کا منشا ہے تو اِن کے نتایج آج بھی ویسے ہی پیدا ہوتے ہیں جیسے قرونِ اولیٰ

میں ہو چکے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ملتِ اسلامی کی حالت ہمیشہ سے زار و زبوں نہیں تھی۔
ہمارے اسلاف پر ایسا وقت رہ چکا ہے کہ دین و دنیا کی سروری اور سرداری اُن کے لیے
مسلّم تھی۔ آسمان کی برکتوں نے اُن ہی کے دامنوں کو منتخب کیا تھا اور زمین اپنے خزانے
اُن ہی کے واسطے اُگلتی تھی۔ یہ سب کچھ اُنھیں الہٰیت اور رسالت کو سمجھنے اور نماز،
زکوٰۃ، روزہ اور حج کی صحیح پابندی سے حاصل ہُوا تھا۔ اسلام لانے سے پہلے وہ
ایک دوسرے کے دشمن اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، لیکن اسلام
میں داخل ہوتے ہی ایک دوسرے کے غم خوار اور مددگار بن گئے۔ جب تک اسلام قبول نہ
کیا تھا، اُن کی جمعیت پراگندہ اور منتشر تھی اور وہ دنیا کی نظر میں حقیر و ذلیل تھے، لیکن خدائے
واحد کے سامنے سر جھکاتے ہی کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ہو گئے۔ اتنے طاقت ور،
اتنے منظم اور باہم اتنے مربوط کہ اُن کی آواز سے شجاعانِ عالم لرزہ براندام ہو جاتے تھے اور قیصر و کسریٰ
کے ایوانوں میں زلزلہ آجاتا تھا۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے نہ صنعت میں ان کا حصہ تھا اور نہ تجارت
پر ان کا قبضہ۔ مگر اسلام قبول کرنے کے بعد تجارت ان کی کنیز تھی اور صنعت ان کی لونڈی۔ غرضیکہ
اللہ کا بن جانے کے بعد اور اللہ کے احکام پر عمل کرتے ہی علم و عرفان، مال و دولت، صنعت و تجارت،
حکومت و سلطنت تمام نعمتوں کے دروازے اُن کے لیے کُھل گئے۔"

حج کے موقع پر اللہ کی یاد کے ساتھ ساتھ اسلام چاہتا ہے کہ اُس کے پیرو ایک دوسرے
سے ملاقاتیں کریں اور ملاقاتوں سے فایدہ اُٹھائیں۔ بالکل ذاتی فایدے حاصل کرنے کی بھی
اجازت ہے۔ (لیکن چور بازاری کی اجازت نہیں ہے) قومی فایدے سے مراد سیاسی،
تجارتی، تمدّنی، تہذیبی، علمی، عقلی، تاریخی اور جغرافی ہر نوع کے فایدے ہیں۔ اہلِ یورپ
کا بیان ہے کہ مسلمانوں نے حج اور جہاد کی وجہ سے جغرافیے کے علم کو بڑی ترقی دی تھی۔

حج کے دوران میں بڑے سے بڑے اور امیر سے امیر مسلمان کا چھوٹے سے چھوٹے
اور غریب سے غریب مسلمان کے ساتھ لباس کی یکسانیت اختیار کر لینا اور مناسک
کی ادائیگی میں ذرہ برابر امتیاز نہ برتنا یوں ہی نہیں ہے۔ حقیقی فلاح مسلمانوں کی امامت
اور مرکزیت میں پوشیدہ ہے۔ نفاق و شقاق کا علاج اسی شفاخانے میں ہوگا اور داروئے
نظم و انضباط یہیں سے ملے گی۔ اپنا مرض مُزمن دُور کرنے کے لیے ہمیں اسی شفاخانے کی
سمت قدم بڑھانا پڑے گا۔ امامت عرصہ دراز سے مفقود ہے، لیکن مرکزیت کا ایک جزو

باقی رہ گیا ہے، جسے حج کہتے ہیں۔ شاید کبھی حج ہی کرتے کرتے امامت اُبھر آئے۔ حج میں وحدتِ اطاعت کا مظاہرہ آج بھی موجود ہے۔

نئے نئے ذرائع ترقی اختیار کرنے سے اسلام منع نہیں کرتا حکمت اور عقل کی ہر بات مسلمان کی گم شدہ میراث ہے، مگر حکمت اور عقل کو کسا جائے گا اسلام کی کسوٹی پر۔ مسلمان جب تک اسلام کے نام لیوا ہیں اُن کی فلاح اسلام کے زیر سایہ ہی ممکن ہے آب و ہوا کے قالب میں ڈھلی ہوئی وحشت انگیز اور جنوں خیز قومیت میں دنیا ڈھل سکتی ہے، مسلمان نہیں ڈھل سکتا۔ ہمارے دین نے ہمیں کام یاب زندگی بسر کرنے کے تمام گُر سکھا دیے ہیں خصوصاً متحد رہنے اور ایک دوسرے کے کام آنے پر جتنا زور ہمارے دین نے دیا ہے اُس کا جواب نہیں پیش کیا جا سکتا۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج سب ملّت کی خرابیوں کی اصلاح کے ضامن ہیں۔ اجتماع کا سبق بار بار دوہرانے سے یہ نہ خیال کیجیے گا کہ واحدی انفرادی عبادت کا وزن گھٹا رہا ہے۔ انفرادی عبادتیں تزکیۂ نفس کے واسطے ضروری ہیں، لیکن انفرادی عبادتیں بھی اس غرض سے کرنی چاہئیں کہ اُن کے ذریعے اجتماعی عبادتوں کی صلاحیت بڑھ جائے۔ مقصود اجتماعی عبادتیں ہی ہیں۔

دُنیا اور آخرت

اے ایمان والو! تمھیں کیا ہو گیا ہے، (تمھارا ایمان کس قسم کا ہے) جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں (کام کرنے کے لیے) نکلو تو تم زمین کے اُوپر بوجھ بنے بیٹھے رہتے ہو (اپنی جگہ سے نہیں ملتے) کیا تم (بھی) آخرت کی نسبت دنیا کی زندگی کو پسند کرنے لگے۔ تو (ہم پھر یاد دلائے دیتے ہیں کہ) آخرت کی آسایش کے سامنے حیات دنیوی کی آسایش (بے حقیقت اور) تھوڑی ہے۔ تم اگر (گھر گھسنا پن نہیں چھوڑو گے اور سُستی برتتے جاؤ گے اور اسلام کا نام بلند کرنے نہیں اُٹھو گے اور گھروں سے) نہیں نکلو گے تو (اللہ کا اور اسلام کا کچھ نہیں بگڑے گا) اللہ تمھیں عذاب میں مبتلا کر دے گا اور تمھارے بدلے کوئی دوسری قوم لے آئے گا (جو اسلام کی شان برقرار رکھے گی) اور تم اُسے مطلق ضرر نہیں پہنچا سکو گے۔ اللہ ہر بات پر قادر ہے۔

(سورہ ۹۔ آیات ۳۸-۳۹)

اسلامی برتاؤ

مسلمانوں کو لوگوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے، اس کے متعلق اسلام کی چند ہدایتیں سُنیے:

(۱) جو چیز، یا جو بات اپنے واسطے پسند نہ کرو، اُسے کسی مسلمان کے واسطے پسند نہ کرو۔ تمھاری زبان اور تمھارے ہاتھ سے کسی مسلمان کو ایذا نہ پہنچے۔ ایک حدیث ہے کہ آنکھ کا اشارہ تک ایسا نہ ہونا چاہیے جس سے مسلمان کا دل دُکھے یا مسلمان[1] کا دل سُہمے۔

(۲) کسی[2] کے ساتھ تکبر مت کرو اور کسی کو حقیر مت سمجھو۔

(۳) کسی سے خفا ہونے کی میعاد تین دن ہے۔ (تین دن میں غصّے کا زور جاتا رہتا ہے۔ حکم ہے کہ تیسرے دن غصّہ تھوک دو اور گلے مل لو۔ ایک حدیث میں تین دن سے زیادہ خفا رہنے کو حرام کہا گیا ہے)

(۴) انسان نیک ہو یا بد، تم اس کے ساتھ نیکی کرو۔ اس کی نیکی بدی نہ دیکھو۔ (ایک حدیث میں ہے کہ جس کے ساتھ تم نیکی اور بھلائی کرتے ہو، وہ اگر نیکی اور بھلائی کا اہل نہیں ہے تو نہ سہی، تم تو نیکی اور بھلائی کرنے کے اہل ہو۔ ایک حدیث ہے: سب سے بڑی عقل کی بات ایمان لانا ہے اور ایمان کے بعد عقل کی بات دوسرے سے بھلائی کرنا ہے۔ دوسرا خواہ نیک ہو خواہ بد۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ اگر کوئی شخص باتیں کرنے کی غرض سے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو جاتا تھا تو جب تک وہ نہیں چھوڑتا تھا حضورؐ ہاتھ نہیں چھڑاتے تھے حضورؐ

---

[1] اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر مسلم کے واسطے وہ چیز اور وہ بات بے وجہ پسند کی جائے جو اپنے واسطے ناپسندیدہ ہے اور غیر مسلم کو زبان، ہاتھ اور آنکھ کے اشارے سے خواہ مخواہ پریشان کیا جائے۔ حقوق میں قربت اور کمی قربت کا لحاظ ضرور ہے لیکن حقوق سے محروم کوئی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں بہتیرے برتاؤ ہیں جن میں مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز محال ہے۔ (واحدی)

[2] کسی کا لفظ مسلم اور غیر مسلم دونوں پر حاوی ہے۔ تکبر کرنا اور دوسرے کو حقیر سمجھنا تو خود اپنے حق میں مضر ہے۔ غیر مسلم کے ساتھ تکبر کیا جائے گا یا غیر مسلم کو حقیر سمجھا جائے گا تو اپنا ہی اخلاق بگڑے گا۔ یہ تمام ہدایتیں تزکیۂ نفس کے واسطے ہیں۔ ان پر عمل کرنے سے دوسرے پر اثر پڑے یا نہ پڑے عمل کرنے والے کا تزکیہ بہرحال ہوتا ہے۔ لہٰذا سوائے حالتِ جنگ کے مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ سخت بننے کی اجازت نہیں ہے (واحدی)

سے جو ہم کلام ہونا چاہتا تھا حضورؐ اُس کی طرف کامل توجہ فرماتے تھے۔ وہ کتنی دیر بھی بولے جاتا حضورؐ نہایت سکون سے سُنتے رہتے تھے۔

(۵) کسی کی چغلی مت کھاؤ، اور نہ کسی سے چغلی سُنو۔ چغل خوری فسق ہے۔ جو شخص تمھارے آگے اوروں کی بُرائی کرتا ہے وہ اوروں کے آگے تمھاری بُرائی کرے گا چغلخور سے بچو۔

(۶) عمر رسیدہ لوگوں کی عزت کرو اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آؤ۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ جو شخص بڑوں کا احترام اور چھوٹوں پر شفقت نہیں کرتا وہ میرا نہیں ہے۔ اور فرمایا: سفید بالوں کی تکریم اللہ کی تکریم ہے اور درازیٔ عمر کی بشارت ہے۔ اللہ تعالےٰ جسے بوڑھوں کی تعظیم و تکریم کرتے دیکھتا ہے اُسے بڑھاپے تک پہنچاتا ہے تاکہ اُس کے چھوٹے اُس کی تعظیم و تکریم کریں اور بدلہ اُتر جائے۔

چھوٹوں پر حضورؐ کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ کوئی بچہ حضورؐ کے پاس لایا گیا تاکہ حضورؐ اس کا نام تجویز فرمادیں۔ حضورؐ نے اُسے گود میں بٹھا لیا۔ بچہ بیٹھتے ہی پیشاب کرنے لگا۔ حاضرین لپکے کہ بچّے کو ہٹا لیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اِس کا پیشاب نہ روکو پیشاب کرنے دو۔ پھر کپڑوں کو بچّے کے باپ کی موجودگی میں نہیں دھویا کہ مبادا وہ محسوس کرے۔

(۷) ہر شخص کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آؤ۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے کہ خندہ پیشانی اور شیریں زبانی مغفرت کی نشانی ہے۔

(۸) کسی سے وعدہ خلافی نہ کرو۔ حدیث میں ہے کہ جس کے اندر یہ تین عیب ہوں، خیانت، دروغ گوئی اور وعدہ خلافی وہ منافق ہے، خواہ نمازیں پڑھے اور روزہ رکھے۔

(۹) ہر شخص کی عزت اُس کے مرتبے کے مطابق کرو۔ جسے اللہ نے عزت دی ہے اور جو اللہ کی نظروں میں معزز ہے وہ قابلِ عزت ہے۔ حدیث میں ہے کہ ہر قوم کے عزت دار آدمی کی عزت کرنی چاہیے۔

(۱۰) دو مسلمان آپس میں لڑ بیٹھیں تو اُن کی صلح کرادو۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ایک دفعہ فرمایا: میں تمھیں نماز، روزے اور صدقے سے بڑھ کر ایک کام بتاؤں۔ وہ ہے دو مسلمانوں کی صلح کرانا۔ قیامت کے دن اللہ تعالےٰ بھی مسلمانوں سے ایک دوسرے کے قصور معاف کرائے گا تاکہ اُن کے گناہوں کا بوجھ ہلکا ہوجائے اور اُنھیں

جنت میں بھیج دیا جائے۔

(۱۱) لوگوں کے عیوب اور پوشیدہ جرائم کی ٹوہ میں نہ رہا کرو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عیوب اور پوشیدہ جرائم کا تجسس مت کرو۔ (ان پر پردہ پڑا ہوا ہے تو پردہ ہی پڑا رہنے دو۔ حدیث میں ہے: جو شخص اس عالم میں مسلمانوں کی پردہ داری کرتا ہے اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں اُس کی پردہ داری کرے گا۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے ایک دفعہ فرمایا: اے لوگو! ابھی تم محض زبان سے ایمان لائے ہو، تمھارے دلوں نے ابھی ایمان نہیں قبول کیا ہے۔ دیکھو دوسروں کے عیوب کا تجسس اور دوسروں کی غیبتیں نہ کرتے رہا کرو۔ جو مسلمان دوسرے مسلمان کے عیوب ڈھونڈتا ہے اور انھیں اُچھالتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے رُسوا کر دیتا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب پہلے پہل چوری کے مجرم کو حضورؐ کے سامنے پیش کیا گیا تاکہ ہاتھ کاٹنے کی اجازت لی جائے تو حضور کے چہرے کا رنگ متغیّر ہو گیا۔ حاضرین نے پوچھا۔ کیا بات ہے؟ فرمایا۔ سزا دینا تو سزا دینے والے کا فرض ہے، لیکن تم اگر چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمھارے گناہ بخش دے اور انھیں ظاہر نہ ہونے دے تو تم بھی دوسروں کے قصور معاف کر دیا کرو اور دوسروں کے قصوروں کو چھپایا کرو۔ ایک دفعہ حضورؐ نے فرمایا: جو شخص ان اُمور کی طرف کان لگائے جو پوشیدہ طور سے کیے جا رہے ہوں تو قیامت کے دن ایسے شخص کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈالا جائے گا۔

ہدایتیں ابھی باقی ہیں، لیکن فی الحال ان کی پابندی کر لیجیے۔ باقی ہدایتیں پھر کبھی لکھ دُوں گا۔ یہ ہدایتیں حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔

جنّت، جہنّم اور اعمال

ایک صحابی کو خیال ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ کے ہاں لکھا جا چکا ہے کہ جسے جنّت میں پہنچنا ہے وہ جنّت میں پہنچے گا اور جسے جہنّم میں پہنچنا ہے وہ جہنّم میں پہنچے گا، تو پھر جدّوجہد کس اُمید پر کی جائے اور کس بات کے لیے کی جائے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا: "اللہ کے ہاں فقط اتنا ہی نہیں لکھا کہ فلاں شخص جنّت میں جائے گا اور فلاں جہنّم میں؛ بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ جنّت میں جانے والا جنّتیوں کے سے کام کرے گا اور جہنّم میں جانے والا

جہنمیوں کے سے کام کرے گا۔ تمہاری قسمت میں اگر جنّت ہے تو اچھے اعمال کیے بغیر تم نہیں رہ سکتے۔ تم عمل وہی کرو گے جو تمہیں یا جنّت میں لے جائیں گے یا جہنّم میں لے جائیں گے۔ تدبیر تقدیر سے الگ چیز نہیں ہے۔

حضرت ابوطالب اور ہرقل

حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے چچا ابوطالب کو حضورؐ سے جیسا قلبی تعلق تھا اُسے آپ جانتے ہیں۔ جناب ابوطالب نے حضورؐ کے ساتھ باپ کا پارٹ ادا کیا تھا۔ ابوطالب حضورؐ کی صداقت کے بھی معترف اور مُقر تھے۔ اُن کے تین شعر ہیں، جن کا مفہوم یہ ہے کہ "آپ نے مجھے اسلام کی دعوت دی اور صحیح دعوت دی، بے شک آپ صادق ہیں۔ لوگوں نے آپ کو امین تسلیم کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کا دین تمام دینوں سے اچھا ہے۔ لوگوں کے طعن و تشنیع اور ملامت کا خوف نہ ہوتا تو میں آپ کے دین کو قطعی لبّیک کہتا۔" اس اعتراف اور اقرار اور حضورؐ سے پدرانہ برتاؤ برتنے کے باوجود ابوطالب کا شمار بس اسلام کے جاننے والوں میں ہے، ماننے والوں میں نہیں ہے۔

ہرقل، قیصرِ روم کے پاس حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا خط لے کر پہنچے تو ہرقل نے حضرت دحیہ کلبی سے دل کھول کر باتیں کیں اور خدّام کو حکم دیا کہ مکّے کا کوئی اور آدمی ملے تو اُسے بھی لاؤ۔ میں اسلام کی بابت کسی غیر مسلم سے بھی بات کرنی چاہتا ہوں۔ ابوسفیان اور چند دوسرے غیر مسلم موجود تھے۔ ابوسفیان سے سوال جواب کرنے کے بعد ہرقل بولا "جس نبی کی حضرت عیسٰے علیہ السّلام نے بشارت دی تھی، محمدؐ وہی نبی معلوم ہوتے ہیں، ابوسفیان! تمھارے جواب اگر واقعی درست ہیں تو جہاں میں بیٹھا ہوں، یہاں کے مالک محمدؐ بنیں گے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ محمدؐ کی خدمت میں حاضر ہوں اور ان کے پاؤں دھو کر پیوں۔"

ہرقل نے اتنا کچھ کہا، مگر اسلام کا اعلان نہیں کیا، کیوں کہ اعلان کی صورت میں آئینِ سلطنت کے مطابق عیسائی پادری اُسے معزول کر دیتے، مسلمانوں کے ہاں بھی ہرقل کا نام مسلمانوں کی فہرست میں نہیں ہے۔

منصف مزاج مستشرق

بعض منصف مزاج مستشرقین یورپ حضورؐ کی زندگی کے وہ وہ محاسن اور کمالات

بیان کر جاتے ہیں، کہ بڑے بڑے ذی علم مسلمانوں کی نظر اُن تک کم جاتی ہے۔ بقول علامہ شبلی نعمانیؒ راکھ کے ڈھیر میں سے سونے کے ذرّے نکال لیتے ہیں۔ منصف مزاج نہیں، متعصب مستشرقین نے بھی صفِ انبیا کا ہیرو حضورؐ ہی کو قرار دیا ہے۔

مستشرقین کے علاوہ دنیا کے ایک ممتاز ترین سائنس دان سر جیمز جینس کے متعلق عرصہ گزرا علامہ عنایت اللہ مشرقی کی روایت پڑھی تھی۔ ۱۹۰۷ء میں عنایت اللہ صاحب بحیثیت طالب علم سر جیمز کے مکان کے قریب رہتے تھے اور دیکھا کرتے تھے کہ سر جیمز اتوار کے اتوار گرجا جاتے ہیں۔ عنایت اللہ صاحب نے اُن سے پوچھا۔ آپ تو سائنس دانوں کے اُستاذ الاساتذہ ہیں، آپ کا اور گرجا کا کیا جوڑ ہے۔ سر جیمز نے جواب میں اجرامِ فلکی کے مہیب نظام پر بڑی ایمان افروز تقریر کی اور اللہ کی حکمت اور عظمت پر اس طرح روشنی ڈالی کہ عنایت اللہ صاحب حیران رہ گئے۔ دورانِ تقریر میں سر جیمز کا عجیب عالم تھا۔ آنکھیں سُرخ تھیں۔ سر کے بال کھڑے تھے اور جسم ہیبتِ الٰہی سے لرز رہا تھا۔ آخر میں سر جیمز نے فرمایا۔ عنایت اللہ! اسی ہیبت کی فراوانی کو کم کرنے کی خاطر میں گرجا جاتا ہوں۔ میں فرشِ خاک پر جبینِ نیاز رکھ کر جب "خدائے عظیم" کہتا ہوں تو یقین کر و کہ یہ آواز میرے قلب کی گہرائیوں سے اُٹھتی ہے۔ عنایت اللہ! میں نے اللہ کے شاہکاروں پر غور کر کے ہی اللہ کی عظمت کا تصور قایم کیا ہے۔ جاہل انسان اللہ کی عظمت کا تصوّر کیا کرے گا۔ سر جیمز کے آخری فقرے پر عنایت اللہ صاحب نے قرآن مجید کی وہ آیت پڑھی: اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا۔[1] اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جنھیں (اُس کی عظمت کا) علم ہے۔ آیت سر جیمز کے دل میں کھُب گئی۔ بے اختیار ہو کر بولے: "ہیں! تمھارے بے پڑھے لکھے نبی کو یہ راز کس نے بتا دیا کہ اللہ سے اہلِ علم ہی ڈر سکتے ہیں۔ یقیناً محمدؐ نبی برحق تھے۔ یقیناً قرآن اللہ کا کلام ہے۔ عنایت اللہ! مجھے اپنے نبی کے معترفین میں لکھ لو۔"

اعتراف میں کس قدر زور ہے، لیکن اعتراف اسلام کے نزدیک کافی نہیں ہے۔ اسلام ایسی تصدیق اور ایسے ایمان کا طالب ہے جو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم کی اتباع اور اطاعت کا جذبہ پیدا کر دے۔ اتباع اور اطاعتِ رسول کا عزم اور

---

[1] سورہ ۳۵۔ آیت ۲۸

عہد لازمی ہے۔ اتباع اور اطاعت ناقص ہو تو ہو لیکن اتباع و اطاعت کی نیت ضروری ہے۔ اُس کے بغیر ایمان ایمان نہیں ہے۔ بندے کا کام تعمیل احکام ہے۔ تعمیل احکام نہ کی جائے تو بندہ بندہ کیسے کہلا سکتا ہے۔ تعمیلِ احکام کی نیت کے بغیر اپنے آپ کو بندہ یعنی مسلم کہنا بے معنی سی بات ہے۔

رُوح اور جسم

انسان پیدائش کے وقت کم وبیش ڈیڑھ بالشت کا ہوتا ہے۔ پھر اُس کا جسم بدلتا بھی رہتا ہے اور بڑھتا بھی رہتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد بڑھنا چھوڑ دیتا ہے، یا بڑھتا ہے تو لمبان میں نہیں بڑھتا، چوڑان میں بڑھتا ہے اور چوڑان میں بڑھنا بھی نہیں گھٹتا بھی ہے۔ کبھی بڑھ جاتا ہے، کبھی گھٹ جاتا ہے۔ لمبان آخر عمر میں سُکڑتی ہے۔ تناؤ کم ہو جاتا ہے اور انسان جُھک جاتا ہے۔ یہ تو جسم کا حال تھا۔ روح بھی بڑھتی اور گھٹتی ہے، ترقّی اور تنزّل کی منازل طے کرتی ہے۔ رُوح اس عالم سے دوسرے عالم میں پہنچ کر بھی ترقّی اور تنزّل کرتی رہتی ہے۔ جنّتی رُوحوں کی ترقّی نہیں رُکتی اور دوزخی رُوحوں کا تنزّل نہیں رُکتا۔ رُوحوں کی نہ ترقّی کی انتہا ہے اور نہ تنزّل کی۔ رُوح جسم کی طرح محدود نہیں ہے اور جسم کی طرح فانی نہیں ہے۔

حضرت طاؤس اور ہشّام

خلیفہ ہشام بن عبدالملک مدینہ منورہ پہنچا اور بولا، کوئی صحابی زندہ ہوں تو بلاؤ۔ جواب ملا، صحابی کوئی زندہ نہیں ہیں۔ خلیفہ نے کہا، کسی تابعی کو لے آؤ۔ حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہ کا انتخاب کیا گیا۔ حضرت طاؤس خلیفہ کے کمرے میں گھسنے لگے تو اُنھوں نے جوتے اُتار دیے اور فرمایا: السلام علیک یا ہشام۔ پھر کہا۔ ہشام کیسے ہو۔ خلیفہ اس بے تکلف طرزِ کلام کا عادی نہیں تھا، بگڑ گیا اور حکم دیا، اِنھیں قتل کر ڈالو۔ لوگوں نے سفارش کی کہ یہ ساکنینِ حرم میں سے ہیں اور اکابر علما میں اِن کا شمار ہے، اور حضرت طاؤس کو سمجھایا کہ خلیفہ سے معافی مانگیے، خلیفہ کے ساتھ آپ نے گُستاخی کی ہے۔ حضرت طاؤس نے فرمایا۔ مجھے بتاؤ تو، کیا گستاخی کی ہے۔ خلیفہ خود بولا: اوّل تو تم پاؤں ننگے کر کے میرے پاس بیٹھے۔ دوسرے

تم نے میرا نام لیا۔ امیر المومنین کہہ کر مخاطب نہیں کیا۔ نام ہی لینا تھا تو کنیت استعمال کرتے۔ تیسرے تم میرا ہاتھ چومے بغیر اور بے اجازت بیٹھ گئے۔ حضرت طاؤس نے فرمایا:- میں رب العزت کے حضور پانچ وقت جوتے اُتار کر اور ننگے پاؤں ہو کر بیٹھتا ہوں، رب العزت تو نہیں بگڑتا۔ امیر المؤمنین میں ضرور کہتا، مگر سارے مسلمان تیری سرداری سے متفق کہاں ہیں، کیا میں دروغ گوئی کرتا۔ میں نے تیرا نام لیا۔ کنیت استعمال نہیں کی، اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ نے اپنے دوستوں کو اُن کے نام سے یاد فرمایا ہے۔ یا داؤد۔ یا یحییٰ۔ یا عیسےٰ، اور اپنے دشمنوں کی کنیت استعمال کی ہے۔ مثلاً تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ ـــــ رہا ہاتھ چومنے کا معاملہ تو میں نے حضرت علیؓ سے سُنا ہے کہ بیوی اور بیٹے کے علاوہ کسی کے ہاتھ چومنے جائز نہیں ہیں۔ آخری اعتراض تو نے یہ کیا ہے کہ میں تیرے سامنے بیٹھ گیا تو حضرت علیؓ کا ایک اور قول سن لو حضرت علیؓ فرماتے ہیں، تم اہل دوزخ میں سے کسی کو دیکھنا چاہو تو ایسے شخص کو دیکھو جو دربار لگائے بیٹھا ہو اور دوسرے اُس کے سامنے ہاتھ باندھے اس طرح کھڑے ہوں جس طرح اللہ کے سامنے نماز پڑھنے کھڑے ہوتے ہیں۔

خلیفہ کا دماغ اپنی جگہ آگیا۔ کہنے لگا: مجھے نصیحت کیجیے۔ فرمایا: میں نے حضرت علیؓ سے سُنا ہے کہ جہنم کے سانپ اور بچھو ایسے حاکم کا انتظار کر رہے ہیں جو رعایا کے ساتھ عدل نہیں برتتا۔ اتنا فرما کر حضرت طاؤس اُٹھے اور چلے گئے۔

دوستی اور وضعداری

پچاس ساٹھ برس قبل دلّی میں متعدد مسلمان تھے کہ اُن کی دین داری کی تو میں قسم نہیں کھاتا، لیکن اسے عادت کہہ لیجیے یا وضعداری کہہ لیجیے، یا کہیے کہ اسلام اور اسلامی آداب کا گھٹتے گھٹتے اتنا اثر باقی تھا کہ دوستی اُن کے نزدیک قریباً نکاح کے برابر اہم تھی۔ دوستی کو وہ اس طرح نباہتے تھے جس طرح نکاح کو نباہا جاتا ہے۔ دوست وہ اندھا دُھند نہیں بناتے تھے، خوب پرکھ لیتے تھے کہ یہ شخص دوستی کے لائق ہے یا نہیں، مگر دوست بنا کر دوستی نہ نباہنا اُن کے نزدیک خیانت تھا۔ دوست بنانے کے بعد دوست کو اپنے اوپر فوقیت دیتے تھے اور اُس کا اپنے سے زیادہ خیال رکھتے تھے۔ دوست کو کبھی کہنا نہیں پڑتا تھا کہ میں تمہاری فلاں مدد کا ضرورت مند ہوں۔ اپنا سودا سُلف خریدنے نکلتے تو دوست کی

کنڈی کھٹکھٹا لیتے تھے کہ کبھی کوئی چیز تو نہیں منگائی ہے۔ مرجانے والے دوستوں کے اہل و عیال کی خبر گیری کرتے تھے۔ دوست کی شان میں اُن کی زبان سے بُرا کلمہ نہیں نکل سکتا تھا۔ تعلقات جاتے رہتے، تب بھی دوست کے رازوں کا افشا بدطینتی سمجھتے تھے۔

اندازہ کیجیے کہ ان سے قبل کے، اُدر اُدر قبل کے، اور بالکل دین دار مسلمانوں کی دوستیوں کا کیا حال ہوگا۔ قدیم مسلمان دوستوں میں تین وصف دیکھا کرتے تھے۔ اوّل عقل، دوم خُلق، سوم صلاحیت۔ بے عقل اور احمق سے دوستی کرنے کو بزرگوں نے حماقت کہا ہے، بد خُلق اور کج خُلق سے بھلائی کی اُمید نہیں کی جا سکتی، اور عدم صلاحیت کی بابت قرآن مجید میں ہے: لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا الخ اُن لوگوں کی تابعداری مت کرو جنھیں ہم نے اپنے ذکر و فکر سے غافل کر دیا ہے، اور جو ہوائے نفس کے غلام ہو گئے ہیں۔

ان سے دُور بھاگو

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ پانچ آدمیوں سے دُور بھاگو۔ ایک جھُوٹے سے، جھوٹا نہ جانے کب دھوکا دے جائے۔ دوسرے احمق سے، احمق فایدے کو نقصان سے بدل سکتا ہے۔ تیسرے بخیل سے، بخیل عین وقت پر دغا دے دیتا ہے۔ چوتھے بزدل سے، بُزدل بھلا کسی کا کیا ساتھ دے گا۔ پانچویں فاسق سے، فاسق دوست کو ایک لقمے کے عوض بیچ ڈالتا ہے۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ہدایت فرماتے ہیں کہ ملنا اُس سے چاہیے جو تمھیں دینی فایدہ پہنچائے یا تم سے دینی فایدہ اُٹھائے۔ حضرت امام غزالی نے انسانوں کی تین قسمیں کی ہیں۔ بعض انسان غذا کے مانند ہیں، ان سے تو انسان الگ رہ ہی نہیں سکتا۔ بعض انسان دوا سے مشابہ ہیں، ان کی بھی انسان کو ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن بعض انسان علّت اور بیماری ہیں، اُن سے بچو، اور اُن میں پھنس گئے ہو تو اس علّت اور بیماری کا علاج کرو اور چھٹکارا پاؤ۔

دو بیل

دو بیل زمین پر ایک دوسرے سے بندھے بیٹھے تھے۔ ایک بیل نے کھڑا ہونا چاہا،

دوسرا بیل بھی کھڑا ہو گیا۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ دیکھ رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کہنے لگے، برادرانِ دین کھڑے ہونے اور چلنے پھرنے میں ایک دوسرے سے اتنی موافقت تو کریں جتنی بیل کرتے ہیں۔ حضرت ابوالدرداء فرماتے ہیں: دوست کی تعریف یہ ہے کہ مرنے کے بعد ورثا تو ورثہ بانٹنے میں مشغول ہوں اور دوست دعائے مغفرت کر رہا ہو اور فکرمند ہو کہ دیکھیے مرنے والے کے ساتھ کیا معاملہ کیا جاتا ہے۔ زندوں کی دُعا مرنے والوں کی قبر میں نور اور روشنی بن کر پہنچتی ہے۔

تعلق کو نباہنا ایمان کی نشانی ہے۔ ایک ضعیفہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ حضورؐ نے اُن کی اتنی تعظیم اور تکریم فرمائی کہ صحابہ حیران رہ گئے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ یہ خدیجہؓ کی ملنے والی ہیں۔ اُن کے پاس بہت آیا کرتی تھیں۔

عزّت وحشمت پاکر دوستوں سے آنکھیں پھیر لینا شیطان کی ہدایت پر چلنا ہے
اِنَّ الشَّیْطَانَ یَنْزَغُ بَیْنَھُمْ۔ شیطان ہی دو دلوں میں فرق ڈالتا ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے شکایت کی، حضرت! دوست نایاب ہوتے جاتے ہیں، حضرت جنیدؒ نے پوچھا۔ تمھیں ایسے دوست کی تلاش ہے جو تمھاری خدمت وغمخواری کرے یا ایسا دوست چاہتے ہو جس کی تم خدمت وغمخواری کرو۔

فاسقوں، بلکہ غیر مسلموں سے بھی دوستی کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ نیت یہ ہو کہ اپنا اچھا نمونہ پیش کرکے فاسقوں کو نیکی کی طرف اور غیر مسلموں کو اسلام کی طرف مائل کروں۔

دولت مند ہندو اور مسلمان

خواجہ حسن نظامی صاحبؒ، عموماً روزانہ تیسرے پہر بستی حضرت نظام الدین سے دلّی آیا کرتے تھے۔ شہر میں گھستے ہی میرا مکان تھا، اُن کی وضع تھی کہ مجھ سے ملے بغیر آگے نہیں جاتے تھے۔

ایک دن تشریف لائے تو کوئی ہندو سادھو ہمراہ تھا۔ چپراسی کو آواز دی کہ انھیں جامع مسجد چھوڑ آؤ۔ لو یہ پیسے۔ ٹرام میں بٹھا دینا اور جہاں کا ٹکٹ کہیں، خرید دینا۔"
سادھو چلا گیا تو میں نے پوچھا، سادھو کیا راستہ نہیں جانتا تھا، اور ٹرام میں بٹھا دینے اور ٹکٹ خرید دینے کا کیا مطلب تھا۔ فرمایا، سادھوؤں میں ایک فرقہ ہے جو پیسے کو ہاتھ

نہیں لگاتا۔

ہندوؤں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں میں بھی اس قسم کے لوگ پیدا ہو گئے ہیں کہ یا تو پیسے سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ ہندو کیا کریں گے۔ ہندو دولت مند ایسے بے شمار ہیں، جنھوں نے رُپیہ جمع تو کیا لیکن جمع شدہ رپیہ خلق اللہ کے لیے وقف کر دیا، مسلمان دولت مند ایسا آجکل کہیں نہیں ہے ـــ یا پھر اکثر غریب مسلمانوں کو مذکورہ بالا سادھو کی طرح پیسے سے نفرت ہے، پیسے کو ہاتھ نہ لگانے تک تو خیر نوبت نہیں پہنچی ہے، لیکن پیسے سے بے نیازی شاید پیسہ نہ چھُونے والے سادھوؤں سے زیادہ ہے۔

ایک دلچسپ مثال

دو دِتی والے سشن جج تھے۔ ایک ہندو، ایک مسلمان۔ ہندو نے جتنا رُپیہ کمایا پنشن لیتے ہی سب قوم کی نذر کر دیا۔ راجس ہندو سشن جج کے باپ کا نام تھا، باپ کے نام پر دِتی راجس کالج بنایا۔ کئی راجس ہائی سکول کھولے اور راجس پرائمری سکولوں کا جال بچھا دیا۔ قوم نے اُس کا ایثار دیکھا تو کالج اور اسکولوں کے لیے رُپے کا مینہ برسا دیا۔

مسلمان سشن جج کا اتہ پتہ کیا بتاؤں، مٹی کے بہت بڑے کونڈے میں مٹی بھری رکھتے تھے، وہ کونڈا اُن کا اُگالدان تھا۔ مرے تو کونڈے کے اندر مٹی کے نیچے لاکھوں رُپے کی اشرفیاں دبی نکلیں۔ اُنھوں نے اپنے اوپر بھی اپنی کمائی خرچ نہیں کی، اور قوم کو کبھی دھیلا نہیں دیا۔ ساری اشرفیاں جس کے مقدر کی تھیں، اُس کے پاس چلی گئیں۔

پڑھے لکھے، ملازمت پیشہ مسلمان رُپے سے محبّت کرتے ہیں تو اس شان سے کرتے ہیں، لہٰذا بے پڑھے لکھے کاروباری مسلمان رُپے کے پیچھے جتنی جان دیں اور جتنا ایمان کھوئیں کم ہے۔ ہندو ایک پیسہ فی رپیہ نفع سے مطمئن ہو جاتا ہے، مسلمان دو آنے فی رپیہ نفع سے مطمئن نہیں ہوتا۔

غربت اور جنّت

رُپے سے بے نیازی برتنے والے غربا کی شکایت فضول ہے۔ اُنھیں اُمرا اور عُلمائے سُوء نے یہ فریب دے رکھا ہے کہ دنیا میں خستہ حال رہو گے تو عقبیٰ میں جنّت پاؤ گے

اور وہ بے چارے اس قدر بھولے ہیں کہ پلٹ کر سوال نہیں کرتے کہ حضرت! آپ کیوں جنت سے محروم رہے جاتے ہیں۔ آپ کیوں بھوکے نہیں مرتے۔ آپ کیوں چیتھڑے لگائے نہیں پھرتے۔ آپ کیوں جھونپڑیوں میں زندگی نہیں کاٹتے۔ آپ کیوں بچوں کو پڑھواتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ رُپے کی محبت اور رُپے سے بے نیازی، اسلام کے نزدیک دونوں عیب ہیں اور دونوں گناہ ہیں۔ اسلام اجازت دیتا ہے کہ آپ جتنا رُپیہ کما سکتے ہوں کمائیں، رُپیہ کمائیں، حکومتیں قایم کریں، تاکہ رُپیہ آپ کے اشاروں پر ناچے مگر رُپے کا کمانا بھی اللہ کے احکام کے مطابق ہو اور رُپے کا خرچ کرنا بھی اللہ کے احکام کے مطابق۔ جیسے بیٹا اپنی کمائی ماں باپ کے قدموں میں لا کر ڈال دیتا ہے ویسے آپ اپنی کمائی اللہ کے حضور پیش کر دیں۔ اور پھر اللہ جس قدر دوسروں کے اوپر خرچ کرنے کو کہے دوسروں کے اوپر خرچ کریں۔

مفلسی میں

کسی ماں یا کسی باپ کو اولاد کا بھوکا مرنا، چیتھڑے لگائے پھرنا، جھونپڑیوں میں رہنا اور پوتا پوتی کا جاہل رکھنا پسند نہیں آتا، اللہ اپنے بندوں کا مفلوک الحال ہونا کیسے پسند کر سکتا ہے۔ مفلوک الحال بنانے والوں کو بھولنا نہیں چاہیے کہ اس کا جواب دینا پڑے گا۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ (ہر چیز کی) بہتات کی خواہش (اور چیزوں کی بہتات پر فخر) تمھیں (حقیقت سے) غافل کیے ہوئے ہے۔ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ؕ حتیٰ کہ (قبریں گن ڈالتے ہو کہ ہمارے مُردے بھی دوسروں سے زیادہ ہیں اور بالآخر خود) قبروں میں چلے جاتے ہو۔ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ؕ یہ باتیں بے کار ہیں۔ عنقریب اس کا تمھیں علم ہو جائے گا۔ پھر (ہم تم سے کہے دیتے ہیں کہ) عنقریب جان جاؤ گے کہ یہ باتیں بے کار ہیں۔ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ؕ ہاں ہاں یہ باتیں بے کار ہیں۔ کاش تمھیں (یہیں) اس کا علم اور یقینی علم ہو جاتا۔ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۙ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۙ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ؕ (ان باتوں سے روح کی ترقی رُک جاتی ہے اور انسان مایوسی کے جہنم میں جلتا ہے۔ جہنم میں پہنچ کر اس کا اندازہ ہوگا) جہنم تم (عنقریب) دیکھنے والے ہو۔ دوزخ دیکھ کر تمھیں (یقین نہیں) عین الیقین ہو جائے گا۔ پھر اُس دن تم سے اِن نعمتوں کے (غلط اور ناجائز استعمال، تکاثر و تشاغل کے) بارے میں سوال کر لیا

جائے گا۔ (سورہ ۱۰۲ - آیات ۱ تا ۸)

اِنسانی رُوح

انسان اور دیگر حیوانوں میں اور فرقوں کے علاوہ ایک فرق یہ ہے کہ انسان کی رُوح کی بھی نشو و نما ہوتی ہے۔ اچھے اعمال رُوح کو ترقی دیتے ہیں اور بُرے اعمال سے رُوح کی ترقی رُکتی ہے اور رُوح پژمردہ ہو جاتی ہے۔ لیکن رُوح کا بڑھنا نہ بڑھنا کوئی کوئی انسان محسوس کرتا ہے، خصوصاً نہ بڑھنا تو محسوس ہی نہیں کیا جاتا، البتہ مرنے کے بعد ہر انسان محسوس کرے گا۔ ترقی یافتہ رُوحیں مرنے کے بعد بھی تا ابد ترقی کرتی رہیں گی اور ترقی اور کامیابی کا احساس انتہائی لطف و مسرت کے ساتھ کریں گی اور تنزّل پذیر رُوحیں مرنے کے بعد تا ابد تنزّل کرتی رہیں گی اور تنزّل و ناکامی کا احساس انتہائی بے چینی اور کرب کے ساتھ کریں گی۔

دو آیتوں کا مفہوم

ہم نے تو (تمہارا بھلا بُرا سمجھانے کے لیے) اس قرآن میں ہر قسم کے مضامین طرح طرح سے (واضح طور پر اور پیرائے بدل بدل کر) بیان کر دیے ہیں (لیکن انسان کی ذہنیت کچھ ایسی ہے کہ اپنی بات کی پچ کیا کرتا ہے) اور (پہلے کے جمے ہوئے خیالات کو ایک طرف رکھ کر حق و صداقت کی تلاش نہیں کرتا)۔ انسان جھگڑنے (اور کج بحثی) میں ساری مخلوق سے پیش پیش ہے۔ (سورہ ۱۸ - آیت ۵۴)

اے رسول! (ان) لوگوں نے کیا یہ سمجھ رکھا ہے کہ (حق پرستی منہ کا نوالہ ہے) فقط اتنا کہہ کر کہ ہم ایمان لے آئے (یہ عذابِ الٰہی سے) چھوٹ جائیں گے، (اور مقاصد دُنیا و عقبیٰ حاصل کرلیں گے) اور (زبانی اقرار کے بعد) اِن (کے ایمان) کا امتحان نہیں لیا جائے گا۔ (ایمان کے ساتھ عمل نہ ہو تو دنیا بھی خطرے میں ہے اور عقبےٰ بھی) آجکل کے مسلمانوں سے پہلے (اگلی اُمتوں میں) جو (مسلمان) گزر چکے ہیں، ہم نے اُن (سب کے ایمان) کو آزمایا تھا۔ لہٰذا جن لوگوں نے (ایمان کا دعوا کرنے میں اس وقت) صداقت برتی ہے (یا آیندہ صداقت برتیں گے) اللہ انہیں بھی ظاہر کرے گا اور اُنہیں بھی (ظاہر کرے گا) جو دروغ گو ہیں۔ وہ لوگ

جو بدکار ہیں کیا یہ سوچے بیٹھے ہیں کہ ہماری گرفت سے آگے نکل جائیں گے (اور ہماری نگاہ سے اوجھل ہو جائیں گے) جو کچھ یہ (سوچے بیٹھے ہیں اور جو کچھ یہ) حکم لگا رہے ہیں وہ بے حد بُرا ہے (اور حقیقت اور واقعیت سے کوسوں دُور ہے)۔ (سورہ ۲۹۔آیات ۱تا۴)

عورتیں، سگرٹ اور سرطان

سگرٹ ایجاد کرنے والی قوموں میں سگرٹ کے خلاف مُہم جاری ہے کہ سگرٹ پینے سے گلے اور پھیپھڑے کا کینسر ہو جاتا ہے، سگرٹ مت پیو، تاکہ گلے اور پھیپھڑے کے کینسر سے محفوظ رہ سکو۔ کینسر (سرطان) لاعلاج مرض ہے۔

سگرٹ ایجاد کرنے والی قومیں اپنی ایجاد کے خلاف جہاد کر رہی ہیں اور ہم سگرٹ بنانے والوں کے خلاف جہاد کیا کرتے ہیں، مگر کس وقت، جب وہ سگرٹ کم بناتے ہیں یا سگرٹ چھپا لیتے ہیں۔ اسٹاک باہر نہیں لاتے اور سگریٹ پینے کو نہیں دیتے۔

پچھلے دنوں لندن سے خبر آئی تھی کہ عورتوں کو اس لیے بھی سگرٹ نہیں پینا چاہیے کہ جو عورتیں سگرٹ پیتی ہیں، اُن کے بچے سگرٹ نہ پینے والیوں کے بچوں کی نسبت چھوٹے اور ناقص رہ جاتے ہیں۔

۱۹۴۷ء سے قبل مجھے علم نہیں تھا کہ عورتیں سگرٹ پینے لگی ہیں۔ کراچی پہنچ کر بھنگنوں کے مُنہ میں سگرٹ دیکھے تو تعجب ہوا۔ دلّی میں بھنگنیں بھی سگرٹ نہیں پیتی تھیں، لیکن اب تو ہمارے اسلامی ملک میں اُسے اونچے طبقے کی عورت سمجھا جاتا ہے جو سگرٹ پیتی ہو۔ کراچی میں یا سب سے نیچے طبقے کی عورتیں سگرٹ پیتی ہیں یا سب سے اونچے طبقے کی عورتیں۔ غریب اور درمیانی طبقے غالباً ابھی محفوظ ہیں۔

دِلّی کا ایک خاندان

دلّی میں، ۱۹۴۷ء تک چند خاندان تھے، جنھوں نے انگریزیت کو قبول نہیں کیا تھا۔ وہی مغلوں کے زمانے کی وضع قطع، وہی رہن سہن، وہی طور طریقے۔ اُن میں ایک خاندان شیخ شجاع الحق کا تھا۔ شیخ صاحب دلّی مسلم لیگ کے صدر تھے اور قائدِ اعظم کے معتمد، بس اتنے نئے پن کے سوا وہ بھی، ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی کے آدمی تھے، اور باقی خاندان تو قطعی

۱۸۵۷ء اس سے پہلے کا تھا۔

شیخ شجاع الحق کی بیوی اور میرے چچا زاد بھائی سید مسعود احمد کی بیوی حقیقی بہنیں تھیں۔ مسعود احمد شادی کے بعد ڈھائی تین برس سے زیادہ زندہ نہیں رہے، لیکن بیوہ مسعود احمد کے لیے ڈھائی تین برس کا تعلق کافی تھا۔ اوّل تو اُس ڈھائی تین برس کی بیاہی نے عقد ثانی نہیں کیا۔ مسعود احمد نے ایک لڑکی چھوڑی تھی، اُس کی خاطر اپنی جوانی نثار کر دی۔ اور نہایت پاک دامنی اور وقار کے ساتھ جوانی گزاری۔ سسرال میں قریب ترین اور معمّر عزیز میں تھا۔ مجھے اُن کے ہاں جانے کی کبھی توفیق نہیں ہوئی، مگر انھوں نے رشتہ نہیں توڑا۔ خصوصاً لڑکی کے معاملے میں میرا مشورہ، بلکہ میری اجازت لیے بغیر قدم نہیں اُٹھاتی تھیں۔ ۱۹۴۰-۱۹۴۱ء میں شہرت پھیلی کہ جاپان دلّی کے اوپر بم باری کرے گا تو اُن کے خاندان کا یو۔ پی میں گاؤں تھا، خاندان وہاں چلا گیا، لیکن وہ میری اجازت حاصل کر کے ہی روانہ ہوئیں۔ علیٰ ہذا لڑکی کے عقد کے وقت بھی بڑے ابّا سے اجازت لینے کی رسم بھی انھوں نے پوری کی۔ اُن کے داماد اب توڈپٹی چیف انجینئر ہیں، جس وقت ہم لوگ کراچی پہنچے ہیں، اُس وقت بھی اگزیکٹو انجینئر تھے۔ بھاوج اُن کے بنگلے میں مقیم تھیں اور میں اُس بنگلے کے قریب بہت گھٹیا سے کوارٹر میں رہتا تھا، لیکن بھاوج نے دلّی کی وضع قایم رکھی۔ میں ان کے ہاں نہیں جاتا تھا اور وہ پھیرے پر پھیرے کرتی تھیں۔

اب اِس خاندان میں بھی انگریزیت گھُس رہی ہے۔ تاہم جتنے پرانے عورت مرد باقی ہیں اُنھیں آپ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی کا پائیں گے۔

پرانے عورت مرد مرتے جاتے ہیں۔ شیخ شجاع الحق جا چکے۔ میری بھاوج بھی گئیں۔ میں خود لبِ گور بیٹھا ہوں ؎

سُنا ہے حضرت اکبر ہیں حامیٔ پردہ
مگر وہ کب تک اور ان کی رباعیاں کب تک

مسلمانوں کی خصوصیّت

دلّی کے کسی آدمی کے سامنے دِلّی والوں کی بُرائی کیجیے، وہ بُرا مانے گا۔ پنجاب کے کسی آدمی کے سامنے اہلِ پنجاب پر آوازہ کسیے، وہ بگڑ جائے گا۔ علیٰ ہذا بنگالی، سندھی، سرحدی، جو بھی اپنے خطّے کے خلاف کوئی لفظ سُنتا ہے تو سمجھتا ہے، خاص مجھ میں کیڑے ڈالے جاتے ہے

ہیں، لیکن صوبے یا شہر کی تخصیص نہ کیجیے اور عمومیت کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف کہیے تو
نہ دہلوی کو خیال آئے گا کہ مجھے بُرا کہا جا رہا ہے اور نہ پنجابی، بنگالی، سندھی اور سرحدی کو۔
مسلمانوں کی بُرائی کرنے اور سننے کے لیے سب مسلمان تیار ہوتے ہیں۔ میں نے مسلمانوں
کے برابر اپنی قوم کی مذمت سے دل چسپی لیتے دوسری قوموں کو نہیں دیکھا۔ شرط اتنی ہے
کہ برائی مسلمان کر رہا ہو اور مسلمان کے سامنے کر رہا ہو۔ مسلمان آپس میں مسلمانوں کی بُرائی
شروع کرتے ہیں تو بھول جاتے ہیں کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ یا شاید سمجھتے ہوں کہ ہم مستثنےٰ ہیں۔
تمام مسلمان تو عیبوں میں مبتلا ہیں، مگر ہم چار چھے مسلمان جو ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں بے عیب
ہیں۔ مجھ سمیت ہر مسلمان اس مرض کا شکار ہے۔ میں نے اور نہیں تو مسلمانوں کا یہی مرض بیان کر
دیا۔ خیر میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ عادت خراب اور حوصلہ شکن ہے۔ اِسے ترک کرنا چاہیے۔
عیب گنوانے سے عیب دُور نہیں ہو سکتے۔ وہ طریقہ اختیار کیجیے جو اپنے بچّوں کی اصلاح
کے واسطے کیا کرتے ہیں۔

میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ مسلمان بے عیب ہیں۔ بے عیب ذات تو اللہ کی ہے
یا انبیا کی تھی، لیکن کم از کم ہندستان اور پاکستان کے عام مسلمانوں کا حال مجھے معلوم ہے۔ اُن
سے بہتر عوام اور قوموں میں نہیں ہیں۔ انھیں سنبھالنے والے ہوں تو مسلمان پھر دنیا پر چھا
سکتے ہیں۔ نمی ملے تو اس مٹی میں بڑی جان ہے۔ خراب اگر ہیں تو مسلمان عوام کے سنبھالنے
والے ہیں، یعنی علما اور امرا۔ عالم اور امیر بھی کُل کے کُل بُرے نہیں ہیں۔ تاہم علم اور پیسہ صحیح
طریقے سے استعمال نہیں ہو رہا ہے، صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے تو پھر مسلمان عوام
میں کچھ خرابی نہیں رہ سکتی۔ مسلمان عوام کو بُرا کہنا ہر اعتبار سے غلطی اور غیر دانش مندی ہے۔

قرآنی آیات کا پس منظر

ہر بات جو زبان سے کہی جاتی ہے یا قلم سے لکھی جاتی ہے، اُس کا کچھ پس منظر اور
بیک گراؤنڈ (BACK GRAUND) ہوا کرتا ہے۔ قرآن مجید کی آیات کا بھی پس منظر
اور بیک گراؤنڈ ہے، جس کے لیے شانِ نزول کا لفظ بولا جاتا ہے۔ لیکن اللہ جل شانہٗ کے
پیشِ نظر فقط گزشتہ اور موجودہ واقعات نہیں ہیں بلکہ وہ واقعات بھی ہیں، جو تا قیامت
اور تا ابد ظہور پذیر ہوں گے۔ اللہ کی باتوں کا شانِ نزول ہرگز نہ بھولیے، مگر انھیں شانِ نزول

میں محدود مت کیجیے۔ اللہ کی بات کسی ایک پس منظر کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی، اللہ کی بات قیامت تک اور ابد الآباد کام دے گی۔

مثلاً فرمایا: اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ؕ غافل کیا تم کو چاہ بہتات کی نے یہاں تک کہ ملو تم قبروں سے۔ (اے لوگو! مال اور اولاد اور ہر چیز کی کثرت طلبی اور) کثرت پسندی (اور اُن چیزوں کے بہ کثرت ہونے کی شیخی) تمھیں (حق سے) غافل کیے رہتی ہے، حتّٰے کہ تم (اپنی تعداد بڑھا کر دکھانے کے لیے قبروں کے مُردے بھی گن ڈالتے ہو اور بالآخر خود) قبروں میں جا پہنچتے ہو۔

جب یہ آیت اُتری ہے تو اِس کے مخاطب یقیناً مشرکین مکّہ تھے، صحابہ کا اِن معایب سے کیا واسطہ، لیکن قرونِ اُولیٰ کے بعد، خاص کر اب، جس پر بھی یہ آیت صادق آئے، وہ اس سے سبق لے سکتا ہے اور فایدہ اُٹھا سکتا ہے۔ مشرکین مکّہ اور شانِ نزول کے ساتھ اسے محدود کر دیا جائے تو یہ آیت گویا اب بے کار ہو گئی، حالاں کہ یہ آیت آج بھی ویسی ہی کار آمد اور سبق آموز ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کار آمد اور سبق آموز رہے گی جیسی نزول کے وقت تھی۔ قرآن مجید کی ہر آیت ایک قاعدہ، ضابطہ، دستور اور فارمولا (FARMULA) ہے جس کا نفاذ نزول کے وقت سے تا قیامت رہے گا۔

قوّت کا اثر

میرے دوست، بھیّا احسان الحق مرحوم نے اپنی طالب علمی کے زمانے کا ایک واقعہ مجھے سنایا تھا۔ وہ میرٹھ کالج میں پڑھتے تھے۔ کالج کے انگریز پرنسپل سے مسلمان طلبا نے مسلمانوں کی کسی تقریب کی چھٹّی مانگی۔ تقریب غیر معروف قسم کی تھی، عید اور بقر عید کی قسم کی نہیں تھی، پرنسپل اُس سے ناواقف تھا، وہ سمجھا کہ طلبا چھٹّیوں کے شوقین ہوتے ہیں، چھُٹی کا بہانہ بنا رہے ہیں۔

جب سیدھی انگلیوں گھی نکلتے نہ دیکھا تو مسلمان طلبا کو غصّہ آگیا، غصّہ آتے ہی پرنسپل نے چھُٹی دے دی، اور کہا کہ تمھاری خوشامد سے میں غلط فہمی میں مبتلا تھا، تمھارے غصّے سے تقریب کی اہمیّت کا اندازہ ہو گیا۔ ہم انگریز خوشامدوں کا اثر نہیں لیا کرتے، ہمیں جوش اور زور کے ساتھ بات بتانے کی ضرورت ہے۔

انگریز ہی نہیں، سارے یورپ کا یہی حال ہے، اور امریکا اور روس بھی بات کی اہمیت جوش اور زور کے بغیر نہیں سمجھ سکتے۔ سمجھانے کے لیے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالیے، حضور اور سرکار کہنے سے آجکل کی قابو یافتہ قومیں نہیں پسیجتیں۔

الجزائر کی آزادی

ملاحظہ فرمائیے، مسلمانانِ الجزائر نے حقِ آزادی کس طرح تسلیم کرایا ہے۔ سات برس مسلسل خون بہوانے کے بعد فرانس نے صرف اتنا مانا ہے کہ تم آزادی پانے کے مستحق ہو۔

مسلمانانِ الجزائر کے پاس حکومتِ فرانس جیسے ہتھیار نہیں تھے، لیکن جانیں پیش کرنے کی ہمت تھی۔ وہ حکومت کو کچل نہیں سکتے تھے، مگر کچلے جانے کے لیے تیار تھے۔ انھوں نے ایسے ایسے مظالم برداشت کیے جن کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ انھیں گھروں کے اندر بھی چین میسّر نہ تھا، فرانسیسی گھروں کے اندر گھس گھس کر خون بہاتے تھے۔ ظلم کی انتہا نہیں تھی۔ لیکن انھوں نے ثابت کر دیا کہ مستقل مزاج مسلمان اب کہیں ہیں تو الجزائر میں ہیں۔

امریکا اور انگلستان اور روس، جو مظلوموں کے بڑے حامی بنتے ہیں، کسی نے مسلمانانِ الجزائر کی حمایت نہیں کی، حتّٰی کہ ہندستان اور پاکستان کے مسلمانوں نے اُتنی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا جتنی ہمدردی کا متحدہ ہندستان کے زمانے میں اظہار ہوا کرتا تھا۔ مسلمانانِ ہندستان و پاکستان کی نئی نسل شاید جانتی ہی نہیں کہ چند برس قبل دنیا میں کہیں بھی مسلمانوں کو تکلیف پہنچتی تھی تو ہم تڑپ جاتے تھے۔ تمام مسلم ممالک خاموش رہے۔ مسلمانانِ عالم کا آپس کا تعلق اور رشتہ الجزائر کی جدّ وجہد آزادی کے دوران میں ظاہر ہی نہیں ہوا۔ کسی نے یہ تک نہ کہا کہ فرانس کی توپوں میں کیڑے پڑیں۔ مسلم حکومتوں نے خیال کر رکھا ہے کہ قابو یافتہ قوموں کی خوشامد میں عافیت ہے، حالاں کہ آجکل کی قابو یافتہ قومیں الجزائر کے مسلمانوں جیسی قربانی چاہتی ہیں۔

الجزائر کے لاکھوں مسلمانوں کو شہید اور لاکھوں مسلمانوں کو گھر سے بے گھر ہی نہیں کیا گیا، انھیں عجیب عجیب ایذائیں دی گئیں۔ کچھ قیدیوں کو چوبیس گھنٹے ٹھنڈے پانی کے نیچے کھڑا رکھا، کچھ قیدیوں کو انتہائی تیز روشنی کے سامنے۔ کچھ قیدیوں کے ناخن

اکھاڑ ڈالے، مگر الجزائر کے مسلمانوں نے حق آزادی سے دست برداری نہیں دی۔ مظالم ابھی جاری ہیں۔ حکومت فرانس نے مسلمانان الجزائر کا حق آزادی تسلیم کر لیا ہے، لیکن جتنے فرانسیسی الجزائر میں جا بسے ہیں وہ باز نہیں آ رہے، برابر مسلمانوں کا خون بہا رہے ہیں۔

بابا فرید کا خط

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سلطان جائر کے سامنے کلمۂ حق کہنے کو افضل الجہاد فرمایا ہے۔ جائر[ا] کے معنی ہیں ٹیڑھا اور کج رو۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا عمل اس حدیث پر عام تھا۔ بے شمار مثالیں کج رو خلفا کے مُنہ در مُنہ کلمۂ حق کہہ دینے کی موجود ہیں۔ بعد میں علمائے حق اور اولیاء اللہ نے بھی اِسے اپنا مسلک بنایا۔ علمائے حق ہمارے آپ کے زمانے میں انگریز حکام سے ٹکرایا کرتے تھے۔

مندرجہ ذیل تحریر مندرجہ بالا حدیث سے براہِ راست تعلق نہیں رکھتی، لیکن تحریر کے ذرا تیور ملاحظہ کیجیے۔ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ مطلق العنان بادشاہ غیاث الدین بلبن کے نام سفارش نامہ لکھ رہے ہیں۔ وَھُوَ ھٰذَا:

"میں نے اِس شخص کی ضرورت کو اللہ کے سامنے پیش کر دیا ہے، پھر تیرے پاس بھیجا ہے۔ تو اِسے کچھ دے گا تو دین اللہ کی ہوگی، اور یہ شکر گزار تیرا بن جائے گا، اور کچھ نہیں دے گا تو روک اللہ کی طرف سے رہے گی اور تو معذور سمجھا جائے گا۔"

خط کی اصل عبارت یہ ہے:

رَفَعْتُ قِصَّتَہٗ اِلَی اللہِ ثُمَّ اِلَیْكَ فَاِنْ اَعْطَیْتَہٗ شَیْئًا فَالْمُعْطِیْ

[ا] یہ لفظ جائر ہے۔ لوگ جابر غلط پڑھا کرتے ہیں۔ سورہ نحل میں ہے: وَعَلَی اللہِ قَصْدُ السَّبِیْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ۔ (اور راہ برِ اللہ کے پہنچتی ہے سیدھی راہ اور بعضے اُن میں سے کج ہے) جابر بھی کج رو ہی ہوتا ہے، لیکن جبر کج روی کی ایک صنف ہے۔ جائر کج روی کی ساری صنفوں پر حاوی ہے۔ حدیث میں جائر ہے، جابر نہیں ہے۔ (واحدی)

هُوَ اللّٰهُ وَاَنْتَ الْمَشْكُوْرُ وَاِنْ لَمْ تُعْطِهٖ شَيْئًا فَالْمَانِعُ هُوَ اللّٰهُ وَاَنْتَ الْمَعْذُوْرُ۔

جو سفارش کرتے وقت اتنے بے باک ہوں، ایسے ہی بزرگ کج رد حکام کے سامنے کلمۂ حق کہہ سکتے ہیں۔

محبت اور صبر

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو آباد رکھنے کے لیے دو چیزیں عجیب و غریب پیدا کی ہیں۔ ایک محبت۔ دوسرے صبر۔

محبت نہ ہو تو کون گوشت کے لوتھڑوں کی پرورش کرے، جنھیں اللہ میاں بلوانا نہیں چاہتے وہ آخر ماؤں ہی کی مرضی سے کوڑے پر پھنکوائے جاتے ہیں۔

صبر کا بھی یہی حال ہے۔ جب کوئی اپنا دلی دوست یا عزیز مرنے لگتا ہے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اس کے ساتھ ہم بھی چلے، مگر ادھر موت واقع ہوئی اور ادھر پسماندگاں کے غم کا چراغ بھڑک کر آہستہ آہستہ بجھا۔ جنھوں نے دوست اور عزیز کے مرنے سے پہلے کھانا چھوڑ رکھا تھا، اُنھوں نے کھانا شروع کر دیا اور جنھوں نے ہنسنا بولنا بند کر رکھا تھا، اُنھوں نے ہنسنا اور قہقہے لگانا شروع کر دیا۔ صبر نہ آیا کرتا تو دنیا قایم نہ رہتی۔

محبت اور صبر دونوں نعمتیں ہماری فطرت میں سمو دی گئی ہیں،

آپ کسی سے اُس کے پردادا کا نام پوچھیے۔ شجرہ دیکھ کر بتا دے تو بتا دے، ویسے نہیں بتا سکے گا۔ دادا کو اکثر دیکھا ہوتا ہے۔ پردادا اور پرپوتے کے درمیان محبت کی ضرورت نہیں پڑتی۔

دادا سے اوپر کے بزرگوں کے ساتھ اگر تعلق رہتا ہے تو فقط اس صورت میں کہ اُن کی نسبت سے عزت بڑھے، ورنہ ایسی مثالیں ہیں کہ باپ مرگیا اور ماں نے دوسرا عقد کیا تو بچوں نے سوتیلے باپ سے رشتہ جوڑ لیا۔ ماں نے شوہر بدلا، بچوں نے ولدیت بدل ڈالی۔ اور ایسی مثالوں کی تو مطلق کمی نہیں ہے کہ باپ کے خاندان سے ماں کا خاندان اہم ہے تو باپ کا خاندان بھلا دیا گیا اور ماں کا خاندان ازبر ہوگیا۔

انسان محبت اس سے کرتا ہے جس سے اُسے کوئی شے ملتی ہے۔ ماں باپ کے

ذریعہ انسان کو وجود ملتا ہے، اور پھر ماں باپ پال پوس کر انسان بناتے ہیں، لہٰذا انسان اُن سے محبّت کرنے پر مجبور ہے۔ نیز اولاد کے دل سے ماں باپ کی محبّت سلب ہو جائے تو گرتے ہوئے ماں باپ کو اولاد کیوں سنبھالے۔ جب اولاد ماں باپ کی محتاج نہیں رہتی تو ماں باپ کے دل میں اولاد کی محبّت کم کر دی جاتی ہے۔ جتنی احتیاج اُتنی محبّت۔ محبّت کے لیے احتیاج شرط ہے۔

یہی حال صبر کا ہے۔ اگر غم جم جائے تو دنیا ختم ہو جائے۔ انسان صفِ ماتم ہی بچھائے بیٹھا رہے تو دنیا کے کام کیسے چلیں۔ اللہ تعالےٰ جنھیں سمجھتا ہے کہ اِن کی اب دنیا کو ضرورت نہیں ہے اُن کے دل میں غم کو جما بھی دیتا ہے۔ بڑھاپے کی بیوی اور بڑھاپے کے شوہر کا غم عموماً نہیں جایا کرتا۔ بوڑھے دوست بھی ایسے ہو سکتے ہیں، جن کی تقدیریں ایک دوسرے سے وابستہ رہی ہوں، ایسے دوست کا دوست کے مرجانے پر تڑپتا رہنا بلکہ مرجانا ممکن ہے۔

حضرت امیر خسروؒ

حضرت امیر خسروؒ حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاؒء کے ایسے ہی دوست اور مرید تھے۔ روحانی مرتبہ حضرت مولانا نصیر الدین چراغ دہلیؒ کا حضرت امیر خسروؒ سے فایق تھا۔ حضرت چراغ دہلیؒ، حضرت سلطان المشائخ کے جانشین ہوئے اور انھوں نے سلسلہ چشتیہ نظامیہ کو خوب چمکایا۔ حضرت امیر خسروؒ کا اس اعتبار سے نمایاں کارنامہ نہیں ہے۔ حضرت سلطان المشائخ کی طبیعت میں اور حضرت امیر خسروؒ کی طبیعت میں بھی زیادہ مناسبت نہیں تھی۔ حضرت سلطان المشائخ بادشاہوں کے سائے سے گھبراتے تھے اور حضرت امیر خسرو بادشاہوں کے مقرّب اور مصاحب تھے۔ بجلی کے تاروں کی طرح ایک کی طبیعت مثبت تھی اور دوسرے کی طبیعت منفی، لیکن دونوں کا جیسا ساتھ نبھا اور دونوں ایک دوسرے سے جیسے وابستہ رہے، اُس شان کا ساتھ اور اُس شان کی وابستگی حضرت سلطان المشائخ اور حضرت چراغ دہلی کے درمیان نہیں تھی، چناں چہ حضرت سلطان المشائخ کی رحلت کا جو اثر حضرت امیر خسرو پر ہوا وہ حضرت چراغ دہلی پر نہیں ہوا۔ حضرت چراغ دہلی سے اللہ تعالیٰ کو ابھی

کام لینا تھا اور حضرت امیر خسروؒ اپنا کام ختم کر چکے تھے۔
حضرت سلطان المشائخؒ کی رحلت کے وقت حضرت امیر خسروؒ کا قیام بنگال میں تھا۔ پورے چھ مہینے کے بعد دلی پہنچے۔ ۱۸ ربیع الثانی کو حضرت سلطان المشائخ کی وفات ہوئی تھی، ۱۷ شوال کو حضرت امیر خسروؒ دلی آئے۔ جہاں حضرت امیر خسروؒ کا مزار ہے، یہاں تک گئے تھے کہ لوگوں نے آگے بڑھنے سے روکا۔ کہا کہ حضرت سلطان المشائخ فرما گئے ہیں کہ خسروؒ میری قبر کے قریب پہنچ گیا تو شریعت میں رخنہ پڑ جائے گا۔ حضرت امیر خسرو نے وہیں کھڑے کھڑے یہ شعر پڑھا ؎

گوری سووے سیج پر، مُکھ پر ڈارے کیس
چل خُسروؒ گھر آپنے، سانجھ بھئی چو دیس

شعر پڑھ کر گرے اور دم دے دیا۔
جنھیں زندہ رکھنا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ صرف انھیں صدمہ برداشت کرنے کی قوت عطا فرماتا ہے۔

حکومتوں سے توقعات

خواجہ ناظم الدین کے دورِ حکومت میں ایک وقت ایسا آگیا تھا کہ لوگ کہتے تھے، اب یہاں خلفائے راشدین کا سا زمانہ آنے والا ہے۔ آجکل پھر وہی چرچے ہیں۔ فیلڈ مارشل محمدؒ ایوب خاں کے اعلانات نے مسلمانوں کو دوبارہ اپنے مستقبل کی طرف سے خوش گمان اور پُر امید کر دیا ہے۔
مسلمان متوقع ہیں کہ آیندہ کوئی بڑے سے بڑا شخص ذخیرہ اندوزی اور بلیک مارکٹ نہیں کر سکے گا۔ کم از کم کھانے اور پہننے کی چیزیں تو بہت جلد ٹھیک داموں بکنے لگیں گی اور ملنے لگیں گی۔ میخانے اور قمار خانے اُجڑ جائیں گے۔ صوم وصلوٰۃ کا ترک اور بدکاری کا ارتکاب ناممکن ہو جائے گا۔ سزائیں اتنی کڑی مقرر ہوں گی کہ اُن کے تصور سے جرم کرنے کی ہمت نہیں پڑے گی۔ آمدنی کی بجائے اندوختے پر ٹیکس لگے گا۔ سودی لین دین ختم کر دیا جائے گا۔
مذہبی اور سیاسی اکھاڑے فیلڈ مارشل بند کر ہی چکے ہیں۔ آیندہ مسلمان اپنے آپ کو صرف مسلمان کہیں گے اور ایک ہو جائیں گے اور اللہ کے اس حکم کی تعمیل کریں گے کہ:

"تم مشرکین جیسے مت ہوجانا، جنھوں نے اپنے دین کے ٹکڑے کر ڈالے ہیں اور جو گروہوں میں بنٹ گئے ہیں، اور ہر گروہ اُس طریقے پر نازاں ہے جسے اُس نے اختیار کیا ہے"

اور اللہ کی یہ تہدید پڑھ پڑھ کر کانپیں گے کہ:

(اے رسول!) جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا ہے اور جو گروہوں میں بنٹ گئے ہیں، تم اُن سے سروکار نہ رکھو۔ اُن کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔ اللہ انھیں بتادے گا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔"

توقعات ہیں تو بالکل واجبی اور معمولی۔ اللہ تعالیٰ توقعات کو پورا فرمائے۔

راج کمار ہردیو اور حسن سنجریؒ

شہنشاہ ہند فیروز تغلق نے دولت آباد (دکن) پر فوج کشی کی۔ دولت آباد کا نام اُس زمانے میں دیوگڑھ تھا۔ دیوگڑھ کے راجہ رام دیو کو شکست ہوئی۔ رام دیو کا ایک عزیز راج کمار ہردیو اِس شکست سے بہت غمگین تھا۔ اتفاقاً اُس کی خواجہ حسن علاء سنجریؒ سے ملاقات ہوگئی۔ خواجہ حسن علاء سنجری فیروز تغلق کی فوج کے افسروں میں تھے۔

خواجہ حسن علاء سنجری کو آپ سمجھے۔ سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہیؒ کے دو بڑے محبوب مریدوں کے نام سُنے ہوں گے۔ خواجہ امیر خسروؒ اور خواجہ حسن علاء سنجریؒ۔ دونوں مشہور شاعر ہیں۔ دونوں نے حضرت سلطان المشائخ کے ملفوظات جمع کیے ہیں۔ خواجہ حسن علاء سنجریؒ کے جمع کردہ ملفوظات کی کتاب "فوائد الفواد" خواجہ امیر خسروؒ کے جمع کردہ ملفوظات کی کتاب "افضل الفوائد" سے زیادہ مقبول ہے۔ خواجہ حسن علاء سنجری کا یہ تاریخی شعر بھی آپ کے کانوں تک شاید پہنچا ہو ؎

اے حسنؔ توبہ آں زماں کر دی

کہ ترا طاقت گناہ نہ ماند

خواجہ حسن علاء سنجری سے راج کمار ہردیو نے کہا۔ میں آپ میں اور دوسرے فوجیوں میں فرق پاتا ہوں۔ اور فوجی تو بڑے اکھڑ ہیں، مگر آپ کی باتیں میرے دل کو کھینچے لے رہی ہیں۔ چند روزہ تعلقات کے بعد راج کمار ہردیو نے فیصلہ کیا کہ اُن بزرگ کی زیارت کرنی چاہیے، جن کے مرید اتنے اچھے ہیں۔ چناں چہ وہ خواجہ حسن علاء سنجری کے ساتھ دلّی آیا اور

پھر دلّی ہی کا ہو گیا۔ بستی نظام الدین میں احمد ایاز کا مقبرہ موجود ہے۔ احمد ایاز ہر دیو کا اسلامی نام تھا۔

ایک دن راج کمار ہر دیو نے سلطان المشائخ سے عرض کیا۔ مجھے مسلمان کر لیجیے۔ سلطان المشائخ نے فرمایا۔ "بُت پرستی سے باز آؤ۔ اللہ کو ایک مانو۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لاؤ، مسلمان ہو جاؤ گے۔ مسلمان کر لیجیے میں غرض، لالچ اور جبر کا شائبہ ہے۔ مسلمان ہونے میں یہ بات نہیں ہے۔"

جانتے ہیں آپ، اِس قسم کا جواب دینے والے کون صاحب تھے، وہ جن کا کام ہی تبلیغ اسلام تھا۔ ہندستان اور پاکستان کے بارہ تیرہ کروڑ مسلمانوں کے اجداد اُن کے اور اُن جیسے بزرگوں کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں مسلمان نہیں کرتا تم مسلمان ہو جاؤ۔

یہ حضرات اپنا نمونہ اور اپنے گرد و پیش کے لوگوں کا نمونہ ایسا پیش کرتے تھے کہ طبیعت اُس دین کی طرف خود بخود مایل ہوتی تھی، جس دین کے یہ حضرات مبلغ تھے۔

دلّی کے یادگار زمانہ لوگ

کسی ضرورت سے کہیں زمین کھدوائی جاتی ہے تو کھودنے والے بیچ بیچ میں موٹام چھوڑ دیتے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ یہاں اتنی مٹی تھی، اتنی کھدائی کی گئی ہے۔

میں ۱۹۴۷ء میں دلّی سے چلا ہوں تو وہاں دلّی کی تہذیب کے متعدد موٹام چھوڑ آیا تھا۔ مفتی کفایت اللہ شاہجہان پور کے باشندے تھے، لیکن جوانی سے آخر وقت تک اُن کا لمحہ لمحہ دلّی کے گلی کوچوں میں گزرا۔ وہ تہذیبِ دہلی کا مکمل نمونہ تھے۔ شاہ کرار حسین، سجادہ نشین درگاہ صابریہ کی شان کا شخص بھی دلّی آیندہ نہیں دیکھے گی۔ لالہ مُرلی دھر شاد، فرزند سر شری رام اور سر شنکر لال جیسے وضعدار ہندو ممکن ہے دلّی میں اور موجود ہوں، مگر میں ان ہی دو سے واقف تھا، یا سر شری رام اور پنڈت زار اور اُن کے بیٹے گل زار سے واقف ہوں۔ سید وحید الدین بے خود تہذیب دہلی کے سب سے بوڑھے نمونہ تھے اور لالہ مُرلی دھر شاد سب سے جوان نمونہ، اتنے جوان کہ دلّی میں مجھ سے ملنے کا کبھی خیال نہیں کر سکے، کیوں کہ میں اُن کے باپ اور دادا کا ملاقاتی تھا۔ کراچی میں لائل پور کاٹن ملز کے کاموں کے لیے تشریف

لائے تو میرے پاس بھی آئے اور گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ اس طرح باتیں کیں کہ دورِ سیاست سے قبل کے ہندو مسلمانوں کی یاد تازہ کر دی۔ شاد بیخود صاحب کے شاگرد تھے۔ اُن کا ذکر فرماتے تو مُنھ سے پھُول جھڑنے لگتے۔ حضرت اُستاد، حضرت اُستاد کہتے کہتے زبان خشک ہُوئی جاتی تھی۔ اللہ تعالےٰ اور تبارک و تعالےٰ مرلی دھر شاد کی زبان سے کیسا بھلا معلوم ہوتا تھا۔

ہاں ہندوؤں میں گوپی ناتھ امن، سابق صدر، دہلی اسمبلی اور بیدھ ویر سنگھ، سابق وزیر دہلی اسٹیٹ جیسے لوگ بھی ہیں، جو اُمید ہے جیتے جی وضع کو نباہ دیں گے۔ امن دہلوی نہیں لکھنوی ہیں، مگر دہلوی، لکھنوی اور لاہوری کا ذکر بے معنی ہے، امن تہذیب قدیم کے زندہ موئمام ہیں۔

مسٹر آصف علی، خواجہ حسن نظامی اور مولانا احمد سعید کے موئمام ہونے میں شبہ کرنا تو کُفر ہے، دلّی عبارت آصف علی، حسن نظامی اور احمد سعید سے تھی۔ وہ کیا مرے، دلّی مر گئی۔

دلّی میں اب کیا دھرا ہے۔ دلّی کے تمام نمایاں حضرات کراچی اور لاہور میں ہیں۔ مگر بکھرے بکھرے۔ دلّی میں جتنے نمایاں حضرات رُک گئے تھے اپنی اپنی جگہ بھاری تھے۔ پیروں تلے کی زمین نکل جانے کے باوجود ہلائے نہیں ہلتے تھے۔

ہر عمل کا ردِّ عمل ہوتا ہے

غذا پر زندگی کا انحصار ہے، لیکن انسان ضرورت سے زیادہ غذا کھا لیتا ہے تو اُسے سزا ملتی ہے۔ کسی کسی کو تو موت کی سزا دے دی جاتی ہے۔ ضرورت سے زیادہ غذا کھانا جرم اور گناہ ہے۔

بعض آفتیں ایسی آتی ہیں کہ انسان جان نہیں سکتا کہ اِنھیں کون سے گناہ لائے ہیں، مگر بعض آفتوں کے نزول پر ہر انسان غور کر سکتا ہے۔ مغرب زدہ لوگ جو سزا اور عذاب کا لفظ سُن کر ہنس پڑتے ہیں، وہ بھی سوچیں گے تو مانیں گے کہ آفت بے وجہ نہیں آیا کرتی۔ اُس وجہ ہی کو ہم لوگ گناہ کہتے ہیں، جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ ضرورت سے زیادہ کھانا کھا جانا گناہ ہے۔ عمل کوئی خالی نہیں جاتا، اچھا عمل ہو یا بُرا عمل، اُس کا بدلہ ملتا ہے۔ آج ملے یا کل، اور اس دنیا میں ملے یا اُس دنیا میں، یا تھوڑا سا یہاں اور بہت وہاں۔ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ۝ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ ۝

یہ پانی کا عذاب جس نے آزادی کے بعد سے بھارت اور پاکستان دونوں کو اپنا نشانہ بنا رکھا ہے قطعی ہمارے گناہوں کا ثمرہ ہے۔ پچھلی دفعہ تو خاصا طوفانِ نوح آیا تھا۔ اسے آپ عام بداعمالیوں کا نتیجہ نہیں مانتے، نہ مانیے، مگر سولہ سال میں کئی دفعہ یہ عذاب نازل ہو چکا ہے۔ اسے مستقل طور سے روکنے کی کوشش نہ کرنا کیا آپ کے نزدیک گناہ نہیں ہے؟ یا مستقل طور سے اس کا روکا جانا محال ہے؟

چین کا دریائے موت

چین کا دریائے زرد ہر سال بہاؤ کا رُخ بدل لیا کرتا تھا اور لاکھوں مویشیوں اور انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا تھا، وہ چینیوں کے قابو میں آگیا یا نہیں۔ چند سال پہلے تک چینیوں کی زبان پر اُس کا نام دریائے زرد کی بجائے دریائے موت تھا، لیکن اب دریائے موت چینیوں کی مرضی کے مطابق بہتا ہے اور دریائے زندگی بن گیا ہے۔ پاکستانیوں کو تو اللہ تعالےٰ کے اس ارشاد سے واقف ہونا چاہیے کہ آسمان اور زمین کے درمیان جو کچھ ہے اُسے ہم نے تم انسانوں کے واسطے قابلِ تسخیر رکھا ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيْعًا ہ

ہالینڈ کا پورا ملک سمندر کے کنارے آباد ہے اور ہالینڈ کی زمین سطح سمندر سے کئی فٹ نیچی ہے۔ اس کے باوجود سمندر ہالینڈ میں گھسنے نہیں پاتا۔

آپ کی تو نگاہ سے تقدیریں بدل سکتی ہیں، دریا اور سمندر کیا شے ہیں ؎

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اصلاح، مایوسی اور کفر

دنیا میں سیاحت کر کے کیا اُنھوں نے نہیں دیکھا کہ جو لوگ اُن سے پہلے ہو گزرے ہیں، اُن کا انجام کیا ہوا۔ وہ لوگ قوت میں (بھی) بڑھ کر تھے اور اُن کے آثار جو دنیا میں (باقی رہ گئے) ہیں (موجودہ زمانے کی نسبت) زیادہ مستحکم ہیں، (لیکن جب اُنھوں نے سرکشی اختیار کی) تو اللہ نے ان کے گناہوں کی بنا پر گرفت کر لی اور اللہ کی گرفت سے انھیں بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ (سُورہ ۴۰۔ آیت ۲۱)

ناچ گانے کی محفلیں

کھیل تماشوں، ناچ گانے کی محفلوں، فلمی پوسٹروں، فحش رسالوں، حسن کے مقابلوں اور آفتابی غسلوں کے دور میں کیا نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ پارسا رہیں گے، ہم انھیں پارسا رکھنے کی کوشش کیے جائیں یا مایوس ہو کر بیٹھ جائیں؟ ان باتوں کو سوچنے کے لیے پچھلے دنوں بڑے بڑے عیسائی پادریوں کا ایک جلسہ ہوا تھا جس کے سربراہ پاپائے روم تھے۔ جلسے نے فیصلہ کیا کہ ہمت نہیں ہارنی چاہیے اور اپنا کام کیے جانا چاہیے۔ بُرے سے بُرے حالات میں بھی پارسا رہنا ممکن ہے، پارسا رہنے والا بُری سے بُری فضا میں پارسا رہ سکتا ہے۔

عیسائیوں نے فیصلہ ٹھیک کیا۔ جنھوں نے بے راہ روی کا احساس کر لیا ہے وہ اپنی قوم کو ضرور راہِ راست پر لے آئیں گے۔ تشخیص کے بعد مرض کا علاج دشوار نہیں ہوتا اور موت کے سوا ہر مرض کا علاج ہے، لیکن بے راہ روی کا احساس اور مرض کی خبر ہی نہ ہو، جیسا کہ ہم، آجکل کے مسلمانوں کو نہیں ہے تو ہمارے حق میں تو موجودہ دور مرض الموت ہے۔ ہم کھیل تماشوں کو لہو و لعب نہیں سمجھتے۔ ناچ گانوں سے ہماری ثقافت کی تکمیل ہونے لگی ہے۔ فلمی پوسٹروں اور فحش رسالوں کے خلاف زبان کھولنا آرٹ کی توہین ہے۔ حسن کے مقابلے اور آفتابی یا ماہتابی غسل تنزل کی نہیں، ترقی کی نشانیاں ہیں۔

ہم ان چیزوں میں خرابی ہی نہیں پاتے تو ہمیں اپنے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے پارسا رہنے نہ رہنے کی فکر کیوں ہو اور انھیں پارسا رکھنے کا سوال ہمارے ہاں کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔

میں مایوس نہیں ہوں۔ اسلام نے مایوسی کو کفر کہا ہے۔ اَلْیَاْسُ مِنَ الْکُفْرِ۔ فرداً فرداً ہر مسلمان موجودہ حالات میں بھی اپنی اصلاح کر سکتا ہے، مگر مسلمانوں کی پوری قوم میرے اور آپ کے بس کی نہیں ہے اور جن کے بس کی ہے رونا اُن ہی کے بگاڑ کا ہے۔ ہمارے اُمرا اور عُلما کا طبقہ درست ہو جائے تو ساری قوم درست ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں گزشتہ قوموں کی تاریخ پڑھنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے کہ ان کی تباہی اور بربادی کے اسباب پر نظر غائر ڈالو، اور ایسی باتوں سے بچو، جنھوں نے گزشتہ قوموں کو تباہ و

برباد کیا تھا ورنہ تمھیں بھی اُن کی طرح آفات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

پُرانے اور نئے تصوّرات

"اُن کو شہرت سے کیا حاصل ہُوا کہ ہم کو تم کو ہوگا" یہ ایک بہت مشہور اور بہت بڑے شخص کا فقرہ ہے، جس کی بڑائی کا اعتراف علّامہ اقبالؔ اِن الفاظ میں کر گئے ہیں۔

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

اور مولانا حالیؔ نے فرمایا ہے ؎

طالب و عرفی و اسیر و کلیم — لوگ جو چاہیں اُن کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے — ہے ادب شرط مُنھ نہ کھلوائیں
غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

اَب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے، وہ مشہور اور بڑے شخص مرزا اسد اللہ خاں غالب ہیں۔ مندرجہ بالا فقرہ اُنھوں نے اپنے شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھا تھا۔

غالب نے زندگی میں بھی عزّت پائی اور آج بھی اُن کی قدر کی جا رہی ہے۔ پاکستان کے اُردو نوازوں سے زیادہ بھارت کے ہندی نواز اُن کی قدر کر رہے ہیں۔ بھارت کا محکمہ ڈاک اپنے ٹکٹوں پر اُن کی تصویر چھاپ چکا ہے۔ بھارت کی حکومت اُن کا مکان محفوظ کرنے والی ہے اور طرح طرح سے اُنھیں یاد رکھا جا رہا ہے۔

انسان اِن ہی باتوں پر جان دیا کرتا ہے کہ زندگی میں عزّت ملے اور مرنے کے بعد نام چمکے۔ غالب کا نام مرنے کے بعد جتنا چمکا ہے اُتنا بادشاہوں کا نہیں چمکتا مگر غالب کہتے ہیں:

"اُن کو شہرت سے کیا حاصل ہُوا کہ ہم کو تم کو ہوگا"

حقیقت یہی ہے کہ مرنے کے بعد اگر اللہ کی خوشنودی میسّر نہ آئی تو دنیا کی عزّت و شہرت سے کیا حاصل ہے۔

غالب مولوی صاحب یا شاہ صاحب نہیں تھے، لیکن سو برس پہلے کے شاعروں اور ادیبوں کے جذبات اور خیالات اس قسم کے ہوتے تھے۔

اب ذرا سو برس بعد کے شاعروں اور ادیبوں کے جذبات اور خیالات کا نمونہ ملاحظہ کیجیے :۔

"امیر خاں کیلے کھاتا رہا۔ ہم پیتے رہے۔ وزیر خاں بولا۔ امیر کیوں نہیں پیتا۔ میں نے کہا۔ اُس کی مرضی۔ وزیر خاں بولا۔ یہ سالا کیسا ادیب ہے، بغیر پیے، لوگوں کو ادیب بننے کا حق کیا ہے۔ میں نے کہا۔ واقعی میری سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ تمام اچھی اچھی چیزیں اسلام نے ممنوع کیوں قرار دی ہیں۔ جاوید نے پوچھا، مثلاً۔ میں نے کہا، جیسے شراب۔ موسیقی۔ سنگ تراشی مصوری۔"

واحدی عرض کرتا ہے :

اِن نینن کے یہی پریکھ
وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

غالب بھی شراب پیتے تھے، لیکن شراب پینا اُن کے نزدیک خوبی اور وصف نہیں تھا۔ غالب بھی کبھی جوان تھے۔ اُس وقت اُن کا تخلّص اسد تھا۔ جوانی میں اُنھوں نے فرمایا تھا ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد

بوفے اور وزیر کا بوفے

یہ قریباً پچپن برس پہلے کی بات ہے، علی گڑھ کالج کے طلبا اور اولڈ بوائز پر جس زمانے میں انگریز اور انگریزیت کا بے حد غلبہ تھا، وہاں کے ایک اولڈ بوائے مسوری پہاڑ تشریف لے گئے۔ شام کو پہنچے۔ صبح غسل کیا اور ہوٹل کے بیرے سے فرمایا، چائے کے ساتھ کچے شلجم لانا۔ دوپہر کے وقت اُنھیں اتنے زور کا بخار چڑھا کہ ڈاکٹر بلانا پڑا۔ ڈاکٹر نے پوچھا، کیا کیا کھایا تھا۔ ڈاکٹر انگریز تھا، جب اُسے معلوم ہُوا کہ ناشتے میں شلجم کھائے تھے تو وہ بولا کہ انگریز شلجم اس لیے کھاتے ہیں کہ رات کو شراب پیتے ہیں۔ کچا شلجم شراب کی حدت کم کر دیتا ہے۔ آپ نے شراب نہیں پی تھی تو شلجم کیوں کھائے۔ ٹھنڈی جگہ، پھر صبح کی ٹھنڈک، اور صبح صبح غسل اور کچے شلجم۔ نمونیہ ہو گیا۔ خیر اللہ نے بچا لیا۔ اُس زمانے میں نمونیہ مہلک مرض تھا۔

جنگِ عظیم کے بعد سے کھانا کھانے کا نیا اور انوکھا طریقہ نکلا ہے، اہلِ جنگ کو اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کی فرصت نہیں ملتی تھی، اُنھوں نے کھڑے رہ کر کھانا کھانا شروع کر دیا اور اِس کا نام رکھا بوفے (BUFFET)، جس طرح کپڑے کی قلت کی وجہ سے آدھی آستین کی بُش شرٹ پہنتے ہیں جو قمیص اور کوٹ دونوں کا کام دیتی ہے، یا گھٹنوں سے اونچا نیکر پہنتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی صاحب مرحوم ۵۲-۱۹۵۱ ش میں کراچی آئے تو ایک وزیر نے اُن کی دعوت کی۔ میں بھی مدعو تھا۔ خواجہ صاحب اور وزیر صاحب اور چار اور وزیر الگ میز پر بیٹھ گئے اور باقی مہمانوں سے کہا گیا کہ بڑی میز پر کھانا چُنا ہوا ہے اور پلیٹیں رکھی ہیں۔ پلیٹوں میں کھانا لیتے جائیے اور کھڑے کھڑے کھائیے۔ دستِ خود دہانِ خود۔

جس کمرے میں کھانا کھایا جا رہا تھا وہ چھوٹا سا کمرہ نہیں تھا، وزیر پاکستان کی عظیم الشان کوٹھی کا ڈائننگ ہال تھا۔ میز جس پر کھانا چُنا ہوا تھا اس کے گرد اسّی نوّے کرسیاں بچھ سکتی تھیں، اور مہمان کل تینتیس پینتیس تھے، لیکن کرسیاں دانستہ ہٹا دی تھیں، تاکہ فرنگیوں کی تقلید کا شرف حاصل ہو جائے۔

خیر میں بوفے سے بہت گھبراتا ہوں۔ وزیر صاحب کے پرائیویٹ سکرٹری نے میری گھبراہٹ محسوس کی، اور مجھے میز سے ذرا دور کرسی پر بٹھا دیا اور وہیں کھانا لا لا کر کھلاتے رہے، لیکن یہ کھڑے ہو کر کھانے سے زیادہ بدتمیزی کی بات تھی کہ سب تو کھڑے ہوں اور میں بیٹھ جاؤں۔

رئیس الاحرار مولانا محمد علی کے لفٹننٹ عبدالرحمٰن صدیقی کا واقعہ یاد آ گیا صدیقی صاحب جب کلکتہ میونسپل کارپوریشن کے میئر تھے تو اسی شان کی دعوت سے انھیں سابقہ پڑا تھا۔ صدیقی صاحب نے میزبان کو بتایا کہ بھائی! میں بچپن میں کبھی کھڑے کھڑے پانی بھی پی لیتا تھا تو میری اماں ڈانٹتی تھیں کہ اللہ کی نعمت کی ناقدری نہ کرو، میں کھانا کھڑے کھڑے کیسے کھا سکتا ہوں۔ میزبان نے صدیقی صاحب کے لیے فوراً کرسی منگا دی۔ صدیقی صاحب نے فرمایا۔ یہ اور زیادہ بدتمیزی ہے کہ سب کھڑے رہیں اور میں کرسی پر بیٹھوں۔ صدیقی صاحب نے کھانا نہیں کھایا۔

میرا موجودہ گھر

میں کراچی آکر پانچ سال ایک جگہ رہا اور دس سال دوسری جگہ، آجکل تیسری جگہ ہوں۔ اللہ سے دُعا ہے کہ اب ہماری خانہ بدوشی کی زندگی ختم فرما دے۔ اِس تیسری قیامگاہ سے ہمیں نہ نکالے ہم یہاں اطمینان اور آرام کی زندگی بسر کریں۔ ہمارے گناہ اب معاف ہوجائیں۔ حُطَّ عَنَّا ذُنُوبَنَا۔

موجودہ قیام گاہ شہر سے آٹھ نو میل باہر ہے، نارتھ ناظم آباد میں، جہاں آبادی ابھی چھدری ہے۔ میرے مکان سے متصل کوئی مکان نہیں ہے۔ مکان ہیں، مگر دُور دُور۔

دِلّی میں ساٹھ باسٹھ برس کی عمر تک ایک ہی مکان میں رہا تھا، یہاں سولہ برس میں یہ تیسرا مکان ہے۔ دلّی میں آدمیوں سے اتنا گھِرا رہتا تھا کہ بعض اوقات بولا اُٹھتا تھا، اب اتنی تنہائی ہے کہ بھولا بسرا آدمی آنکلتا ہے تو خوش ہوجاتا ہوں اور حیرت شملوی کا مصرع پڑھتا ہوں ؎

تم آگئے تو رونق کاشانہ ہوگئی

بس لکھنے پڑھنے کا شغل ہے۔ یا سامنے تین منٹ کے فاصلے پر پہاڑ ہے، اُس کا نظارہ بھی دل کو بہلاتا ہے۔ خصوصاً صبح یہاں کی ایسی پُرکیف ہے کہ صبح بنارس کیا ہوگی۔ جاڑے میں طویل اور عریض جنگل شبنم سے پٹ جاتا ہے اور کُہر سے ڈھک جاتا ہے۔ گرمی میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔

مکان کے اندر چاروں طرف کیاری ہے۔ اُس میں قسم قسم کے پھول ہیں۔ آج کی کلی دوسرے دن پھول بن جاتی ہے اور تیسرے دن مجھے مرے ہوؤں کی یاد دلاتی ہے۔ کچھ پھولوں کی عمر طویل ہوتی ہے، کچھ کی مختصر۔

بالکل گھانس جیسی ایک چیز ہے، اُس میں روز آٹھ ساڑھے آٹھ بجے نہایت حسین مخملی پھول کھِلتے ہیں اور دو ڈھائی بجے ایسے غایب ہوجاتے ہیں کہ پتہ نہیں لگتا کہ گئے تو کہاں گئے اور میری زبان پر حیرت شملوی کا یہ شعر آجاتا ہے ؎

مِل جائے تو بتلاؤں کہ کیا ڈھونڈھ رہا ہوں

شبنم میں، نسیم سحری میں، گُل تر میں

اُف یہ اختلافات!

اسلامی ملک پاکستان میں ہجری تاریخ کا صرف رمضان، عید، بقرعید، محرم اور شب برات کے وقت خیال آجاتا ہے، ویسے غالباً مولوی صاحبان بھی استعمال عیسوی تاریخوں ہی کا کرتے ہیں۔ لیکن جب سے حکومت کو ہجری تاریخ سے دل چسپی پیدا ہوئی ہے، ہم دقیانوسی مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ جو مسلمان ابھی تک بھولے نہیں ہیں کہ ہجری تاریخ کو ہمارے پیشوا کی ہجرت سے تعلق ہے وہ چکرا جاتے ہیں کہ ہجری تاریخ کون سی مانیں اور کون سی نہ مانیں۔ حکومت کہتی ہے، پانچ جون ۱۹۶۲ء کو محرم ۱۳۸۲ھ کی دو تاریخ تھی، مولوی صاحبان کہتے ہیں، نہیں، محرم کی پہلی تھی۔ خاصی دو عملی چل رہی ہے۔

مجھے اس دو عملی سے اتنی تکلیف ہے جتنی اس خبر سے ہے کہ مصر کے صدر جناب ناصر نے بھارت کے سفیر مسٹر عظیم حسین سے وعدہ کیا ہے کہ یو۔ این۔ او میں جب کشمیر کا معاملہ پیش ہوگا تو مصر بھارت کی ہمنوائی کرے گا، پاکستان کو مدد نہیں دے گا۔ بلکہ اس قسم کی خبروں سے اتنی تکلیف کیا ہوگی، ایسی خبروں کے سننے کی تو طبیعت عادی بن چکی ہے۔ معلوم ہے کہ مسلمان مملکتیں اپنی ڈفلی بجاتی ہیں اور اپنا راگ گاتی ہیں۔ مسلمان حاکموں کے پیش نظر اپنی اپنی ذات ہے، اسلام، ملک اور پبلک نہیں ہے۔ لیکن ہجری تاریخ کے اختلاف کو طبیعت گوارا نہیں کرتی۔

بڑے جانیں اور بڑے اختلاف جانیں، ہم چھوٹے تو چھوٹے اختلافوں سے گھٹے جاتے ہیں۔

اچھائی اور برائی

یاد نہیں، کہاں پڑھا ہے، یا بس سُنا ہی سُنا ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا ہے، جس مسلمان کی مرنے کے بعد چالیس آدمی بھی تعریف کر دیں، وہ جنّتی ہے۔

اور خیر یہ تو حدیث ہے ہی کہ مرنے والوں کی اچھائیاں بیان کیا کرو، برائیاں نہ بیان کیا کرو۔ اُذکُرُوا اَمْوَاتَکُمْ بِالْخَیْر۔

عام طور سے مرنے کے بعد تعریف جب ہی کی جاتی ہے جب لوگوں نے مرنے والے میں کچھ اچھائیاں دیکھی ہوتی ہیں، لیکن حضورؐ فرماتے ہیں، مرنے والے کی اچھائیوں کو اُبھارو اور برائیوں کو نظر انداز کرو، مرنے والے کے لیے اُس کی اچھائیوں کا تذکرہ ذریعہ بخشش بن جائے گا۔

اللہ تعالےٰ ویسے بھی بخش سکتا ہے، لیکن مرنے والے کی اچھائیاں بیان کرنے سے ایک تو تمہارا اخلاق سنورے گا، اچھائیاں بیان کرنا اچھی بات ہے، برائیاں بیان کرنا بری بات۔ دوسرے ہر شخص کو خیال رہے گا کہ وہ خلق اللہ کو مطمئن اور خوش رکھے تاکہ خلق اللہ مرنے کے بعد اُسے اچھا کہے۔

ہر انسان چاہتا ہے کہ اُسے اچھا سمجھا جائے اور اچھا کہا جائے۔ یہ انسانی فطرت ہے جو اِس فطرت کو ضایع کر دیتے ہیں وہ ڈھیٹ قسم کے غلط کار ہو جاتے ہیں، جیسے چور، ڈاکو، رشوت خوار، زناکار، لیکن جو اِس فطرت کو فربہ کر لیتے ہیں، وہ بھی بگڑ جاتے ہیں، جیسے بعض علما، بعض مشایخ، بعض لیڈر، بگاڑ یہاں نہ کھلے، نہ سہی، اللہ کے ہاں پہنچ کر ضرور کھل جائے گا۔

خداداد قوتوں اور فطرتوں کا مٹ جانا بھی بدنصیبی ہے اور اُنھیں اُن کی حدود سے بڑھانا بھی بدنصیبی ہے۔

اِتنی حد تک تعریف ہونے میں قطعی حرج نہیں ہے کہ تعریف سے اُس کام کا شوق ترقی کرے جس کام کی وجہ سے تعریف کی جارہی ہے۔ مگر تعریفوں کے جال میں اگر پھنس گئے تو مارے گئے۔

نپولین بہت سی فتوحات کر کے پیرس آیا تو اُس کی خوب آؤبھگت ہوئی۔ ایک دن نپولین نے کہا، اب پھر اُسی کام میں لگ جانا چاہیے جس کام نے آؤبھگت کرائی ہے، ورنہ آؤبھگت ایک دن ختم ہو جائے گی، اور میں اکیلا کھڑا رہ جاؤں گا، کوئی مجھے نہیں پوچھے گا۔

تعریف کی حد

تمام چیزوں کی طرح تعریف کی بھی حد ہے۔ تعریف کا حد سے آگے نکلنا تعریف کرنے والے کو نظروں سے گرا دیتا ہے اور جس کی تعریف کی جاتی ہے اُسے سخت نقصان پہنچاتا ہے۔ قدردانی (APPRECIATION) سے آگے تعریف کو نہیں نکلنا چاہیے۔ قدردانی ضروری

شے ہے۔ قدردانی سے کام کے جاری رکھنے اور زیادہ اچھی طرح کرنے کی تحریک ہوا کرتی ہے، ناقدری سے دل بجھ جاتا ہے، لیکن تعریف اس حد سے آگے نکلی، مثلاً آپ نے مولوی صاحب کے، یا شاہ صاحب کے، یا لیڈر صاحب کے ہاتھ پاؤں چومنے شروع کر دیے تو آپ خوشامدی کہلائیں یا نہ کہلائیں اپنے ممدوح کو آپ امتحانِ عظیم میں ڈال دیں گے۔ ہاتھ پاؤں چومے جانے کے بعد کسی کا قابو میں رہنا اور غلط فہمی اور غرور میں مبتلا نہ ہونا جنید و بایزید کا ظرف چاہتا ہے۔ ایسے ظرف ملتے ہیں، مگر کم لوگوں کو ملتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو تعریف اور تحریک کی منزل سے گزر جاتے ہیں، تعریف و تحریک کی فطری خواہش کو دباتے نہیں، بلکہ اس خواہش کی منزل سے گزر جاتے ہیں۔

تدبیر، تقدیر اور دُعا

اللہ تعالٰے کی اپنی شان تو یہ ہے کہ جب (کسی کام کو کرنا چاہتا ہے، یا) کسی چیز کو وجود میں لانا چاہتا ہے تو فرماتا ہے، ہو جا، بس وہ ہو جاتی ہے۔ اِنَّمَآ اَمۡرُہٗۤ اِذَآ اَرَادَ شَیۡئًا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ[١]۔ لیکن انسانی کاموں میں اس نے دوسرا طریقہ رکھا ہے۔ انسان کو احکام اور قوانین اور ضابطوں قاعدوں کی پابندی کرا کر پھل دیتا ہے۔ پہلے بوؤ اور پسینہ بہاؤ، پھر ایک دانے کے ہزار ہزار دانے کاٹو۔ اُسے قدرت ہے کہ بغیر بوئے فصل اُگا دے، مگر ایسا کرتا نہیں، بلکہ قوانین زراعت کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو فصل کو جلا ڈالتا ہے۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے: اَلسَّعۡیُ مِنِّیۡ وَالۡاِتۡمَامُ مِنَ اللہِ۔ ہمارا فرض ہے کہ جدّوجہد کریں، جدّوجہد کو بار آور اللہ کرے گا۔ ہمیں جدّوجہد کرنی چاہیے اور اُس کے بار آور ہونے کو اللہ پر چھوڑنا چاہیے۔ اِس کے معنی ہیں کہ انسان کی تمنّائیں سعی و عمل کے بغیر نتیجہ نہیں دکھاتیں۔ تدبیر کیجیے اور تدبیر کرنے کے بعد دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائیے۔ لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی[٢] نہیں واسطے آدمی کے مگر جو کچھ سعی کی ہے۔ وَقَالَ رَبُّکُمُ ادۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ[٣]۔ تمھارے رب نے کہا ہے، تم مجھ سے دُعائیں مانگو میں تمھاری دعائیں قبول کروں گا، مگر اِنَّ الَّذِیۡنَ یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِیۡ سَیَدۡخُلُوۡنَ جَہَنَّمَ دٰخِرِیۡنَ[٤]

---

[١] سورہ ٣٦ - آیت ٨٢ [٢] سورہ ٥٣ - آیت ٣٩ [٣-٤] سورہ ٤٠ - آیت ٦٠

مگر جو لوگ متکبر ہیں اور میرے احکام کی تعمیل نہیں کرتے (اور میرے قوانین کی پابندی سے سرتابی برتتے ہیں، اُنھیں احکام نہ ماننے اور قوانین پر نہ چلنے کی سزا بھگتنی پڑے گی) وہ عنقریب ذلیل و خوار (اور ناکام) ہو کر جہنّم میں جا گریں گے۔ یہ تو کافروں کا شیوہ ہے کہ اللہ کے احکام اور قوانین کی خلاف ورزی کیے جاتے ہیں اور امید باندھتے ہیں کہ اللہ انھیں سرسبز کرے گا۔
وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِىْ ضَلٰلٍ[1]۔

دعا کے ساتھ تدبیر ضروری ہے اور تدبیر کے ساتھ دعا ضروری۔ تدبیر یہی ہے کہ اللہ کے احکام اور قوانین اور ضابطوں قاعدوں سے سرکشی نہ کی جائے۔

اگر تدبیر کرنے کے باوجود دُعا قبول نہ ہو تو سمجھ لیجیے کہ احکام اور قوانین اور ضابطوں، قاعدوں کی تعمیل میں کہیں جھُول رہ گیا ہے، یا پھر اللہ تعالےٰ ہمیں کوئی نعمت اِس سے بہتر عطا فرمانے والا ہے۔ اللہ کسی صحیح اور اچھے عمل کو ضایع نہیں کیا کرتا۔ اُس کا ارشاد ہے۔ اَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ[2]۔

مشرق، مغرب اور صفائی

مذہب پرست اور روحانیت دوست ممالک ہندستان و پاکستان میں ستّر فی صدی اور پچھتّر فی صدی انسانوں کی جیسی خراب حالت ہے ویسی لامذہب اور غیر روحانی ملکوں میں مویشیوں کی نہیں ہے۔ یورپ، امریکا اور روس وغیرہ کے جانور ہندستان و پاکستان کے انسانوں سے بڑھ کر صاف سُتھرے، تندرست اور تنومند ہیں۔ وہاں جانور لاوارثے نہیں پھرتے، یہاں انسان لاوارثے پھرتے ہیں۔ وہاں جانور کی پرسش ہے، یہاں انسان نے انسان کو بھُلا دیا ہے۔

ہندستان کی دو تہائی آبادی گائے کی پجاری ہے۔ ہندو ہونے کے لیے خدا کا ماننا لازمی نہیں ہے، گائے کا ماننا لازمی ہے، لیکن اِس معبود کو ہندو رکھتے کہاں ہیں؟ مکان کے کس گوشے میں ہندوؤں کی یہ ماتا رہتی ہے؟ مکان کے ایسے گوشے میں جہاں روشنی اور ہوا کا گزر نہیں ہوتا۔ جہاں اُسے دق لگ جاتی ہے۔

لامذہب اور غیر رُوحانی ملک جانوروں کا کام مشینوں سے لیتے ہیں، مذہبی اور رُوحانی

---

[1] سورہ ۴۰ - آیت ۵۰ [2] سورہ ۱۲ - آیت ۵۶

ممالک میں آپ نے جانوروں کا کام انسانوں سے لیتے اور انسانوں کو انسانوں کا گھوڑا بنتے دیکھا ہوگا۔

انسان کی غلاظت انسان ہندستان اور پاکستان کے کس شہر میں نہیں اُٹھاتا۔ ذرا ملاحظہ کیجیے۔ ساون کا مہینہ ہے۔ سب بارانِ رحمت سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، مگر ایک انسان بالکل ہمارے ہی جیسا انسان، فقط مرد صورت نہیں، عورت صورت بھی سامنے سے جا رہا ہے۔ اُس کے سر پر بڑا سا ٹوکرا ہے۔ اس ٹوکرے میں کھاد نہیں ہے، گوبر نہیں ہے، جانوروں کی غلاظت نہیں ہے، انسانوں کی غلاظت ہے، اور وہ غلاظت بارش سے بہہ بہہ کر مُنھ پر آ رہی ہے۔

انگریز ہمیں جو چند چیزیں اچھی دے گئے ہیں، اُن میں فلش سسٹم بڑی اچھی چیز ہے۔ لیکن ہم نے اُس کی بھی مٹی پلید کر ڈالی ہے۔

پاکستان قایم ہونے سے پہلے دلّی میونسپل کمیٹی کا کوئی ممبر کراچی آنکلتا تھا تو دِلّی واپس جا کر یہاں کی صفائی ستھرائی کے پُل باندھ دیتا تھا اور دلّی میونسپل کمیٹی کے محکمۂ حفظانِ صحت کو خوب جھاڑتا تھا۔ میں اکتوبر ۱۹۴۷ء میں کراچی پہنچا تو میں نے بھی یہاں واقعی صفائی ستھرائی کے آثار پائے۔ لیکن اب کیفیت کیا ہے؟ میں کراچی شہر کے اندر منجھ میں نہیں، کراچی سے سات آٹھ میل باہر اُس جگہ بیٹھا ہوں جو قدرتی ہوا کے اعتبار سے کراچی کی بہترین جگہ ہے اور کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی اور کراچی میونسپل کارپوریشن، دو جماعتیں جس کی نگران ہیں، یعنی نارتھ ناظم آباد، مگر دونوں جماعتیں اتنا انتظام نہیں کر سکتیں کہ گٹر صاف رہیں اور غلاظت ان میں سے نہ اُبلے اور رہیں کہنا نہ پڑے کہ اس فلش سسٹم سے تو ڈرامی سسٹم بہتر تھا۔

ہم غالباً ابھی یہ نہیں جانتے کہ ہسپتالوں سے زیادہ حفظانِ صحت کی طرف توجّہ دینی چاہیے۔ حفظانِ صحت کی طرف توجہ کرنے سے ہسپتالوں کا خرچ گھٹتا ہے اور لوگ بیماریوں کی تکلیف سے بچ جاتے ہیں۔ بیماری میں مبتلا کر کے علاج کرانا ہرگز قابلِ تعریف نہیں ہے۔

اسلامی اور مغربی سیاست

اسلام نام ہے زندگی کے تمام شعبوں کے نظام کا، جن میں عبادات، اخلاق اور

معاملات سب چیزیں شامل ہیں۔ اسلام خالی پوجا پاٹ کا مذہب نہیں ہے، یا محض اخلاقی ضابطہ نہیں ہے۔ سیاست بھی اسلام کا ایسا ہی جزو ہے جیسا عبادت جزو ہے۔ کوئی مسلمان سیاست میں اللہ اور رسول کی راہ نمائی سے بے نیازی اور بے اعتنائی برتتا ہے تو وہ اُسی طرح گناہگار ہے جس طرح ادائگی نماز میں غفلت کرنے والا گناہگار ہے۔ اسلامی حکومت قائم ہو اور اسلامی سیاست رائج ہو تو اسلامی سیاست سے اپنی قابلیت اور حیثیت کے مطابق وابستہ رہنا مسلمان پر فرض ہے۔ اسلامی سیاست اور مغربی سیاست میں زمین آسمان کا فرق ہے، اور مغربی سیاست کا جو بدترا ہم مشرقیوں نے بنایا ہے، اس کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اسلامی سیاست کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

میدان بدر میں ایک طرف مشرکین کے ہزار سے اوپر آدمی جمع ہیں اور دوسری طرف تین سو تیرہ مسلمان ہیں۔ جنگ شروع ہونے والی ہے، کہ ایک صحابی ادھر سے گزرے جدھر مشرکین نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ مکے گئے تھے اور واپس لوٹ رہے تھے۔ راستے میں مشرکین کے ہاتھوں میں پڑنا ہی تھا مشرکین نے پکڑ لیا اور کہا۔ اس شرط پر چھوڑتے ہیں کہ وعدہ کرو، ہم سے لڑنے نہیں آؤ گے۔ انھوں نے وعدہ کر لیا، مشرکین نے چھوڑ دیا۔ مدینے پہنچ کر صحابی نے سوچا، مشرکین سے وعدہ خلافی کرنا گناہ نہیں ہو سکتا، وہ جنگ میں جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ماجرا سنا تو فرمایا، ایفائے وعدہ ضروری ہے، تم اِس جنگ میں شرکت نہیں کر سکتے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جنگ کے وقت ایک آدمی کی کمی اور ایک آدمی کے اضافے کے کچھ معنی تھے، مگر حضورؐ نے ایفائے وعدہ کے سامنے جنگی نقصان کی پرواہ نہیں کی۔ سیرت کی پاکیزگی اسلام کے نزدیک جہاد کی شرکت سے زیادہ اہم اور فائق شے ہے۔ جس کی سیرت غیر پاکیزہ ہے اُس کے جہاد کو اسلام نفسانیت قرار دیتا ہے۔ اسلامی سیاست کھری اور STRAIGHT FORWARD قسم کی سیاست ہے۔

سیاست کیا ہے؟

کام چھوٹا ہو یا بڑا، اُسے سمجھ داری اور ہوشیاری کے ساتھ انجام دینے کا نام سیاست ہے۔ سائیس گھوڑے کو سدھاتا ہے، سائیس کہلاتا ہے۔ سائیس کے معنی ہیں صاحب سیاست۔

نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ دولھا دُلھن جذبات کی رو میں نہیں بہہ جاتے، شروع ہی سے عاقلانہ برتاؤ رکھتے ہیں۔ یہ بھی سیاست ہے۔ آپ اپنے گھر کو جنت بنا دیتے ہیں، پڑوسیوں کی خدمت کے لیے تیار رہتے ہیں۔ محلّے والوں کے دل میں گھر کر لیتے ہیں۔ علاقے والے دیکھتے ہیں کہ آدمی ٹھیک ہے۔ وہ خود ملتجی ہوتے ہیں کہ میونسپل کمیٹی میں ہماری نمایندگی فرمایئے۔

عرفِ عام میں اور اصطلاحاً جسے سیاست کہا جاتا ہے، میونسپل کمیٹی اُس کی ایک ابتدائی شکل ہے اور اسمبلی و پارلیمنٹ اُس کی ایک انتہائی شکل۔ اِس سیاست کو اُسی انسانیت اور شرافت کے ساتھ برتیے جیسا گھریلو اور محلّہ داری کی سیاست کو برتا جاتا ہے۔ اِس سیاست کو بھی شریفانہ عقل اور بصیرت سے انجام دیجیے، غیر شریفانہ ہتھکنڈے مت اختیار کیجیے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی سیاست کے نمونے آپ کے پاس ہیں، اور خود حضور سرورِ کائناتؐ کا اُسوۂ حسنہ موجود ہے۔

حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی مرتضےٰؓ سے لوگوں نے اختلاف کیا، لیکن کسی نے اُنھیں بداخلاق نہیں بتایا۔ یہ دونوں خلفا بھی آپ کے لیے مثالیں ہیں۔

صاحبِ اخلاق مسلمان ہار جاتا ہے تو حسین ابن علی کی صف میں جگہ پاتا ہے اور بداخلاق جیت کر یزیدیوں میں کھڑا نظر آتا ہے۔ اللہ کی خوشنودی مطلوب ہے تو اللہ کی خوشنودی حضرت امام حسینؓ کی طرح شکست کھانے سے بھی حاصل ہو سکتی ہے اور عزت درکار ہے تو عزت بھی حضرت امام حسینؓ کی طرح شکست کھانے سے مل سکتی ہے۔ حضرت امام زین العابدینؒ حجرِ اسود کو بوسہ دینے تشریف لاتے ہیں تو حجرِ اسود کے پاس کی بھیڑ چھٹ جاتی ہے اور اُسی وقت خلیفہ ہشام حجرِ اسود کو بوسہ دینے کے لیے بڑھتا ہے تو حجرِ اسود کے پاس سے کوئی نہیں ہٹتا۔

مغربی سیاست کا استعمال

مغربی سیاست کا ہم مشرقیوں نے ایسا بُرا استعمال کیا ہے کہ سیاست مشرق بدنام ہے۔ سیاست بُری چیز نہیں ہے لیکن بُرے استعمال نے اُسے بُرا بنا دیا ہے۔

دلّی کے ایک ممبر میونسپل کمیٹی تھے، خان بہادر ایس۔ ایم۔ عبداللہ۔ ایکسپورٹ امپورٹ اُن کا پیشہ تھا۔ اُنھوں نے مجھ سے فرمایا کہ میں یورپ خط لکھتا ہوں تو اس لیٹر پیپر

پر لکھتا ہوں، جس میں میری میونسپل کمیٹی کی ممبری اور خطاب یافتگی کا ذکر ہے اور ہندستان کے اندر خط وکتابت کرتا ہوں تو دوسرا لیٹرپیپر لیتا ہوں جو اِن امتیازات کے تذکرے سے خالی ہے۔ یورپ میں ان امتیازات کی قدر کی جاتی ہے، یہاں اِن کا اُلٹا اثر پڑتا ہے۔

دِلّی کا ڈپٹی کمشنر

دلی کے ایک ڈپٹی کمشنر تھے، مسٹر ایونز۔ ایران میں رہ چکے تھے، اس لیے جدید فارسی خوب بولتے تھے اور سرمد شہید پر کتاب لکھنے والے تھے۔ دلّی کا ڈپٹی کمشنر دلی کی میونسپل کمیٹی کا صدر ہوتا تھا۔ مسٹر ایونز چھ مہینے کی چھٹی لے کر لندن جانے لگے تو میں بھی انھیں رخصت کرنے ہوائی اڈے گیا۔ ممبران میونسپل کمیٹی کے علاوہ سب ججوں اور مجسٹریٹوں کا مجمع تھا۔ ایک سب جج نے مسٹر لوئس ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر سے کہا، اب آپ کو ڈپٹی کمشنری کی ذمہ داری سنبھالنی ہے۔ مسٹر لوئس بولے "ڈپٹی کمشنری تو خیر سنبھال لوں گا، مجھے فکر علی بابا چالیس چوروں کی ہے، اُن سے کیسے نمٹوں گا۔ دلی میونسپل کمیٹی کے ممبروں کی تعداد چالیس تھی۔

مسٹر لوئس اور مجسٹریٹ اور سب جج مجھے نہیں پہچانتے تھے، کیوں کہ میں حکام کے ہاں نہیں جاتا تھا۔ مسٹر لوئس نے بے دھڑک میرے سامنے علی بابا چالیس چور کی پھبتی میونسپل کمیٹی کے ممبروں پر کس دی۔ مسٹر لوئس دیسی عیسائی تھے۔

اگرچہ مسٹر لوئس کو ممبران میونسپل کمیٹی کا خراب تجربہ نہیں ہوا، لیکن عام طور سے پبلک پر اور حکام پر ممبران میونسپل کمیٹی، ممبران اسمبلی اور ممبران پارلیمنٹ کا یہ اثر ہوتا ہے جس کی دو مثالیں آپ نے ملاحظہ کی ہیں۔ ممبری سے الگ رہنے والے اہل سیاست کی عزت کا بھی اعتبار نہیں۔ صبح ہے، شام تک غایب۔ مگر میونسپل کمیٹی، اسمبلی اور پارلیمنٹ کا ممبر ہو جانا تو امتحان عظیم میں پڑ جانا ہے۔

مارشل لا کے بعد

مارشل لا اُٹھنے کے بعد، پاکستان میں سیاست کا جو نیا آغاز ہوا ہے، وہ دل خوش کن ہے۔ مشرقی پاکستان کے ممبران پارلیمنٹ نے اپنا مقدس ترین سیاست داں پارلیمنٹ

کی صدارت کے واسطے پیش کیا اور مغربی پاکستان کے اخباروں اور ممبران پارلیمنٹ نے اُسے لبّیک کہا۔

مشرقی پاکستان والے دین دین پکارتے آئے ہیں اور دین داری کی ادائیں ساتھ لائے ہیں، اُمید ہے مغربی پاکستان والے اِن اداؤں کو بھی لبّیک کہیں گے۔ سیاست پر اسلامیت غالب ہوگئی اور چھاگئی تو انشاءاللہ سیاست کی بدنامی ڈھل جائے گی۔ نیت اگر یہ ہو کہ اپنے گھر کی طرح اپنے ملک کو جنت بنانا ہے تو پھر اللہ ضرور مدد کرے گا۔ سیاست کا ناس نفسانیت نے کیا ہے۔

قرآن مجید پڑھو

جو شخص قرآن مجید کا ترجمہ تک نہیں پڑھ سکتا، اور مطلب مطلق نہیں سمجھتا اُسے قرآن مجید کو بے سمجھے اور بغیر ترجمے ہی کے پڑھ لینا چاہیے، اور جسے قرآن مجید بھی پڑھنا نہیں آتا وہ قرآن مجید کی سطروں پر اُنگلی پھیرے، جیسا کہ لوگ پھیرا کرتے ہیں۔ کچھ تو تعلق اس کتاب سے رہے۔

قرآن مجید کو جہیز میں دینے اور عزیزوں کے مرنے کے بعد خیرات کرنے میں بھی بُرائی نہیں ہے بلکہ کسی نہ کسی قدر اچھائی ہے۔ طاق بے تعلقی اور طاقِ نسیاں پر رکھ دینے کی نسبت قرآن مجید کا سجے ہوئے طاق میں رکھنا کچھ نہ کچھ تعلق ہی ظاہر کرتا ہے۔ لیکن میرے پاس اِن باتوں کے لیے قرآن وحدیث کی سند کوئی نہیں ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے زمانے میں ہر مسلمان قرآن مجید سمجھ سکتا تھا۔ لہٰذا اُن سے تو بس اتنا کہا گیا تھا کہ اپنی زندگیاں قرآن مجید کے مطابق ڈھالو۔ قرآن چاہتا حقیقتاً یہی ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے بہ حالتِ مجبوری لکھا ہے۔ میں ایسے مسلمان کو جو قرآن کی سطور پر صرف اُنگلی پھیرتا ہے اُن مسلمانوں سے بہتر خیال کرتا ہوں جو کہتے رہتے ہیں کہ ہم قرآن سمجھ نہیں سکتے تو قرآن طوطے کی طرح رٹنے میں وقت کیوں کھوئیں۔

ایک کام قرآن مجید سے اور لیا جاتا ہے کہ اُس کی آیتیں تعویذوں میں لکھی اور چلّوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ قرآن مجید میں سفلی عملیات کا ذکر ہے، چناں چہ مسلمان کہا کرتے ہیں،

جادو برحق، کرنے والا کافر، لیکن قرآن مجید میں قرآنی آیات کو بطور عملیات استعمال کرنے کا ذکر نہیں ہے۔ سورہ الفلق میں ارشاد ہے :۔ کہو میں اللہ کی پناہ کا طالب ہوں۔ (وہ مجھے گنڈوں پر (پڑھ پڑھ کر) پھونکنے والیوں (یعنی جادوگرنیوں) کے شر سے بچائے۔ میرے نزدیک اس ارشاد کا منشا فقط اتنا ہے کہ اِس شر سے بچنے کی اللہ سے دعا مانگا کرو، تاہم اگر یہ سورت پڑھ کر دم کر دی جائے تو قرآن مجید نے اسے کہیں منع بھی نہیں کیا ہے۔ دم کرنے میں مدد تو اللہ ہی سے مانگی جائے گی، غیر اللہ سے نہیں مانگی جائے گی۔ قرآن میں نہ سہی، احادیث میں ایسے واقعے موجود ہیں کہ صحابہؓ نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے کہا کہ فلاں بیمار کو ہم دیکھنے گئے تھے اور ہم نے اس پر فلاں سورۃ پڑھ کر دم کر دی۔ حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم نے قرآن کا غلط استعمال کیا۔

اللہ تعالےٰ اپنے نیک بندوں کے الفاظ میں اثر دے دیتا ہے، تو اپنے الفاظ میں اثر کیوں نہ دے گا، مگر بال سے زیادہ باریک معاملہ ہے۔ نیت بالکل صحیح ہونی چاہیے، جینچی تُلی، ذرا ذہن اُدھر چلا گیا کہ فلاں بزرگ میں فلاں طاقت ہے، بس مارے گئے۔ ذہن اِدھر جانا چاہیے کہ فلاں بزرگ ہم سے بہتر ہیں۔ اللہ غالباً اُن سے راضی ہے، اُن کی درخواست قبول فرما لیتا ہے۔

غوث علی شاہ رح کا تعویذ

تذکرہ غوثیہ میں ہے کہ ایک طوائف اپنی بیٹی کو لے کر حضرت غوث علی شاہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ حضور! اس کا دھندا نہیں چلتا۔ حضرت غوث علی شاہ نے تعویذ دے دیا۔ سال چھے مہینے کے بعد وہ دونوں ماں بیٹیاں پھر آئیں اور پھل اور مٹھائی لائیں۔ ہر وقت کے حاضر باشوں کی تعویذ دیتے وقت تو ہمت نہیں پڑی تھی کہ پوچھتے مگر اب اُنھوں نے پوچھا کہ حضرت! آپ بدکاری میں کامیاب ہونے کا تعویذ دے دیتے ہیں۔ حضرت غوث علی شاہ نے طوائف سے کہا۔ تعویذ دکھا۔ تعویذ کے اوپر چاندی کا خول تھا، اُسے توڑ ڈالا۔ تعویذ میں لکھا تھا:

"یا اللہ اس کی قسمت میں اگر اسی ذریعے سے رزق ملنا ہے تو اِسی

بابا فریدؒ کا ٹھیکرا

حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ خچر پر سوار رات کے وقت کسی گاؤں میں پہنچے۔ برسات کا موسم تھا۔ ایک گنوار سے کہا کہ اپنے گھر میں رات گزارنے کی اجازت دے دو۔ گنوار نے اجازت دے دی اور بزرگ صورت دیکھ کر بیان کیا کہ میری بیوی تین دن سے دردِ زہ میں مبتلا ہے۔ بچہ نہیں ہوتا۔ حضرت بابا صاحب نے فرمایا، کورا ٹھیکرا لے آؤ، اور کوئلہ بھی۔ کوئلے سے ٹھیکرے پر تحریر کیا:

مرا جا داد خرم را نیز جا داد
زنِ دہقان زاید یا نہ زاید

مجھے جگہ مل گئی، میرے گدھے کو جگہ مل گئی، اب تو چاہے جن چاہے نہ جن، اور کہا ٹھیکرا پیٹ پر رکھ دو۔ ٹھیکرے کا پیٹ پر رکھنا تھا، بچہ ہو گیا۔ ان الفاظ میں آج تک اثر ہے۔ حضرت بابا صاحب کے سلسلے کے لوگ ٹھیکرا لکھ کر اب بھی دیتے ہیں اور اثر ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا اپنے ان اچھے بندوں پر غیر معمولی کرم تھا کہ ان کے معمولی الفاظ میں ایسا اثر بھر دیا ہے کہ آج تک اثر باقی ہے، پھر کوئی اللہ کا اچھا بندہ اگر یہ کہہ دے کہ جاؤ سات دفعہ سورہ مزمل پڑھ کر پانی پہ دم کرو اور اُس مریضہ کو پلا دو، جس کے علاج سے بڑے بڑے ڈاکٹر ہار گئے ہیں، اور وہ پانی کا پہلا گھونٹ پیتے ہی تندرست ہو جائے تو تعجب کیا ہے۔ میں نے ایسے کرشمے آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میرا رجحان طبع اسی طرف ہے کہ قرآن محض ان کاموں کے واسطے نہیں اُترا ہے، آپ قرآن کے مطابق اپنی زندگی بنا لیں اور خواہ مخواہ کے دشمن پیدا کرنے کی عادت چھوڑ دیں تو تعویذ لینے اور دم کرانے اور قرآنی آیتوں کو عملیات کے طور پر پڑھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ یہ سب باتیں قرآن کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کی جاتی تھیں، مثلاً مجھ سے کہا جائے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ کا ورد رکھو، تو میں قرآن کی طرف اور قرآن کے اِس مضمون کی طرف متوجہ ہوں گا اور اللہ کے سوا اور کسی کو حاکم، معبود اور مؤثر نہیں مانوں گا۔ اللہ ہی کی ذات کو قابلِ تسبیح و تقدیس سمجھوں گا، اور جو جو حکم عدولیاں اور نافرمانیاں اللہ کی کر چکا ہوں وہ ایک ایک کر کے میری نظروں کے سامنے پھرنے لگیں گی۔

مگر اب تو لوگوں نے ان باتوں کو قرآن کی طرف متوجہ کرنے کا ذریعہ بنانے کی بجائے روپیہ کمانے کا ذریعہ بنا لیا ہے اور بہت سے لوگ تعویذ گنڈے اور وظائف و اوراد ہی کو اسلام تصوّر کرتے ہیں۔ میں قرآن کی سطور پر انگلی پھیرنے کو قرآن سے تعلق کہتا ہوں، لیکن قرآنی آیات کے تعویذ بنا کر روپیہ کمانے کو قرآن سے تعلق نہیں کہہ سکتا۔ علمائے سلف قرآن کی تعلیم کا معاوضہ نہیں لیتے تھے، کجا قرآنی تعویذوں کا معاوضہ۔

اللہ کیسا ہے؟

پاک ہے اللہ اس چیز سے کہ بیان کرتے ہیں، سُبۡحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ٥ (سورۃ ۲۳۔ آیت ۹۱)۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ خدا ایک تو خود ہے، اور ایک اس کا بیٹا ہے، یسوع مسیح۔ وہ بھی خدا ہے۔ باپ کا اور بیٹے کا جوہر واحد ہے۔ ہماری نجات کی خاطر یسوع مسیح بشکل انسان ظاہر ہوا تھا اور منکروں کے ہاتھ سے تکلیفیں پا کر واپس چلا گیا، اور ایک بار پھر آئے گا۔

یہودیوں کا خدا بقول ایک مغربی مصنف کے، بڑا ظالم اور خونخوار ہے، نہ گناہگار کو دیکھتا ہے، نہ بے گناہ کو، اسے سزائیں دینے سے کام ہے۔ خون سے ہولی کھیلتا ہے، ڈھٹائی سے جھوٹ بولتا ہے۔

ہندوؤں کے خدا لاتعداد ہیں، لیکن اہم اور اعلیٰ خدا تین ہیں۔ شیوجی، برہما، وشنو، تینوں نے انسانی روپ لیا تھا، اب ان کے بُت موجود ہیں۔ خداؤں میں اور انسانوں میں فرق یہ ہے کہ خداؤں کے بعض اعضا زیادہ ہیں، اور خداؤں کی طاقت کا انسان مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ایک خدا (شیوجی) کے بیٹے (گنیش) کا جسم انسانی ہے، مگر سر ہاتھی کا سا ہے۔

شیوجی اہم اور اعلا خداؤں میں اہم تر اور اعلا تر ہیں۔ شیوجی نمبر دو کے خدا (برہما) کے خالق ہیں، اور برہما نے تیسرے خدا (وشنو) کو جنم دیا تھا، اس طرح کہ پانی کا چلّو بھر کر پانی پر مارا۔ اس سے بلبلا اٹھا اور بلبلے میں سے وشنو نکلا۔ وشنو نے نکلتے ہی برہما کو بیٹا کہا۔ برہما بولا، ہیں! الٹی بات۔ میں تیرا بیٹا ہوں یا تو میرا بیٹا ہے۔ دونوں کی بحث بڑھی تو شیوجی نے اپنا لنگ آسمان کی طرف کر دیا۔ وشنو اور برہما سناٹے میں رہ گئے اور کہنے

لگے، جو اس لنگ کی ابتدا اور انتہا معلوم کرلے وہ باپ ہے اور جو معلوم نہ کرسکے وہ بیٹا ہے۔ وشنو کچھوا بن کر پانی میں اُترا اور برہما ہنس بن کر اوپر اُڑا۔ دونوں دو ہزار برس اُترتے اور چڑھتے رہے، لیکن لنگ کی ابتدا اور انتہا نہ ملی۔ برہما نے اس سلسلے میں کچھ چالاکی برتی تھی، لہٰذا اُس کی پوجا نہیں کی جاتی۔ ہندؤں کے خداؤں کا سارا حال نقل کرنا دشوار ہے۔ کہنا دراصل اتنا ہے کہ مسلمانوں کی کتاب نے ان باتوں کی تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ اِن (عجیب وغریب) اوصاف سے مُبرّا و مُنزّہ ہے جو عیسائیت اور یہودیت کو بدنام کرنے والوں اور مشرکین نے اپنی اپنی عقل سے گھڑے ہیں۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○

اللہ کیسا ہے اسے تم کیوں کر سمجھ سکتے ہو۔ اللہ کی مثل کوئی دوسرا ہو تو دکھا دیا جائے کہ اللہ ایسا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ۔ (سورۃ ۴۲۔ آیت ۱۱) اُس سے مشابہ کوئی شے ہے ہی نہیں، تو مشابہت کس شے سے دی جائے۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ۔ (سورۃ ۶۔ آیت ۱۰۴) ہماری موجودہ آنکھیں اُسے نہیں دیکھ سکتیں۔ اُن آنکھوں کا انتظار کرو جو مرنے کے بعد ملیں گی۔ فی الحال اللہ کی ذات، اور اللہ کی ماہیّت کو سمجھنے کے چکّر میں مت پڑو۔ اُس کی صفات کو سمجھو اور وہ صفات اپنے اندر پیدا کرو، جہاں تک ممکن ہے۔

علماء، مشایخ اور حکمران

امرا اور رُؤسا تو بادشاہوں اور حاکموں سے ملا ہی کرتے ہیں، لیکن علما اور مشایخ ہمیشہ بادشاہوں اور حاکموں سے دُور رہتے تھے۔ سوائے مجدّد الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ[1] کے کوئی بزرگ ایسا نہیں ہے جس نے دنیاوی وجاہت واقتدار والے طبقے سے میل جول بڑھایا ہو اور پھر بھی ہر دلعزیز رہا ہو۔ جو اس طبقے سے میل جول بڑھاتے تھے وہ علمائے سُو کہلاتے تھے۔

میں نے خود دیکھا ہے کہ علما اور مشایخ انگریزی حکّام کی کسی تقریب میں جاتے تھے تو اُن کے ساتھ مسلمان پیروں کا برتاؤ بگڑ جاتا تھا۔ پیرے سمجھتے تھے کہ انھوں نے انگریزی دعوت میں شرکت کرکے اسلام کی توہین کی ہے۔

---

[1] حضرت مجدّد صاحب نے شہنشاہ اکبر کے "دینِ الٰہی" کو روکنے کی غرض سے عمائدِ سلطنت کے ہاں آنا جانا اختیار کیا تھا۔

بیرے کا جواب

ایک سجادہ نشین صاحب لال قلعے کی سالانہ سرکاری ٹی پارٹی میں پہلی مرتبہ شریک ہوئے۔ ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا۔ کھانے کی چیزیں میزوں کے اوپر چن دی گئی تھیں اور پینے کی چیزیں بیرے لیے لیے پھر رہے تھے۔ سجادہ نشین صاحب نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ البتہ جب پانی کے گلاس آئے تو مسلمان بیرے سے پوچھا۔ بھائی گلاس پاک ہیں؟ بیرا برجستہ بولا۔ شاہ صاحب! یہاں ایسی باتیں نہیں پوچھنی چاہئیں۔

بھک منگا اور انگریز

یہ گھٹیا سی مثال تھی میرے زمانے کے غریب مسلمانوں کی اسلام دوستی کی۔ اونچی مثال سُنیے۔ ذرا پیچھے چلنا ہوگا سو برس قبل کا واقعہ ہے۔ کوئی فرنگی جامع مسجد، دِلّی دیکھنے آیا۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بھک منگے بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک بھک منگے نے اُس فرنگی کے آگے ہاتھ پھیلایا اور فرنگی نے جیب سے بٹوا نکال کر اُسے کچھ دیا۔ بٹوا جیب میں واپس جانے کی بجائے نیچے گر پڑا اور بھک منگے نے اٹھالیا۔ تین چار دن بعد وہی فرنگی صاحب پھر تشریف لائے۔ بھک منگے نے انھیں پہچانا اور کہا، اُس دن آپ کا بٹوا گر گیا تھا۔ لیجیے فرنگی نے سوال کیا۔ اِس میں اتنی اشرفیاں تھیں، تمھاری نیت نہیں بگڑی۔ بھک منگے نے جواب دیا۔ بگڑی تو تھی، مگر خیال ہوا کہ حضرت عیسےٰ علیہ السّلام کے آگے حضرت محمد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی گردن جھک جائے گی کہ اُن کے اُمّتی نے عیسائی کی اشرفیاں ہتھیالیں۔

فرنگی نے فوراً دو اشرفیاں بطور انعام پیش کیں۔ بھک منگے نے انھیں بھی قبول نہیں کیا۔ کہا، اس سلسلے میں انعام قبول کرنا بھی ہمارے پیشوا کو سُبک کر دے گا۔

عالمگیر اور بہروپیا

اور پیچھے چلیے۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا زمانہ ہے۔ ایک بہروپیا بار بار شہنشاہ کے دربار میں پہنچ جاتا ہے اور شہنشاہ ہر بار شناخت کر لیتا ہے کہ بہروپیا ہے۔

بالآخر بہروپیے نے درویشی لباس پہنا اور جمنا کے کنارے جھونپڑی ڈال لی اور ایسی شہرت کرائی کہ شہنشاہ اُس کی خدمت میں حاضر ہوا اور کثیر رقم نذر کی۔ بہروپیے نے وہ رقم کثیر جمنا میں پھینک دی۔ جب شہنشاہ کو خوب گرویدہ بنا لیا۔ اور شہنشاہ شناخت نہیں کر سکے تو بہروپیے نے سلام کرکے عرض کیا۔ حضور، میں بہروپیا ہوں۔

اب شہنشاہ نے اُسے انعام دیا اور پوچھا کہ اتنی بڑی رقم تم نے جمنا میں کیوں پھینک دی تھی، وہ تو انعام کی رقم سے بہت زیادہ تھی۔ بہروپیے نے کہا، رقم جمنا میں نہ پھینکتا تو درویشی کی نقل کیسے مکمل ہوتی۔ مجھے تو درویشی کا پورا پارٹ ادا کرنا تھا۔

چھوٹی لغزشیں

آپ نے دیکھا ہوگا، میعادی بخار اُترنے کے بعد جو لوگ احتیاط سے کام نہیں لیتے، بد پرہیزی کر بیٹھتے ہیں، اُنھیں دوبارہ بخار آنے لگتا ہے، پھر ایک میعاد کے لیے بخار عود کر آتا ہے اور دوسری دفعہ کا بخار پہلی دفعہ کے بخار سے زیادہ خطرناک بن جاتا ہے۔ اِسے انگریزی میں RELAPSE کہتے ہیں۔ اُردو میں ابتر پلٹا۔

اسی طرح کسی نے گناہوں سے توبہ کر رکھی ہو اور وہ صالح زندگی بسر کرنے لگا ہو، اُس کے اعمال، خیالات اور جذبات میں تبدیلی پیدا ہو گئی ہو، اُس کی رُوح رُوبہ ترقّی ہو اور اُس پر نیکی کی کیفیات طاری ہوں، اب اگر وہ کوئی چھوٹی موٹی لغزش بھی کر بیٹھے گا تو اُسے شدید نقصان پہنچے گا۔ روح ترقّی کی منازل طے کرتے کرتے رُک جائے گی، بلکہ پیچھے ہٹے گی — SET BACK ہوگا۔ اعمال، خیالات اور جذبات میں زلزلہ آجائے گا اور گناہگارانہ زندگی پلٹ پڑے گی، اور دوسری دفعہ توبہ کرنا پہلی دفعہ کی توبہ کی نسبت دشوار تر ہو جائے گا۔

چھوٹی موٹی لغزش کو معمولی شے نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کھیت کی مینڈ۔ مینڈ نہیں ہوتی تو جانور کھیت کے اندر گھس آتے ہیں اور کھیت کا ناس کر ڈالتے ہیں۔ علیٰ ہذا چھوٹی موٹی لغزشوں کو اہمیت نہیں دی جاتی تو کبیرہ گناہوں کو راستہ مل جاتا ہے اور انسان کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ صغیرہ گناہ کبیرہ گناہوں کی الف، بے، تے ہیں۔ انسان الف، بے، تے پڑھے بغیر علم و فضل کی طرف قدم نہیں اُٹھا سکتا اور صغیرہ گناہ کیے بغیر کبیرہ گناہ کی طرف نہیں بڑھنے پاتا۔ صغیرہ گناہ اور مبادیات گناہ

سے بچنا بے حد ضروری ہے۔

مُردے سُنتے ہیں

"مردے سُنتے ہیں یا نہیں سُنتے" یہ اسی قسم کی بحث ہے جیسی میرے بچپن میں ایک دفعہ بحثیں چلی تھیں کہ اللہ جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں، اور اللہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا مثیل پیدا کر سکتا ہے یا نہیں، وغیرہ وغیرہ

اس قسم کی بحثیں ہمارے علما کیا کرتے ہیں، میں علما کی بحثوں میں کیا دخل دوں، لیکن میرا جی ایسی بحثوں سے ضرور گھبراتا ہے۔ اِن بحثوں کا دنیا میں کوئی اچھا پھل ملنا ممکن ہے تو میں اُس اچھے پھل سے محروم ہوں، اور ان بحثوں پر نجاتِ اُخروی منحصر ہے تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے اور راہِ راست دکھائے۔

"مردے سُنتے ہیں یا نہیں سنتے" کی بحث خاص میرے شہر میں چھڑی تھی۔ جامع مسجد (دلی) سے جو سڑک مٹیا محل کی طرف جاتی ہے اُس سڑک کے اِدھر اُدھر، قریباً آمنے سامنے دینی علوم کے دو بڑے مدرسے ہیں۔ ایک کا نام حسین بخش کا مدرسہ ہے؛ دوسرے کا نام مولوی محمد حسین کا مدرسہ۔ مدرسہ حسین بخش میں جمعہ کے جمعہ مولوی کرامت اللہ صاحب وعظ فرمایا کرتے تھے اور مدرسہ مولوی محمد حسین میں مولانا محمد ابراہیم صاحب۔ میں مولوی کرامت اللہ کے وعظ میں پابندی کے ساتھ جاتا تھا۔ یکایک مولوی کرامت اللہ نے "مُردے سنتے ہیں" کے عنوان پر بولنا شروع کر دیا۔ معلوم ہُوا کہ مدرسہ مولوی محمد حسین میں "مُردے نہیں سنتے" کے عنوان پر مولانا محمد ابراہیم گوہر افشانی کر رہے ہیں۔ ہم نوائی اور غیر ہم نوائی کی تو عمر اور قابلیت نہیں تھی، وعظوں میں شرکت کا شوق بجھ گیا۔

مُردوں کا دُنیا سے تعلق

اِس وقت ایک خط پیشِ نظر ہے۔ راقم خط نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا دنیا والوں سے تعلق رہتا ہے یا نہیں، فلاں صاحب کہتے ہیں کہ فلاں فلاں آیات سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ تعلق نہیں رہتا۔ میں نے جواب دے دیا کہ "اِن آیات کا تو میرے نزدیک یہ مفہوم نہیں ہے لیکن قرآن مجید میں کسی جگہ بھی ہو کہ تعلق نہیں رہتا تو بس

ٹھیک ہے۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ البتہ پریشانی اور فکر کی بات یہ ہو سکتی ہے کہ پسماندہ عزیز اور دوست جب وہاں پہنچیں گے تو تعلقات کی تجدید کی جائے گی یا نہیں۔ ویسے ہمیں وہاں جاکر ہی نہیں، یہاں رہ کر بھی اللہ سے تعلق بڑھانا چاہیے اور غیر اللہ سے صرف اتنا تعلق رکھنا چاہیے جتنے تعلق کا اللہ نے حکم دیا ہے"۔

اس سے زیادہ میں اُن صاحب کو نہیں لکھ سکا، کیوں کہ یہ مضمون بھی ویسا ہی ہے، جس پر غور کرنا میرے بس کا نہیں ہے۔ مضمون پر غور کرتے کرتے سوچنے لگتا ہوں کہ اس پر غور کرنے سے فایدہ کیا ہے۔ وہ فایدہ کم علمی کی وجہ سے یا بدقسمتی سے مجھے سجھائی نہیں دیتا۔

خیال پڑتا ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک مرتبہ صحابہ کو تقدیر پر بحث کرنے سے روکا تھا، مگر میں نے راقم خط کو حدیث نہیں لکھی، کیوں کہ انھوں نے ہدایت کر دی تھی کہ جواب قرآن مجید کے حوالے سے دیا جائے، تفسیر قرآن یا احادیث رسول کے حوالے سے نہ دیا جائے۔

اسمبلی میں

قومی اسمبلی میں ممبروں کے گروپ بن گئے۔ اللہ مبارک کرے۔ اب دیکھیں کون کون سا گروپ، اللہ کی خوشنودی ملحوظ رکھتا ہے اور اس دن کی تیاری میں لگ جاتا ہے جس دن سب لوگ اپنے اپنے پیشواؤں کے ساتھ اللہ کے سامنے بلائے جائیں گے۔

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ (سورہ ۱۷ - آیت ۷۱)

سب سے بڑا گروپ ڈیماکریٹوں کا ہے، سب سے بڑی ذمّہ داری اِس گروپ پر اور اِس کے امام پر ہے اور سب سے زیادہ اِس گروپ سے اور اِس کے امام سے باز پرس ہوگی۔ دیکھیں ڈیماکریٹک نام اختیار کر کے اس گروپ کی ذہنیت اسلامی رہتی ہے یا نہیں، یہ صدارتی کانسٹی ٹیوشن پر صرف پارلیمنٹری رنگ چڑھاتا ہے یا اسلامی رنگ بھی اس کے پاس ہے اور صبغت اللہ کو بھی یہ جانتا ہے۔

خدا کرے اب ایسا نہ ہو کہ اسلامی رنگ کھٹائی ہی میں پڑا رہے اور سنّت کے یقین اور عدمِ یقین کا چکر پھر کہوا دے کہ تو کو نہ مو کو، لے چولھے میں جھو کو۔

دِلّی میونسپلٹی کے ایک رُکن

۱۹۲۴ء سے پہلے دلّی میونسپل کمیٹی کے ایک ممبر تھے، میر محمد حسین۔ ممبری کی دنیا میں اُن جیسا آدمی نہیں دیکھا۔ خلافت کمیٹی اور انڈین نیشنل کانگریس کے اتحاد کا دَور دَورہ تھا، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری نے میر محمد حسین کو کانگریس کی طرف سے کھڑا کیا اور میر صاحب میونسپل کمیٹی دلّی کے ممبر بن گئے ـــ لیکن میر صاحب نے یہ روش رکھی کہ جو بات اُن کے ضمیر کے خلاف ہوتی تھی اُس میں کانگریس پارٹی کے ساتھ ہاتھ نہیں اُٹھاتے تھے۔ دوسرے انتخاب کا موقع آیا تو کانگریس کا ٹکٹ نہیں ملا۔ انگریز ڈپٹی کمشنر نے بہ حیثیت پریسیڈنٹ میونسپل کمیٹی میر صاحب کی روش دیکھی تھی، اُس نے چیف کمشنر سے اُنھیں نامزد کرا دیا۔ حکومت کے مفاد کے معاملے میونسپل کمیٹی میں کبھی کبھار ہی آتے تھے۔ ایک دفعہ تجویز پیش کی گئی کہ میونسپل کمیٹی گاندھی جی کو ایڈریس دے۔ سرکاری نامزد ممبروں اور خان بہادر اور رائے بہادر قسم کے ممبروں کی اکثریت سے تجویز مسترد ہو گئی، لیکن سرکاری نامزد میر محمد حسین نے کانگریس پارٹی کی ہم نوائی کی، حتیٰ کہ کانگریس پارٹی نے اظہارِ ناراضگی کے لیے واک آؤٹ کیا تو میر صاحب بھی باہر چلے گئے۔ میر صاحب کا رویّہ جو کانگریسی ممبر ہونے کے وقت تھا وہی سرکاری ممبر ہونے کے وقت رہا۔ میر صاحب ضمیر کے خلاف عمل کرنا نہیں جانتے تھے۔ انگریز حکومت نے میر صاحب کو نو برس نبھایا، مگر ۱۹۳۴ء میں انتخاب ہونے لگا تو ایک دن چیف کمشنر نے پوچھا۔ میر صاحب! سنا ہے اس دفعہ غیر سرکاری پریسیڈنٹ کی تجویز پیش کی جائے گی میر صاحب نے کہا۔ صحیح سُنا ہے۔ چیف کمشنر نے پوچھا۔ آپ کی کیا رائے ہے۔ تجویز مناسب ہے یا نامناسب۔ میر صاحب نے کہا۔ نہایت مناسب تجویز ہے۔

میر صاحب تفضّل حسین خاں کے حقیقی پوتے تھے، جنھیں ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں دار پر چڑھایا گیا تھا، جن کی کھڑکی تفضّل حسین جامع مسجد دلّی کے قریب مشہور جگہ ہے۔ میر صاحب کی میرے ہاں روز کی نشست تھی، چیف کمشنر سے باتیں کر کے میر صاحب سیدھے میرے پاس تشریف لائے اور بولے "ہمارا پتہ کٹ گیا۔ سرکاری پریسیڈنٹ کے ہٹانے کو انھوں نے "مناسب" یہ سمجھ کر فرمایا تھا کہ اب نامزد نہیں ہوں گا۔

ایسا مستحکم، صاف گو اور کھرا ممبر میونسپل کمیٹی، دلّی میں دوسرا کوئی نہیں تھا، لیکن

دوسرے ممبر بھی اُس زمانے میں ایسے تھے کہ ۱۹۵۰ء سے قبل، پاکستان کے ممبروں کی کارگزاریاں مجھے آمادہ کرتی تھیں کہ اُن کے مقابلے میں دلی کے ممبروں کو فرشتوں کی جماعت کہوں۔ اب پھر پاکستان میں پارلیمنٹ، اور اسمبلیاں اور میونسپل کمیٹیاں چیت رہی ہیں، خدا کرے اب ایں انھیں فرشتہ کہہ سکوں۔

نئے ممبروں میں اگر صرف ایک وصف بھی ہے بہت سے وصف نہیں، صرف ایک وصف، تو انشاء اللہ فرشتے ہی ثابت ہوں گے۔ وہ وصف یہ ہے کہ رشوت دے کر ممبر نہ بنے ہوں۔ جن کی گھٹی میں رشوت دینی اور رشوت لینی اور بے ایمانی پڑی ہو اُن سے بھلائی کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔

خشت اوّل چوں نہد معمار کج

تا ثریا می رود دیوار کج

دلی میونسپل کمیٹی کے تمام ممبر رشوت دینے سے پاک نہیں تھے لیکن کچھ قطعی پاک تھے۔ اُن کا اخلاقی اثر باقی ممبروں پر پڑتا تھا۔ اِسی باعث دلی میونسپل کمیٹی خاصی نیک نام تھی۔

سینما اور زمانہ

سینما میں جو ڈرامے دکھائے جاتے ہیں، اُن کی پوری کہانی کا ریل چرخی پر لپٹا ہوتا ہے۔ ریل کا ایک ایک ٹکڑا، یا کہانی کا تھوڑا تھوڑا حصہ سامنے آتا ہے۔ پردہ جس پر عکس پڑتا ہے اگر بہت بڑا بنایا جائے اور پوری ریل ایک دم کھول دی جائے تو آپ دیکھیں گے کہ تمام واقعات ایک ہی وقت میں سرزد ہو رہے ہیں۔ وہی جو رنگ رلیاں منا رہا ہے، وہی ساتھ کے ساتھ دم توڑ رہا ہے۔ ایک ہی وقت ساری حالتیں نظر آجائیں گی۔

زمانے کا ریل بھی ہمارے سامنے تھوڑا کر کے کھلتا ہے، لیکن زمانے کا پورا ریل اللہ تعالیٰ کے سامنے بالکل اس طرح عیاں ہے جس طرح سینما کا پورا ریل ہمارے سامنے آجائے۔ اللہ تعالیٰ جس آن کن فرما رہا ہے، اُسی آن حضرت اسرافیلؑ سے صورِ قیامت پھنکوا رہا ہے اور اپنا تمام کام اللہ بہ یک آن دیکھ رہا ہے۔ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ○ وہ اُسے دُور دیکھتے ہیں، ہم اُسے قریب دیکھتے ہیں۔ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ۔ قیامت کا معاملہ اللہ کے لیے ایسا ہے، گویا پلک

جھپکانے میں بھی کچھ دیر لگتی ہے قیامت اُس کے حسابوں اس سے زیادہ نزدیک ہے۔
پورا زمانہ اللہ کے لیے آنِ واحد ہے۔ یہاں اسی آنِ واحد کی صدیوں، برسوں، مہینوں، ہفتوں اور دنوں میں تقسیم کی جا رہی ہے، اور لوگ پوچھ رہے ہیں کہ یہ اللہ نے کیا فرما دیا۔
اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ، ہم نے زمین اور آسمان اور زمین و آسمان کی جملہ چیزیں چھے دن میں پیدا کی ہیں، اللہ تو دعوے کر چکا ہے، اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔ اللہ ایسا صاحبِ قدرت ہے کہ جب اُسے کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو فرماتا ہے، اے کام ہو جا، کام ہو جاتا ہے اور علامہ محمد ایوب شبہ کا جواب دے رہے ہیں کہ ہمارے سِتَّۃِ اَیَّامٍ (چھے دن) اللہ کے پورے زمانے کا قلیل ترین جزو ہیں۔ اللہ کے کُنْ فرمانے سے چشم زدن میں زمانہ وجود پذیر ہو گیا، آیت والے چھے دن زمانے کے اندر ہیں، زمانے سے باہر نہیں ہیں۔ وہ تمھارے حساب سے چھے دن ہیں، اللہ کے حساب سے آن کا قلیل ترین حصہ ہیں۔ میں حضرت علامہ کے جواب کا مطلب یہی سمجھا ہوں کہ چھے دن کا لفظ اللہ تعالےٰ نے ہمارے سمجھانے کے واسطے استعمال کیا ہے۔ اللہ کا حساب کُنْ فَیَکُوْنُ ہی ہے۔

عورتیں، گھر اور ملازمت

ابھی ابتدائی عمر میں اِس کا مجھے کبھی تصور بھی نہیں ہوا تھا کہ تھوڑے دن بعد اُونچے اُونچے خاندانوں کی عورتیں نوکریاں کرتی پھریں گی۔ صرف سقنوں اور مچھیرنوں کو دیکھتا تھا کہ وہ لوگوں کے ہاں کھانا پکانے آتی ہیں اور تنخواہیں پاتی ہیں۔ یا کچھ عورتیں ہیں جو کپڑے سیتی ہیں اور مغلانیاں کہلاتی ہیں۔ پہلی دفعہ ہندو عورتوں کے ایک جلسے میں پنڈت جواہر لال نہرو کی بہن وجے لکشمی سے میں نے سُنا کہ اب یہ ممکن نہیں ہے کہ فقط مردوں کی کمائی پر زندگی بسر کی جا سکے۔

میری نوجوانی تک برقعے اوڑھ کر بس سقنیں، دھوبنیں، مچھیرنیں، تیلنیں اور چوڑیاں پہنانے والیاں نکلتی تھیں، یا طوائفیں برقعہ اوڑھتی تھیں۔ طوائفوں کے واسطے کسبی کا لفظ بولا جاتا تھا۔

کسب کے معنی بُرے نہیں، مگر عورت کا کسب اور پیشہ کرنا اور روزی کمانا

معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اب روزی کمانا عورت کے لیے معیوب نہیں رہا ہے، لیکن کبھی اب بھی آپ کسی عورت کو نہیں کہہ سکتے۔

اونچے خاندانوں کی عورتیں جب ڈولیوں، فینسوں، پالکیوں اور گھوڑا گاڑیوں میں سوار ہونے لگی تھیں تو اس وقت وہ بھی برقعہ اوڑھتی تھیں، ویسے زنانہ برقعے نہیں پھڑکاتی پھرتی تھیں۔ برقعے پھڑکانا برا خیال کیا جاتا تھا۔ برقعے والیاں پردہ نشینوں میں شمار نہیں ہوتی تھیں، برقعے والی کا لفظ معیوب سا تھا۔

مجھے اپنی والدہ کا گھوڑے گاڑی میں سوار ہونا یاد ہے۔ کرائے کی گاڑی پھاٹک کے آگے لا کر کھڑی کر دی جاتی تھی۔ دو رشتہ دار گاڑی کے ایک طرف اور دو رشتہ دار گاڑی کے دوسری طرف چاندنیاں تان لیتے تھے۔ ایک آدمی سڑک کا ایک ناکا روکتا تھا اور دوسرا آدمی سڑک کا دوسرا ناکا۔ پردے کے اس قدر انتظامات کے بعد والدہ ماجدہ برقعہ اوڑھے تشریف لاتی تھیں اور گاڑی میں بیٹھتی تھیں۔

میرا خاندان امیر خاندان نہیں تھا، اوسط حیثیت کا خاندان تھا، لیکن اوسط حیثیت کی عورتیں گھر سے چلتی تھیں تو اس شان سے چلتی تھیں، گویا ملکہ وکٹوریہ چلی ہیں اور آوازیں لگ رہی ہیں کہ خبردار کوئی قدم نہ بڑھائے۔ اندازہ کر لیجیے کہ امیر عورتوں کی شان کیا رہی ہوگی اور فیصلہ کیجیے کہ یہ عورت ذات کی عزت تھی یا بے عزتی۔

کنبے میں ایسے بھی گھر تھے، جن کے مرد مر چکے تھے۔ اُن گھروں کی عورتوں کو لاوارثہ نہیں چھوڑا جاتا تھا اور مجبور نہیں کیا جاتا تھا کہ جاؤ ماماگیری کرو اور اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالو۔ کنبے کے چھوٹے بڑے انھیں مالی مدد دیتے تھے۔ غریب مردوں کی مالی امداد میں تامل ہو سکتا تھا، لیکن غریب عورتوں کی مالی امداد میں تامل نہیں ہوتا تھا۔ چھوٹیاں چھوٹیاں کر کے تالاب بھر دیا جاتا تھا۔ دو دو چار چار روپے ماہوار سے عورتوں کی عزت برقرار رہ جاتی تھی۔

یکایک حالات نے پلٹا کھایا۔ اِن یکایک کے پلٹوں کی وجہ میں کیا بتاؤں، رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند، یا ماہرینِ اقتصادیات اِنھیں حل کریں گے۔ بہرحال حالات نے پلٹا کھایا اور مالی مدد دینے کی ہماری عادت یکایک غایب ہو گئی۔ ہمیں اپنی اپنی پڑ گئی کہ ہم مر گئے تو ہماری بیٹیوں کا کیا بنے گا۔ سگے بھائیوں سے امید نہیں ہے

کہ بہنوں کی مدد کو اٹھیں گے۔ شوہر خواہش کرنے لگے کہ بیویاں الہ دین کا طلسمی چراغ جہیز میں لائیں۔ آخر ہماری بیٹیوں کا حشر کیا ہوگا۔ کیا روٹی پکانے کی نوکریاں اِن کی قسمت میں لکھی ہیں۔ کم از کم اتنی لاچاری ہے تو انھیں بچانا چاہیے۔ انھیں اس قابل کر دینا چاہیے کہ شوہر اگر نہ لیں یا بیوہ ہو جائیں تو ماماگیری نہ کریں اور بھیک نہ مانگیں۔ انھیں تعلیم تو حالات کی تبدیلی سے پہلے بھی دلانی چاہیے تھی، طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ، علم سیکھنا ہر مسلم مرد اور ہر مسلم عورت پر فرض ہے، لیکن حالات کی تبدیلی کے بعد تو تعلیم نسواں فرض بالائے فرض ہو گئی ہے۔ اس بحث میں مت اُلجھیے کہ نصاب تعلیم ایسا ہے کہ

اُس کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

لڑکیوں پر ایسے نصاب کا کیا اثر پڑے گا۔ اِس بحث میں مت اُلجھیے اور لڑکیوں کو روٹی پکانے کی نوکریوں سے بچائیے۔ نوکریاں اِنھیں کرنی ہیں، نوکریاں کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے اور ماماگیری سے نرس گیری اچھی ہے، ایر ہوسٹس ہونا اچھا ہے اور اُستانی گیری کی لیاقت آجائے تو ہم خرما و ہم ثواب ہے۔

پردہ میرے اور آپ کے روکے نہیں رُک سکتا۔ عمایدِ قوم کا رُجحان پردے کے خلاف ہے۔ عوام عمایدکی پیروی کیا کرتے ہیں۔ میں اور آپ خالاؤں اور پھوپیوں کے گیت گاتے جائیں، میری اور آپ کی اولاد عمایدکی پیروی کرے گی۔ تاہم مجھے اجازت دیجیے کہ اتنی بات ریکارڈ کرتا جاؤں کہ میں نے جن غیر تعلیم یافتہ خالاؤں اور پھوپیوں کو دیکھا ہے، اُن کی شان آج کل کی تعلیم یافتہ بڑھیوں سے اعلیٰ تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے تعلیم یافتہ لڑکیاں بوڑھی ہو چکی ہیں، تعلیم یافتہ بڑھیوں میں وہ بُردباری، وہ بھاری بھرکم پن اور وہ فراست نظر نہیں آتی جو ایک نسل پہلے کی غیر تعلیم یافتہ خواتین میں خالی تربیت کی بہ دولت نظر آتی تھی۔

یہ بھی کہیں نوٹ کر لیجیے کہ گھر کو سنبھالنے اور گھر کو جنّت بنانے کی جیسی قابلیت عورت میں ودیعت کی گئی ہے وہ مرد میں نہیں کی گئی۔ اسی طرح گھر سے باہر کے کام جس خوش اسلوبی سے مرد انجام دے سکتا ہے اُس خوش اسلوبی سے عورت انجام نہیں دے سکتی۔ عورت کے جوہر گھر کے اندر کھلتے ہیں اور مرد کے جوہر گھر کے باہر کھلتے ہیں۔ عورت کا اصلی اور فطری میدان گھر کے اندر ہے اور مرد کا میدان گھر کے باہر۔ مرد اپنے اصلی اور فطری فرائض سے غفلت برتیں گے اور گھروں کے انتظام کرنے بیٹھ جائیں گے تو گھر ہرگز نہیں چلا سکیں گے،

اور اپنی بیرونی دنیا تباہ کرلیں گے۔ علی ہذا عورتیں، اگر بیرونی دنیا میں دخیل ہوں گی اور اپنے اصلی اور فطری فرایض بھول جائیں گی تو اپنا گھر بگاڑ لیں گے۔ عورت کے بغیر مرد کی زندگی ہوٹلوں میں کٹتی ہے اور مرتا ہسپتال جاکر ہے۔ اور جب عورت مردوں کے دوش بردوش مزدوری کرنے نکلتی ہے تو آدھی اُجرت پاتی ہے، نوکری کرتی ہے تو ترقی کی رفتار میں مردوں سے پیچھے رہ جاتی ہے۔ لیڈری سنبھالتی ہے تو سروجنی جیسی یگانہ روزگار اور ذہین و فطین عورت جواہر لال اور ابو الکلام سے بازی نہیں لے جاتی اور گاندھی جی کی تونگاہیں دیکھتی ہے۔

المختصر مرد کا مردپن چھوڑ دینا اور عورت کا عورت پن چھوڑ دینا معاشرے کو تہ و بالا کردیگا، مگر معاشرہ تہ و بالا ہو، یا تہ و بالا سے بھی بدتر ہو جائے ؎

یہ مجھے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی

عورتوں کی حکومت گھروں میں

میں نے اپنے دادا کو نہیں دیکھا، لیکن دادا کی ممانی کو دیکھا ہے۔ میرے دادا کی والدہ کا ۱۸۵۰ء میں انتقال ہوگیا تھا، مگر دادا کی ممانی دادا سے چھوٹی تھیں، وہ ۱۹۱۰ء تک زندہ رہیں۔

ہمارے خاندان کے بیشتر آدمی کوچہ چیلان (دلّی) کے باشندے ہیں، لیکن بعض صاحبان بلّی ماران، فراشخانہ اور پنڈت کے کوچے میں جا بسے تھے۔ جمعہ کی نماز ہر مرد، خواہ بوڑھا ہوتا یا جوان، جامع مسجد میں پڑھتا تھا اور نماز پڑھ کر میرے دادا کی ممانی کی خدمت میں حاضری دیتا تھا۔ کوچہ چیلان جامع مسجد سے دُور نہیں ہے

بزرگ خاتون اُس دن اپنے دالان کی دری جھڑواتیں اور چاندنی بدلواتیں اور پاندان آگے رکھ، انتظار کرنے بیٹھ جاتیں۔ خاندان کا ہر شخص اُن کا ادب کرتا تھا اور اُن کی دعائیں لیتا تھا۔

دو ڈھائی گھنٹے یہ مجلس جمتی۔ بزرگ خاتون خاندان کی اُلجھنیں سُلجھاتیں، رائے اور مشورے سے معاملہ نہ سُلجھتا تو اُن کا حکم کافی تھا۔ کوئی اُن کے حکم کو نہیں ٹالتا تھا۔ حکم کیا، اشارے پر بیٹا بیٹی پرائے ہو جاتے تھے۔ فرماتیں: ۔میاں حفیظ الرحمٰن! مسعود اب ماشاءاللہ جوان ہے۔

کہیں اس کا رشتہ ٹھہرایا یا نہیں؟ حفیظ الرحمٰن کہتے: "چچی اماں! آپ کے ہوتے ہم رشتہ ٹھہرانے والے کون۔ بزرگ خاتون فوراً مجید اللہ سے مخاطب ہوجاتیں۔ کیوں میاں مجید اللہ! افروز جہاں اور مسعود الرحمٰن کی جوڑی کیسی رہے گی۔ میاں مجید اللہ دست بستہ اور سر تسلیم جھکا کر عرض کرتے، "جو ارشاد عالی"۔ بزرگ خاتون بٹوے میں سے دو روپے نکالتیں اور دو روپے کی چار سیر جلیبیاں منگا، سب کا منھ میٹھا کر دیتیں۔

نکاح سال چھے مہینے میں ہوجائے گا، نکاح کی عجلت نہیں ہے۔ بات اتنی پکی ہے کہ اب مسعود الرحمٰن اور افروز جہاں کو بھی نباہنی پڑے گی، اور ہنسی خوشی نباہنی پڑے گی۔ بات دادی اماں نے طے کی ہے، اسے کون توڑ سکتا ہے۔ دادی اماں کی لاج رکھنی ضروری ہے، دادی اماں کے دم سے خاندان کا بھرم ہے۔

دادی اماں اور دادی اماں کے خاندان والے آجکل جیسے تعلیم یافتہ نہیں تھے، البتہ تربیت یافتہ تھے۔ انھوں نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یہ ارشاد بارہا سنا تھا کہ "جو چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کی توقیر نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔" یعنی حضورؐ کے مسلک سے برگشتہ ہے۔ لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا۔

کیسا جامع ارشاد ہے۔ کہنے کے چھوٹوں بڑوں میں اسے محدود نہ کیجیے، نوکروں اور آقاؤں، ماتحتوں اور افسروں کے پیش نظر بھی یہ ارشاد رہا کرے تو دنیا سے ناگواری اور آزردگی کا وجود مٹ جائے۔

بہت سی اعلا تعلیم یافتہ خواتین اس وقت میرے تصور کی آنکھوں کے سامنے ہیں، ان میں ایک بھی مجھے دادی اماں کے برابر با اثر نظر نہیں آتی۔

اگلے زمانے کی عورتیں خاوندوں کی بے شک محکوم ہوتی تھیں، وہ اپنے سے زیادہ عمر کے تمام مردوں کو اپنے اوپر فوقیت دیتی تھیں، لیکن اگلے زمانے کی عورتیں اپنے سے کم عمر کے مردوں پر حکومت کرتی تھیں۔ مردوں پر مردوں کی اتنی حکومت نہیں تھی جتنی عورتوں کی تھی۔ اور خاوند کی محکومی یا تابعداری کے معنی یہ نہیں تھے کہ بیوی سچ مچ غلام بن گئی۔ یہ لفظ تو خاوند کے لیے تھا۔ جب نکاح کے بعد دولہا دلہن کے گھر میں آتا تھا اور آرسی مصحف کی رسم ادا کی جاتی تھی تو دولہا کہتا تھا کہ بیوی آنکھیں کھولو، میں تمھارا غلام

ہوں، اور پھر وہ تابعدار بیوی کا واقعی تابعدار بنتا تھا۔ دادی اماں کی میکے پر نہیں، سسرال پر حکومت آپ نے ملاحظہ فرمالی۔

دادی اماں کے علاوہ، پھوپیوں اور خالاؤں کو بھی میں نے حاکم پایا۔ میری بڑی پھوپی کی عادت تھی، جہاں عزیزوں میں کوئی لاوارث رہ گیا، جھٹ اُسے اپنے ہاں لے آئیں۔ اُن کا گھر خاصا یتیم خانہ تھا، اور بیٹے کی کمائی کا غالب حصہ اُس یتیم خانے پر خرچ ہوتا تھا، مگر بیٹے کی مجال نہیں تھی کہ تیوری چڑھالے۔ یہی حال بڑی خالہ کا تھا۔ دونوں دو دو تین تین سال کی بیاہی بیوہ ہوگئی تھیں۔ دونوں نے ایک ایک بیٹے کی خاطر جوانی نثار کی تھی، اور پیسے کی خاصی تکلیفیں اُٹھاکر بیٹوں کو پالا تھا۔ بیٹے اللہ کے فضل سے پروان چڑھے۔ پیسوں کی بجائے رُپے اور اشرفیاں ماں کے قدموں میں ڈال دیتے تھے۔ ماں اُنھیں بطور جیب خرچ جو کچھ دے دیتی ہوں، باقی ساری کمائی ماں کی نذر تھی۔

میری خالہ کا کیانوے بانوے سال کی عمر میں ۱۹۴۷ء کے بعد انتقال ہوا ہے۔ میرے ماموں مجھے کراچی خط بھیجتے تھے تو پتے میں میرے نام کے ساتھ مولوی اور ملّا لکھتے تھے اور خالہ ہمیشہ ڈانٹ پلاتی تھیں اور تو اور تیرے بول جاتی تھیں۔ اُن کی ڈانٹ اور تُو اور تیرے کی لذت میں آپ سے کیا بیان کروں۔

زندگی ہمارے اکثر خیالات بدل چکے ہیں، مگر تبدیل شدہ خیالات میں دو بے حد اہم ہیں۔ ایک خیال قومیت کو وطن میں محدود کر دینے کے متعلق ہے، دوسرا خیال عورتوں کی ترقی کی بابت ہے۔ اسلام نے قومیت کو وطن اور نسل کی بندشوں سے آزاد کیا تھا، اب ہم پہلے تُرک ہیں اور نمبر دو مسلمان۔ تورانی مسلمانوں کا ارشاد ہے کہ ہمارا کعبہ صرف توران ہے۔ مصری مسلمان فرعون مُوسے پر فخر کرنے لگے ہیں۔

علیٰ ہذا اسلام عورتوں کی ترقی کا حامی ہے۔ اسلام کو یہ پسند نہیں ہے کہ مسلمان عورت کے وارث مرجائیں تو مسلمان عورت بھیک مانگتی پھرے، یا کھانا پکانے اور سینے پرونے کی نوکری کرے۔ بیت المال موجود ہو تو مسلمان عورت کی مدد بیت المال کے ذمّے ہے، ورنہ مسلمان عورت کو ایک نہ ایک ہنر ایسا سیکھنا چاہیے، جس سے اُس کی لاوارثی کی زندگی باعزّت گزرے۔ ماماگیری سے اُستانی گیری یقیناً عزّت کی چیز ہے۔ تاہم اسلام نے عورت اور مرد، سب ہی کی ترقی کی حدود مقرر کردی ہیں۔ حدود اللہ سے باہر نہیں جانا چاہیے

وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ - جس نے حدود اللہ کو توڑا اُس نے اپنے اوپر ظلم کیا۔

اختلاف اور حزبِ اختلاف

آزادی مل چکی تھی، لیکن ابھی ہنگامے نہیں چھڑے تھے۔ ۱۹۴۷ء کا اگست غالباً ختم کے قریب تھا کہ ایک شام کو فیض بازار (دلی) میں علی گڑھ کے مشہور وکیل اور لیڈر مسٹر عبدالمجید خواجہ نظر پڑ گئے۔ میں نے کہا۔ فرمائیے، خواجہ صاحب! اب تو آپ خوش ہیں۔ آزادی مبارک ہو۔ بولے، جی ہاں، مبارک ہو۔ مگر ہم تو پہلے بھی اپوزیشن میں تھے، اب بھی اپوزیشن ہی میں رہیں گے۔ آج مجھے یہ بات یاد آگئی، اور میں سوچنے بیٹھا ہوں کہ اپوزیشن کیا واقعی بہت ضروری چیز ہے، اپوزیشن کے بغیر کیا حکومتیں چل نہیں سکتیں۔ اپوزیشن کی اتنی اہمیت کیوں ہے کہ اپوزیشن پارٹی نہیں بنتی تو حکومتیں اُسے بنواتی ہیں۔ اپوزیشن پارٹی کے لیڈر کو وزیروں کی طرح تنخواہ اور سہولتیں دی جاتی ہیں۔

کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اپوزیشن پارٹی کی آؤ بھگت کرکے حکام دکھانا چاہتے ہوں کہ ہم اس قدر صحیح کار ہیں، خود چاہتے ہیں کہ ہم سے کوئی اختلاف کرے اور ہمیں غلط راستہ چلنے سے روکے۔ اگر اس نوع کا جذبہ کسی حاکم کے دل میں واقعی ہے تو وہ حاکم قابلِ تحسین ہے۔ وہ حاکم مسلمان ہے تو خلفائے راشدینؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا مقلد ہے، اور جذبہ واقعتہً نہیں ہے، محض دکھاوا ہے تو پھر جوتیوں میں دال بٹتی ہے۔

حکومت کے دل میں واقعتہً یہ خیال ہونا چاہیے کہ اپوزیشن پارٹی ہماری خیر خواہ ہے کہ ہم کو دوزخ میں جانے سے بچاتی ہے، اور اپوزیشن پارٹی کا فرض بھی بس اسی حد تک رہنا چاہیے، تاکہ اُن کا اختلاف مسلمان ہونے کی صورت میں اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَةٌ کا مصداق بن جائے۔ اپوزیشن پارٹیوں کا فرض اختلاف کرنا ہے، مخالفت کرنا نہیں ہے۔ اپوزیشن پارٹیوں کا اس فکر میں لگ جانا کہ موجودہ حکومت کا تختہ اُلٹ کر تخت پر قبضہ کرلیں بُرا ہے۔ پوری قوم تختہ اُلٹنے کی خواہش مند ہو تب بھی افراد کے اندر حاکم بننے کا جذبہ مکروہ ہے اور حاکم بنے رہنے کا جذبہ بھی مکروہ ہے۔ افراد کو تو مسلمان ہونے کی صورت میں حضرت خالد ابن ولیدؓ کی پیروی کرنی چاہیے کہ سپہ سالار سے معمولی سپاہی بنا دیے گئے

اور تیوری پر بل اور جذبۂ خدمت میں فرق نہیں آیا۔ حاکم بن جانے کے بعد حکومت چھوڑنے کو جی نہ چاہے یا اپوزیشن پارٹی میں پہنچ کر حکومت کے لیے منھ میں پانی بھر ے ، دونوں جذبے کراہیت کے قابل ہیں اور انسانیت کے شرف کو گھائل کرنے والے ہیں۔ حاکم بننے کے شوق ہی نے دنیا میں بے چینی پھیلا رکھی ہے اور خون خرابا برپا کر رکھا ہے۔

اہل اللہ نہیں ملتے؟

کسی بزرگ کے سامنے گلہ کیا گیا کہ حضرت! دوست مفقود ہو گئے ہیں، دوست اور خیر خواہ نہیں ملتے۔ بزرگ نے فرمایا، ایسا شخص چاہتے ہو، جو تمھارے ساتھ دوستی اور خیر خواہی کرے یا ایسے شخص کی تلاش ہے جس کے ساتھ تم دوستی اور خیر خواہی کرو۔ تمھاری دوستی اور خیر خواہی کو قبول کرنے والوں کی تو کمی نہیں ہے۔ ارے میاں! تم بھی تو دوستوں کے دوست نہیں بنتے۔ دوست ملتا ہے دوست کو، خیر خواہ ملتا ہے خیر خواہ کو۔

اسی طرح ایک شکایت ہے کہ پہلے جیسے جیسے اہل اللہ گزرے ہیں، اب کہیں نہیں ہیں۔ اچھے آدمی کیوں نہیں ملتے۔ اس کا جواب بھی کسی بزرگ ہی نے دیا ہے کہ اچھا آدمی ملتا ہے اچھے آدمی کو۔

اپنے زمانے کے اکثر درویشوں سے میں نے سنا ہے کہ کوئی رزق میں اضافے کی دعا منگواتا ہے، کوئی تندرستی اور اولاد پیدا ہونے کی، غرض ہمارے پاس جو آتا ہے دنیا ہی کے مقاصد لاتا ہے، کوئی ایسا نہیں آتا جو اللہ کا طالب ہو۔ اللہ سے تعلق پیدا کرنے کی طلب اور چینک نہیں ہے تو اہل اللہ کیا "کام بڑھئی" کی آواز لگاتے پھریں اور آپ کے گھر پہنچ جائیں۔

علما و مشایخ کے گرد عام طور سے جس طبقے کے لوگ جمع رہتے ہیں، وہ طبقے اپنے اپنے علما و مشایخ سے مطمئن ہیں۔ اخبارات میں روز خبریں چھپتی ہیں کہ فلاں پیر مرید کی بیٹی کو لے اُڑا، فلاں پیر نے مرید کا اتنا روپیہ مار لیا۔ اخبارات یہ نہیں لکھتے کہ فلاں بدمعاش نے پیر کا بہروپ بھر کر ایسا ایسا کیا، اخبارات انھیں پیر ہی قرار دیتے ہیں، مگر علما و مشایخ کے گرد رہنے والا طبقہ اخبارات کی خبروں کی پروا نہیں کرتا۔ اس طبقے میں جیسے علما و مشایخ کی مانگ ہے، ویسے علما و مشایخ اسے بہ کثرت ملتے ہیں۔ بازار میں وہی چیز آتی ہے جس کی مانگ ہوا کرتی ہے۔ تعلیم یافتہ اور سمجھ دار طبقے میں صرف شکایت ہے کہ اہل اللہ نہیں ملتے،

تعلیم یافتہ طبقے میں اہل اللہ کی مانگ نہیں ہے، اور میرے دیکھتے دیکھتے شکایت بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ شاید کچھ دن بعد اتنا کہنے والے بھی نہیں ہوں گے کہ جیسے جیسے اہل اللہ پہلے گزرے ہیں، اب کیوں نہیں ملتے۔

عورتیں اور دوسری شادی

جب سے پاکستان کی خواتین کو معلوم ہُوا ہے کہ مرد پھر کہیں دوسری شادیاں نہ کرنے لگیں، اُن میں خاصی بے چینی پھیل گئی ہے۔ دوسری شادی کی شرعی اجازت سے مسلمانانِ پاکستان کا نچلا اور اوسط طبقہ فایدہ نہیں اُٹھا رہا تھا۔ ان طبقوں کے مرد دوسری شادی کیا کریں گے۔ دوسری شادی کے شوقین صرف اُمرا ہیں، امیر خواہ مولوی ہوں، خواہ صنّاع و تاجر، خواہ ایم۔ اے، بی۔ اے۔

مولوی امیر اکّا دکّا نکلیں گے۔ صنّاعوں اور تاجروں کے قلوب میں رُپیہ کمانے کی خواہش اتنی ہے کہ دوسری بیوی کی خواہش کے لیے قلوب میں جگہ نہیں ہے۔ ایم۔ اے، بی۔ اے البتّہ بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ جاتے ہیں تو اُنھیں ضرور سُوجھتی ہے کہ اب ہمارے پاس ایسی بیوی ہونی چاہیے اور ویسی بیوی ہونی چاہیے۔ اپنے معمولی زمانے کی بیوی سے دل پھر جاتا ہے، اسلام کی اور باتوں سے واسطہ رکھیں یا نہ رکھیں دوسری شادی کے لیے اسلام کا جامہ پہن لیتے ہیں۔

پاکستان بننے سے پہلے یہ طبقہ زیادہ مال دار نہیں تھا، لیکن پاکستان بننے کے بعد یہ طبقہ نسبتاً مالدار ہو گیا۔ صنّاعوں اور تاجروں کے مقابلے میں اسے فرصت بھی تھی۔ دھڑا دھڑ شادیاں شروع کر دیں، اور بعض نے نئی وضع کی بیویوں کی موجودگی میں شادی کر لی۔ اس ستم نے وہ حکم نافذ کرایا جسے علما مداخلت فی الدّین کہتے ہیں اور ممبرانِ قومی اسمبلی کی اکثریت جسے منسوخ کرانا چاہتی ہے۔

معزز خواتین حکم کی منسوخی پر واویلا مچانے کے بجائے یہ کریں کہ خود عورتوں سے کہیں کہ عورتوں کے گھر مت اُجاڑو۔ دوسری بیوی مرد سے عورت ہو کر اور جنس بدل کر گھروں میں نہیں گھستی، دوسری بیوی عورت ہی ہُوا کرتی ہے۔ عورت اگر فیصلہ کرے کہ میں اُس مرد سے شادی نہیں کروں گی جس کی پہلی بیوی زندہ ہے، تو اِسے مداخلت فی الدّین نہیں سمجھا جائے گا۔

عورتیں عورتوں کی جیسی دشمن ہیں ویسے مرد عورتوں کے دشمن نہیں ہیں۔ عورت سوکن اور ساس اور بہو کی شکل میں جو جو ظلم ڈھاتی ہے وہ مرد نہیں ڈھاتا۔

۵ رجولائی کے اخباروں میں خبر چھپی تھی کہ مسٹر محمد علی آف بوگرا، وزیر خارجہ پاکستان نے اعلان فرمایا ہے کہ آیندہ ترمیمی مسودہ قانون کے خلاف عورتوں کا جو جلوس نکلے گا اس میں مسز عالیہ محمد علی بھی شریک ہوں گی۔ مسز عالیہ محمد علی مسٹر محمد علی کی دوسری بیوی ہیں، جنھوں نے پہلی بیوی کی موجودگی میں مسٹر محمد علی سے نکاح کیا تھا۔

شہرت اور ثواب

ایک دفعہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس بات پر بحث ہو رہی تھی کہ شہرت طلبی اور تفاخر خلوص عمل کے منافی ہے یا نہیں۔ ایک صحابی نے کہا: اس نوع کے فقرے جہاد کے وقت بولے جائیں کہ "میں فلاں ہوں اور فلاں قبیلے سے ہوں، ذرا میرا وار روکو" تو جہاد کا ثواب نہیں ملے گا۔ دوسرے صحابی نے کہا: میرے نزدیک اتنا کہہ دینا جائز ہے۔ حضور سرور کائنات ؐ نے سنا تو بس اتنا فرمایا کہ شہرت اور ثواب میں بیر نہیں ہے۔ بحث سے قطع نظر کیجیے اور صرف حضور کے الفاظ پر غور کیجیے۔ الفاظ ہیں "شہرت اور ثواب میں بیر نہیں ہے"۔

شہرت حاصل کرنے کی خواہش ایسی ہی چیز ہے جیسی عزت حاصل کرنے کی خواہش۔ کوئی شخص نہیں چاہتا کہ اسے عزت و شہرت حاصل نہ ہو۔ عزت و شہرت حاصل کرنے کی خواہش ہر شخص میں ہوتی ہے، کسی میں کم، کسی میں زیادہ۔ ہے یہ فطری خواہش، اور انسان کی خصوصیت۔ جانور اس خواہش سے انسان کی طرح بہرہ ور نہیں ہیں۔ مگر تمام خواہشوں کے ساتھ اسے بھی دبا کر رکھنا چاہیے اور دل کی بجائے دماغ کے ماتحت رکھنا چاہیے۔ عزت و شہرت کی خواہش کا نہ ہونا بھی خوبی کی بات نہیں ہے اور عزت و شہرت کی خواہش کا حد سے بڑھ جانا بھی خوبی کی بات نہیں ہے۔ آپ عزت اور شہرت کے کام کریں گے تو عزت و شہرت خود بخود ہو گی۔ اپنے اچھے کاموں کو عزت و شہرت سے وابستہ مت کیجیے، اچھے کاموں کا اجر مخلوق سے نہ مانگیے، اللہ سے مانگیے۔ کام اللہ تعالٰی کی خوشنودی کے لیے انجام دیجیے اور عزت و شہرت ملے تو عزت و شہرت کو اللہ کا انعام سمجھیے۔ اس پر اترائیے

نہیں، سجدۂ شکر بجا لائیے۔

جو لوگ کام عزت و شہرت کے لیے کرتے ہیں، اُنھیں شہرت تو مل جاتی ہے عزت نہیں ملتی، اور شہرت بھی بدنامی کی ملتی ہے۔ وہ پھوہڑ کہے جاتے ہیں۔ دُنیا جان لیتی ہے کہ کام کچھ نہیں کیا جا رہا۔ صرف ہمیں بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔

کام اللہ کی خوشنودی کے لیے کیا جائے اور شہرت ملے تو شہرت اور ثواب میں بیر کیوں ہونے لگا۔ شہرت اللہ کا انعام ہوگا۔ شہرت کا انعام انبیا کو دیا گیا ہے اور اولیا کو دیا گیا ہے۔ اللہ کے انعام میں دوام ہے۔ جھوٹی عزت و شہرت دوام نہیں پاتی، اور دوام پاتی ہے تو فرعون و نمرود کا سا دوام پاتی ہے۔

رہنمائی اور اصلاح

آپ کو اللہ تعالےٰ نے لوگوں کی رہنمائی کا منصب عطا فرمایا ہے، آپ اخبار نویس ہیں، اسمبلی کے ممبر ہیں، لیڈر ہیں، مولوی ہیں، پیر ہیں، آپ کو لوگوں کے احساسات اور جذبات ضرور پیشِ نظر رکھنے چاہئیں، لیکن لوگوں کے احساسات اور جذبات کی اصلاح کرنا بھی آپ کا فرض ہے۔ آپ پیرو نہ بنیں، رہنما بنیں۔ پیروی صرف اللہ کے احکام کی کریں۔ لوگ آپ سے کوئی کام اللہ کے حکم کے خلاف کرانا چاہتے ہیں تو لوگوں سے کہیں کہ یہ کام اللہ پسند نہیں کرے گا اور جو کام اللہ پسند نہ کرے وہ تمھارے حق میں مضر پڑے گا۔ عام لوگ اللہ سے منحرف نہیں ہیں حقیقت الامر بتائی جائے گی تو عام لوگ اللہ کے حکم کے آگے سر جھکا دیں گے لیکن اُنھیں دھوکا نہ دیجیے۔ اللہ کا نام بیچ میں لا کر دھوکا دینا اس سے زیادہ بُرا ہے کہ ویسے ہی دھوکا دیتے رہیے اور ان کے جذبات اور احساسات سے کھیلتے رہیے۔

ہمت دکھائیے اور پھر دیکھیے کہ اللہ کی رحمت آپ پر کیسی برستی ہے۔ لوگوں کے منشا اور مطلب کی باتیں نہ کیجیے، لوگوں کے مفید مطلب باتیں کیجیے۔ لوگوں کے غلط احساسات اور غلط جذبات آپ کے پیش روؤں کے پیدا کردہ ہیں، آپ انھیں صحیح راستے سے آشنا کر دیجیے، ورنہ چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات کی ضرب المثل صادق آ جائے گی، جیسے پیش رو گوشۂ گمنامی میں جا چھپے آپ بھی چند روز عیش کر کے اور جھوٹا سچا ڈنکا بجا کر نَسیًا مَّنسِیًّا ہو جائیں گے۔

آسودہ اور غریب مسلمان

دلی کا ہفتہ وار اخبار پیام مشرق راوی ہے کہ دلی سے غازی آباد کو جو سڑک جاتی ہے، اُس پر جدھر دیکھیے کارخانے ہی کارخانے ہیں۔ اِن کارخانوں میں ایک کارخانہ ایسا بھی ہے جس کے مالک مسلمان ہیں، لیکن اس کارخانے میں کام کرنے والا مسلمان کوئی نہیں ہے۔ حالاں کہ حکومت نے مسلم مالک پر یہ پابندی نہیں لگائی ہے کہ مسلمانوں کو ملازم نہ رکھو۔ اِس کارخانے کے قریب چینی بنانے کا کارخانہ ہے، اُس میں کچھ مسلمان کام کرتے ہیں۔ ہندو کے کارخانے میں مسلمان اور مسلمان کے کارخانے میں مسلمان نہیں، کتنی عجیب اور عبرتناک روایت ہے۔ پیام مشرق پُر وقار اخبار ہے۔ پیام مشرق کا بیان غلط نہیں ہو سکتا۔

یہ حال ہے بھارت کے غریب مسلمانوں کا جنھیں بھارت کے امیر مسلمان بھی نہیں پوچھتے۔ اور ہی کس جگہ کے امیر مسلمان غریب مسلمانوں کو پوچھ رہے ہیں۔

پیام مشرق نے لکھا ہے کہ بھارت کے ہر شہر میں تھوڑے بہت آسودہ مسلمان ابھی موجود ہیں۔ خود دلی میں دس ہزار ایسے لکھ پتی مسلمان ہوں گے، جو چاہیں تو دلی کے دو لاکھ مسلمانوں کی اقتصادی ترقی کے لیے معقول رقم فراہم کر سکتے ہیں۔ اس رقم سے امداد باہمی کے اصول پر بہت سے کاروبار کیے جا سکتے ہیں۔ مسلمان اگر اچھے کاروبار کے واسطے ضروری رقم فراہم کر لیں تو حکومت بھی قطعی مدد کرے گی۔ حکومت اتنی ذلیل نہیں ہو گئی ہے کہ مسلمان کو اپریٹو سوسائٹی کی رجسٹری کرانی چاہیں تو رجسٹری محض مسلمانوں کا کاروبار ہونے کی وجہ سے نہ ہو۔

پیام مشرق لکھا کرے، آسودہ مسلمانوں کے کانوں پر جُوں بھی نہیں رینگے گی۔ آسودہ مسلمانوں کی قسمت میں لکھا جا چکا ہے کہ اُن کی رُوحیں اولاد کے افلاس کا صدمہ دیکھیں گی۔

ایک دِل کش تہوار۔ سلونو

ہندؤں کے ہاں برسات کا ایک تہوار ہوتا ہے، جس کا نام سلونو ہے، اس میں بہنیں بھائیوں کے راکھی باندھتی ہیں۔ راکھی یا رکھشا بندھن کا مقصد اور منشا یہ ہے کہ

بہنیں ہر سال بھائیوں سے اپنی رکھشا اور حفاظت کا عہد لیں اور بھائیوں کے قلوب میں اپنی محبّت تازہ کریں۔

آج دلّی ریڈیو اسٹیشن کھولا تو "رکھیاں بندھا لو بھیّا" کا گیت گایا جا رہا تھا۔ مجھے وہ واقعہ یاد آگیا جو مہارانی کرماوتی اور شہنشاہ ہمایوں کے متعلق تاریخ کی کتابوں میں درج ہے۔

رانا سانگا اور بابر عمر بھر لڑتے رہے اور بابر چتوڑ فتح کرنے کا ارمان ہمایوں کو ورثے میں دے گیا، لیکن اللہ کی شان دیکھیے، گجرات کے بادشاہ بہادر شاہ سے اُس کا بھائی چاند خاں بگڑتا ہے اور مہاراجہ چتوڑ (رانا سانگا) کی پناہ میں آجاتا ہے۔ بہادر شاہ مہاراجہ چتوڑ سے کہتا ہے کہ چاند خاں کو میرے حوالے کرو، ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ مہاراجہ لڑتا ہے اور مارا جاتا ہے۔ راجپوت مرد گھبرا اُٹھتے ہیں، مگر راجپوتوں کی ماں کرماوتی پناہ گزین سے مُنہ موڑنے پر موت کو ترجیح دیتی ہے اور یہ سوچ کر کہ بہادر بہادر کی قدر کیا کرتے ہیں، اپنے شوہر (رانا سانگا) اور اپنی حکومت (چتوڑ) کے دشمن ہمایوں سے مدد مانگتی ہے۔ اتفاق سے سلونو کے تہوار کا زمانہ تھا، مہارانی کرماوتی شہنشاہ ہمایوں کو راکھی بھیجتی ہے، گویا اُسے بھائی بناتی ہے اور اس سے دشمنی ختم کرتی ہے۔ قاصد ہمایوں کو کرماوتی کی مصیبت کا حال سُناتا ہے۔ ہمایوں اُس وقت ہندستان کو دوبارہ قبضے میں لا رہا تھا۔ اُس کا اپنا حریف اس کے سامنے تھا۔ مشیر اُسے سمجھاتے ہیں کہ اپنی آگ بُجھاتے بُجھاتے دوسروں کی آگ میں نہ کود پڑیے، لیکن ہمایوں راکھی کی قیمت سے واقف تھا۔ اُس نے لشکر کا رُخ اپنے حریف کے بدلے میواڑ کی طرف موڑ دیا۔ اگرچہ ہمایوں کے پہنچتے پہنچتے میواڑ کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی اور کرماوتی اور بارہ ہزار دوسری راجپوتنیاں چِتا میں جل کر راکھ ہو چکی تھیں، تاہم ہمایوں نے کرماوتی کی راکھ سے بھائی پنا نبھایا اور میواڑ بہادر شاہ سے واپس چھین کر کرماوتی کے بیٹے کو تخت پر بٹھا دیا۔

یہ تاریخی واقعہ ہے۔ آج دہلی ریڈیو اسٹیشن سے "رکھیاں بندھا لو بھیّا" کی آواز فضا میں گونجی تو مجھے آجکل کے حالات کا خیال کر کے دکھ ہونے لگا۔ ہمارے بڑے کتنے اونچے تھے اور ہم کتنے نیچے ہیں۔

عمل، جنّت اور جہنّم

انسان اپنے عمل سے اپنے لیے جنّت اور جہنّم دونوں بنا سکتا ہے۔ بنا سکتا نہیں، بناتا ہے، حیات موجودہ میں بھی اور حیات آخرت میں بھی۔

اسی طرح قومیں اپنے لیے دونوں چیزیں، دونوں جگہ اپنے عمل سے بناتی ہیں۔

اسلام آیا ہی اس لیے تھا کہ ہمیں وہ طرزِ زندگی سکھا دے جس سے ہماری دنیا سنور جائے اور اسلام کی ہدایت کے مطابق دنیا کا سنوارنا ہی عقبےٰ کی جنّت دلاتا ہے۔

دنیا کے سنورنے کا یہ تصور نہ کیجیے کہ آپ کسی انگریزی ہوٹل میں عیش کے دن اور عیش کی راتیں گزارنے لگیں۔ شرابیں پئیں اور نیم برہنہ عورتوں کے ناچ دیکھیں۔ ضمیر کا آئینہ صاف ہو تو اُس عیش میں تو جنّت کی بجائے جہنّم نظر آئے گا۔ وہ عیش ایسا عیش ہے جو سیدھا جہنّم پہنچاتا ہے۔ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِيْنَ (سورہ ۸۲ آیت ۱۶)

اس قسم کے عیش کرنے والے تو جہنّم کے بالکل سامنے ہیں۔ جہنّم سے چھپے ہوئے نہیں۔ جہنّم انھیں تاک رہا ہے۔

اسلام کے مطابق دنیا کا سنورنا وہ ہے جس کا نمونہ عہد خلفائے راشدین نے پیش کیا تھا۔

اللہ اور رسولؐ کے مجوزہ نظام پر عمل پیرا ہونے سے ہم عہد خلفائے راشدین کو واپس لا سکتے ہیں اور اللہ رسولؐ کے مجوزہ نظام پر عمل پیرا ہو کر ہی ہم عقبےٰ کی جنّت پا سکتے ہیں۔

عہد خلفائے راشدین کے مسلمانوں، بلکہ تمام صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کا مسلک یہ تھا کہ اللہ کے اِس حکم کو نہیں بھولتے تھے۔ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (سورہ ۲- آیت ۳۵) اس میں سے جو چیز چاہو جی بھر کر کھاؤ پیو مگر فلاں فلاں شجر کے قریب مت جانا۔

مسلمان دنیا کی تمام جائز آسائشیں حاصل کر سکتے ہیں لیکن اُن حرکتوں کے قریب بھی نہیں جا سکتے جن کے قریب جانے کو اللہ اور رسولؐ نے منع فرما دیا ہے۔ انھیں منکرات کے مبادیات تک سے بچنا چاہیے۔ مسلمان اگر ایسی زندگی اختیار کریں گے تو جنّت کی بہاروں کا تھوڑا سا لطف دنیا ہی میں لے لیں گے۔ باقی اصل جنّت کا لطف اور پورا لطف

تو مرنے کے بعد ملے گا۔ اُس کا فی الحال ہم ادراک اور اندازہ نہیں کر سکتے۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ کوئی نہیں جانتا کہ آنکھوں کی کیسی ٹھنڈک (اور کلیجے کی کیسی طراوت ہمارے ہاں انھیں میسر ہوگی) اُن کے واسطے اُن کے اعمال (نیک) کے بدلے (جو عیش و راحت کا سامان مہیا ہے وہ ابھی پردۂ راز میں ہے کسی کا وہم و گمان بھی اُس سامان تک نہیں پہنچ سکتا۔)

موت اور اُس کے بعد

موت کی بے ہوشی کا طاری ہونا تو بالکل یقینی ہے (اس میں شک اور شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے، اُس وقت انسان سے کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ (چیز) جس سے تو منھ موڑے رہتا تھا۔ پھر (جب قیامت کے دن) صور پھونکا جائے گا (تو موت سے غفلت برتنے والوں کو بتایا جائے گا کہ) یہ ہے وہ وعدۂ عذاب کا دن۔

ہر (نافرمان) انسان (میدانِ قیامت میں) اِس شان سے آئے گا کہ اُس کے ساتھ ایک ہانکنے والا (فرشتہ) ہوگا، نیز ایک (اس کے اعمال کا) گواہ (فرشتہ۔ اللہ اُس سے فرمائے گا) تو اِس (دن) سے غافل تھا، لے (آج) ہم نے تیرے آگے سے پردہ ہٹا دیا۔ آج تو تیری نگاہ تیز ہے؛ (آج تو تجھے سب کچھ دکھائی دیتا ہے)

اُس کا ہم نشین (فرشتہ، جو زندگی بھر اُس کے ساتھ رہا) بولے گا کہ یہ (اعمال نامہ) جو میرے پاس ہے حاضر ہے۔ (حکم ہوگا) دوزخ میں ڈال دو، تم دونوں (فرشتے مل کر)، ہر عناد رکھنے والے (دشمن ایمان اور) بھلائی سے روکنے والے (اور) حد (اعتدال) سے باہر نکل جانے والے (اور احکام دین میں) شک (اور ہیر پھیر) کرنے والے کافر کو، جس نے اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی معبود بنایا۔ اور دوزخ میں ڈال کر اُسے سخت عذاب میں مبتلا کر دو۔

(یہ پریشان کن حکم سُن کر ہر ایسا شخص اپنے دنیاوی ہم نشین شیطان سے جھگڑنے لگے گا کہ تیری وجہ سے یہ روزِ بد دیکھنا پڑ رہا ہے) اُس کا ہم نشین (شیطان جناب الٰہی میں)

لہ سورہ ۳۲۔ آیت ۱۷

عرض کرے گا کہ اے میرے پروردگار میں نے اسے نافرمان (اور گمراہ) نہیں بنایا تھا، بلکہ یہ (خود) پرلے درجے کی گمراہی میں پڑا ہُوا تھا۔ (اللہ) فرمائے گا، میرے سامنے بحث مت کرو، اور جھگڑو نہیں۔ میں نے تو پہلے ہی تم (سب) کو عذاب سے متنبہ کر دیا تھا۔ میرے سامنے بات بدلی نہیں جا سکتی (اور ہیر پھیر میں نہیں ڈالی جا سکتی۔ اب میں جو کچھ کروں گا، ٹھیک کروں گا) میں بندوں پر ظلم نہیں کرتا (بندوں کے ساتھ انصاف کرتا ہوں)

(وہ دن وہ ہوگا) جس دن ہم دوزخ سے پوچھیں گے کہ تُو کیا بھر گئی۔ وہ کہے گی (کیوں) کیا اور (دوزخی) ہیں، اور (وہ دن وہ ہوگا کہ بہشت پرہیزگاروں کے (اس قدر) قریب لے آئی جائے گی کہ فاصلہ مطلق نہیں رہے گا۔ یہی ہے وہ بہشت جس کا تم میں سے (اللہ کی طرف) رجوع ہونے والوں (اور اللہ کے احکام کی) حفاظت کرنے والوں سے وعدہ کیا جا رہا ہے (ہمارے ہاں سزائیں ہی نہیں ہیں جزائیں بھی ہیں)۔

جو لوگ بن دیکھے اللہ تعالیٰ سے ڈرے (اور جنھوں نے عقل سے اُسے پا لیا) اور (اس کی طرف) رجوع کرنے والا دل لے کر وہ بڑھے، (اُن سے ہم کہیں گے کہ) سلامتی کے ساتھ بہشت میں داخل ہو، (اُس دن سزا دی جائے گی تو ہمیشہ کے لیے دی جائے گی اور جزا دی جائے گی تو ہمیشہ کے لیے دی جائے گی) وہ ہمیشگی کا دن ہے (دنیا کی طرح عارضی سزائیں اور جزائیں نہیں ملیں گی)۔ بہشت میں اہلِ بہشت جو چاہیں گے (وہ انھیں) حاصل ہو جائے گا۔ ہمارے پاس اُس سے زیادہ موجود ہے جو وہ چاہیں گے۔

ہم اِن (آجکل کے) سرکشوں سے پہلے بہت سی (سرکش) امتوں کو ہلاک (اور ختم) کر چکے ہیں، جو قوت میں اِن (آجکل کے سرکشوں) سے بڑھ چڑھ کر تھے، (جب ہمارا عذاب نازل ہُوا) تو انھوں نے شہر چھان مارے کہ سر چھپانے کی جگہ میسّر آ جائے (مگر انھیں کہیں جگہ میسّر نہ آئی)۔

اس بیان سے وہی انسان نصیحت حاصل کر سکتا ہے جو قلب (سلیم) رکھتا ہے یا جو حضورِ قلب کے ساتھ (اس بیان پر) کان لگا دیتا ہے اور دلی توجہ سے اِسے سُنتا ہے۔

(سورہ ۵۰۔ آیات ۱۹ تا ۳۷)

دروغ مصلحت آمیز

ایک صاحب نے جو خاصے محتاط آدمی ہیں، مجھ سے کہا کہ ایک لغزش ہو گئی ہے، میں بیوی سے جھوٹ بولا ہوں۔ بیوی گھر کے چوکیدار کی شکایت لائی تھیں کہ صبح اپنے واسطے چاء بناتا ہے تو ہمارے کوئلے چرا لیتا ہے۔ چوکیدار سے علاحدگی میں تحقیق کیا تو اس نے بتایا کراچی کی تیز ہوا کبھی کبھی میری لکڑیاں نہیں سلگنے دیتی۔ دو چار کوئلے لکڑیوں کی مدد کو ضرور اٹھا لیتا ہوں۔ میں نے کہا، بغیر اجازت کے دوسرے کی چیز اٹھانا خراب بات ہے۔ تم مجھ سے بارہ آنے لو اور پانچ سیر کوئلے خرید کر کوٹھڑی میں الگ رکھو۔ گھر کے کوئلوں کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ بیوی میری عادت جانتی ہیں۔ کوٹھڑی میں اکٹھے کوئلے دیکھے تو انھیں شبہ گزرا۔ مگر میں نے رفع شر کے خیال سے جھوٹ بول دیا کہ چوکیدار کوئلے اپنے پیسوں سے لایا ہے۔ اب فرمائیے، اس جھوٹ کی گرفت تو نہیں کی جائے گی۔ میری نیت بخیر تھی۔

میں نے کہا حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا فتویٰ اگر صحیح ہے تو اللہ سے امید ہے کہ وہ آپ کی نیت پر نظر کرے گا اور اس لغزش کی گرفت نہیں فرمائے گا۔ شیخ سعدی کہتے ہیں:

دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز

یہ جواب دینے کے بعد مجھے ایک اور صاحب یاد آ گئے، جن سے ۱۹۵۰ء میں جب میں دلی گیا ہوں، سردار دیوان سنگھ صاحب مفتون، ایڈیٹر ریاست کے ہاں ملاقات ہوئی تھی وہ بھی سکھ ہیں۔ سردار دیوان سنگھ صاحب نے تعارف کرایا کہ ۴۷ء کے ہنگامے میں انھوں نے کئی مسلمان لڑکیوں کو چھپایا تھا۔ مسلمان لڑکیاں ان کی لڑکی کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھیں۔ بڑے راست گو آدمی ہیں۔ گاندھی جی کے پورے پیرو اور بھگت، لیکن جب ہنگامہ کرنے والے آئے تو انھوں نے جھوٹ بول دیا کہ میرے ہاں کوئی مسلمان لڑکی نہیں ہے۔ روزانہ شام کے وقت گاندھی جی کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ انھیں واقعہ سنایا اور سوال کیا کہ باپو! اس جھوٹ کو تو آپ جھوٹ نہیں سمجھتے۔ گاندھی جی نے فرمایا۔ جھوٹ تو جھوٹ ہی ہے تمھیں چاہیے تھا کہ لڑکیوں کی جان کی خاطر خود مر جاتے، لیکن جھوٹ نہ بولتے۔ یعنی سچ کے مقابلے میں لڑکیوں کی جان کی پرواہ ضروری نہیں تھی۔

دین فطرت جھوٹ اور سچ کے معاملے میں اس قدر سخت نہیں ہے۔ دو چیزیں

رہیں، ایک بے قصوروں کی جان بچانا، دوسرے جھوٹ بولنا۔ دونوں میں سے ایک کے اختیار کرنے پر انسان مجبور کر دیا جائے تو فطرتاً وہ کون سی چیز اختیار کرے گا۔ معصوم قسم کا جھوٹ بولے گا، یا معصوموں کو مرنے دے گا۔

اللہ تعالےٰ کا وعدہ

(منافقوں سے) کہو کہ اللہ کی فرماں برداری کریں اور رسولؐ کی فرماں برداری کریں (اے منافقو) تم اگر (اللہ رسول کا) حکم نہیں مانو گے تو (رسولؐ اس کا خمیازہ نہیں بھگتیں گے)، رسول بس ہمارا حکم پہنچا دینے کے ذمہ دار ہیں، حکم کو ماننے نہ ماننے کے ذمہ دار تم ہو۔ تم ہمارے رسول کے کہنے کے مطابق چلو گے تو راہ (فلاح) پا لو گے۔ رسولؐ کے ذمے (ہمارے حکم کی) علی الاعلان تبلیغ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

تم میں جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور جنھوں نے (ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اللہ کے احکام کے مطابق) اچھے عمل (بھی) کیے ہیں، اُن سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انھیں اللہ (اُسی طرح) اِس زمین کا حکمراں بنا دے گا جس طرح اُس نے اُن (ایمان و عمل والے) لوگوں کو حکمراں بنایا تھا جو اِن سے پہلے گزر چکے ہیں، اور اللہ اُن کے واسطے اِس دین (اسلام) کو جو اللہ نے اُن کے لیے پسند کیا ہے مستحکم کر دے گا اور اُن کا خوف (و ہراس) ختم کر کے خوف (و ہراس) کے بدلے انھیں (ایسا) امن (و اطمینان) بخشے گا کہ (پھر) وہ (بالکل سکون سے) ہماری عبادت (و اطاعت) کیا کریں گے اور کسی کو ہمارا شریک نہیں سمجھیں گے (سمجھ جائیں گے کہ خوف و ہراس دُور ہو سکتا ہے تو ایمان لانے اور اللہ کی حکم برداری سے ہو سکتا ہے۔ اللہ کے علاوہ کوئی خوف و ہراس دُور نہیں کر سکتا۔)

جو (ہمارے اِس (وعدے) کے بعد کفر کرے (اور ہمارے وعدے کو سچا نہ جانے) تو یہی لوگ تو نافرمان ہیں۔ (خواہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے رہیں۔ انھیں چوٹوں پر چوٹیں کھانی ہیں اور نقصان پر نقصان برداشت کرنے ہیں)۔ (سورہ ۲۴۔ آیات ۵۴۔۵۵)

مسلمان وہ ہیں کہ ہم انھیں زمین میں قوت و حکومت عطا فرمائیں گے تو (حق کا بول بالا کریں گے۔ نیز خود) نماز پڑھیں گے اور زکوٰۃ دیں گے (اور دوسروں سے بھی) اچھے

عمل کرائیں گے اور (دوسروں کو بھی) بُرے عمل سے روکیں گے۔ (سورہ ۲۲۔آیت ۴۱)

سکیولر حکومت

بھارت کے ہندو جب بھارت کے مسلمانوں پر ظلم توڑتے ہیں تو پاکستان کے مسلمانوں کو رنج اور صدمہ ہوتا ہے۔ رنج اور صدمہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو ہونا چاہیے لیکن اسلام کا رشتہ چوں کہ کمزور پڑ گیا ہے پاکستانی مسلمان ہی بھارتی مسلمانوں کے لیے روتے ہیں، کیوں کہ اُن کے بھارتی مسلمانوں سے دوسرے رشتے بھی ہیں۔ دوستیاں، کنبہ داریاں، پاکستان کے مسلمان بھارت کے مسلمانوں کا دکھ درد کیسے محسوس نہ کریں گے۔ یہ احساس ظاہر کیا جاتا ہے تو بھارت کی حکومت چلاّتی ہے کہ دیکھیے صاحب، ہمارے داخلی اُمور میں دخل دیا جاتا ہے، اُسے چلاّنے دیجیے۔ لیکن پاکستان میں ایسی باتیں کہی جانے لگیں جو بھارت کے مسلمانوں ہی کو پسند نہ آئیں، تو ہمیں ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئیں۔ جو کرنا نہیں ہے اُسے زبان سے کیوں نکالا جائے۔ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔

علیٰ ہذا بھارت کے ممتاز اہلِ علم اور اہلِ قلم بھارت کے حالات کے پیشِ نظر کچھ تحریر فرمانے بیٹھیں تو براہِ کرم مسلمانانِ پاکستان کا نیک و بد نہ بھولیں۔ پاکستان کے مسلمانوں کا نیک و بد جس میں مسلمانان بھارت اثرانداز ہو سکتے ہیں فقط ایک ہے، دینی حکومت اور لادینی حکومت۔

دارالعلوم دیوبند کے مشہور فاضل مولانا سعید احمد اکبرآبادی، ایم۔اے نے جو مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) میں شعبہ دینیات کے صدر رہیں ایک مضمون شایع کیا ہے، جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

"الجزائر پر آزادی اور خودمختاری کی پُو پھٹتی نظر آئی تو مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے نے الجزائری مسلمانوں کو "مجاہد فی سبیل اللہ" کہا۔ غازی اور شہید کا لقب دیا اور اُن سے توقعات قایم کرلیں کہ اب یہ لوگ آزاد ہوتے ہی اسلامی حکومت قایم کریں گے اور اس کے نتیجے میں یہ ہوگا اور وہ ہوگا۔ لیکن پچھلے دنوں الجزائری حکومت کے نمایندے نے نئی دہلی میں اعلان کیا کہ الجزائر میں سکیولر جمہوری حکومت قایم کی جائے گی تو اتنا سنتے ہی اِن سب حضرات پر اوس سی پڑ گئی ہے، اور اِنھیں ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ

گویا الجزائر کے فداکارانِ حریت نے آزادی کی خلعتِ فاخرہ زیب تن کرتے ہی اپنا رُخ بجائے کعبہ کے دیر و کلیسا کی طرف کر لیا ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ سب ملکوں کی حالت یکساں نہیں ہے۔ بلکہ کہیں مسلمان اکثریت میں ہیں اور کہیں غیر مسلم۔"

اِس کے بعد مولانا سعید احمد صاحب فرماتے ہیں:

"پھر جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، وہاں سب ہی ایک عقیدے اور ایک خیال کے نہیں ہیں۔ اُن میں سُنّی بھی ہیں اور شیعہ بھی، آزاد خیال بھی ہیں اور قدامت پرست بھی، پختہ کار اور صادق بھی ہیں اور نام کے مسلمان بھی۔ اِن اختلافات سے قطع نظر، مشاہدہ تو یہ ہے کہ ایک ہی مسلک و مشرب (مثلاً احناف) کے علما چند جدید مسائل پر متفق نہیں ہو سکتے۔ اب جس ملک میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہاں اسلامی حکومت بنالی گئی تو آخر اُس کی شکل و صورت کیا ہوگی؟ وہ سنّی ہوگی یا شیعہ۔ اُس کے قوانین کی بنیاد قرآن مجید کی کس تفسیر اور حدیث کی کس شرح پر رکھی جائے گی اور فیصلے کیوں کر ہوں گے؟ عددی اکثریت سے؟ تو سُنّی یا شیعہ جو فرقہ بھی اقلیت میں رہ جائے گا وہ محسوس کرے گا کہ اُس پر ظلم ہو رہا ہے۔ اور اگر ہر فرقے کو آزادی دی گئی کہ اپنے اپنے مسلک فقہ کے مطابق عمل کرے تو انفرادی زندگی میں تو یہ چیز نبھ سکتی ہے، لیکن کیا اجتماعی مسائل میں اِس آزادی سے بدنظمی اور افراتفری نہیں پیدا ہوگی؟ پھر وہ اسلامی حکومت ہی کیا ہوئی جو متعہ اور سُودی کاروبار جیسی چیزوں کو بند نہ کر سکے، صرف اس لیے کہ مسلمانوں کے بعض فرقے اِن کے جواز کے قایل ہیں۔"

"علاوہ ازیں سوال یہ ہے کہ اچھا اگر اپنی اکثریت کے ملکوں میں مسلمانوں نے اپنی حکومت کو اسلامی قرار دے بھی دیا (اس سے قطع نظر کہ وہ درحقیقت اسلامی ہے یا محض برائے نام ہے) تو اب فرمائیے کہ جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں کس قسم کی حکومت قایم کی جائے؟ عیسائی، یہودی، بودھ، ہندو، جینی، پارسی یا سیکولر؟ اگر پہلی صورت منظور ہے تو اپنے حوصلہ و ظرف کے گریبان میں منھ ڈال کر بتائیے کہ آپ اس غیر مسلم مذہبی حکومت کو برداشت کرلیں گے؟ کیا آپ کو اُمید اور بھروسہ ہے کہ اس حکومت میں آپ کی اسلامی زندگی اور اُس کے مفادات محفوظ رہیں گے؟ اور اگر اس کے برعکس دوسری صورت یعنی سیکولرزم آپ کو پسند ہے تو یہ دیکھیے کہ جن جن ملکوں میں آپ اقلیت میں ہیں وہاں کی اکثریتوں کا دل کبھی

آپ کی طرف سے صاف ہو سکتا ہے ؟ وہ کہیں گی نہیں کہ مسلمان عجب خود غرض اور موقع پرست لوگ ہیں، جہاں اقلیت میں ہوتے ہیں، وہاں مطالبہ کرتے ہیں کہ حکومت سیکولر جمہوریہ ہو، جس میں کسی مذہب کے ساتھ ترجیحی سلوک نہ کیا جائے اور جہاں ہر شخص کو شہری حقوق یکساں حاصل ہوں، لیکن جس ملک میں مسلمانوں کی ذرا سی اکثریت ہوتی ہے، وہاں مسلمان جھٹ اپنی حکومت کے "اسلامی" ہونے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ غور کیجیے، مختلف ملکوں کی غیر مسلم اکثریتوں کے دل اور دماغ میں اگر یہ خیال جم گیا تو دنیا کے تمام مسلمانوں کو بہ یک وقت سامنے رکھ کر ارشاد فرمائیے کہ مجموعی طور پر دو چار ملکوں کی حکومت کو اسلامی کہہ دینے سے مسلمانوں کو فائدہ زیادہ پہنچے گا یا نقصان؟"

آگے چل کر مولانا سعید احمد صاحب نے دو ٹوک فیصلہ دے دیا ہے کہ

"اگر غیر مسلم اکثریت کے ملکوں نے سیکولر جمہوریت قایم کی ہے جس کا فایدہ اُن ملکوں کی مسلم اقلیت کو پہنچ رہا ہے اور اس حد تک پہنچ رہا ہے کہ دستوری اعتبار سے ایک مسلمان بھی اُن ملکوں کا صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم اور کمانڈر انچیف ہو سکتا ہے تو اس کے جواب میں مسلم اکثریت کے ملکوں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے لیے ایک ایسی طرز اختیار کریں، جس کے تحت اُن ملکوں میں غیر مسلم اقلیتوں کو وہی مراعات اور وہی حقوق حاصل ہوں جو مسلمان اقلیتوں کو غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں حاصل ہیں، یعنی وہاں سیکولر جمہوریت ہو تو یہاں بھی وہی ہو۔"

اگرچہ سارا مضمون الجزائر کے متعلق ہے، لیکن الجزائر میں اسے کون پڑھے گا۔ سبق تو اس سے اُردو داں لے سکتے ہیں اور فایدہ تو اس سے پاکستان کے وہ لوگ اُٹھا سکتے ہیں جو پاکستان میں دینی حکومت نہیں چاہتے۔

خواجہ ناظم الدین کی وزارت کے زمانے میں مولانا احتشام الحق نے پاکستان کے شیعہ، سُنی، مقلد، غیر مقلد، سب فرقوں کے بڑے بڑے اکتیس عالموں کو جمع کیا تھا جنھوں نے فروعی اختلافات کے حل تلاش کر لیے تھے، وہی حل مولانا سعید احمد کی اس تشویش کا جواب ہیں کہ "اسلامی حکومت بنی تو آخر اس کی شکل کیا ہوگی، وہ سنی ہوگی یا شیعہ"

مولانا سعید احمد اُن عالموں کے حل سے متفق نہ ہوں تو پھر صاف صاف اُس جماعت کی تائید کریں جو بار بار بتا چکی ہے کہ "اسلامی حکومت قایم کرنے والے مسلمان غیر مسلم حکومتوں سے

اُن کی مسلمان رعایا کے لیے بس اُتنی مراعات مانگیں گے جتنی مراعات وہ غیر مسلم رعایا کو دیں گے۔"

اُس جماعت نے بار بار یہ بات دوہرائی ہے کہ "اتنی مراعات پانے کے بعد آپ دیکھیے گا کہ غیر مسلم حکومتوں کی مسلمان رعایا کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ اگر بھارت کی سیکولر حکومت آج بھارت کی اقلیتوں کو وہ حقوق و مراعات دے دے جو قرآنی حکومت میں غیر مسلموں کو حاصل ہوتے ہیں تو بھارت کے مسلمانوں کی مصیبتیں باقی نہیں رہ سکتیں۔"

اسی جماعت کی طرف سے ایک سوال اور کیا جاتا ہے کہ سورہ ۲۴ اور سورہ ۲۲ کی جن آیات کا ہیں نے اوپر مفہوم درج کیا ہے، اُن کی بابت مولانا سعید احمد صاحب کا کیا خیال ہے۔ آیا قرآن مجید کی مندرجہ آیات وقتی تھیں اور اب ناقابلِ عمل اور منسوخ ہیں؟

اختلاف کی وجہ معلوم کرو

کسی شخص کے بچوں کا ایک دوسرے سے دل بگڑ جائے اور وہ شخص ہو حساس، تو اُس کے لیے بچوں کا اختلاف مصیبت بن جاتا ہے۔ سگے بھائی بہن ہی نہیں، اللہ تعالےٰ تو کہتا ہے کہ تمام قرابت داروں کے ساتھ سلوک اور محبت سے رہا جائے۔ قرابت کے سلوک و محبت کو اللہ تعالےٰ نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی تعلیم دینِ حق کا معاوضہ قرار دیا ہے۔ اِس سے زیادہ سلوک و محبت کی اہمیت اور کیا ہو سکتی ہے۔ ارشاد ہے: (اے محمدؐ! مسلمانوں سے) کہو کہ میں (دینِ حق کی تعلیم کا) تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، الّا یہ کہ قرابت داروں کے جو حقوق ہوتے ہیں وہ مت بھولو، آپس میں سلوک اور محبت سے رہو۔ (قرابت داروں کے ساتھ تعلقات قائم رکھنا بڑی نیکی ہے اور) جو شخص نیکی کرے گا، اُس کی نیکی میں ہم مزید حُسن پیدا کر دیں گے۔ (کسی قسم کا شبہ نہ کرو) بلا شبہ اللہ (گناہوں کا) بخشنے والا (اور نیکیوں کی) قدر کرنے والا ہے۔ (سورہ ۴۲۔ آیت ۲۳)

بچوں کے اختلاف سے تڑپو نہیں، تڑپنے سے کیا حاصل ہوگا۔ یہ سوچو کہ اختلاف کی وجہ کیا ہے۔ سوچو گے تو تمہارا ہی قصور نکل آئے گا۔ تم نے بچوں کی تربیت میں کچھ نہ کچھ کسر چھوڑی ہے، یا اپنا نمونہ اُن کے سامنے ایسا پیش کیا ہے جس کا اثر اور عکس آج دیکھ رہے

ہو، وَمَآ اَصَابَکُمْ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ........ وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ۔ تم پر جو مصیبت آتی ہے تمھارے ہاتھوں آتی ہے۔ اللہ تو تمھاری) بہت سی (لغزشوں اور غلطیوں کو) معاف (اور نظر انداز) کرتا رہتا ہے، اور (یہ اُس کا فضل و کرم ہے، ورنہ) تم (یہاں) دنیا میں (بھی) اُسے عاجز و مجبور نہیں کرسکتے۔ (اب بھی اگر اُس کی ہدایات کے مطابق زندگی گزارنے لگو تو اللہ مدد کو موجود ہے۔ یقین مانو) اللہ کے سوا تمھارا حقیقی مددگار دوسرا کوئی نہیں ہے۔ (سورہ ۴۲ - آیات ۳۰ — ۳۱)

اپنی غلطیوں کی تلافی کرو اور اللہ سے کہو ؎

اے نوح کی کشتی کے نگہبان ! بچالے
میری بھی ہے اک کشتیٔ امید بھنور میں

مصنُوعی بارش

امریکا والے آجکل کوشش کر رہے ہیں کہ سمندر کے کھاری پانی سے میٹھا پانی نکالا جائے۔ جس طرح سمندر کی بھاپیں اُٹھنے سے بادل بنتے ہیں اور بادلوں سے میٹھا پانی برستا ہے، اسی طرح سمندر کا سارا پانی کہیں روک کر غالباً بھاپیں اُٹھائی جائیں گی اور بادل برسائے جائیں گے۔ ایسی کوششوں کی اسلام نے دعوت دی ہے۔ اللہ کی ہر صنعت غور کرنے اور کام لینے کے لیے ہے۔ اللہ کی صنعتوں ہی سے اللہ کا پتہ لگتا ہے اور نئی نئی ایجادوں کی تحریک ہوتی ہے۔ افسوس میں نے ابتدائے عمر اور طالب علمی کے زمانے میں یہ بات نہیں سمجھی، ورنہ سائنس ضرور پڑھتا اور اسلام کی یہ دعوت قبول کرتا۔ ایجادوں کی وجہ سے موجدوں کا اِترا جانا اور بے آپے ہو جانا بُرا ہے۔ اُنھیں سوچنا چاہیے کہ وہ کھاری پانی سے میٹھا پانی تو نکال سکتے ہیں، مگر کھاری پانی بہرحال اللہ ہی کے سمندر سے لینا پڑے گا اور اللہ ہی کی بارش سے سیکھنا پڑے گا کہ کھاری کو میٹھا کیسے بنایا جائے۔ تمام ایجادوں کی بنیاد اللہ کی صنعتوں پر ہے۔ اِس بنیاد کو نہیں بھولنا چاہیے، اور اِس حقیقت کو بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ انسان اللہ کی صنعتوں سے سبق لے سکتا ہے، اللہ کی صنعتوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ہوا کا رُخ نہیں پھیر سکتا۔ جہاز اور کشتیاں بنا سکتا ہے، اُن کے واسطے لکڑی اور لوہا نہیں پیدا کرسکتا۔

۱۹۶۰ء میں چرچا ہوا تھا کہ حکومت پاکستان نے محکمہ موسمیات کو حکم دیا ہے کہ مصنوعی

بارش برسانے کا تجربہ کیا جائے۔ اچھی خبر تھی۔ پتیلی سے بھاپیں اُٹھتی ہیں تو بڑے برتن سے بھاپیں کیوں نہ اُٹھیں گی، اور بھاپیں بادلوں کی شکل اختیار کر لیں تو تعجب کیا ہے، لیکن اول تو ہر بادل برسا نہیں کرتا، دوسرے ہوا بالکل اللہ کے قبضے میں ہے۔ آپ نے مصنوعی بادل کو لاہور میں برسانا چاہا اور ہوا اُسے امرتسر لے اُڑی تو کیسی رہے گی، یا ساتھ کے ساتھ طوفان بھی آگیا تو کیوں کر نمٹیے گا۔

جس طرح قیامت کا وقوع فقط اللہ کے علم میں ہے اور یہ کہ فلاں انسان کل کیا کر سکے گا اور یہ کہ فلاں انسان کہاں مرے گا، سب امور فقط اللہ جانتا ہے، انسان کو اپنے مستقبل اور اپنی موت کا علم نہیں دیا گیا ہے، اِسی طرح اس کا علم کہ پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی، اور گھٹا یہاں برسے گی یا وہاں، اس کا علم بھی اللہ کے ساتھ مختص ہے، آپ صرف ٹامک ٹوئیے مار سکتے ہیں، جو کبھی ٹھیک نکلیں گے، کبھی غلط۔

عکس ریز (X Ray) کے ذریعے بچّے کا سر، پیر، آنکھ، ناک تمام اعضا دیکھ لیجیے؛ مگر پیٹ میں بچّے کی نشست اللہ تعالیٰ نے ایسی رکھی ہے کہ پتہ نہیں چلتا کہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ علیٰ ہذا بادل شاید آپ تیار کر لیں، لیکن انھیں مرضی کے مطابق برسانا محال ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ج وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ج وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ط وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ط وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ط اس لیے کھاری پانی سے کسی اور طرح میٹھا پانی نکال کر نہریں ہی بھانی مناسب ہوں گی۔ پانی برسانے کا خیال شاید ابھی قبل از وقت ہے۔

دولت اور اقتدار کا نشہ

دو نشے تمام نشوں سے زیادہ خطرناک ہیں، ایک دولت کا نشہ، دوسرے اقتدار کا نشہ۔ دولت کے اعتبار سے یا اقتدار کے اعتبار سے انسان ذرا سا اونچا ہو جاتا ہے تو پھر اُس سے اپنا آپا نہیں سنبھلتا۔ افراد کے اور قوموں کے ظرف کو جانچنے کی کسوٹی میرے نزدیک صرف یہی ہے کہ دولت اور اقتدار کی اُس میں کتنی سہار ہے۔

جس کے پاس دولت و اقتدار ہے ہی نہیں، اُس کی بابت کہا گیا ہے ؎

گدا اگر تواضع کند خوئے اوست

غریب آدمی انکسار برتتا ہے اور لوگوں کے ساتھ اچھی طرح پیش آتا ہے تو کیا کمال کرتا ہے، تعریف کے مستحق حقیقتاً وہ دولت مند اور حاکم ہیں جو غریب آدمی کو آدمی سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ملحوظ رکھتے ہیں کہ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ط (بات اچھی اور بخش دینا بہتر ہے اس خیرات سے کہ پیچھے اس کے ہو ایذا۔) جن کی زبان سے اُن کے دست نگر اور ماتحت محفوظ رہتے ہیں ؎

گر بہ دولت برسی مست نہ گردی مردی

دولت اور اقتدار حاصل ہو اور نشہ نہ چڑھے تو مردانگی یہ ہے۔

دولت مندوں اور حاکموں کا بے آپے پن دیکھ کر کہا جاتا ہے ؎

چہ گونہ شکر ایں نعمت گزارم
کہ زور مردم آزاری نہ دارم

ایسے دولت مندوں سے دُور بھاگنے کا حکم ہے ؎

جس کو ہو دین و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں

قدیم درویش صرف ان دولت مندوں اور حاکموں سے ملا کرتے تھے جو اُن کے ہاں پہنچ جاتے تھے، وہ دولتمندوں اور حاکموں کے ہاں کے کاوے نہیں کاٹتے تھے۔ خدا معلوم حدیثِ رسولؐ ہے یا قول صحابہ کہ وہ امیر بہت اچھا جو درویش کے دروازے پر دکھائی دے اور وہ درویش بہت بُرا جو امیر کے دروازے پر نظر آئے۔ نِعْمَ الْاَمِيْرُ عَلٰى بَابِ الْفَقِيْرِ وَبِئْسَ الْفَقِيْرُ عَلٰى بَابِ الْاَمِيْرِ۔ اپنے اور اپنے اللہ کے درمیان انبیا اور اولیا کے سوا کسی کی بڑائی نہ ماننے والا اور اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ دل سے کہنے والا دولت مندوں اور حاکموں کے گھر کا طواف کیسے کر سکتا ہے۔

قرآن مجید کی صداقت

ہمارے مذہب سے پہلے کے جتنے مذاہب دنیا میں آج موجود ہیں ہم مسلمان ان سب کو مانتے ہیں۔ کچھ کا نام لے کر اقرار کرتے ہیں، اور کچھ کا نام نہیں لیتے، یہ کہتے ہیں کہ انھیں بھی ضرور کسی نبی نے پہنچایا ہوگا۔ اس عقیدے کے بغیر مسلمان مسلمان نہیں بن

سکتے۔ مسلمانوں کے سوا کوئی اور قوم ایسی نہیں ہے جو سب مذاہب کو مانتی ہو اور اُن پر اپنے خاص مذہب کا اضافہ کرتی ہو۔ دوسری قومیں فقط اپنے ہی مذہب کی قایل ہیں، دوسرے مذاہب سے غرض نہیں رکھتیں، اُنھیں از سرتاپا جھوٹا سمجھتی ہیں۔ لہٰذا ہمارا معاملہ تمام مذاہب کے ساتھ اس نوعیت کا ہے کہ ہم اُن مذاہب سے مُنھ نہیں چھپائیں گے ان کے سامنے سرخرو جائیں گے۔

کتنی آسانی اللہ اور اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے کردی ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ہرگز دعوا نہیں کرتا کہ میں نیا دین ہوں اُس کا کہنا صرف اتنا ہے کہ شروع سے آخر تک جتنے دین آئے، ان کا نام اسلام تھا، میں اسلام کا آخری ایڈیشن ہو۔ میرے بعد اور دین نہیں آئیں گے۔

ایک دین کے بعد دوسرے دین کی ضرورت یوں پڑتی رہی کہ ہر دین میں تحریف اور آمیزش کردی جاتی تھی۔ نیز نوعِ انسان طفل سے جوان، اور جوان سے پختہ ہوتی گئی طفل کے نصابِ تعلیم کو جوانی کے وقت اور جوانی کے نصابِ تعلیم کو پختگی کے وقت بدلنا ہی چاہیے تھا۔ اب دورِ پختگی چلے گا۔ دین میں گڑبڑ کی بھی گئی تو دین کی بنیاد اب اتنی مضبوط ہے کہ گڑبڑ کرنے والے اُسے ہلا نہیں سکیں گے۔ اللہ تعالےٰ نے اُس کی حفاظت کا وعدہ کرلیا ہے اور اُس وعدے کی صداقت چودہ سو برس سے ثابت اور قایم ہے۔

چودہ سو برس کا زمانہ بہت طویل زمانہ ہے۔ اتنا وقفہ دو نبیوں کے درمیان کہیں نہیں دکھائی دیتا۔ اتنے عرصے تک اور نبی کا پیدا نہ ہونا بھی قرآن کی صداقت کی دلیل ہے سوا تیرہ سو برس نبی یا ظلّی نبی کے پیدا نہ ہونے کو مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے متبع بھی تسلیم کرتے ہیں۔ نیز مرزا صاحب کے متبعین کا خاصا بڑا حصّہ مرزا صاحب کو ظلّی نبی کی بجائے مجدد بتاتا ہے۔ بہرحال چودہ سو برس کے طویل عرصے میں قرآن کا محفوظ رہنا اور نبی یا ظلّی نبی کا نہ آنا قرآن مجید کی صداقت کی عظیم ترین دلیلیں ہیں۔

آزادی کی نعمت

یہ سمجھ جانے کے بعد کہ برِ صغیر تقسیم ضرور ہوگا، مالدار ہندوؤں اور سکھوں نے

مسلم لیگ کے حصے میں آنے والے علاقوں کو چھوڑنا شروع کر دیا تھا اور وہ جوق در جوق وہاں پہنچ رہے تھے جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ مالدار ہندو اور سکھ پوری جمع پونجی لے کر پہنچتے تھے اور فوراً کاروبار جما لیتے تھے۔ ابھی برِصغیر کی تقسیم ہوئی نہیں تھی اور ابھی آزادی ملی نہیں تھی کہ ایک دن دلّی کے ایک ہندو نے مجھ سے کہا کہ یہ آزادی ہمیں کہیں کا نہیں رکھے گی۔ شرنارتھی جب سے ہمارے گلی کوچوں اور بازاروں میں گھسے ہیں، نہ ہماری بہو بیٹیاں محفوظ ہیں اور نہ ہماری تجارت کی خیر ہے۔ شرنارتھیوں نے ہمیں ناک چنے چبوا دیے ہیں۔ میں ۱۹۵۰ء میں دلّی گیا تو معلوم ہوا کہ بعض قدیم ہندو خاندانوں نے ۱۹۴۷ء سے اپنی خواتین کو پردے میں بٹھا دیا ہے۔ اُن کی خواتین حتی الامکان باہر نہیں نکلتیں، اور نکلتی ہیں تو بڑے اہتمام کے ساتھ نکلتی ہیں ؎

ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گئے

مسلمان دُور اندیش نہیں تھے، مسلمان اُس وقت چلے، جب بھگدڑ مچی۔ اُن کا استقبال پاکستان کے قدیم باشندوں نے اُسی طرح کیا جس طرح پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں کا بھارت کے قدیم باشندوں نے کیا تھا۔

میں بالکل شروع کی بات نہیں کہہ رہا۔ شروع میں بھارت کے ہندوؤں نے شرنارتھیوں کو اور پاکستان کے مسلمانوں نے مہاجرین کو سر آنکھوں پر بٹھایا تھا۔ اُس جذباتی دَور کے بعد ۱۹۴۸ء میں کراچی کے قدیم مسلمان غربا مہاجروں کو طعنے دیتے تھے کہ پچھلے آنے میں قورمے، چپاتی اور فیرنی سے پیٹ بھر جاتا تھا، تم لوگوں نے آکر ہر چیز مہنگی کرا دی۔

غرض بھارت اور پاکستان، دونوں جگہ، کچھ روز بعد سے آزادی کو بُرا بھلا کہا جانے لگا تھا۔ خوش نصیب تھے گاندھی جی کہ آزادی دلا کر جھٹ پٹ سدھار گئے اور اللہ کا کرم تھا قائدِ اعظم اور قائدِ ملت پر کہ پاکستان بنوا کر اُنھیں جلدی بُلا لیا گیا، ورنہ پنڈت نہرو کا حشر دیکھیے، اُن کی محبوبیت اور ہر دلعزیزی اب اُتنی نہیں ہے جتنی وزیر اعظم بننے سے قبل تھی۔

آزادی کے ابتدائی ایام ہمیشہ سخت ہوا کرتے ہیں۔ آزادی کی ابتدا میں قوم کے عوام تکلیفیں اور مصیبتیں اُٹھاتے ہیں اور قوم کے خواص ہر دلعزیزی کھو دیتے ہیں۔ آزادی نہ آزادی پانے والوں سے سنبھلتی ہے اور نہ آزادی دلوانے والے آزادی سنبھلوانا جانتے ہیں۔ طویل عرصے تک جُوتیوں میں دال بٹتی ہے۔ سوائے اُس انقلاب کے جسے حضور سرورِ

کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے مبارک اور مقدس ہاتھوں نے رونما کیا تھا آپ کسی انقلاب کی بابت نہیں بتا سکتے کہ فلاں انقلاب سے پہلے ہی دن کامیابی اور کامرانی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ آزادی کا جو لطف امریکا میں آج ہے کیا وہ آزادی ملنے کے دن سے ہے۔

بھارت اور پاکستان کے پندرہ سولہ برس جیسے گزرے ہیں، یہ ایسے ہی گزرنے چاہیے تھے۔ ابتدا میں آزادی کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے واسطہ پڑنا ہی تھا تیرنا سیکھتے وقت ڈبکیاں کون نہیں کھاتا۔

آزادی کا لطف ہمیں ملے یا نہ ملے، ہماری اولاد کو انشاءاللہ ملے گا۔ آزادی کا استعمال کبھی نہ کبھی تو آئے گا کبھی نہ کبھی تو ہوش کی آنکھیں کھلیں گی۔ نو تعمیر مکان کی پاڑیں کھلنے دو اور کوڑا کرکٹ ہٹنے دو، مکان جگ مگ جگ مگ کرے گا۔

اس قسم کی باتیں فضول اور غلط ہیں کہ آزادی اُس وقت ملنی چاہیے تھی جس وقت آزادی کے استعمال کی قابلیت پیدا ہو جاتی۔ آزادی کے استعمال کی قابلیت آزادی کا استعمال کرنے سے پیدا ہوتی ہے، غلامی کی حالت میں نہیں پیدا ہوتی۔ غلامی کا زمانہ تو جس قدر اور طول پکڑتا اُسی قدر آزادی پانے کے ابتدائی زمانے کو زیادہ گندا کرتا۔ جو کچھ ہوتا رہا ہے، وہ آزادی کا نتیجہ نہیں ہے، غلامی کا ثمرہ ہے۔

اہلِ کتاب

کیا تم نے اُن (لوگوں کے حال) کا خیال نہیں کیا، جنہیں (اللہ کی) کتاب کا حصہ ملا ہے، (جنہیں اللہ نے ضابطہ حیات بنا کر دے دیا ہے، مگر) وہ (تو تم پرستی میں مبتلا ہیں اور) بے حقیقت چیزوں اور شیطان کو مانتے ہیں۔ (اللہ کے عطا کردہ ضابطۂ حیات کو چھوڑ کر غیر اللہ کے من گھڑت ضابطۂ حیات کو اپنانا شیطان ہی کا ماننا ہے) یہی لوگ ہیں، جن پر اللہ نے لعنت بھیجی ہے (جن پر اللہ کی پھٹکار ہے)، اور جس کو اللہ پھٹکار دے تو (یقین رکھو کہ) پھر اُس کا تمہیں کوئی مددگار نہیں ملے گا۔ (سورہ ۴- آیات ۵۱-۵۲)

دوستی کا اِمتحان

آپ کو اپنے کسی دوست کا اندازہ کرنا ہو کہ اُسے آپ سے کتنا تعلق ہے تو اُس

کی اولاد اور اُس کے گھر والوں کے برتاؤ پر غور کیجیے۔ وہ آپ کے دوست کے تعلق اور اخلاص کی کسوٹی ہیں۔

دوست کے ظاہری برتاؤ پر مت جائیے بلکہ دیکھیے کہ اس نے اپنے اہل و عیال کے دلوں میں آپ کے متعلق کیا بیج بویا ہے۔ اُس کے اہل و عیال کا برتاؤ آپ کے ساتھ کیا ہے۔

اسی طرح اگر آپ یہ اندازہ لگانا چاہیں کہ فلاں شخص کا نفس کیسا ہے، تو اُس کی امارت اور غربت سے اندازہ لگائیں۔ امیر ہے تو غرور کا ہونا اور غرور کا نہ ہونا نفس کا حال بتا دے گا اور غریب ہے تو خودداری کا ہونا اور خودداری کا نہ ہونا پتہ دے دے گا کہ نفس کیسا ہے۔

غرور کا وجود اور خودداری کا فقدان اہلِ علم میں بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے اور اس کسوٹی پر سب ہی کا نفس پرکھا جا سکتا ہے، لیکن جیسی صحیح کسوٹی یہ اہل زر اور اہلِ اقتدار اور محروم زر اور محروم اقتدار لوگوں کے لیے ہے ویسی اوروں کے لیے نہیں ہے۔ اہلِ زر اور اہلِ اقتدار اور محروم زر اور محروم اقتدار کے نفوس کا حال اِس کسوٹی سے سو فی صدی صحیح معلوم ہو سکتا ہے۔

اہلِ زر اور اہلِ اقتدار عموماً بھلاوے میں جلدی آجاتے ہیں۔ غرور کے معنی بھلاوے کے ہیں۔ علمی آدمی اتنی بات سمجھ سکتا ہے کہ میرے علم کا سلب کیا جانا ممکن ہے اور جو اتنی بات بھی نہیں سمجھتا وہ علمی آدمی نہیں ہے، اُس کے اوپر کتابیں بس لدی ہوئی ہیں۔ اہلِ زر اور اہل اقتدار میں جس کا نفس خراب ہے وہ اندھا ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ زر اور اقتدار اُس کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ۔ (سورہ ۱۰۴ آیت ۳) اہل زر اور اہلِ اقتدار زر والوں کو بے زر ہوتے اور اقتدار والوں کو اقتدار کی کرسی سے اُترتے دیکھتے ہیں لیکن اُن کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ نفس خراب ہے تو اہل زر اور اہل اقتدار موت تک کو بھول جاتے ہیں، حالاں کہ موت کا آنا ہی نہیں، موت کے بعد اعمال کا حساب لیا جانا بھی یقینی ہے اور قرآن مجید سمجھا رہا ہے۔ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَلَا یَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝ وعدہ الٰہی (یعنی قیامت کا آنا) برحق ہے۔ (کہیں) تم کو دنیا کی (چند روزہ) زندگی بھلاوے میں نہ ڈال دے (اور

زادِ آخرت مہیا کرنے سے نہ روک دے) اور اللہ (کی یاد) سے دھوکا دینے والا (شیطان) غافل نہ کر دے۔ (سورہ ۳۱ - آیت ۳۳)

اہلِ زر اور اہلِ اقتدار کے نفس کی کسوٹی غرور و عدمِ غرور ہے، اور غرور و عدمِ غرور کی کسوٹی آنکھیں ہیں۔ مغرور اور غیر مغرور، نیز خود دار اور غیر خود دار کی آنکھ الگ پہچانی جاتی ہے۔

صداقت اور وہم

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ انسان قرآن مجید کی فقط اِس آیت پر غور کرلے تو دین کی ساری اُلجھنیں سُلجھ جائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (اے محمدؐ! اہلِ مکّہ سے کہو کہ) میں نبوّت کے دعوے سے قبل دو چار نہیں، چالیس برس، یعنی قریباً پوری عمر تمھارے (ہی) ساتھ بسر کرچکا ہوں۔ کیا تم اتنی بات بھی نہیں سوچ سکتے (کہ جس شخص نے کبھی لوگوں کے معاملے میں جھوٹ نہیں بولا وہ اب بڑھاپے کے وقت اللہ کے اُوپر بہتان باندھے گا کہ وحی نہ آتی ہوگی اور کہے گا کہ وحی آتی ہے۔)

یہ آیت حقیقتاً اُنھوں نے ہی سمجھی تھی جو اِس کے مخاطَب اوّل تھے۔ صحابہ کو حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی صداقت کا ایسا یقین تھا کہ حضورؐ سے چون وچرا نہیں کیا کرتے تھے، اور حضورؐ کی باتوں میں مین میخ نہیں نکالتے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے جو کہا ہے ؎

خرد کی گتھیاں سُلجھا چکا ہوں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

اُس جنون سے صحابہ کی وہ کیفیّت مراد ہے کہ شادی کی پہلی رات تھی، نوجوان دولھا دُلہن کے پاس تھا کہ آواز آئی، حضورؐ جہاد کے واسطے روانہ ہو رہے ہیں۔ دُولھا دُلہن کو چھوڑ جہاد میں شریک ہوگیا اور جامِ شہادت پی کر قبر میں جا سویا، کیوں کہ صادق نبیؐ نے اللہ کا پیغام پہنچایا تھا کہ شہید کا بڑا مرتبہ ہے۔

صحابہ نے بس ایک بات پر ضرور غور کیا تھا کہ حضورؐ کا دعوا صحیح ہے یا غلط۔ اُس کے بعد وہ وہموں اور شبہوں میں نہیں پڑے۔ صَدَقْتَ یَا رَسُوْلَ اللہ ہی کہتے رہے۔

اس ایمان کا صلہ اُنھیں اللہ کے ہاں جو ملا ہوگا وہ تو ملا ہی ہوگا، دُنیا میں بھی وہ چند سال کے اندر آدھی دنیا کے مالک بن گئے تھے۔ تاریخ اُن کے سے یقینِ محکم کی مثال پیش نہیں کرسکتی

اور نہ اُن کی طرح دنیا پر اس قدر جلد چھا جانے کی مثال پیش کر سکتی ہے۔

ہندستان اور پاکستان میں

کسی شاعر نے اپنی بیوی کے متعلق کہا تھا یا لکھا تھا کہ پچاس سال سے ایک بیڑی پاؤں
میں پڑی ہوئی ہے۔ شاعر غالباً مرزا غالب تھے۔ اُن کا ایک بیوی کو دیکھتے دیکھتے جی گھبرا گیا
ہوگا۔ غالب اب تک زندہ رہتے تو ممکن ہے پنڈت نہرو اور اُن کی کانگریس کو بھی بیڑی کہنے
لگتے اور جوش ملیح آبادی کی طرح پاکستان چلے آتے۔ یہاں ماشاءاللہ سولہ برس میں اتنی حکومتیں
بدل چکی ہیں کہ تعداد بتانی مناسب نہیں ہے۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے۔

اقلیتوں کو کچلنے کے معاملے میں بھارت نے ریکارڈ قائم کر دیا ہے اور حکومتیں بدلنے
کے معاملے میں پاکستان اپنا آپ جواب ہے۔

مجھے صرف دو چیزیں، دونوں ملکوں میں مشترک دکھائی دیتی ہیں، ایک تو یہ یقین دلانا
کہ ہم نے جو قدم اٹھایا ہے وہ عوام کے بھلے کے لیے اٹھایا ہے۔ دوسرے اس یقین دہانی کے
باوجود عوام کے افلاس کا روز افزوں بڑھنا اور خواص کی دولت مندی کا حد و حساب نہ رہنا۔

حکومت نہ بدلنے کی وجہ سے بھارت کے عوام پاکستانی عوام کی نسبت زیادہ مایوس ہیں
کہ نہ پنڈت نہرو اور کانگریس کی حکومت ہٹے گی اور نہ ہماری حالت درست ہوگی۔ پاکستانی عوام
کی حکومتیں بدلنے کی وجہ سے ڈھارس بندھ جاتی ہے کہ فلاں پارٹی کی یا فلاں قسم کی حکومت ہماری
حالت درست نہ کر سکی تو کیا ہے، انشاءاللہ نئی حکومت حالت درست کر دے گی۔

بھارتی اخبارات چیخ اُٹھے ہیں کہ بھوک کے بم سے ڈرو۔ بھوک جب اپنا پرچم لہراتی آتی
ہے تو تخت اُلٹ جاتے ہیں اور تاج اُڑ جاتے ہیں، لیکن الحمدللہ ہماری امیدیں ابھی ایسی
متزلزل نہیں ہوئی ہیں۔ حکومتیں بدلتے رہنے کا اتنا احسان کیا کم ہے۔ اہلِ حکومت ممکن ہے
مطمئن نہ ہوں لیکن اہلِ دول تو مطمئن ہیں۔

بھارت کی بابت بھارت کا ایک اخبار رقم طراز ہے:

"بھوک کی آندھیاں چل رہی ہیں۔ مفلسی کا طوفان زوروں پر ہے۔ زندگی ہچکولے
کھا رہی ہے۔ اچھے اچھے گھر بدحالی میں مبتلا ہیں اور جس خوش حالی کا ہم نے خواب دیکھا
تھا اُس کی تعبیر اب تک نہیں ملی ہے۔"

مسلمانوں کی پہلی آزادی

اسلام کے ابتدائی تیرہ سال مسلمانوں پر بے حد کٹھن گزرے تھے۔ ہجرت سے قبل کا زمانہ مسلمانوں کی مغلوبیت کا زمانہ تھا۔ ہجرت کے بعد مسلمانوں نے پنپنا شروع کیا، اور فتح مکہ کے بعد مسلمان مغلوبیت سے آزاد ہو گئے ـــ یہ آزادی مسلمانوں کو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زیرِ سایہ و زیرِ قیادت حاصل ہوئی تھی، اور ہمارے لیے اُسوۂ حسنہ ہے۔

ہجرت کر لینے اور وطن سے بے وطن ہو جانے کے باوجود مشرکینِ مکہ نے مسلمانوں کا پیچھا نہیں چھوڑا تو مسلمان اُن کا مقابلہ اور اپنی مدافعت کرنے نکلے۔ کئی جنگیں ہوئیں۔ اِن جنگوں میں فتح زیادہ تر مسلمانوں کی رہی۔ آخر مشرکینِ مکہ اور مسلمانوں میں ایک معاہدہ طے پایا، جو صلح حُدَیبیہ کہلاتا ہے۔ اس میں علاوہ اور باتوں کے تین باتیں حسبِ ذیل تھیں:

۱۔ جو جس قبیلے کے ساتھ دوستی رکھنی چاہے رکھ سکتا ہے۔

۲۔ مسلمانوں کے حلیفوں کا غیر مسلم لحاظ کریں گے اور غیر مسلموں کے حلیفوں کا مسلمان لحاظ کریں گے۔

۳۔ دس سال تک کوئی فریق جنگ کا نام نہیں لے گا۔

دو سال معاہدہ ٹھیک چلا، لیکن ۸ھ میں ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے بنو بکر کو اُبھار دیا کہ مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنو خزاعہ سے جا بھڑو۔ قبیلہ بنو بکر نے قبیلہ بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا اور مشرکینِ مکہ نے بنو بکر کی ہتھیار وغیرہ سے مدد کی اور مُنھ نقاب سے چھُپا چھُپا کر لڑائی میں حصہ لیا۔

بنو خزاعہ کے لوگ بھاگ کر اور پناہ گاہ سمجھ کر خانہ کعبہ آئے، مگر خانہ کعبہ میں بھی انھیں قتل کیا گیا۔ وہ خدا کا واسطہ دیتے۔ اِلٰهَكَ اِلٰهَكَ پکارتے اور امان مانگتے تو جواب ملتا لَا اِلٰهَ اَلْيَوْمَ آج خدا نہیں ہے۔ بنو خزاعہ کے چالیس آدمی بچتے بچاتے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُنھوں نے کہا ہمیں خشک گھاس کی طرح روند ڈالا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا حلیف قبایل کی حفاظت کرنا اور معاہدے کی پابندی کرانا میرا فرض ہے، میں تمھاری دادرسی کروں گا۔

حضورؐ نے مشرکینِ مکہ کے پاس پیغام بھیجا کہ بنو خزاعہ کے مقتولوں کا خوں بہا ادا کرا دو

یا بنو بکر سے علاحدہ ہو جاؤ۔ دونوں باتیں منظور نہ ہوں تو پھر کھُل کر کہو کہ معاہدہ حُدَیبیہ ٹوٹ گیا۔ مشرکین مکّہ نے جواب دیا، آخری بات منظور ہے۔ معاہدہ حُدَیبیہ منسُوخ۔

ابو سُفیان اُس وقت مشرکین مکّہ کے بہت بڑے لیڈر تھے۔ کہنے کو تو کہہ گئے کہ معاہدہ منسوخ کرتے ہیں لیکن سوچا تو فیصلہ غلط نظر آیا۔ ابو سفیان نے تجدید کی کوشش کی۔ حضورؐ نے جواب نہ دیا تو یک طرفہ اعلان کر کے مکّے میں جا بیٹھے کہ میں معاہدہ حُدَیبیہ کی تجدید کرتا ہوں۔ اُدھر مشرکین مکّہ دُھکڑ پُکڑ میں تھے کہ تنہا ابو سفیان کے اعلان کو کیا سمجھیں، صلح یا جنگ؛ اِدھر حضورؐ نے ۱۰ رمضان ۸ھ کو دس ہزار صحابہ کا لشکر لے کر مکّہ کی طرف کوچ کر دیا۔ راستے میں دیکھا کہ ابو سفیان اور عبد اللہ بن ابو اُمیہ معافی مانگنے کے ارادے سے آ رہے ہیں۔ انھیں خبر نہیں تھی کہ حضورؐ لشکر لے کر چل چکے ہیں۔ حضورؐ نے اِن دونوں کو دیکھ کر مُنھ پھیر لیا۔ اُمّ المؤمنین حضرت اُمِّ سلمہ ہم راہ تھیں، اُنھوں نے سفارش کی کہ ابو سفیان اور عبد اللہ آپ کے چچا زاد اور پھوپی زاد بھائی ہیں، اِن کے قصوروں سے درگزر فرمائیے، مگر سفارش کا اثر نہیں ہُوا۔ اور کس کی مجال تھی کہ عرض معروض کرتا۔ حضرت علی مرتضیٰؓ کو البتّہ بڑی اچھی تدبیر سُوجھی۔ ابو سفیان سے کہا، حضورؐ کے سامنے وہ الفاظ دہراؤ جو حضرت یوسف علیہ السّلام کے سامنے اُن کے مجرم بھائیوں کی زبان سے نکلے تھے اور قرآن میں موجود ہیں۔ تَاللّٰہِ لَقَدْ اٰثَرَکَ اللّٰہُ عَلَیْنَا وَاِنْ کُنَّا لَخٰطِئِیْنَ۔ اس تدبیر نے کام کیا، حضورؐ نے وہی جواب دے دیا جو حضرت یوسفؑ نے اپنے مجرم بھائیوں کو دیا تھا۔ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ یَغْفِرُ اللّٰہُ لَکُمْ وَھُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ۔ ابو سفیان نے معافی ملتے ہی چند شعر فی البدیہہ کہے، جن کا مطلب ہے کہ "جس زمانے میں جنگ کا پرچم میں اس خیال سے اُٹھاتا تھا کہ لات (بُت) کی فوج محمدؐ کی فوج پر غلبہ حاصل کرے اُس زمانے میں میری مثال اُس خارپُشت کی سی تھی جو تاریک رات میں مارا مارا پھرتا ہے، اب وہ زمانہ آ گیا کہ مجھے ہدایت ملے اور میں سیدھا راستہ اختیار کروں۔ مجھے اللہ کا راستہ اس نے دکھایا ہے جس سے میں نے بے رُخی برتی تھی اور جسے میں نے چھوڑے رکھا تھا" ـــــ حضورؐ نے فرمایا۔ ہاں، تم نے مجھے بہت عرصے چھوڑے رکھا۔

اسلامی لشکر کے سردار حضرت سعد بن عبادہؓ نے ابو سفیان کو چڑانے کی غرض سے نعرہ لگایا۔ "آج گھمسان کا دن ہے۔ آج کعبہ کو حلال کیا جائے گا" یعنی آج کعبے میں خوں ریزی

جائز ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ نہیں، آج کعبے کی عظمت کا دن ہے۔ حضورؐ نے حضرت سعد کا طرز عمل پسند نہیں کیا، علَم اُن سے لے لیا اور اُن کے بیٹے کو دے دیا۔ حضرت سعد کا طرزِ عمل بھڑاؤنا تھا۔ بھڑاؤنی باتیں حضورؐ ناپسند کرتے تھے۔

حضورؐ کی خواہش تھی کہ مکّے میں خاموشی سے داخل ہوا جائے، کسی کو داخلے سے پہلے خبر نہ ہو، تاکہ جنگ کی نوبت نہ آئے۔ سو اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کر دیا کہ اہلِ مکّہ بے خبر رہے اور مسلمان جب تک مکّے کی سرحد پر نہیں پہنچ گئے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔

رات بھر آرام کر کے صبح حضورؐ نے حکم فرمایا کہ مختلف اطراف سے مکّے میں داخل ہو اور جو تعارض نہ کرے اُسے مت چھیڑو، جو گھر میں بیٹھا رہے اُسے امن سے بیٹھا رہنے دو، جو بھاگے اُس کا پیچھا نہ کرو، جو کعبے میں پناہ لے وہ تو پناہ میں ہے ہی، جو ابوسفیان اور حکیم بن حزام کے ہاں پناہ لے وہ بھی پناہ میں ہے۔ مقابلہ کر کے کوئی زخمی ہو جائے یا قیدی بن جائے تو بس اتنا کافی ہے۔ اُسے قتل نہ کرنا۔

فتح میں شانِ عبودیّت

اللہ کے فضل سے جدال و قتال کی نوبت نہیں آئی۔ صرف ایک معمولی سی جھڑپ ہوئی تھی، جس میں تین صحابیوں نے جامِ شہادت پیا اور تیرہ مشرک مارے گئے۔ اتنی جھڑپ بھی حضورؐ کی منشا کے خلاف تھی، چناں چہ کمانڈر کا جواب طلب کیا گیا۔ دفاعی سیاست کی اِس سے بہتر مثال تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

حضورؐ ناقے پر سوار تھے۔ حضورؐ کے پیچھے حضورؐ کے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ کے فرزند حضرت اسامہ بیٹھے تھے۔ حضورؐ کا سر جھکا ہوا تھا، اور حضورؐ سورہ فتح کی تلاوت کر رہے تھے۔ مکّہ فتح کرتے وقت یہ شانِ عبودیت تھی۔ اِدھر اُدھر کہیں نہیں رُکے۔ مکّے میں داخل ہو کر سیدھے خانہ کعبہ گئے۔

جس گھر کو سب سے بڑے بُت شکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا اُسے تین سو ساٹھ بُتوں نے گھیر رکھا تھا، حضورؐ نے کمان کی نوک سے ایک ایک بُت گرا دیا۔ گراتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔ حق کی حقانیت عیاں ہو گئی اور باطل مٹ گیا۔ باطل مٹنے ہی کے لیے

ہوتا ہے۔ جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ۔ حق آگیا اور باطل کی تو نہ کبھی کوئی حقیقت تھی اور نہ کبھی کوئی حقیقت ہوگی۔

بُت گرا چکے تو کعبہ کے کلید بردار کو بُلوایا۔ کلید بردار کا نام عثمان بن طلحہ تھا۔ کنجی لے کر حضورؐ نے کعبے کا دروازہ کھولا اور کونے کونے میں پھر کر اللّٰہُ اکبر کہا اور پیشانی زمین پر رکھ دی، نمازِ شکر ادا کی۔

حضرت عباسؓ نے کہا، کنجی کسی ہاشمی کے سپرد کر دیجیے۔ فرمایا۔ اَلْیَوْمُ یَوْمُ الْبِرِّ وَالْوَفَا۔ آج کا دن اچھا برتاؤ کرنے اور انعام دینے کا دن ہے۔ کنجی حضورؐ نے عثمان ہی کو عطا فرما دی، اور کہا کہ تم سے کنجی وہ لے جو ظالم ہو۔

حضورؐ نے عثمان بن طلحہ سے ایک دفعہ ابتدائے نبوت میں خواہش کی تھی کہ ذرا کی ذرا کعبے کو کھول دو۔ عثمان نے انکار کر دیا تھا۔ حضورؐ نے اُس وقت فرمایا تھا کہ یہ کنجی ایک دن میرے ہاتھ میں آنی ہے۔ عثمان نے کہا تھا کہ قریش کیا اتنے بے جان اور ذلیل ہو جائیں گے۔

خیر یہ فقرہ تو بس فقرہ ہی تھا۔ آج حضور کے سامنے وہ تمام عمایدِ قریش کھڑے تھے جنھوں نے حضورؐ کو اور مسلمانوں کو تیرہ سال مسلسل سخت ترین ایذائیں دی تھیں اور ہجرت کرا کر بھی پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ حضورؐ نے اُن سے خطاب کیا:۔

"یا معشر القریش! اللہ تعالیٰ نے تمھاری جاہلانہ نخوت کا خاتمہ کر دیا۔ یاد رکھو، سب انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ہم نے تم سب کو مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے۔ خاندان اور قبیلے تو محض پہچان کی خاطر ہیں۔ (غریب مسلمانوں پر طنز کرنا اور) اپنے خاندان اور قبیلوں پر اترانا بے معنی حرکت تھی۔ اللہ کے نزدیک زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔ جاؤ، تم آزاد ہو۔ تم سے بدلہ نہیں لیا جائے گا۔

احمقانہ محبّت

کسی بادشاہ نے ایک بندر پال رکھا تھا اور اُسے یہ تربیت دی تھی کہ رات کو خنجر ہاتھ میں لے کر بادشاہ کے پلنگ کے گرد پھرتا رہے اور اُس کی جان کی حفاظت کرے۔ بندر بے حد وفادار تھا اور بادشاہ سے اتنی محبت کرتا تھا کہ ساری رات جاگ کر گزارتا تھا اور اپنی نظر بادشاہ پر سے نہیں ہٹاتا تھا۔

ایک رات بندر حسبِ معمول خنجر تانے حاضر تھا کہ چیونٹیاں چھت پر سے ٹپکیں اور بادشاہ کے سینے کے اوپر رینگنے لگیں۔ بندر تلملا اٹھا۔ اُس سے چیونٹیوں کی گستاخی برداشت نہ ہوئی۔ انھیں قتل کرنے کے لیے فوراً خنجر کا بھرپور ہاتھ مارا اور پورا خنجر بادشاہ کے سینے میں اُتار دیا۔ چیونٹیوں کی بجائے بادشاہ کی جان لے لی۔ بندر نے جب اپنی احمقانہ خیرخواہی کا نتیجہ دیکھا تو اُس کے رنج کی انتہا نہ رہی۔

بالکل اسی طرح کا واقعہ فرانس کی کسی امیر زادی کے متعلق پڑھا ہے اُس نے شیر کا بچہ پالا تھا۔ وہ درندہ بھی اسے دل سے چاہتا تھا۔ امیر زادی جب جوان ہو گئی اور شادی کر کے سسرال چلی تو عزیزوں رشتہ داروں سے مل ملا کر شیر کے بچّے کے پاس بھی پہنچی اور لپٹ لپٹ کر اُسے خوب پیار کیا۔ بچّہ سمجھ گیا کہ جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے۔ بچّے نے وداع ہونے والی لڑکی کو روکنے کی کوشش کی اور اُسے اپنی طرف اتنے زور سے کھینچا کہ شانہ ٹوٹ گیا اور لڑکی نے تڑپ تڑپ کر وہیں جان دے دی۔ شیر کا بچہ بہتیرا تصدق ہوتا رہا اور موٹے موٹے آنسو بہاتا رہا، مگر جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ لڑکی دشمن کے ہاتھوں نہیں محبت کرنے والے کے ہاتھوں مر چکی تھی۔

ممکن ہے دونوں قصے من گھڑت ہوں، لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہمیں اس قسم کے بے وقوفوں سے اکثر سابقہ پڑتا رہتا ہے، جن کے جذبات محبت تو جذبات محبت ضرور ہوتے ہیں، مگر وہ اُسی شخص کو یا اُسی مقصد کو بے وقوفی کی حرکات سے نقصان پہنچا دیا کرتے ہیں، جس کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔

پاکستان اور بھارت میں دو چار یا دس بیس نہیں، ہزاروں ماں باپ موجود ہوں گے جو بچوں کے ٹیکہ نہیں لگواتے کہ انھیں تکلیف پہنچے گی چناں چہ جسم نازک سوئیوں کے چبھنے سے تو بچ جاتا ہے مگر چیچک کے مہیب دانوں سے بھر جاتا ہے اور پھر کوئی بچہ مر جاتا ہے اور کوئی اندھا ہو جاتا ہے۔ صورت تو کم از کم ضرور ہر بچّے کی بگڑ جاتی ہے۔

بچے کو پڑھنے لکھنے کی تکلیف سے بھی دُور رکھا جاتا ہے۔ بچّے نے چوری کر لی ہے تو ماں شریکِ جُرم بن جاتی ہے تاکہ باپ سزا نہ دے۔ یہ سب اُس محبت کی مثالیں ہیں جو نتائج کے اعتبار سے مہلک ہے۔

لوگ اپنے مذہب اور مسلک سے بھی عموماً اسی نوع کی محبت کیا کرتے ہیں اور مذہب

اور مسلک کی بربادی کا باعث بن جاتے ہیں۔ انسانی نفوس کی اصلاح کے واسطے جس دن سے مذہب نے دُنیا میں قدم رکھا ہے اُسی دن سے اِس کے ایسے عشّاق بھی پیدا ہو رہے ہیں، جن کے عشق نے مذہب کو رُسوا کر دیا ہے۔ مذہب کی جڑیں ہمیشہ دشمنوں سے زیادہ دوستوں کے ہاتھوں سے اُکھڑی ہیں۔

ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کے مسیحی پیشواؤں نے مذہب کی آڑ میں اور مذہب کا نام لے لے کر جیسی جیسی ناپاک اور بہیمانہ حرکتیں کی تھیں اُن کے بیان سے تاریخ اشرماتی ہے اور اُنھیں پڑھ کر اور سُن کر رُوح لرز جاتی ہے۔

مذہبی کتابوں میں کتنی ہی اچھی باتیں لکھی ہوں اُن کو کوئی نہیں دیکھتا، دیکھنے والے مذہب کے پیروؤں کو دیکھا کرتے ہیں۔ عیسائیوں نے اپنے پادریوں کی حرکتیں دیکھیں تو وہ پادریوں اور گرجاؤں سے نفرت کرنے لگے۔ نفرت آہستہ آہستہ دشمنی میں بدلی اور آخر کار عوام نے ہمّت کر کے اُس لامذہبیت کے خلاف جسے مذہب کے نام سے روا رکھا جا رہا تھا کُھلم کُھلا بغاوت کر دی اور اُس نفرت اور عداوت کی بنیاد پڑ گئی جو اِس وقت یورپ کے تعلیم یافتہ طبقے اور مذہب کے نام لیواؤں کے درمیان رُونما ہے۔ اربابِ علم وعقل کا پادریوں کی حرکات سے ناراض ہو کر مذہب سے برگشتہ ہو جانا علم اور عقل کے منافی ہے، لیکن بہر حال تعلیم یافتہ لوگ فرشتے نہیں تھے، اُن کے سامنے جو شئے مذہب کے نام سے پیش کی جاتی تھی، وہ یقیناً بُری تھی، اور چوں کہ اُسی کو مذہب کہا جاتا تھا اُن کا مذہب سے بیزار ہو جانا عجیب نہیں ہے۔

بدقسمتی سے یہی حالت اب دوسرے مذاہب کی ہو رہی ہے۔ ہمارے پاکستان اور بھارت میں تو اہلِ سیاست بھی مذہب سے کھیلتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا مذہب کے نام سے ہوا اور اہلِ سیاست نے کرایا۔ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں، سب میں جھوٹے رہنماؤں اور پیشواؤں کی تعداد روز افزوں ترقی پر ہے، جو اپنی شکم پُری اور حصولِ جاہ کی خاطر مذہب کے نام سے وہ کام کر رہے ہیں اور دوسروں سے وہ کام کرا رہے ہیں، جن سے روکنا حقیقتاً مذہب کا اصل مقصود ہے۔

جنگ اور خوں ریزی انسان کی فطرت نہیں ہے۔ گو بعض ناگزیر حالات سے مجبور ہو کر انسان اپنے بنی نوع سے کبھی کبھی جنگ کرتا ہے، پھر بھی بالطبع انسان جنگ اور خوں ریزی کو اچھی چیز قرار نہیں دیتا۔ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی فطرت بھی عام انسانوں سے مختلف

نہیں ہے۔ لہذا کیسے ممکن ہے کہ وہ مستقل طور پر ایسی صورت حال سے مانوس ہو سکیں جس میں ہر وقت انھیں اپنی فطرت کے خلاف قتل و غارت سے واسطہ رہے۔ آج ہندو، سکھ اور مسلمان مذہب کو انتہائی تعظیم اور وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، لیکن اُن کے مذہبی اور سیاسی پیشواؤں نے مذہب کو اسی طرح کھلونا بنائے رکھا تو وہ دن دُور نہ سمجھیے کہ پیشواؤں کے پیرو اور مذہب کے عشاق یورپ کے عیسائیوں کی طرح ہمارے ہاں بھی مذہب کے دشمن ہو جائیں گے، اور ایک دفعہ نفرت اور عداوت اگر چل نکلی تو اُسے روکا نہ جا سکے گا۔

آج جنھیں یہ سبق پڑھا دیا گیا ہے کہ تمھارے سوا دنیا میں کسی اور کو رہنے کا حق نہیں ہے وہی کل مذہب سے بے تعلق ہو کر فرزانے تو خیر کیا بنیں گے، البتہ مستانے بن جائیں گے۔ ہندو اور سکھ اسلام کو اُتنا نقصان نہیں پہنچا سکتے اور نہ مسلمان ہندو ازم اور سکھ ازم کو اُتنا نقصان پہنچا سکتے ہیں جتنا تمام مذاہب کو مذاہب کے دوست نما دشمنوں سے پہنچ رہا ہے۔

مذہب کے دشمن فقط وہی نہیں ہیں، جو فتنہ و فساد پھیلاتے ہیں بلکہ ہر وہ شخص مذہب کا بدترین دشمن ہے جو مذہب کا نام لے کر ایسے کام کرتا ہے جن سے مذہب نے روکا ہے۔

ہر وہ شخص جس کے افعال اور اعمال دیکھ کر نفرت پیدا ہو، اپنے مذہب کا بدخواہ اور بیری ہے، کیوں کہ کہنے والے ہمیشہ اُس کے مذہب کو بُرا کہنے لگتے ہیں۔ یہ کہنے کی بجائے کہ فلاں شخص ایسا ہے یہ کہتے ہیں کہ مسلمان ایسے ہوتے ہیں اور ہندو ایسے ہوتے ہیں اور سکھ ایسے ہوتے ہیں۔

جس قدر نفرت جس کسی دل میں بھی اسلام یا ہندو مت اور سکھ مت کے خلاف پیدا ہوگی، اُس کی ذمہ داری اُن مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں پر ہے جن کی حرکتیں ناشائستہ اور قابلِ نفرت ہیں۔

مذہبی تنفر کا سیلاب ابھی بھارت اور پاکستان میں رواں نہیں ہوا ہے، اور ابھی وقت ہے کہ اس کا بند باندھ لیا جائے، اس لیے مذہب کے سچے اور مخلص متبع اگر چاہتے ہیں کہ وہ خوفناک گھڑی نہ آئے کہ لوگ مذہب اور اہلِ مذہب کو علی الاعلان بُرا کہیں تو اِس کی روک تھام انھیں شروع کر دینی چاہیے۔ روکِ تھام یہی ہے کہ مذہب کے نام پر لامذہبیت نہ پھیلنے دیں اور صحیح مذہبی تعلیم عام کر دیں۔

یہ بات خوب ذہن نشین کر لیجیے کہ جو لوگ قابلِ نفرت حرکتوں کو مذہبی رنگ دیتے ہیں وہ دوسروں کے مذہب کے نہیں، اپنے مذہب کے دشمن ہیں، وہ اپنے مذہب کی جڑیں کاٹتے ہیں۔

قانون اور بے راہ روی

بد اعمالی اگر ختم ہو سکتی ہے تو فقط اللہ کا قانون ماننے سے ہو سکتی ہے، انسانوں کے ساختہ قانون بد اعمالی کو ختم نہیں کر سکتے۔

انسانوں کے پیشِ نظر قانون بناتے وقت عموماً ذاتی مصلحتیں رہتی ہیں اور اُن کے قانون سے کسی جگہ گناہ کا زخم بھر بھی جاتا ہے تو گناہ کا مواد دوسری جگہ سے راستہ کر لیتا ہے۔ یورپ و امریکا میں پیشہ ور بدکار عورتیں نہیں ہیں، لیکن وہاں بدکاری کیا ختم ہو گئی ہے۔

ہمارے ہاں، پاکستان میں اور بھارت میں، جہاں جہاں میونسپلٹیوں نے حکم صادر کیا کہ پیشہ ور بدکار عورتیں شہر سے دُور رہیں گی وہیں پیشہ ور بدکار عورتیں محلّوں اور گلیوں میں گھس آئیں اور گندگی ایک جگہ کے بدلے دسیوں جگہ پھیل گئی۔

کہاں انسانی قانون کا ڈر اور کہاں اللہ کے قانون کا ڈر، وہی انسان جو قانون بناتے ہیں اپنے قانون کی پرواہ نہیں کرتے، دوسرے اُن کے قانون کی کیا پرواہ کریں گے۔ چھوٹوں کی بدی ہی بدی نہیں ہوتی، بڑوں کی بدی بھی بدی ہے اور بڑی بدی ہے۔

انسان کو اپنی غلطیوں پر زیادہ افسوس کرنا چاہیے یا دوسروں کی غلطیوں پر۔ دوسرے کی غلطی سے ہمیں نقصان پہنچنے لگے تو ہمارا چراغ پا ہونا قدرتی امر ہے، لیکن معقول لوگ ایسے وقت بھی سوچتے ہیں کہ دوسرا یہ غلطی کسی میری غلطی کی وجہ سے تو نہیں کر رہا ہے۔

اپنی غلطیوں کو غلطی نہ سمجھنا اور دوسرے کی غلطیوں پر شور مچا دینا عاقلانہ حرکت نہیں ہے۔ اِس سے بجائے اچھا اور مفید نتیجہ نکلنے کے بُرا اور مُضر نتیجہ نکلتا ہے۔ آپ اپنی آنکھیں بند کر سکتے ہیں، دنیا کی آنکھیں نہیں بند کر سکتے۔ دنیا سب کچھ دیکھتی ہے۔ اور اللہ کے دیکھنے کا تو ذکر ہی کیا ہے، اللہ دوسرے کی غلطی پر دوسرے کو بھی سزا دے گا، مگر آپ کو اُس سے کیا حاصل، آپ کو تو اپنی غلطی کا فکر ہونا چاہیے۔ آپ اپنی غلطی کی وجہ سے کہیں سزا کے مستحق نہ ٹھہر جائیں۔ اور آپ کی غلطی کی وجہ سے دوسرے نے غلطی کی ہے تو آپ اپنی غلطی کی بھی

سزا پائیں گے اور دوسرے کی سزا میں بھی حصہ بٹائیں گے۔

فرض کیجیے ایک شخص اپنی بے راہ روی کی وجہ سے اتنا ذلیل ہوگیا ہے کہ جس کا جی چاہتا ہے اُسے ٹھوکر مار دیتا ہے۔ وہ شخص محض ٹھوکر مارنے والوں کی نامعقولیت ثابت کرکے قعرِ ذلت سے باہر نہیں آسکتا۔ حرکاتِ ذلت کی موجودگی میں عزت کا مطالبہ کبھی پورا نہیں ہوا کرتا، بلکہ مزید ذلت کا موجب ہوتا ہے۔ اور انسان دنیا میں بھی خسارہ اُٹھاتا ہے اور آخرت میں بھی عذاب بھگتتا ہے۔ قعرِ ذلت سے باہر آنے کی تدبیر صرف ایک ہے کہ بے راہ روی چھوڑ دی جائے۔

مامون الرشید کے دربار میں

ایک دفعہ مامون الرشید عباسی کے کسی درباری شاعر نے مامون الرشید کی شان میں قصیدہ پڑھا اور اُس میں کہا: "اے امیرالمومنین! آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ہوتے تو خلافت کا جھگڑا نہ اُٹھتا، آپ بالاتفاق خلیفہ منتخب کیے جاتے۔ سب آپ کے ہاتھ پر خوشی خوشی بیعت کرلیتے۔ ذرا سا بھی اختلاف نہ رہتا۔" درباریوں ہی میں سے کوئی باہمت درباری بولے: "یہ بات تو صحیح نہیں ہے۔ امیرالمومنین کے جدِ امجد حضرت عباس رضی اللہ عنہ اُس وقت موجود تھے، اُن کا انتخاب کیوں نہ کرلیا گیا؟"

کیسی سخت گرفت تھی، لیکن مامون الرشید نے اِسے برداشت کیا، بلکہ فرمایا:۔ بہت اچھی گرفت کی ہے۔

خلفائے بنو امیہ (بہ استثناءِ حضرت عمر بن عبدالعزیز رح) اور خلفائے بنو عباس اور بعد کے جملہ خلفا نے خلفائے راشدین کا نقشِ قدم چھوڑ دیا تھا۔ وہ خلفا کیا تھے، بادشاہ تھے۔ مگر مسلمان بادشاہ بھی ایسے ہوا کرتے تھے۔

صحابہ رض کے فیصلے

۱ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سامنے کسی صحابی نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ایک ارشاد دہرایا کہ مرنے پر نوحہ کرنے سے مُردے کو عذاب دیا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ رض نے فرمایا۔ یہ حضورؐ کا ارشاد نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کہتا ہے۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ ایک کے کیے کی سزا دوسرا نہیں بھگتتا۔ صحابہ رض

نے اور جمہور مسلمین نے اُم المومنین رضؓ کی رائے سے اتفاق نہیں کیا اور کہا کہ مردہ اگر اپنی زندگی میں نوحہ کرنے سے گھر والوں کو نہیں روکتا تھا تو وہ سزا کا مستحق ہے۔ نوحہ کرنے سے روکتا رہتا تو اس کے مرنے پر بھی نوحہ نہ کیا جاتا۔ گھر کا سربراہ گھر والوں کی ہر عادت کا ذمہ دار ہے۔

ایسے اختلافات صحابۂ کرام میں یقیناً تھے، مگر اِن کی وجہ سے اُن میں تفرقہ کبھی نہیں پڑا۔ اصُول میں اختلاف خلافِ اسلام ہے۔ فروعی مسایل کے اختلافات کی بابت حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا قول دل پر نقش کرلینے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں: "میں صحابہؓ کے اختلافات کا معترف ہوں۔ صحابہ اختلاف نہ کرتے تو بعد کو تنگی محسوس کی جاتی۔ اُن کے اختلافات نے دین میں عمل کی مختلف راہیں کھول دی ہیں۔ تمام صحابہ ہمارے مقتدیٰ تھے۔ ان میں سے کسی کا بھی اقتدا کیا جائے جائز ہے"

صحابہؓ کے اختلافات سے بعض اعمال کی جو مختلف شکلیں پیدا ہو گئی ہیں وہ سب صحیح ہیں۔ صحابہ کا منشا دین میں وسعت دینا تھا۔ ایک فرقے کے مسلمانوں کو دوسرے فرقے کے مسلمانوں سے غیریت نہیں برتنی چاہیے۔ غیریت وہ ڈلواتے ہیں جن کی روزی غیریت ڈلوانے پر منحصر ہے۔

تقدیرِ الٰہی

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ دمشق جارہے تھے۔ راستے میں معلوم ہُوا، وہاں وبا کا زور ہے۔ حضرت عمر نے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ رائے قرار پائی کہ واپس چلنا چاہیے شہر کے اندر جانا ٹھیک نہیں ہے۔ حضرت ابو عبیدہؓ اس رائے کے خلاف تھے۔ وہ کہنے لگے۔ کیا تقدیرِ الٰہی سے بچ کر بھاگتے ہو۔ حضرت عمر نے جواب دیا: نَحْنُ نَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ اِلٰى قَدَرِ اللّٰهِ۔ ہم تقدیرِ الٰہی سے تقدیرِ الٰہی کی طرف جائیں گے۔ حضرت عمرؓ نے مثال دے کر سمجھایا، کہا: "چرواہے کے پیشِ نظر دو جنگل ہوں۔ ایک خشک اور ایک سرسبز، تو چرواہا اپنے ڈھوروں کو خشک جنگل میں لے جائے گا یا سرسبز جنگل میں۔ یہ بھی تقدیرِ الٰہی ہے، تدبیر تقدیرِ الٰہی سے باہر کی چیز نہیں ہوتی" صحابہؓ نے اور جمہور مسلمین نے حضرت عمر کے اس فیصلے کو تسلیم کیا ہے۔ مسلمانوں کا عمل حضرت عمر کے اجتہاد پر ہے۔ حضرت ابو عبیدہؓ کی بات پر نہیں ہے۔ مسلمان وبا کی جگہ نہیں جایا کرتے۔

دوزخ کس کے لیے؟

(جنتی) مجرموں سے پوچھیں گے، تمہیں کن باتوں نے دوزخ میں لا ڈالا (تو وہ) جواب دیں گے، (ایک تو) ہم (اللہ کے آگے سر نہیں جھکاتے تھے اور) نماز نہیں پڑھتے تھے، اور (دوسرا قصور ہمارا یہ تھا کہ) ہم مساکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، اور (تیسرا قصور یہ تھا کہ) ہم کج بحثی کرنے والوں کے ساتھ مل کر (حق پرستوں سے) کج بحثی کیا کرتے تھے، اور (چوتھا قصور یہ ہے کہ) روزِ جزا کو جھٹلاتے تھے۔ یہاں تک کہ ہمیں موت آگئی (اور موت کے بعد حقیقتِ حال ہم پر ظاہر ہوگئی)۔ (قرآن پاک)

دولت کی چمک اور ایمان

اہلِ دول کے ہاں جانے سے کوفت کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم فرماتے ہیں کہ اہل دول کی رنگ رلیاں دیکھ کر وہ پاک روزی جو اللہ نے تمہیں دے رکھی ہے بُری لگنے لگتی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ اہل دول کی دنیاوی چمک دمک اور روشنی، ایمان کی حلاوت کھو دیتی ہے۔

بادشاہ یا حاکم کی بابت یقین ہُوا ہے کہ سفارش سُن لے گا تو اہل اللہ سفارش کرنے ضرور چلے گئے ہیں، مگر اہل اللہ اُن سے رسم نہیں بڑھاتے تھے۔ رسم بڑھانے میں ایمان کے ڈگمگانے کا امکان رہتا ہے۔ بادشاہ یا حاکم طلب کرتا تھا اور نہ جانے میں خطرہ نظر آتا تھا تو جاتے تھے ورنہ از خود نہیں جاتے تھے۔ اہل اللہ کا دل اہل دول کی طرف کھنچ نہیں سکتا۔

بادشاہ اور حاکم دین دار ہوں اور اہل اللہ کے پاس آئیں تو اُن سے اخلاق برتنے کا حکم ہے۔ ہر بادشاہ اور حاکم آئے گا ہی نہیں، وہی آئے گا جسے اللہ سے اور دین سے لگاؤ ہوگا۔ ایسا بادشاہ اور حاکم عزت اور ہمت افزائی کا مستحق ہے، بالکل اُسی طرح جس طرح ظالم بادشاہ اور حاکم اہانت اور ہمت شکنی کا مستحق ہے۔

نذر وغیرہ تو اکثر بزرگ اچھے بادشاہوں اور حاکموں کی بھی نہیں قبول کرتے تھے حضرت حمّاد بن سلمہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ حضرت مقابل بن صالحؒ بیان فرماتے ہیں کہ میں حضرت حمّاد کی خدمت میں حاضر تھا، کسی نے کُنڈی کھٹکھٹائی۔ پوچھا کون ہے۔ معلوم ہُوا خلیفۂ وقت

محمد بن سلیمان ہیں اندر بلا لیا۔ خلیفہ نے چار ہزار درہم پیش کیے۔ حضرت حمادؒ نے لینے سے انکار کیا۔ خلیفہ نے قسم کھائی کہ میری میراث حلال کے درہم ہیں۔ حضرت حمادؒ نے کہا۔ مجھے تو ضرورت ہی نہیں ہے۔ خلیفہ نے کہا۔ اچھا اپنے ہاتھ سے فقرا میں بانٹ دیجیے۔ حضرت حمادؒ نے فرمایا۔ میں کتنے بھی انصاف سے بانٹوں، معترض نہیں چوکیں گے اور بدگمانی کرنے کے گناہگار ہوں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کوئی گناہگار ہو۔

حق پرست اور حق شکن ہر جماعت، ہر قوم اور ہر زمانے میں رہے ہیں جس خاندان سے یزید تھا اُسی خاندان سے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، جنھوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یاد تازہ کر دی تھی۔

مطلق العنان بادشاہوں میں سچے اور درویش صفت مسلمان ملتے ہیں۔ علما و مشایخ نیک خصلت بادشاہوں کا ساتھ دیتے تھے۔ بد خصلت بادشاہوں کا ساتھ نہیں دیتے تھے۔ بد خصلت بادشاہوں کے معاون علمائے سُوٗ اور مشایخ سُوٗ کہلاتے تھے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بد خصلت حکام اور بد خصلت اُمرا کی علامتیں بتائی ہیں اور فرمایا ہے کہ ایسے حکام اور اُمرا سے مسلمانوں کو بھی کبھی نہ کبھی سابقہ پڑے گا، جو اُن کا ساتھ دے گا وہ اُن ہی جیسا ہو جائے گا اور جو اُن سے دُور رہے گا وہ نجات پائے گا۔ اُن کا ساتھ دینے والا میرا ساتھی نہیں ہے۔

ایک اور حدیث ہے کہ علما بادشاہوں سے خلط ملط نہ ہوں تو پیغمبر کے امانت دار ہیں اور خلط ملط ہوں تو اُنھوں نے امانت میں خیانت کی، اُن علما کے قریب مت جاؤ۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں:۔ آدمی بھلا چنگا دین لے کر بادشاہوں کے ہاں جاتا ہے اور بے دین ہو کر واپس آتا ہے۔ پھر وہ بادشاہوں کی رضا جوئی کے آگے اللہ کی خوشی ناخوشی کا دھیان نہیں رکھتا۔

حضرت فضیلؒ کہتے ہیں:۔ عالم جس قدر بادشاہ کا قُرب حاصل کرتا ہے اُسی قدر اللہ سے بعید ہو جاتا ہے۔

حضرت وہب بن منبہؒ کہتے ہیں:۔ جو علما بادشاہوں کے پاس جاتے ہیں وہ مسلمانوں کو بادشاہ کے مصاحبوں سے زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں۔

حضرت محمد بن سلمہؓ فرماتے ہیں:۔ نجاست پر بیٹھی ہوئی مکھی اس عالم سے بہتر ہے جو

بدخصلت بادشاہوں کے ہاں آمد و رفت رکھتا ہے۔

بڑے سخت اقوال ہیں۔ اس قدر سختی کا سبب حضرت امام غزالی لکھتے ہیں، یہ ہے کہ بادشاہوں کے ہاں جانے والوں کو بادشاہ کی نازیبا حرکات کو نازیبا کہنے کی ہمت نہیں ہوتی انھیں ازراہِ خوشامد نازیبا کو زیبا کہنا پڑتا ہے۔ حدیث یہ ہے کہ جو شخص تونگروں کے ساتھ محض اُن کی تونگری کے باعث عاجزی و فروتنی برتتا ہے اُس کا دین ناقص ہو جاتا ہے۔ فقط ایسے لوگوں کا ادب کرنا چاہیے جو دینی اعتبار سے مستحق ادب ہوں۔ اُن میں عادل حکمراں شامل ہیں۔ ظالم کا تو سلام لینے کی بھی بعض بزرگانِ سلف نے ممانعت کی ہے تاکہ اُسے محسوس ہو کہ ظلم اُسے ذلیل کرا رہا ہے۔ ظالم کو درازی عمر کی دُعا نہیں دی جاسکتی، کیوں کہ اس کی عمر کی درازی دَورِ ظلم کی درازی ہے۔ اپنے مخالفوں سے تو انسان بیزاری کا اظہار کرے اور اللہ کے مخالفوں سے رغبت رکھے، اِسی کو کہتے ہیں کہ دل میں نورِ اسلام نہیں رہا۔ اِنسان احتساب نہ کرسکے تو کم از کم اللہ کے مخالفوں کا ہم نوا تو نہ بنے۔ احتساب بیشک مشکل کام ہے، لیکن دربارداری کا کیا عذر ہو سکتا ہے۔ ایسی مثالیں بہت کم ہیں کہ دربارداری یا سرکاری عہدہ قبول کرنے پر کسی کو مجبور کیا گیا ہو۔

یہ سارا نوٹ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں کا خلاصہ ہے۔ ہاں، ایک بات اور سُن لیجیے۔ مالدار ہونا اسلام کے نزدیک جُرم نہیں ہے۔ خلفائے راشدین میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بہت زیادہ مالدار تھے۔ نیز جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام دولت کی تقسیم کا حامی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ سب کی مالی حالت بالکل یکساں کر دی جائے۔ ایسا کبھی نہیں ہُوا اور ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ جرم ہے مال کے پیچھے اللہ کو بھولنا، ناجائز طریقوں سے مالدار بننا اور مال پر سانپ کی طرح بیٹھ جانا۔ اُسے گننے، قوم اور ملک کے لیے وقف نہ رکھنا اور اللہ کے بتائے ہوئے کاموں میں خرچ نہ کرنا اور مال کو معیارِ عزت سمجھنا۔ اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے بڑے مالداروں، بڑے حاکموں اور بڑے بادشاہوں کے متعلق ہے، اچھے مالداروں، اچھے حاکموں اور اچھے بادشاہوں کے متعلق نہیں ہے۔ بادشاہت اور ملوکیت بذاتِ خود غلط شے ہے، لیکن شمس الدین التمش اور عالمگیر اورنگ زیب جیسے بادشاہ اور ملوک بھی ہوں تو انھیں مستثنےٰ کیا جاسکتا ہے۔ خیر بادشاہت تو اب قریباً ہے ہی نہیں اور ہے تو ختم ہونے والی ہے۔

مال کو معیارِ عزت سمجھنے پر ایک واقعہ یاد آیا۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے والد مالدار

آدمی تھے اور حضرت جنیدؒ کے ماموں غریب تھے، ایسے غریب کہ زکوٰۃ لیں۔ حضرت جنیدؒ کم عمر تھے اور پڑھ رہے تھے۔ مکتب سے گھر تشریف لائے۔ تو دیکھا والد کچھ اُداس ہیں۔ حضرت جنیدؒ نے سبب پوچھا۔ معلوم ہوا، ماموں کو زکوٰۃ کی رقم بھیجی تھی، انھوں نے واپس کر دی۔ حضرت جنیدؒ نے کہا، آپ اُداس نہ ہوں، میں ماموں کے پاس جاتا ہوں۔ انشاء اللہ زکوٰۃ کی رقم لے لیں گے۔

حضرت جنیدؒ نے ماموں کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ والد نے اللہ کے حکم کی تعمیل کر دی اور زکوٰۃ نکال دی۔ آپ زکوٰۃ لے لیں تو آپ بھی اللہ کے حکم اور اللہ کے منشا کی تعمیل کریں گے۔

گویا زکوٰۃ دینا اور زکوٰۃ لینا دُنیا کے ڈرامے کے دو ایکٹنگ (ACTING) ہیں کسی سے اللہ یہ پارٹ ادا کرا رہا ہے کسی سے وہ۔ مالدار ہونے اور زکوٰۃ دے سکنے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ چناں چہ بتائیے۔ حضرت جنید کے دولت مند والد کا نام کیا تھا اور حضرت جنید کے غریب ماموں حضرت سری سقطیؒ تھے انھیں ساری دنیا جانتی ہے اور اُن کی ساری دُنیا عزّت کرتی ہے، وہی حضرت جنیدؒ کے پیر بھی تھے۔

مال معیارِ عزّت نہیں ہے۔ مال معیارِ عزّت ہوتا تو حضرت عثمان کی عزّت حضرت ابوبکرؓ حضرت عمر اور حضرت علی سے بڑھ جاتی۔

ایک تصویر

ایک مؤقّر اخبار میں تازہ تازہ گروپ فوٹو دیکھا۔ دو مسلمان میاں بیوی اپنے مہمانوں کا استقبال کر رہے ہیں۔ دونوں ماشاء اللہ جوان ہیں۔ بیوی کا ہاتھ کوئی ادھیڑ عمر کا فرنگی دبائے ہوئے ہے اور ہاتھ کی طرف اس طرح جُھکا جاتا ہے جیسے ہاتھ کا بوسہ لے گا۔ ادھیڑ فرنگی کے چہرے پر وہی کیفیت ہے جو ایسے وقت ہونی چاہیے۔ عورت بھی خوشی کے مارے نہال نہال ہے۔ میاں کی مسکراہٹ میں البتّہ تصنع اور کھسیانہ پن ہے، خدا جانے کیوں!

یہ میاں صاحب پاکستان کے بہت بڑے آدمی ہیں۔ سب پاکستانیوں کے لیے فخر کا موجب۔ پاکستان بنانے کے تو شاید مدّعی نہ ہوں لیکن اب پاکستان کے صفِ اوّل کے خیرخواہ سمجھے جاتے ہیں اور اُن لوگوں میں شامل ہیں، جن کے نقوش قدم پر مسلمانانِ پاکستان کو جبراً نہیں

نظر آتا چلتا ہے۔ عوام اپنے عمائد کا پورا دین اختیار کیا کرتے ہیں۔ تصویر ہٰذا ترقی یافتہ دین کا چھوٹا سا نمونہ ہے۔ اعلیٰ نمونے روز نظر آتے ہیں اور ترقی یافتہ (PROGRESSIVE) دین کے نام سے نظر آتے ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ پاکستان نے دین کی بحالی کا وعدہ ایفا نہیں کیا!

ڈاکٹر انصاری کا مجسّمہ

ڈاکٹر انصاری، علی برادران اور حکیم اجمل خاں کے ساتھی اور ہندو مسلم اتّحاد کے زمانے کے لیڈر تھے۔ ان کا انتقال ہوا تو دلی میونسپلٹی میں کانگریس پارٹی نے تجویز پیش کی کہ جس سڑک پر ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی ہے اُس سڑک کا نام انصاری روڈ رکھا جائے اور ڈاکٹر صاحب کا بت بنوایا جائے۔ سڑک کا نام بغیر اختلاف کے منظور ہوگیا۔ بت والی تجویز بھی شاید اکثریت سے پاس کر لی جاتی، مگر میں نے کہا کہ بت آپ لوگ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی عزّت افزائی کے لیے بنوانا چاہتے ہیں، نامناسب نہ ہو تو ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی حکیم نابینا صاحب سے پوچھ لیجیے کہ وہ اسے عزّت افزائی سمجھتے ہیں یا نہیں۔ حکیم نابینا صاحب ہی نے ڈاکٹر انصاری صاحب کو پڑھوایا لکھوایا تھا۔ حکیم نابینا صاحب ڈاکٹر انصاری صاحب کے باپ کی جگہ تھے۔ میونسپل کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ واحدی اور لالہ دیش بندھو گپتا (ایڈیٹر روزانہ تیج) حکیم نابینا صاحب سے استصواب کریں۔ چناں چہ میں اور گپتا جی میٹنگ کے فوراً بعد حکیم نابینا صاحب کے پاس پہنچے۔ میں گپتا جی کا تعارف کرا کر خاموش بیٹھ گیا اور گپتا جی نے حکیم صاحب کو شیشے میں اُتارنے کی کوشش شروع کی۔ حکیم نابینا صاحب نہایت سکون سے گپتا جی کی باتیں سنتے رہے۔ گپتا جی کنویسنگ ختم کر چکے تو حکیم نابینا صاحب نے دریافت فرمایا۔ بت کہاں نصب کیا جائے گا۔ گپتا جی نے جواب دیا، بیگم کے باغ میں ٹاؤن ہال کے سامنے۔ حکیم نابینا صاحب نے کہا۔ آپ بت نصب کرا دیجیے، میں اُسے اپنے ہاتھ سے توڑ دوں گا۔

تجویز دھڑام سے نیچے آگری۔

اِنسان کا حق اِنسان پر

آپ بوڑھے ہو چکے ہیں تو ضرور کبھی نہ کبھی یہ سوچتے ہوں گے کہ ؎

کس لیے آئے تھے اور کیا کر چلے

نماز بھی پڑھتے ہوں گے اور پابندی سے پڑھتے ہوں گے۔ رمضان آپ کا رمضان کی طرح گزرتا ہوگا۔ زکوٰۃ دینے اور حج کرنے کی طاقت ہے تو ان فریضوں کو آپ نے ادا کر دیا ہوگا۔ یہ باتیں بنیادی ہیں، لیکن فقط اِن پر اسلام کا انحصار نہیں ہے۔ بنیادوں پر دیواریں بھی تو اُٹھنی چاہئیں، چھتیں بھی تو پڑنی چاہئیں۔ پوری عمارت بننی چاہیے۔ خالی بنیادیں بھر دینا اور اُن پر عمارت کھڑی نہ کرنا کافی نہیں ہے۔ بنیاد ہے حقوق اللہ کی ادائگی اور عمارت ہے حقوق العباد کی ادائگی۔ جو شخص اللہ کے حقوق ادا نہیں کرتا اور بندوں کے حقوق ادا کرتا ہے وہ بغیر بنیاد کے عمارت کھڑی کرتا ہے۔ ایسی عمارت ڈھے جاتی ہے، اور جو شخص اللہ کے حقوق ادا کرتا ہے اور بندوں کے حقوق ادا نہیں کرتا، وہ گویا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کی بجائے سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا کہتا ہے، یعنی اے اللہ! میں نے (تجھے مان لیا اور) تیرے احکام سُن لیے مگر اِن کی تعمیل نہیں کروں گا۔ میں تو ایسے احکام کی تعمیل کروں گا، جن کا تعلق تیری ذات سے ہو، نماز روزہ کیا، چلے کھنچوا لے، ریاضتیں اور مجاہدے کرا لے، مگر یہ نہ کہہ کہ میری مخلوق کے فایدے کے کام انجام دو۔ اُسے کسی قسم کا دُکھ اور نقصان مت پہنچاؤ۔ میں رشوت لے سکتا ہوں تو رشوت لوں گا۔ چور بازاری کر سکتا ہوں تو چور بازاری کروں گا۔ خون پی سکتا ہوں تو خون پیوں گا، چاہے غیبتیں کر کے پیوں، چاہے زور اقتدار دکھا کر پیوں۔ حضور! میں حقوق العباد کے چکر سے معافی کا خواہاں ہوں۔ یہ باتیں زبان سے نہ سہی، زبان حال سے کہی جاتی ہیں، اور اللہ تعالےٰ ایسے شخص کا نماز روزہ اس کے مُنھ پر مار دیتا ہے اور پھر دھیان مرتے مرتے اِدھر نہیں جانے پاتا کہ ؎

کس لیے آئے تھے اور کیا کر چلے

حالاں کہ مرنے کے قریب تو اتنا احساس ہونا ہی چاہیے کہ ہم اللہ کے کامل بندے ثابت نہیں ہوئے۔ ہماری بندگی اور عبدیت ناقص رہی۔

خلق اللہ کے فایدے کے کام کرنا ہر شخص کے بس کا نہیں ہے، لیکن خلق اللہ کو دُکھ اور نقصان نہ پہنچانا ہر شخص کے بس کا ہے۔ پھر فایدہ پہنچا سکنے والے فایدے پہنچانے کے پردے میں نقصان پہنچائیں تو بُری بات ہے۔

رحمت اور بندگی

اللہ تعالیٰ کا احسانِ عظیم ہے کہ اُس نے ہمیں عدم سے نکالا اور معدوم سے موجود کر دیا، اور درندو چرند و پرند اور حشرات الارض نہیں بنایا، انسان بنایا، مسجود ملائک انسان۔ ہم میں وہ قابلیت رکھی کہ چاہیں تو ملائکہ سے واقعی بڑھ جائیں۔ ہمارے ہوش اور حواس قائم کیے۔ ہمیں کان دیے کہ سُنیں آنکھیں دیں کہ دیکھیں اور دل و دماغ دیے کہ سمجھیں اور سُن کر، دیکھ کر اور سمجھ کر انسانیت کے لیے جو باتیں لازمی ہیں اُنھیں سیکھیں اور اُن سے اپنی انسانیت کو ترقی دیں، انسانیت کو ڈیولپ (DEVELOP) کریں۔ انسان تو بناتا لیکن ہوش و حواس اور سننے دیکھنے اور سوچنے سمجھنے کی قوتیں نہ دیتا تو ہم اللہ کا کیا بگاڑ لیتے۔ پاگل پیدا ہونا یا پیدائش کے بعد پاگل ہوجانا کیا آپ کی نظر سے نہیں گزرا۔ وہ پاگل ہیں بھی تو ہو سکتا تھا۔ صحیح وسالم پیدا کرکے اور سلامت طبعی اور سلامت روی عطا فرما کر ہمارے جسم اور روح کی پرورش اور نشوونما کرنا کیا کچھ کم احسان ہے۔ اللہ کے احسانات پر انسان غور کرتا ہے تو رحمٰن اور رحیم کے معنی جان جاتا ہے اور بے اختیار پکار اُٹھتا ہے۔

تو اگر مجھے نوازے تو ترا کرم ہے ورنہ
تری رحمتوں کا بدلہ مری بندگی نہیں ہے

مدد اللہ سے مانگو

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ٥ (سورہ ۱۔ آیت ۴) (اے اللہ! تو رحمٰن ہے کہ تو نے ہمیں معدوم سے موجود کر دیا۔ تجھ پر ہمارا کیا حق تھا کہ تو ہمیں وجود ضرور دیتا، اور اے اللہ! تو رحیم ہے کہ وجود بخشنے کے بعد تو نے ہمیں فراموش نہیں کیا، برابر ہماری پرورش اور نگہداشت فرما رہا ہے۔ اے اللہ! بندگی کا مستحق بھلا تیرے سوا اور کون ہو سکتا ہے اور تیرے سوا کون ہے جو ہمیں مدد دے سکے۔ سب تیرے دست نگر ہیں) ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

آج بھی، دنیا میں نمرودوں اور فرعونوں کی کمی نہیں ہے۔ نمرود اور فرعون کُھلّم کُھلّا اپنی بندگی کراتے تھے، آج کے اکثر دولتمند اور ذی اقتدار ہیر پھیر سے خواہاں ہیں کہ اللہ کے

احکام پس پشت ڈال دیے جائیں اور اُن کے حکم چلیں۔ جو حاکم اور بادشاہ اللہ کے احکام کی تعمیل کراتا ہے، اُس کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور جو حاکم اور بادشاہ اللہ کے احکام کو پس پشت ڈالتا ہے اور اپنا حکم چلاتا ہے، وہ گویا بازار میں کھوٹا سکہ پھیلاتا ہے۔ اللہ کی اطاعت کرائیں گے تو حاکم اور بادشاہ بھی، اللہ خود اطاعت کرانے نہیں آئے گا، ہم اگر ذی علم نہیں ہیں تو کم از کم ہماری نیت قطعی ہونی چاہیے کہ ہمیں اللہ کی اطاعت کرنی ہے۔ حاکم اور بادشاہ یا علما ہماری صحیح راہ نمائی نہیں کریں گے تو ذمہ داری اُن پر رہے گی۔ ہم صرف اس نیت کی وجہ سے کہ ہمیں اللہ کی اطاعت کرنی ہے شاید سزا سے بچ جائیں یا زیادہ سے زیادہ جہالت کی سزا پائیں۔

اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں بھی یہی صورت ہے کہ اللہ براہِ راست مدد نہیں دیا کرتا۔ ایک مخلوق کو دوسری مخلوق سے مدد دلواتا ہے۔ کسی کے دماغ میں یہ خنّاس نہیں سمانا چاہیے کہ میں دوسرے کو مدد دے سکتا ہوں۔ بڑے سے بڑے آدمی کو بھی، کبھی چھوٹے سے چھوٹے آدمی کی مدد کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ بادشاہ دواؤں کا محتاج ہوتا ہے، لیکن دواؤں میں اثر بھرنا اور ایک انسان سے دوسرے انسان کو مدد دلانا اللہ کا کام ہے۔ مدد کے لیے آمادہ وہی کرتا ہے۔ لہٰذا حقیقی مددگار وہی ہے۔ جب کسی سے مدد کی درخواست کرو تو پہلے اللہ سے دعا مانگو کہ یا اللہ! تو اُسے میری مدد پر آمادہ فرما دے، اُس کے ہاتھ سے میرا کام کرا دے۔ مدد دینے والے انسان کے شکر گزار ہو، مگر اُسے قاضی الحاجات ہرگز نہ مانو۔ قاضی الحاجات اللہ ہے، اور یہی اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے معنی ہیں۔

اِس عقیدے میں اتنی پختگی پیدا ہو جانی بھی ممکن ہے کہ آپ کو غیر اللہ کے آگے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہ آئے۔ مدد دینے والا اُلٹا آپ کے پاس پہنچ جائے اور آپ سے مدد کا طلب گار بن جائے۔ بادشاہوں کو اہل اللہ سے مدد کی طلب کرتے آپ نے سُنا ہوگا۔ اہل اللہ ضروریں اس قدر محدود کر لیتے ہیں کہ انھیں غیر اللہ کے آگے ہاتھ پھیلانے کی حاجت نہیں رہتی۔ پھر وہ مستجاب الدعوات ہوتے ہیں، اللہ اُن کی دُعا سنتا ہے اور بادشاہ اُن سے دُعا کراتے ہیں۔ لیکن خیر اِس وقت ان کا ذکر چھوڑیے آپ تو اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا مطلب ذہن میں بٹھائیے کہ حقیقی مددگار اللہ ہے، وہ نہیں ہے جو بظاہر آپ کی مدد کر رہا ہے وہ تو مثل دوا کے ہے۔ دوا کبھی اثر کرتی ہے کبھی نہیں کرتی، اور اللہ جو چاہتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔

انسانیت کا بہترین نمونہ

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ ۔ (آسمان کی طرف اُڑنا چاہتے ہو تو چیل کوّوں سے اُڑنا سیکھو اور سمندر میں تیرنا چاہتے ہو تو مچھلیاں سبق پڑھا سکتی ہیں۔ انسانیت کے مدارج طے کرنے ہیں تو انسانیت کا ہر نمونہ اور) بہترین نمونہ تمھارے لیے صرف محمدؐ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم) کی حیاتِ طیّبہ میں ہے۔

تم اُن جملہ مراحل سے نہیں گزر سکتے، جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم گزرے تھے۔ تم اگر جج ہو تو جنرل نہیں ہو، تم اگر تاجر ہو تو حاکم نہیں ہو، وغیرہ وغیرہ۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم سب کچھ تھے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس سے حضورؐ کو واسطہ نہ رہا ہو، تمھیں جس شعبے میں راہنمائی کی ضرورت پڑے حضورؐ کی زندگی اُس میں تمھاری راہنمائی کرے گی۔

تم ججی کی قابلیت لے کر پیدا ہوتے ہو تو سپہ سالاری کے پیچھے مت دوڑو، ویسے جج بنو جیسے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم تھے تم سپہ سالار ہو تو سپہ سالار رہو اور اپنے آپ کو حضورؐ کی سپہ سالاری کے نمونے پر ڈھالو۔ حضورؐ کی طرح تجارت کرو، حضورؐ کی طرح حکومت چلاؤ۔ عام انسان حضورؐ سے عام اخلاق سیکھ سکتے ہیں اور ممتاز انسان حضورؐ سے ممتاز اخلاق سیکھ سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ یہ نہیں کہہ رہا کہ بالکل رسول بن جاؤ۔ رسول تو ابوبکرؓ و علیؓ نہیں بنے تھے، ہم آپ کیا بنیں گے۔ رسول بس رسول ہی ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی محدود زندگی کو حضورؐ کے نمونے کے مطابق بنانے کا حکم ہے۔ زندگی کے متعدد شعبوں میں غیر نبی کمال حاصل نہیں کر سکتا، میں متعدد شعبوں میں گھسنے کا قایل نہیں ہوں۔ مولانا ابوالکلام آزاد میرے زمانے کے ذہین ترین انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں وہ قلم عطا فرمایا تھا کہ اگر قلم ہی سے کام لیتے تو اُن کا نام ہمیشہ ابنِ تیمیہ کے ساتھ لیا جاتا، جس طرح علامہ اقبال کا نام مولانا رومیؒ کے ساتھ لیا جائے گا، لیکن مولانا ابوالکلام تحریر کو چھوڑ کر تقریر کی جانب متوجہ ہو گئے اور انھوں نے مذہبیات کی بجائے سیاسیات کی راہ اختیار کر لی۔ مولانا سیاسیات میں بھی یگانہ نکلے۔ پنڈت جواہر لال نہرو وزارتِ عظمیٰ کے بعد اُن کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے تھے اور ۱۹۴۷ء ش

سے پہلے تو پنڈت جی کا قول تھا کہ میں نے سیاست سبقاً سبقاً پڑھی ہے، میں عملی سیاست اور علمی سیاست دونوں سے واقف ہوں اور سیاست کے علم کو تازہ کرنے دوسرے تیسرے سال یورپ جاتا ہوں، مگر جب یورپ سے واپس آتا ہوں تو مولانا کو اپنے سے آگے ہی پاتا ہوں۔

مولانا نے سیاست میں نام پیدا کیا، لیکن سیاست نے اُس نام سے محروم کر دیا جو تنہا قلم پیدا کرا سکتا تھا۔

کچھ اپنے بارے میں

میری زندگی بے حد یکساں گزری ہے، اُتار چڑھاؤ سے خالی۔ یہ مطلب نہیں کہ اب دیکھ سکتا ہوں اور سن سکتا ہوں تو پیدایش کے پہلے دن بھی دیکھتا تھا اور سُنتا تھا ——— فطری تبدیلیاں تو ہوئیں۔ بچپن گیا، جوانی آئی۔ جوانی گئی، بڑھاپا آیا۔ اب نہ دیکھنا اور نہ سُننا پیدایش کے وقت کا سا پھر قدم بڑھا رہا ہے، پیدایش کے وقت کی سی بے حواسی و بے خبری پھر طاری ہونا چاہتی ہے ——— فطری تبدیلیاں تو ہوئیں۔ مطلب یہ ہوا کہ عام طور پر لوگوں کو جیسے مدّ و جزر کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ویسے مدّ و جزر کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ عادتیں اور خصلتیں یکساں رہیں۔ مشاغل یکساں رہے۔ تندرستی یکساں رہی۔ مالی حالت یکساں رہی۔ پیدایش کے وقت تانبے کا چمچہ ملا تھا، وہ الحمد للہ کبھی نہیں چھنا، اور تانبے کے چمچے کا ایسا عادی ہو گیا ہوں کہ اُسے اپنے لیے چاندی کے چمچے سے بدلنا خطرناک سمجھتا ہوں اور تام چینی کے چمچے سے بدلنا تکلیف دہ۔

شکر کی ہمیشہ سے مشق ہے۔ صبر سے ۱۹۴۷ء تک ناآشنا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب نے زندگی کی یکسانیت میں فرق ڈالا، دلّی چھٹ گئی، تو میں نے جانا کہ صبر کیا شے ہے۔ ۱۹۴۷ء میں فقط دلّی چھٹنے کا صدمہ تھا۔ بال بچے بفضلہٖ تعالےٰ سب آنکھوں کے سامنے تھے، ۱۹۵۹ء کے انقلاب، یعنی دارالسلطنت پاکستان کی تبدیلی نے کئی بچوں کو راولپنڈی پہنچا دیا اور اچھی طرح صبر کا مزہ چکھا دیا۔[1]

---

[1] اس کا مطلب کوئی صاحب یہ نہ لیں کہ میں دارالسلطنت کی تبدیلی کے خلاف ہوں۔ ایسی باتوں پر غور کرنے کی مجھے فرصت ہی نہیں ہے۔ میرا مضمون تو صرف مذہب ہے یا معاشرہ۔

اِن دو انقلابوں کے سوا میں نہیں جانتا کہ زندگی کن کن انقلابوں سے گزرتی ہے۔
میری زندگی بالکل مشینی زندگی رہی ہے۔ صبح طلوعِ آفتاب سے گھنٹہ بھر قبل جاگنا، دن بھر مسلسل کام کرنا، اور مغربی پاکستان کی گھڑیوں کے مطابق رات کے ساڑھے نو اور پونے دس کے درمیان سو جانا، وقت پر کھانا کھانا، وقت پر چہل قدمی کرنا۔
علی الصباح جتنے بجے آپ مجھے اپنے مصنوعی دانت صابون سے دھوتے آج ملاحظہ فرمائیں گے اُتنے ہی بجے کل ملاحظہ فرمائیں گے۔ میرے دانتوں کے دھونے سے اور میرے ہر کام سے آپ گھڑی درست کر سکتے ہیں۔
میں جو کام کر رہا ہوتا ہوں، اُس کی بابت روز سوچتا ہوں کہ اسی وقت کل بھی یہی کر رہا تھا۔ آج میں نے سوچا کہ یُوں ہی کل پہ کل آئی چلی جاتی ہے۔ کل کی کل آج تھی۔ آج کی کل کل ہوگی۔ کل کی کل پرسوں۔ یوں ہی کل کا سلسلہ چلے جائے گا، یہاں تک ایک کل ایسی آئے گی کہ میں دُنیا میں نہیں ہوں گا۔
اُس کل میں اور کل والی کل میں کیا فرق ہے۔ وہ عین مین ایسی ہی کل ہوگی جیسی کل کی کل آج ہے۔ کیا خبر ہے کہ کل کی کل ہی وہ کل ہو۔ کون واقف ہے کہ کل کی کل میری زندگی میں آتی ہے، یا میرے مرنے کے بعد آتی ہے۔ اعتبار تو دوسرے سانس کا نہیں ہے، آتا ہے یا نہیں آتا۔
خیر اس وقت ایک تجربہ بیان کرنا ہے کہ میری جیسی یکساں زندگی گزارنے والا آدمی ناتجربہ کار رہ جاتا ہے۔ اُس کا شمار خواجہ حسن نظامی اور سردار دیوان سنگھ مفتون جیسے تجربہ کار آدمیوں میں نہیں ہو سکتا۔ وہ مصائب برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ جرأت اور بہادری نہیں دکھا سکتا۔ اُس سے میدانِ جہاد میں اُترنے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ وہ زندگی کا حقیقی لُطف نہیں اُٹھاتا۔
مثل ہے کہ بیاہ نہیں کیا، مگر باراتیں تو دیکھی ہیں۔ میری زندگی کو ہچکولے نہیں لگے، مگر میں نے ہچکولے کھانے والے خواجہ حسن نظامی اور سردار دیوان سنگھ مفتون کو دیکھا ہے کیسی کی دعاؤں کا صدقہ ہے جو میں یکساں زندگی گزارنے کے باوجود آپ سے باتیں کر لیتا ہوں۔ میرے والد حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی علیہ الرحمتہ کے مرید تھے، انھوں نے مجھے دُعائیں دی تھیں۔

حضرت امیر خسروؒ کا منڈھا

حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کا ایک گیت ہے، جسے منڈھا کہتے ہیں۔ دلّی میں دلہنیں عموماً رات کے پچھلے پہر وداع کی جاتی تھیں۔ وداع کے وقت ڈومنیاں بھیرویں کے سُروں میں یہ منڈھا گاتی تھیں، اور ایک سماں باندھ دیتی تھیں۔ آنکھوں سے ساون بھادوں کا مینہ برسنے لگتا تھا اور بڑی بوڑھیوں کو اپنا دُنیا سے رُخصت ہونا دکھائی دینے لگتا تھا۔ ممکن ہے دوسرے شہروں میں بھی یہ منڈھا گایا جاتا ہو، مجھے دوسرے شہروں کا علم نہیں ہے۔ اب تو غالباً دلّی والے بھی بھول بھلا گئے ہوں گے۔ برسہا برس سے کانوں میں منڈھے کی آواز نہیں پڑی بساط ہی اُلٹ چکی ۔

نادر شاہ تیرے ہولوں سے

چرخے لگ گئے کوٹوں سے

مجھے منڈھے کا کوئی کوئی بول یاد ہے۔ فرماتے ہیں :۔

(۱) ہم تو بابُل تیرے گھر کی چڑیاں، چریں، چگیں، اُڑ جائیں۔

(۲) اوے رے کولے گڑیاں چھوڑیں اور چھوڑا سہیلا ساتھ رے۔

(۳) ہوتے نہ دیتی بابُل زہر کی گھُٹّی اب کیا من پچھتاوے رے۔

قریباً ساڑھے چھے سو برس سے حضرت امیر خسروؒ کا منڈھا گایا جا رہا ہے۔ ساڑھے چھے سو برس میں زبان کہیں سے کہیں پہنچ گئی، لیکن آجکل کی زبان اِس ابتدائی زمانے کی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ حضرت امیر خسروؒ کی زبان میں بڑی حلاوت ہے۔

حضرت امیر خسروؒ اُردو زبان کے مُوجد اور بانی ہیں۔ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ نے اُن سے فرمایا تھا کہ ایسی زبان ایجاد کرو جسے فاتح مسلمان اور مفتوح ہندو دونوں بولیں، جس کے ذریعے دونوں ایک دوسرے کے قریب آئیں، ربط ضبط بڑھائیں اور ایک دوسرے کو سمجھیں۔ حضرت امیر خسروؒ نے "خالق باری" لکھ کر پیش کی۔ حضرت سلطان المشائخ نے کتاب کی تعریف فرمائی، مگر کہا ایسے اشعار لکھو جنھیں گانے پر لوگ مجبور ہو جائیں، چناں چہ حضرت امیر خسرو کی پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں اور منڈھا، سب آج تک زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ حضرت امیر خسرو کے تمام کلام میں حضرت سلطان المشائخ کی دعاؤں کا اثر ہے۔

انسان اور لباس

اَلنَّاسُ بِاللِّبَاسِ۔ انسان لباس سے پہچانا جاتا ہے کہ شہری ہے، یا قصباتی، یا دیہاتی۔ پڑھا لکھا ہے یا بے پڑھا لکھا۔ ثقہ ہے یا غیر ثقہ۔ ایک زمانے میں ہندو مسلمانوں کا لباس ایک تھا، لیکن پھر بھی انگرکھے کی چولی سے پہچان لیے جاتے تھے کہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ ہر طبقے کا لباس الگ الگ تھا، قدیم خاندانوں کا الگ، علما کا الگ، صوفیا کا الگ۔

لباس کا فرق نئی چیز نہیں ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے زمانے کے شرفا کا لباس پہنا کرتے تھے۔ اُمرا کا نہیں، شرفا کا اور ثقہ طبقے کا لباس۔ اُس زمانے میں اُمرائے عرب کا تہ بند نیچا لٹکتا رہتا تھا۔ زمین کی مٹی اُسے چھوتی تھی۔ اُمرا دکھاتے تھے کہ ہم امیر ہیں، ہمیں تہ بند کے خراب ہونے کی پرواہ نہیں ہے۔ خراب ہوتا ہے، ہو جائے۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم تھا کہ تمھیں تکلف اور کسرِ نفسی کرنے کی اجازت نہیں ہے، بے دھڑک کہو کہ ہم پیغمبر ہیں، ہم پر وحی اُترتی ہے اور جو کچھ تم سے کہا جائے دوسروں تک ضرور پہنچاؤ۔ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ۔ اِس کے باوجود حضورؐ میں تفاخر اور تکبّر مطلق نہیں تھا، حتّٰی کہ حضورؐ اہلِ تفاخر اور اہلِ تکبّر کا لباس نہیں پہنتے تھے۔ حضورؐ ہجرت کر کے مدینے پہنچے ہیں تو حضورؐ کا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا لباس یکساں تھا، اتنا یکساں کہ مدینے والے فرق نہ کر سکے تھے کہ رسول اللہ کون ہیں۔ جب دھوپ پھیلی اور حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضورؐ پر چادر سے سایہ کیا تب مدینے والوں نے جانا۔ غرضکہ انبیا کا کوئی مخصوص لباس نہیں تھا، انبیا بس اپنے زمانے کے شرفا کا لباس پہنتے تھے۔ حضورؐ نے اپنا کوئی مخصوص لباس الگ تجویز نہیں فرمایا تھا۔ مخصوص لباس طبقے اختیار کر سکتے ہیں افراد نہیں کر سکتے۔ چناں چہ ابتدائے اسلام ہی میں خلفا اور اُمرا نے خلفائے راشدین کی اور روشیں چھوڑنے کے ساتھ سادہ لباس ترک کیا اور بھڑک دار لباس پہنا تو ثقہ طبقے نے صوف کا لباس اختیار کر لیا، اور صوفی کہلانے لگے۔ اُن کا مقصد موٹا جھوٹا اور کمبل جیسا لباس پہن کر تفاخر اور تکبّر تو ہو نہیں سکتا تھا، اُن کا مقصد خلافِ سنّت لباس سے بیزاری ظاہر کرنا تھا۔ موٹے، جھوٹے اور کمبل جیسے کپڑے پہن کر بھی تفاخر و تکبّر کا شائبہ آجائے تو بھڑک دار لباس والوں کے تفاخر و تکبّر سے زیادہ

بُرا ہے۔

لباس کے معاملے میں ہوتا یہ رہا ہے کہ حسین لباس کو غیر ثقہ طبقے نے اپنایا ثقہ طبقے نے اُسے ترک کر دیا۔ بھڑک دار لباس ڈوموں اور میراثیوں نے پہننا شروع کیا تو پھر بھڑک دار لباس اُمرا کے جسموں سے اُتر گیا۔

آجکل جس قسم کی تنگ پتلون ٹیڈی لڑکے پہنتے ہیں، اِس قسم کی پتلون پچاس برس پہلے عام تھی، مگر اب بدن سے چمٹی ہوئی پتلون شرفا پہننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اسی طرح ممکن ہے ایسا زمانہ بھی آئے کہ حقیقی صوفیا مخصوص لباس سے پناہ مانگیں، کیوں کہ مصنوعی صُوفیوں نے اُن کے لباس کی ساکھ بگاڑ دی ہے۔ حقیقی صوفیا تو اشارے کنائے سے بھی نہیں بتانا چاہتے کہ وہ اللہ کے عام بندے نہیں ہیں، خاص بندے ہیں۔ خاص بندوں کے لیے خاص لباس لازمی کہاں لکھا ہے۔ حقیقی صوفیا کو تو بس رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوا عَنْہُ کا مصداق بننا چاہیے، یعنی اللہ اُن سے راضی، اور وہ اللہ سے خوش۔

خُدا کی حکمت

ریاست جودھپور میں ایک جگہ ہے، کاکر ولی۔ وہاں ایک تالاب تھا، جسے مولوی عبدالقادر خاں مصنّف وقائع عبدالقادر خانی نے بتایا ہے کہ "دس بارہ کوس میں پھیلا ہُوا ہے اور اس کے کنارے پختہ ہیں۔" تالاب، ممکن ہے اب بھی ہو۔

مولوی عبدالقادر خاں لکھتے ہیں: اس میں مچھلیاں بے شمار ہیں، جب غلّہ ڈالا جاتا ہے تو پانی کے اُوپر آجاتی ہیں، مگر چوں کہ ہندوؤں کا مندر نزدیک ہے، کوئی شخص اُنھیں پکڑ نہیں سکتا۔ سیکڑوں بگلے تالاب کے اُوپر منڈلاتے رہتے ہیں، وہ خوب شکار کرتے ہیں اور انسانوں سے زیادہ مچھلیاں کھا لیتے ہیں۔ اس تحریر کی تاریخ ۱۴ فروری ۱۸۲۱ء ہے۔

حکیم مطلق کی حکمت دیکھیے کہ مچھلیوں کو انسان نہیں کھا سکتے تو بگلے کھا جاتے ہیں۔ جہاں مچھلیاں پکڑنے کی اجازت ہے، وہاں اتنے بگلے نہیں ہوتے جو انسانوں کے شکار نہ کرنے کی کمی پوری کر دیں اور مچھلیوں کی تعداد اتنی رکھیں جتنی پانی میں گنجایش ہے، ورنہ مچھلیاں مریں گی تو ضرور، اپنی موت مر کر پانی میں سڑیں گی، اور آب و ہوا خراب کریں گی اور وبا پھیلائیں گی۔

خاکی جانوروں کے ساتھ بھی اسی طرح کا معاملہ ہے۔ حلال جانوروں اور حرام جانوروں کی تعداد کا مقابلہ کرلیجیے۔ ویسے بھیڑیں، بکریاں کتیوں کے برابر بچے نہیں دیتیں، اِس کے باوجود بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کے ریوڑ آپ کے لیے حاضر ہیں۔ گائے، اونٹ، غرض حلال جانوروں پر نظر ڈال جائیے۔ جنگلوں میں نیل گائے اور ہرن پاڑے کی جیسی کثرت ہے ویسی شیر، بھیڑیے اور ہاتھی کی نہیں ہے۔

ہاں ایک بات اور لایق غور ہے۔ آپ جو چیزیں نہیں کھاتے، گوشت خور جانور بھی اُن چیزوں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ پرندوں کا حال بھی آبی اور خاکی جانوروں جیسا ہے۔

قربان جائیے اُس کے، جس کے قبضے میں نظام عالم ہے۔

مسلمان کہاں ہیں؟

بے پڑھے لکھے مسلمانوں میں نہیں، ایسے پڑھے لکھے مسلمانوں میں، جنھوں نے سیکڑوں کتابیں پڑھی ہوں گی اور دو چار شاید لکھی بھی ہوں گی، اس وقت غالباً ایک فی صد نہیں ہیں، جو یہ دعوا کرسکیں کہ ہم نے کبھی قرآن مجید کو از اوّل تا آخر سمجھ کر پڑھا ہے۔ جنھیں دین سے لگاؤ نہیں ہے، اُن کا تو کہنا کیا، دین دار قسم کے مسلمان ایک فی صد بہ مشکل نکلیں گے۔

میرا اندازہ غلط ہے تو مجھے متنبہ کر دیجیے، لیکن ذرا سا غور کرنے کے بعد۔ خدا کرے آپ ایک فی صد ہی میں ہوں۔ اپنے گرد و پیش نظر ڈالیے۔ دوستوں اور عزیزوں سے دریافت کیجیے کہ انھوں نے پورا قرآن کتنی دفعہ سمجھ کر پڑھا ہے۔

یہ بُرا تجسس نہیں ہے۔ نیک نیتی کی جُستجو ہے۔ اِس جستجو سے آپ اُس مرض کی تشخیص کر سکیں گے، جس میں دُنیا بھر کے مسلمان مبتلا ہیں۔

اکبر الہ آبادیؒ نے کہا تھا ؎

اک شور ہے بپا کہ مسلمان ہیں تباہ
میں پوچھتا ہوں تم سے مسلمان ہیں کہاں

خدا کو کیسے پہچانیں؟

سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا بہت مشہور قول ہے: عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ۔

میں نے اپنے رب کو فسخِ عزائم سے پہچانا۔ میرے ارادے اور منصوبے جب ٹوٹے تو مجھے پتہ چلا کہ انھیں کامیاب کرنے والا کوئی اور ہی ہے۔ گویا یہ بھی ایک نعمت ہے کہ انسان کے سب ارادے اور منصوبے پورے نہ ہوں۔ سب ارادے اور منصوبے پورے ہونے لگتے ہیں تو انسان اللہ کو بھول جاتا ہے۔ ارادوں اور منصوبوں کو کبھی کبھی ٹوٹتا اور ناکام ہوتا رہنا چاہیے، تاکہ اللہ فراموش نہ ہو اور اللہ سمجھ میں آئے۔ جو لوگ ناکامی سے گھبرا جاتے ہیں اور دماغی توازن کھو بیٹھتے ہیں، اُن کا ذکر نہیں، ذکر اُن کا ہے، جنھیں اللہ ناکام کرنے کے بعد توفیقِ صبر عطا فرماتا ہے اور جو سوچ سکتے ہیں کہ یہ کیا ہُوا۔ ہم نے تو بڑے بڑے اہتمام کیے تھے اور بڑی بڑی اُمیدیں باندھی تھیں۔ ہماری اسکیمیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ غفلت کا پردہ گھبرانے اور فکرمند ہونے سے نہیں ہٹے گا، غور اور تفکّر سے ہٹے گا۔ غور و تفکّر ہی سے معلوم ہو گا کہ ناکامی اللہ کا عرفان ہی نہیں کراتی دنیا میں بھی کامیابی کے دروازے کھولتی ہے جن کے سب ارادے اور منصوبے پورے ہو جاتے ہیں اُن کی دنیاوی ترقی بھی رُک جاتی ہے اور جو گر گر کر گرنے کی پرواہ نہیں کرتے اور پھر قدم بڑھاتے ہیں، پھر اسکیم بناتے ہیں، وہ کہیں کے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ یگانہ لکھنوی کس قدر صحیح بات کہہ گیا ہے ؎

بجز ارادہ پرستی، خدا کو کیا جانے

وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا

جو ہمیشہ کامران و کامگار رہے اُسے خوش نصیب نہ سمجھیے، اُس پر تو جمود طاری ہے، وہ کشمکشِ حیات سے بے خبر اور بیگانہ ہے، اور اِس سے زیادہ بدنصیبی کیا ہوگی کہ اُسے اپنے خالق اور پروردگار کی بابت سوچنے کا موقع میسّر نہیں آتا۔ اللہ کو پہچاننے کے لیے اور دینی و دنیاوی ترقی کرنے کے لیے جھٹکے لگنے چاہئیں۔ بختِ رسا اور بختِ نارسا کو ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔ مسلسل کامیابیاں خدا پرست بنانے کی بجائے ارادہ پرست بنا دیتی ہیں۔ انسان سمجھنے لگتا ہے کہ میں جو چاہوں گا وہ ہو جائے گا۔ میرے ارادے سے مراد جدا نہیں رہ سکتی۔ جو شان اللہ کی ہے وہ اُسے اپنے اندر دکھائی دینے لگتی ہے۔ ایسا انسان خدا کو کیا پہچانے گا۔

اسلامی مملکت کی آمدنی

جو مال جنگ میں ہاتھ آئے اُسے مالِ غنیمت کہتے ہیں، اور جو مال جنگ کے بغیر

حاصل ہو وہ مالِ فئے کہلاتا ہے۔ مالِ غنیمت کے پانچ حصے کیے جاتے ہیں، چار حصوں کو جنگ کرنے والوں میں تقسیم کردینے کا حکم ہے، اور پانچواں حصہ باقی مسلمانوں کے لیے رکھا جاتا ہے۔ مالِ فئے سارا کا سارا کل مسلمانوں کا ہوتا ہے۔ اس میں جنگ کرنے والوں اور جنگ نہ کرنے والوں کا سوال ہی نہیں ہے۔ معمولی سی برائے نام جنگ ہونے کے بعد صلح ہوجائے اور صلح کی صورت میں کچھ مال ملے تو وہ بھی فئےٌ ہے، غنیمت نہیں ہے۔

یہودیوں کے قبیلہ بنی نضیر سے جب حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا کہ مدینہ خالی کرو اور خیبر جاؤ، تو بنی نضیر اس فرمان کی تعمیل کے لیے آمادہ نہیں تھے حضورؐ نے چڑھائی کی تو آمادہ ہوگئے۔ جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی، صرف گھیرا ڈالا تھا اور چاروں طرف کے درختوں کو کاٹنا اور آگ لگانا شروع کیا تھا تاکہ بنی نضیر قلعہ بند نہ رہ سکیں اور مدینہ جلد چھوڑ دیں۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا: وَمَآ اَفَآءَ اللّٰہُ...... وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ٥ (سورہ ۵۹ - آیت ۶) جو (سامان اور زمین وغیرہ) اللہ نے اپنے رسولؐ کو ان (سرکشوں) سے دلائی ہے (اس کا چڑھائی کرنے والو اور مالدار مسلمانو! تم کیوں مطالبہ کرتے ہو) تم نے یہودیوں پر گھوڑے تو دوڑائے نہیں (تھے) اور نہ (تم نے) اونٹ لے کر ان پر دھاوا بولا تھا۔ بلکہ (یہ سامان تو اللہ نے اپنے رسولؐ کو بے مشقت دیا ہے، اور) اللہ اپنے رسولوں کو جس مال کا چاہتا ہے قابض بنا دیتا ہے (اور جس پر چاہتا ہے، اسی طرح بغیر لڑے غلبہ دے دیتا ہے) اللہ ہر بات پر قادر ہے۔ مَآ اَفَآءَ اللّٰہُ...........
بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ ط (سورہ ۵۹ - آیت ۷) جو مال اللہ نے اپنے رسولؐ کو ان بستیوں والوں سے دلایا ہے وہ مال اللہ اور رسولؐ کا ہے، اور (رسولؐ کے) قرابت دارؐ اور یتیموں، محتاجوں اور مسافروں کے واسطے ہے، تاکہ دولت مندوں کے قبضے میں نہ جائے، (اور دولت مندوں کے پھندے میں نہ پھنسے) وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡہُ ...... اِنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ (سورہ ۵۹ - آیت ۷) (تمہاری فلاح و بہبود اسی میں ہے کہ ہر اعتبار سے اپنے اللہ اور رسولؐ کی فرماں برداری کرو، جھگڑو نہیں)

ؐ رسولؐ کے قرابت داروں پر زکوٰۃ حرام ہے۔ مالِ فئے حرام نہیں ہے، بلکہ مالِ فئے میں انھیں دوسرے ضرورت مندوں پر سبقت دی جاتی ہے۔

رسولؐ جو تم کو دیں اُسے لے لو اور جس کے لینے سے روکیں اُسے چھوڑ دو۔ اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شبہ اللہ کی پکڑ سخت ہے۔ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ .... اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (سورہ ۵۹ - آیت ۸) مال فئے ان نادار و تمند مہاجرین کا حق ہے جو اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے ہیں (اور) اپنے مال (و متاع) سے محروم ہو گئے ہیں اور اللہ کے فضل اور اللہ کی رضامندی کے متلاشی ہیں اور اللہ اور اُس کے رسولؐ کی مدد کرتے ہیں۔ یہی لوگ (قول کے) سچے (اور ایمان کے پکے) ہیں۔ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ .... هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (سورہ ۵۹ - آیت ۹)

(نیز مال فئے) اُن کا (حق) ہے جو دار الاسلام و الایمان (مدینہ) میں ان (مہاجروں کے ورود) سے پہلے کے باشندے ہیں (یعنی انصار) جن کے پاس مہاجر ہجرت کر کے پہنچتا ہے تو وہ اُس سے محبت کرتے ہیں، اور مہاجروں کو کوئی چیز دی جاتی ہے تو اُس کا بُرا نہیں مانتے اور اپنے دلوں میں تنگی نہیں پاتے، خواہ خود اپنے اوپر فاقہ کیوں نہ ہو۔ انصار مہاجرین کو اپنی ذات سے مقدم سمجھتے ہیں (مسلمانو! یاد رکھو) جو شخص نفس کے بخل سے محفوظ ہے (وہی اللہ کا نیک بندہ ہے، اور) ایسے ہی لوگ (دنیا و عقبیٰ میں) فلاح یاب ہوں گے (حریص و بخیل اور خود غرض و خود پرست لوگوں کے لیے فلاح نہیں ہے، وہ آج نہیں ڈوبے، تو کل ڈوبیں گے) وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ .... رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ (سورہ ۵۹- آیت ۱۰) اور (مال فئے) اُن کا (حق) ہے جو ان (مہاجرین) کے بعد (ایمان لائے اور) یہ دُعا مانگتے ہوئے آئے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اور ہم سے قبل ایمان لانے والوں، ہمارے بھائیوں کو بخش دے، اور ہمارے دلوں میں اہلِ ایمان سے بیر اور بغض نہ رکھ۔ اے ہمارے پروردگار! (تو ہماری سُن لے) تو ہی (بے کسوں پر) مہربان اور (لاچاروں پر) شفیق ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ از رُوئے قرآن اسلامی مملکت کی آمدنی مملکت کی پوری آبادی پر خرچ ہونی چاہیے۔ مال فئے تو سب کے لیے ہے ہی، مالِ غنیمت کی بابت بھی شیخ ابو بکر رازیؒ "احکام القرآن" میں لکھتے ہیں کہ چار حصے جنگ کرنے والوں کو منقولہ مال میں سے دینے ضروری ہیں، غیر منقولہ مالِ غنیمت امام وقت اپنے اختیار سے تقسیم کر سکتا ہے۔ مصلحت سمجھے تو جنگ کرنے والوں کو چار حصے دے دے اور مصلحت نہ سمجھے تو کُل غیر منقولہ مالِ غنیمت ضروریاتِ عامّہ کے لیے رہنے دے۔

آج کل تو مندرجہ بالا آیات سے یہ سیکھنا ہے کہ رُپے کا بہاؤ صرف چند خاندانوں کی طرف نہ رہنا چاہیے۔ دولت مندوں کا زیادہ دولت مند ہوتا جانا غریبوں کو زیادہ غریب بناتا ہے۔

مولانا آزاد جوانی میں

میں نے اِس شکل کے ابوالکلام کو دیکھا ہے۔ میں اور خواجہ حسن نظامی لکھنؤ سے دِلّی واپس جا رہے تھے۔ کانپور کے اسٹیشن پر گاڑی بدلنے کے لیے اُترے۔ دیکھتے کیا ہیں، چھریرا بدن، نہایت حسین چہرہ، ڈاڑھی مونچھیں ایسی صاف کہ گویا ابھی مسیں نہیں بھیگیں، اچھے کپڑے کی اور اچھی تراش کی شیروانی، علی گڑھی فیشن کا پاجامہ، پیروں میں پمپ شو، سَر پر ایرانی ٹوپی۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور شیروانی کے دامن اُونچے کیے، ایک جوان رعنا چلا آتا ہے۔ خواجہ صاحب کی زبان سے نکلا، ابوالکلام — اور ابوالکلام اخاہ خواجہ صاحب کہتے ہوئے خواجہ صاحب کی طرف بڑھے — یہ ۱۹۱۰ کا واقعہ ہے — ۱۹۱۰ میں مولانا ابوالکلام بالکل ایسے تھے، جیسی تصویر ابوالکلام کی کہانی میں جناب شورش کاشمیری نے چھاپی ہے۔

میں اور خواجہ صاحب انٹر کلاس میں تھے اور مولانا فرسٹ کلاس میں راستے بھر ہمیں اُن کی اور اُنھیں ہماری خبر نہیں لگی۔ میرے لیے مولانا کی یہ پہلی دید تھی۔

مولانا نے فرمایا۔ یہاں کب تک گاڑی کا انتظار کیجیے گا۔ گاڑی کا وقت تو رات کے دس بجے ہے، اور ابھی دن کے گیارہ بجے ہیں۔ میرے ساتھ حافظ حلیم کی کوٹھی چلیے۔ میں اُن ہی کے ہاں مقیم ہوں۔

حافظ محمد حلیم چمڑے کے بہت بڑے تاجر تھے۔ مولانا کو جو کمرہ اُنھوں نے دے رکھا تھا وہ چمڑے کی بدبُو کی بجائے عطر کی خوشبو سے مہک رہا تھا، اور بے حد آراستہ تھا۔

مولانا اُس کم عمری میں شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اُن کے علم اور اُن کی ذہانت اور طبّاعی کی دھوم تھی۔ اپنے سے دُگنی اور تگنی عمر کے علما کے ساتھ اُن کا اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ خواجہ

لہ سالہ ۱۹۱۱ء میں مولانا ابوالکلام آزاد ہندستان کے ممتاز عالم کی حیثیت سے جارج پنجم کے دربار کی بعض تقریبات میں بلائے گئے تھے۔ علما و مشایخ اور پنڈتوں اور سادھوؤں کو ہاتھیوں پر بٹھا کر جارج پنجم کے سامنے لے جایا گیا تھا۔ مولانا اس تقریب میں شامل تھے۔ (واحدی)

صاحب نے مولانا کی باتیں اکثر سُنائی تھیں، میں سُن کر متاثر تھا، دیکھ کر مرعوب ہو گیا۔
مولانا رُعب بٹھاتے نہیں تھے، لیکن رکھ رکھاؤ اس قدر پختہ، پائدار اور غیر مصنوعی تھا کہ رُعب
خود بخود پڑتا تھا۔ مولانا مجھ سے چند مہینے چھوٹے تھے، لیکن کوئی چیز تھی جو انھیں بڑا سمجھنے
پر مجبور کر رہی تھی۔ ابوالکلام سے زیادہ رعب دار بوڑھے میری نظر سے گزرے ہیں لیکن ابوالکلام
سے زیادہ رعب دار نوجوان میری نظر سے نہیں گزرا۔ امام الہند بننے والا نوجوان۔

گاندھی جی سے مولانا ۱۹۲۰ میں ملے تھے، جبکہ مولانا بتیس سے زیادہ کے نہ ہوں گے اور
گاندھی جی پچاس اور ساٹھ کے درمیان تھے۔ گاندھی جی کے پرائیویٹ سیکرٹری مہادیو ڈیسائی
کا بیان ہے کہ گاندھی جی نے کہا، میں مولانا ابوالکلام آزاد سے مرعوب ہوا۔ انگریزوں میں
بھی ایسے دماغ کا انسان نہیں ہے۔ میں اس نوجوان کی راہنمائی میں اپنی منزلیں طے کروں گا۔

قرآن اور دُوسری زندگی

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ . . . . . .
وَ اَنْبَتَتْ مِنْ کُلِّ زَوْجٍ بَہِیْجٍ ۝ (سورہ ۲۲ - آیت ۵) اے لوگو! تمھیں اگر
(مرنے کے بعد) دوبارہ جی اُٹھنے میں شک ہے۔ (تمھاری سمجھ میں نہیں آتا کہ ریزہ ریزہ ہو جانے
کے بعد جسم پھر کیسے جڑ جائے گا اور کیوں کر اُسے زندگی مل جائے گی، تو اپنی پیدائش پر غور کرو،
پیدائش سے پہلے تو ریزہ ریزہ جسم بھی نہیں تھا) ہم نے تمھیں (اس طرح) پیدا کیا (کہ) مٹی
سے (اناج اور پھل اگائے) پھر (اناجوں اور پھلوں کو نطفے کی شکل دی، اور) نطفے سے (تم
آدمی بننے لگے ۔ نطفہ خون بستہ ہو گیا) خون بستہ سے (گوشت کا بوٹا) پھر گوشت کے بوٹے
سے (کبھی) ڈھلا ڈھلایا (آدمی) اور (کبھی) بے ڈھلا، تاکہ تم پر (اپنی قدرت) ظاہر کر دیں۔
(نطفے کو آدمی کی شکل دینا نہ دینا ہمارے قبضے میں ہے اور توالد کا یہ سارا ہی طریقہ ہماری قدرت
کا بیّن کرشمہ ہے) ہم (جس مضغہ گوشت کو چاہتے ہیں ناتمام گرا دیتے ہیں اور) جسے چاہتے
ہیں وقت مقررہ تک (ماؤں کے) پیٹ میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تمھیں بچہ سا نکالتے ہیں،
پھر (تمھارے جسم کی تربیت و نگرانی کرتے ہیں) تاکہ تم بھرپور جوانی کو پہنچو، اور (تم میں سے کوئی
ایسا ہے کہ (چھوٹی عمر میں) وفات پا جاتا ہے اور کوئی ایسا کہ بڈھا پھونس کر دیا جاتا ہے (اتنا
بڈھا پھونس) کہ وہ سمجھ داری کی منازل طے کر کے (دوبارہ) ناسمجھ ہو جاتے ہیں۔ (سوچو کہ

انھیں کس نے شعور دیا تھا اور کس نے اِن کا شعور واپس لے لیا۔ یہ جیسے بے شعور دنیا میں آئے تھے، ویسے ہی بے شعور دنیا سے چلے۔ جو شعور دے کر شعور واپس لے سکتا ہے اور زندگی دے کر زندگی واپس لے سکتا ہے وہ کیا زندگی واپس لے کر دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا۔ شعور کو واپس آتے تو بارہا دیکھا ہوگا۔ ارے انسان! تو (روز) دیکھتا ہے کہ زمین مردہ پڑی ہوتی ہے اور جہاں ہم نے اُس پر مینہ برسایا، جی اُٹھتی ہے اور لہلہا اُٹھتی ہے اور اس کی پیداوار اوپر کو اُٹھتی ہے۔ (اُس میں) قسم قسم کی رونق دار (خوش نما، فرحت افزا نشاط انگیز) چیزیں اُگ آتی ہیں۔

اِن سب باتوں پر غور کر کے بھی دوسری زندگی میں شک رہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی یہی مرضی ہے کہ تم شک کیے جاؤ۔

فقہی اختلافی مسائل

بہت سے دینی معاملے ایسے ہیں، جن میں مسلمان فرقے ایک دوسرے سے متفق نہیں ہیں۔ مثلاً طلاق کے مسلمان فرقوں نے الگ الگ طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسلامی قانون کون سے اسلام کا نافذ کیا جائے۔ شیعوں کے اسلام کو لیتے ہیں تو سُنّی بگڑتے ہیں اور سُنّیوں کے اسلام کو تسلیم کرتے ہیں تو شیعہ شاکی ہوتے ہیں۔ پھر سُنّیوں کے اسلام میں اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ کا قصہ ہے، اور صرف فقہ کو بنیاد بنائیں تو حنفی، مالکی، حنبلی، شافعی کس کی فقہ کو بنیاد بنائیں۔

خواجہ ناظم الدین جب پاکستان کے وزیرِ اعظم تھے تو مولوی احتشام الحق صاحب نے مختلف فرقوں کے اکتیس جیّد اور با اثر علما اپنے ہاں اکٹھے کیے تھے اور اُن سے اس مشکل کا حل تجویز کرایا تھا۔ معلوم نہیں، وہ حل کیا تھا۔ علما کا اجتماع چوں کہ خواجہ ناظم الدین کے ایما پر ہُوا تھا وہ وزارتِ عظمیٰ کی کرسی سے اُتار پھینکے گئے اور غالباً اُس حل کی عام اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ بہر حال اب اُسے شایع کر دینا چاہیے۔

مذہب میرا مضمون ہے، لیکن مذہب میں مجھے جتنا ایمانیات سے لگاؤ ہے اتنا اس قسم کے مسایل سے نہیں ہے۔ ورثہ کسے کسے ملتا ہے اور کتنا کتنا ملتا ہے، میں پوری طرح نہیں جانتا۔ تاہم میرے نزدیک مندرجہ مشکل کا ایک ہی حل ہے کہ مختلف فیہ معاملات میں فی الحال نہ پڑا جائے، یا انھیں فی الحال پرسنل لا رہنے دیا جائے، جیسا کہ انگریزوں کے زمانے میں

تھا۔ اور بے شمار دینی معاملات ایسے ہیں، جن میں مطلق اختلاف نہیں ہے، جن کی اچھائی اور برائی قرآن مجید سے براہِ راست اور صاف صاف ثابت ہے، پہل اُن سے کی جائے، مثلاً سُنتا ہوں کہ پاکستان کے قیام کے بعد سے مسلمان شراب زیادہ پینے لگے ہیں۔ ہوٹلوں میں برہنہ یا نیم برہنہ عورتیں ناچتی ہیں، بازاروں میں عورتیں بے محابا تبرّج جاہلیت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ سُود خواری کا زور ہے۔ زناکاری کا زور ہے، امیروں کی امارت اور غریبوں کی غربت تیزی سے بڑھتی جاتی ہے، سینماؤں نے شرافت کو ڈبو دیا ہے، ریڈیو میں مخرب اخلاق گانے گائے جاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ، ان سب باتوں کا قرآن مخالف ہے۔ آپ پہلے خالص قرآنی احکام کو پکڑیے۔ آپ کا ہاتھ کوئی نہیں روکے گا۔ اسلامی فضا پیدا کر دیجیے، اللہ تعالےٰ مختلف فیہ معاملات کا بھی کچھ نہ کچھ حل نکال دے گا، فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ط اللہ اُن کو جو ایمان لاتے ہیں (اور واقعی ہدایت حاصل کرنی چاہتے ہیں) اُن معاملوں میں جن کی نسبت لوگ اختلاف کیا کرتے ہیں اپنی کتاب (قرآن) ہی کے ذریعے حق کے ساتھ صحیح راہ نمائی کر دیتا ہے (سورہ ۲ - آیت ۲۱۳)

مختلف فیہ معاملوں سے قوانین سازی کا کام شروع ہونا فرض نہیں ہے، متفق علیہ معاملوں سے کام شروع کیجیے۔

قرآن مجید کا دعوا ہے کہ قرآن میں تضاد اور اختلاف نہیں ہے، مگر خیر جن آیات قرآنی کی تعبیر میں اختلاف ہو اس وقت انھیں بھی نہ چھیڑیے۔ جن آیات کی تعبیر میں اختلاف نہیں ہے، وہ کام کے آغاز کے واسطے کافی ہیں۔

تمام پبلک لاز کی اصلاح مجلس قانون ساز کے دو چار سیشنوں میں نہیں ہو جائے گی، لہٰذا تھوڑے دن پرسنل لاز اور باقی رہیں تو کیا حرج ہے۔

سوچ سوچ میں فرق

موجودہ دَور کیا منصوبہ بازی کا دَور نہیں ہے؟

ہٹلر کا منصوبہ تھا کہ انگریزوں کی صاحبی ختم کر کے دنیا پر جرمنوں کا سکہ بٹھائے۔ انگریزوں کے پیشِ نظر تھا کہ ۱۹۴۴ء کے خاتمے سے پہلے ہٹلر کا خاتمہ کر دیں۔ ہندو کہتے تھے کہ ہماری تعداد ہندستان کی آبادی کی تین چوتھائی ہے، ہم بڑے بن کر رہیں گے۔ مسلمانوں

نے ٹھانی تھی کہ یا گھی سے کھائیں گے یا جی سے جائیں گے۔ اچھوت سوچتے تھے کہ ہندو مسلمان دونوں حکومت کر چکے، اب حکومت کا مزا ہمیں ملنا چاہیے۔ انگریز حکام ایک اسکیم کے مدعی تھے جس سے ہمیں کھانے پینے، پہننے، اوڑھنے اور رہنے سہنے کی وہ سہولتیں ملنے والی تھیں جو خود انگریزوں کو حاصل تھیں۔ ۱۹۴۶ء میں ہندستان کے چند عظیم سرمایہ داروں نے اعلان کیا تھا کہ ہم ایسی اسکیم تیار کر چکے ہیں، جس سے پندرہ سال کے اندر اندر سارا ملک خوش حال بن جائے گا۔ اس آخری منصوبے کو پڑھ کر مجھے اپنا تصور کرنا یاد ہے۔ میں نے ۱۹۴۶ میں سولہ سال بعد کا، یعنی ۱۹۶۲ کا تصور کیا تھا کہ ۱۹۶۲ میں ہندستان کا ایک ایک فرد خواندہ ہو گیا ہے۔ کوئی ہندستانی نہیں ہے، جسے کھانے، کپڑے، رہایش، اولاد کی تعلیم و تربیت اور اولاد کے مستقبل کی پریشانی ہو۔ زراعت پیشہ اپنی جگہ پیٹ بھرے ہیں۔ تجارت پیشہ اپنی جگہ سیر۔ دست کار، اہلِ سیف اور اہلِ قلم سب مطمئن ہیں اور سب یک زبان ہیں کہ ہم عوام کو اور چاہیے کیا تھا۔ اب چاہے انگریزوں کا بول بالا رہے، چاہے سرمایہ داروں کی جے ہو۔ ہمارے سرمایہ دار مزدور کو اپنے برابر لے آنے کی فکر میں بے چین ہیں تو پروردگار ان ہی کی فتح کیوں نہ کرے۔ انگریز تو غیر ہیں۔ انگلستان چلے جائیں گے۔ حاکم و محکوم کا فرق چند روز کی بات ہے۔ دنیا بدلنے والی ہے۔ دنیا کی ذہنیت بدلنے والی ہے۔ لیکن اسی وقت اخبار ریاست میں ایک خبر چھپ گئی کہ "پنجاب گورنمنٹ اپنے صوبے میں نئے جیل تعمیر کرنے کے مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کر رہی ہے، کیوں کہ اس صوبے کے جیلوں میں سولہ ہزار قیدیوں کی گنجایش تھی اور اب اُن میں پچیس ہزار قیدی ہیں۔ گورنمنٹ کا خیال ہے کہ جنگ کے بعد بے کاری بڑھے گی اور بے کاری کے باعث جرائم کا اضافہ ہوگا، لہٰذا جیلوں کے اضافے کی بھی ضرورت ہے۔"

منصوبے باندھنا ایسے لوگوں کا کام ہے، جن میں زندہ رہنے کی قوت، وائی ٹیلیٹی (VITALITY) بھرپور ہو۔ انسان بچپن اور جوانی میں جیسے جیسے منصوبے باندھتا ہے، بڑھاپے میں ویسے نہیں باندھ سکتا۔ چاق و چوبند قوموں کے منصوبوں اور مضمحل قوموں کے منصوبوں میں فرق ہوتا ہے۔ انگریز کے منصوبوں کو ہندو مسلمان دونوں نہیں پہنچے تھے۔

منصوبے حسبِ حیثیت اور حسبِ ہمت ہر شخص باندھتا ہے۔ حاکم اپنی شان کے مطابق، محکوم اپنی شان کے مطابق۔ امیر اپنی ہمت کے مطابق اور غریب اپنی ہمت کے مطابق۔

ایک زمانہ تھا کہ ہم مسلمانوں کے ارادے سے مُراد جُدا نہیں ہُوا کرتی تھی۔ اِدھر ارادہ کیا، اُدھر وہ چیز جس کا ارادہ کیا ہے ہاتھ جوڑے حاضر ہُوئی۔ ہمارے اِن صاحبِ عزم بزرگوں کے ظرف کا کبھی کبھی اللہ تعالےٰ امتحان بھی لے لیتا تھا اور منصوبہ پورا نہ ہونے دیتا تھا، تاکہ انھیں اس حقیقت کا احساس رہے کہ قصد اور ارادے مقصود اور مراد کو اللہ کے فضل اور کرم سے پاتے ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے: عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ۔ یعنی میں نے ارادوں کے پورا نہ ہونے سے اپنے رب کو پہچانا۔ منصوبوں کے ٹوٹنے سے مجھے پتہ چلا کہ انھیں پروان چڑھانے والا اور انھیں کامیاب کرنے والا میں نہیں ہوں، بلکہ اللہ ہے۔

منصوبہ بازی اچھی بات بھی ہے اور بُری بات بھی۔ جس کے دماغ میں کوئی منصوبہ نہیں ہے وہ مُردے کے مثل ہے، یا کالانعام ہے۔

ماہرِ نفسیات، مسٹر ولیم مولٹن نے تین ہزار آدمیوں سے سوال کیا تھا کہ آپ کا مقصدِ زندگی کیا ہے۔ دو ہزار آٹھ سو بیس نے جواب دیا کہ فی الحال تو بغیر کسی مقصد کے جی رہے ہیں۔ ایک سو اسّی نے مقصدِ زندگی بتایا تھا۔

ولیم مولٹن کا سوال اپنی زندہ قوم سے تھا، ہندستانیوں اور پاکستانیوں یا ایشیائیوں سے نہیں تھا۔ اُن سے سوال کیا جاتا تو چورانوے فی صدی کی بجائے سو فی صد جواب دیتے کہ ہم نے تو کاغذ کی ناؤ بہا کر چھوڑ رکھی ہے، کسی طرف بھی بہ جائے۔

ولیم مولٹن کے ہم قوموں نے اتنا اور کہا تھا کہ آپ نے توجہ دلائی ہے تو مقصدِ زندگی کو آیندہ ضرور سوچیں گے۔ انھوں نے مستقبل میں مقصدِ زندگی سوچنے کا وعدہ کیا تھا۔ انھیں بس "کل" کا انتظار تھا کہ "آج" گزرے اور "کل" آئے تو مقصدِ زندگی سوچیں، ہم ایشیائی "کل" کے بھی منتظر نہیں ہیں۔

سوچا صرف "آج" جا سکتا ہے، خیر کل بھی سہی، لیکن ہم تو نہ آج سوچنے پر آمادہ ہیں اور نہ کل سوچنے پر۔

منصوبہ بازی بُری اس اعتبار سے ہے کہ مقصدِ زندگی سوچیں یا نہ سوچیں، آج یہ کریں گے اور کل وہ کریں گے تو اکثر صاحبان سوچتے رہتے ہیں، مگر اُن کا سوچنا عموماً شیخ چلی کا سا سوچنا ہوتا ہے۔

اچھی اور بُری عادت

حضرت رابعہ عدویہؒ نے حضرت سفیان ثوریؒ جیسے بزرگ سے ایک دن فرمایا، آپ دنیا کے طالب نہ ہوتے تو واقعی اچھے آدمی تھے۔ حضرت سفیان نے کہا۔ مجھ میں دنیا کی طلب کیا دیکھ لی۔ فرمایا۔ آپ حدیثیں روایت کرنے کے بڑے شوقین ہیں۔ مُراد یہ تھی کہ گھڑی گھڑی حَدَّثَنَا حَدَّثَنَا کہنے والے کا جی چاہنے لگتا ہے کہ لوگ اُسے مسند پر بٹھا دیں۔

حضرت فضیلؒ فرمایا کرتے تھے کہ رات کی تاریکی میرے لیے خوشی لاتی ہے، میں سوچتا ہوں کہ اب میں ہوں گا اور میرا اللہ ہوگا۔ دن کی روشنی اس خوشی کو کھو دیتی ہے، خلقت مجھے میرے خالق سے غافل کر دیتی ہے۔

ایک بزرگ تھے، جو ہمہ وقت کُتب بینی میں مصروف رہتے تھے، یا قبرستان چلے جاتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ میں نے تنہائی سے زیادہ کہیں سلامتی نہیں دیکھی اور قبر سے بڑھ کر کوئی واعظ نہیں دیکھا اور کتابوں سے بڑھ کر کوئی مونس نہیں پایا۔

واقعی میل جول والے کے لیے غیبت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے اجتناب اور ریا و نفاق، یہ چند گناہ مُنھ کھولے رہتے ہیں۔ روز صبح مصمم ارادہ کیجیے کہ آج سے اللہ کی مرضی کے خلاف کام نہیں کروں گا، اور اللہ کی خوشنودی کا خیال رکھوں گا، اور روز رات کو سوتے وقت جائزہ لیجیے کہ ارادے پر کہاں تک عمل کیا تو جو گناہ نمایاں نظر آئیں گے، وہ یہی ہوں گے، غیبتیں کرنا یا کم از کم سننا۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے اجتناب اور ریا و نفاق۔

جس صحبت میں جا کر بیٹھے وہاں غیبتیں سُنیں۔ سُنتے سُنتے اپنا بھی جی چاہ گیا کہ دو چار غیبتیں تم بھی کر ڈالو۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اوّل تو کسی میں ہمت ہی نہیں، اور ہمت ہے تو اُن میں سے جو دیگراں را نصیحت خود را فضیحت کے مصداق ہیں، یا جو نصیحت کرتے ہیں تو ایسے بھونڈے پن سے کرتے ہیں جیسے ساس بہو کو کچوکے دیتی ہے۔

علےٰ ہٰذا مدارات میں ریا و نفاق دخل نہ پائے، یہ امر بھی دشوار ہے۔ دو آدمی آپ سے

ملتے ہیں، جو ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ آپ دو رُخی باتیں کیے بغیر دونوں کو راضی نہیں رکھ سکتے۔

میل جول کی ایک خرابی اور ہے، مال کی حرص پیدا ہو جاتی ہے۔ مال تو ملتا ملاتا نہیں، دین میں رخنہ پڑ جاتا ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص با اعتبارِ مال تم سے زیادہ ہو اُس کی طرف نظر اُٹھا کر مت دیکھو ورنہ جو نعمت اللہ نے تمھیں عطا فرمائی ہے وہ تمھاری نظروں سے گر جائے گی۔ قرآن مجید میں بھی ہے کہ ان (نافرمانوں) کے مختلف الاقسام لوگوں کو جو دولت و ثروت ہم نے دے رکھی ہے تم اپنی آنکھیں اُس (دولت و ثروت) کی طرف نہ دوڑاؤ۔ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ الخ

ایک مصیبت یہ ہے کہ صحبت کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ آپ محسوس نہیں کرتے، لیکن ملاقاتیوں کی اچھائیاں، برائیاں دل کے اندر جذب ہوتی رہتی ہیں ؎

صحبتِ صالح ترا صالح کُند
صحبتِ طالح ترا طالح کُند

دوسروں کی خُو، خصلت، عادت، اخلاق بچہ کتنی جلدی سیکھتا ہے۔ یہ بچّے ہی کی خاصیت نہیں ہے، بڑی عمر کے انسانوں کی بھی فطرت ہے۔ اس فطرت میں عمر کے ساتھ کمی بے شک آتی ہے، لیکن فطرت مٹتی نہیں ہے۔ اس فطرت کو دبانے کی ایک ہی ترکیب ہے کہ اللہ اور رسول سے اتنے متاثر ہو جائیے کہ اغیار کا اثر قبول کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے فرمایا، ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ انسان اپنا دین بچانے کے واسطے اس طرح چھپتا پھرے گا جس طرح لومڑی چھپتی پھرتی ہے۔ صحابہ نے پوچھا، یا رسول اللہ! وہ زمانہ کب آئے گا۔ فرمایا، جب روزی گناہ کیے بغیر نہیں ملے گی۔ اُس وقت گوشہ نشینی حلال ہے۔ اُس وقت انسان کا دین ماں باپ کے ہاتھوں خراب ہوگا، زن و فرزند کے ہاتھوں خراب ہوگا اور خویش و اقارب کے ہاتھوں خراب ہوگا۔ سب اُس سے ایسی چیزیں طلب کریں گے جنھیں ایمان سلامت رکھ کر وہ مہیا نہیں کر سکے گا اور اُس کا ایمان غارت ہو جائے گا۔

حضورؐ کی ایک اور حدیث ہے کہ بد لوگوں میں بیٹھنا ایسا ہے جیسے لوہار کی دوکان

میں بیٹھ گئے، اور کچھ نہ ہوگا تو کپڑوں کو دُھواں تو لگ ہی جائے گا اور نیک لوگوں میں بیٹھنا ایسا ہے جیسے عطار کی دوکان میں بیٹھ گئے کہ مشک ملے یا نہ ملے مشک کی خوشبو ناک تک ضرور پہنچ جائے گی۔

مستقل گوشہ نشینی کی تو اسلام نے اجازت نہیں دی ہے، لیکن گوشہ نشینی کا مقصد اگر بُری صحبت سے بچنا ہو تو گوشہ نشینی بُری صحبت سے یقیناً بہتر ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص کی صحبت تمھیں اللہ سے غافل کر دے اُس سے بچو۔

زبان پر قابو رکھنا

گوشہ نشینی اختیار کرتے وقت نیت یہ ہونی چاہیے کہ اوّل لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھنا ہے اور پھر لوگوں کے شر سے خود بچنا ہے۔ خود اپنے شر سے بچنے کے لیے ہفتے میں یا مہینے میں ایک دن مقرر کر لینا چاہیے یا روزانہ دن میں تھوڑی دیر، پابندیٔ وقت کے ساتھ مثلاً عصر اور مغرب کے درمیان کسی ایسی جگہ ہوا خوری کے لیے چلا جانا چاہیے جہاں کامل تنہائی ملے، یا گھر ہی میں عصر اور مغرب کے درمیان بولا نہ جائے، تو کم از کم زبان پر قابو رکھنے کی خاصی مشق ہو سکتی ہے۔ نوّے فی صدی گناہ زبان کا بے قابو پن کرایا کرتا ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :- جو شخص زبان کا استعمال اللہ کے احکام کے مطابق کرلے وہ آخرت میں مجھ سے اس قدر قریب ہوگا جس قدر ہاتھ کی انگلیاں آپس میں قریب ہوتی ہیں۔

زبان پر قابو رکھنے کی مشق یا اور روحانی مشقیں بالکل جسمانی ورزشوں کے مانند ہیں۔ جسمانی ورزشوں سے جسم کو فایدہ پہنچتا ہے اور رُوحانی مشقوں اور ورزشوں سے رُوح کو۔ ورزش اور ریاض ہم معنی الفاظ ہیں۔ ورزش اور ریاضت بذاتِ خود مقصود نہیں ہوتے مقصود جسم کا یا رُوح کا فایدہ ہوتا ہے ؎

لب بہ بند و چشم بند و گوش بند
گر نہ بینی سرِّ حق بر ما بخند

(حضرت امام غزالیؒ سے استفادہ)

اچھی صحت اچھی بیوی

واشنگٹن (امریکا) سے ایک ماہنامے کا نام جوگریفک میگزین ہے۔ اس میں جغرافیائی مضامین چھپتے ہیں۔ میرے دوست لطیف الرحمٰن صدیقی صاحب کے پاس یہ ماہنامہ آتا ہے۔ وہ کبھی کبھی مجھے دکھا دیا کرتے ہیں۔ ایک دفعہ جوگریفک میگزین میں حج بیت اللہ کے متعلق بڑا مبسوط اور باتصویر مضمون چھپا تھا۔ گھر بیٹھے حج کے تمام مناظر سامنے آگئے تھے۔ یہ مضمون امریکا سے کسی مسلمان طالب علم کو بھیج کر اور ہزار ہا روپیہ خرچ کر کے لکھوایا گیا تھا۔

حال میں میگزین کے بانی اور ایڈیٹر ڈاکٹر گلبرٹ پچپن برس خدمت میگزین انجام دینے کے بعد ریٹائر ہوئے ہیں، ریٹائر ہوتے وقت انھوں نے اپنے عملے کے سامنے تقریر کی تھی، اس کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔ پڑھنے کے لائق ہے۔ ایڈیٹر صاحب نے کہا:
"جب میگزین کا پہلا پرچہ شایع ہوا تھا تو خریدار اتنے کم تھے کہ پتے میں نے اپنے ہاتھ سے لکھے تھے، اور سارا پرچہ ڈاک خانے خود پہنچایا تھا۔ اب اشاعت اتنی ہے کہ برابر برابر الماریاں کھڑی کی جائیں اور کسی مہینے کے پرچوں کو ان میں رکھا جائے تو الماریوں کی قطار دس میل لمبی جائے گی۔"

"میری کامیابی کی بڑی وجہیں دو ہیں، ایک یہ کہ میں ہمیشہ تندرست رہا اور دوسری یہ کہ مجھے بیوی ایسی ملی جس نے میرے چاروں طرف سکون اور اطمینان کی فضا پیدا کر دی اور کام میں پورا ہاتھ بٹایا۔ میگزین کی ادارت سنبھالنے کے سال بھر بعد ہماری شادی ہوئی تھی۔ میگزین اس وقت مضمون نگاروں کو ہزار ہزار ڈالر تک معاوضہ پیش کرتا ہے۔ میگزین کی حالت نہایت مستحکم ہے۔"

زندہ قوموں کے اخبار اور رسالے ایسے ہوتے ہیں۔ جوگریفک میگزین نہایت ثقہ رسالہ ہے۔ ثقہ رسالے کی کروڑوں اشاعت ہے تو امریکا کے غیر ثقہ رسالوں کی اشاعت کتنی ہوگی۔ غیر ثقہ رسالے تو بھارت اور پاکستان میں بھی کامیاب ہیں۔

دوسری بات جو نوٹ کرلینے کی ہے وہ طبیعت کے مطابق جوڑے کا ملنا ہے۔ ایڈیٹر صاحب جوگریفک میگزین کو سکون و اطمینان کی فضا پیدا کر دینے والی اور کام میں ہاتھ بٹانے والی بیوی میسر نہ آتی تو میگزین اتنی ترقی نہیں کرسکتا تھا۔

میاں بیوی اور اسلام

میاں بیوی میں الفت و محبت کا ہونا اللہ کا احسانِ عظیم ہے، اللہ نے اسے بطور احسان جتایا ہے۔ وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝ (سورہ ۳۰۔ آیت ۲۱) تم (میاں بیوی) میں باہم اُلفت اور محبت رکھ دی (تاکہ تمھاری اُن کی اچھی طرح گزر بسر ہو)۔ لاریب اس میں سوچنے والوں کے لیے (اللہ کی قدرت کی) نشانیاں ہیں۔

میاں بیوی ہوتے ہی ایک دوسرے کے سکون و اطمینان کے واسطے ہیں۔ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا (سورۃ ۳۰۔ آیت ۲۱) اللہ کے نشانات (قدرت) میں سے (ایک) یہ (نشانی بھی) ہے کہ اُس نے تمھارے واسطے تمھاری ہی جنس کے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم اُن سے سکون (اور اطمینان) حاصل کرو۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں مشرک عورتوں اور مشرک مردوں سے رشتے کرنے کی اسی لیے ممانعت کی ہے کہ مسلمان اور مشرک ہم رنگ اور ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔ ایسے رشتوں کو اللہ جہنم قرار دیتا ہے، اور فرماتا ہے:۔ أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ (سورہ ۲۔ آیت ۲۲۱) وہ تمھیں جہنم کی طرف کھینچتے ہیں اور اللہ تمھیں جنت کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔

جن گھروں میں میاں بیوی ہم خیال اور ہم مذاق ہوتے ہیں، ان پر اللہ کی رحمت برستی ہے اور جن گھروں میں میاں بیوی بھٹیاروں اور بھٹیاریوں کی طرح جھگڑتے رہتے ہیں ان پر نحوست چھا جاتی ہے۔

پرانی اور نئی عمارت

وَلَوْ نَشَاءُ لَطَمَسْنَا عَلَىٰ أَعْيُنِهِمْ .... وَمَن نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۖ أَفَلَا يَعْقِلُونَ ۝ (سورہ ۳۶۔ آیات ۶۷۔۶۸) ہم چاہیں قرآن کی آنکھیں ملیٹ کر دیں۔ (پھر) یہ راستے کی طرف چلیں تو انھیں راستہ کیسے

نظر آئے۔ ہم چاہیں تو یہ جہاں ہوں، وہیں اِنھیں مسخ (اور تہس نہس) کر کے رکھ دیں۔ (پھر) یہ نہ آگے بڑھ سکیں اور نہ پیچھے ہٹ سکیں۔

(کیا اس قسم کے واقعات لوگوں کے سامنے نہیں ہیں کہ) جس شخص کی عمر ہم زیادہ بڑھا دیتے ہیں اُس کے طبعی حالات اُلٹے کر دیتے ہیں (اُس کے قوے ناتواں ہو جاتے ہیں اور وہ ترقی کی بجائے تنزّل کرنے لگتا ہے کیا کسی کے طبعی حالات ہم جوانی میں نہیں اُلٹ سکتے) کیا لوگ اتنی بات نہیں سمجھتے۔

بنانا اور بگاڑنا قطعی اللہ کے قبضے میں ہے، افراد کا بھی اور اقوام کا بھی۔ البتہ اللہ تعالےٰ بنوانا اور بگڑوانا افراد کو اور اقوام کو خود اُن کے اپنے ہاتھوں سے ہے۔ اللہ کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے افراد اور اقوام میں جان رہتی ہے اور اللہ کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے سے جان نکل جاتی ہے۔ وَ مَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

غیر مسلموں کے پاس خدائی قوانین کے نام سے خدائی قوانین نہیں ہیں، لیکن وہ نادانستہ طور پر تھوڑے سے خدائی قوانین کی پابندی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس خدائی قوانین کا خزانہ ہے، مگر اُنھوں نے خدائی قوانین سے منھ موڑ لیا ہے۔ تھوڑے سے خدائی قوانین کا نتیجہ غیر مسلموں کے ہاں دیکھ لیجیے۔ مسلمان اگر تمام خدائی قوانین کی پابندی کریں تو نتیجہ کتنا خوش گوار ہو۔

غیر مسلموں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ملازم آقازادے کو ہوا کھلانے کھلے میدان میں روزانہ جائے تو ملازم بھی بغیر ہوا کھانے کی نیت کے ہوا ضرور کھائے گا اور ہوا کھانے کا اثر آقازادے ہی پر نہیں پڑے گا، ملازم پر بھی پڑے گا۔

مسلمان مثل آقازادے کے ہیں کہ آقازادہ فقط ہوا نہیں کھاتا دوسری بہت سی نعمتیں اُسے ملتی ہیں تو اُس کی صحت ملازم سے بہتر ہونی چاہیے یا بدتر۔ علےٰ ہٰذا تمام خدائی قوانین کی پابندی کرنے والوں اور تھوڑے سے خدائی قوانین کی پابندی کرنے والوں کی بابت سوچ لیجیے لیکن مسلمان تو اب تھوڑے سے خدائی قوانین کی بھی پابندی نہیں کرتے۔

چند لیڈروں کی یاد

دلی میں میرا مکان اور مولانا محمد علی کا مکان ایک سڑک پر تھا۔ فیض بازار (دریا گنج) سے کوچہ چیلان کے اندر جائیے تو پہلے میرا مکان آئے گا، اور پھر مولانا محمد علی کا۔ میں جس کمرے میں بیٹھتا تھا، وہ سڑک کے کنارے تھا اور اس کے دروازے اور کھڑکیاں سڑک کی طرف کھلتی تھیں۔ گاندھی جی مولانا محمد علی کے ہاں تشریف لاتے تھے تو بالکل سامنے سے گزرتے تھے گاندھی جی کے ساتھ پٹیل اور راجندر پرشاد جیسے دوسرے درجے کے لیڈروں کا چھوٹا سا قافلہ ضرور ہوتا تھا جو ازراہِ ادب و تعظیم اُن کے پیچھے پیچھے چلتا تھا۔ برابر چلتے میں نے صرف حکیم اجمل خاں کو دیکھا ہے۔ پٹیل اور راجندر پرشاد کا شمار اُس وقت دوسرے درجے کے لیڈروں میں تھا۔ گاندھی جی کے ہم مرتبہ ہندو تو تھے پنڈت موتی لال نہرو۔ سی۔ آر۔ داس اور راج گوپال اچاریہ وغیرہ اور مسلمان ہم مرتبہ تھے مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا عبدالباری، مولانا محمود الحسن، مفتی کفایت اللہ اور مولانا ابوالکلام آزاد۔

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد اگرچہ عمر میں سب سے کم تھے اور بہت کم، لیکن اُنھوں نے اس قسم کا موقع کبھی نہیں دیا کہ دیکھنے والے اُنھیں گاندھی جی یا کسی صفِ اوّل کے لیڈر سے کم سمجھیں۔

مولانا محمد علی جب تک کانگریس میں رہے اُن کا اثر گاندھی جی پر ہر ہندو مسلمان لیڈر سے زیادہ تھا، مولانا ابوالکلام سے بھی زیادہ۔ مولانا ابوالکلام نے مولانا محمد علی کی جگہ مولانا محمد علی کے بعد لی ہے، مگر گاندھی جی مولانا محمد علی کو یا مولانا محمد علی گاندھی جی کو لیے لیے پھر سکتے تھے، مولانا ابوالکلام کو لے کر پھرنا آسان نہیں تھا۔ مولانا ابوالکلام کے سوا اتنی کم عمر کا کوئی شخص کانگریس کی صفِ اوّل میں پہلے دن نہیں پہنچا، حتےٰ کہ پنڈت جواہر لال نہرو کو پہلے دن صفِ اوّل میں جگہ نہیں ملی تھی اور خود گاندھی جی نے بہ تدریج صفِ اوّل میں جگہ پائی تھی۔

انگریزی اور امریکی سرپرستی

اس قسم کا صرف ایک واقعہ انگریزوں کے زمانے کا میرے علم میں ہے کہ کوئی لڑکا انگلستان پڑھنے گیا تھا اور اس کا وہاں سے واپس آنے کو جی نہیں چاہتا تھا، ماں باپ نے اُسے جبر کر کے بُلایا تھا، لیکن انگریز خُدا جانے چلتے وقت کیا جادو کر گئے ہیں کہ اب جو لڑکا انگلستان جاتا ہے، واپس نہیں آتا۔ بلکہ اَب تو انگریزوں کے ساتھ امریکنوں نے بھی ہمارے سر پر ہاتھ دھر دیا ہے، جو لڑکا امریکا پہنچتا ہے وہ امریکا کا ہو رہتا ہے اور ماں باپ سے ہمیشہ کے لیے جیتے جی چھُٹ جاتا ہے۔ ماں باپ غیر معمولی دولت مند ہوں تو دولت میں تو کشش ہے، باقی ماں باپ میں کشش نہیں رہی ہے۔ سولہ برس سے یہی سُن رہا ہوں کہ جو گیا، پلٹا نہیں۔

واعظوں کی فیسیں

دوسری بات نئی یہ دیکھی ہے کہ دین و مذہب سے بے گانگی اور بیزاری کے باوجود واعظوں کی فیسیں بے حد بڑھ گئی ہیں۔ ۲۶ اگست ۱۹۶۲ء کے نوائے وقت میں خبر چھپی ہے کہ موضع سالم (پھلرواں) کی یونین کونسل نے سرگودھا کے ایک عالمِ دین سے درخواست کی کہ ہمارے گاؤں تشریف لائیے اور یونین کونسل کو نیکی کی تلقین کیجیے۔ اُن عالمِ دین نے فرمایا۔ دو گھنٹے کی تقریر کا معاوضہ چار سو رُپے لیا کرتا ہوں، تم نیکی کی تلقین کرانی چاہتے ہو تو چار سو رُپے پیش کرو۔

مشہور ہے کہ کراچی میں واعظوں کی اس سے زیادہ فیسیں ہیں۔ صرف دو تین صاحبوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ فیس نہیں لیتے۔ وعظ سے پہلے یا وعظ کے بعد فیس پوچھی جاتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ رپیہ دینا ہی ہے تو فلاں دینی مدرسے میں دے دو۔ میرا خیال ہے کہ اس میں کچھ برائی نہیں ہے، اور واعظوں کو تھوڑا سا نذرانہ بھی ملے تو جائز ہے۔ واعظ آخر بیوی بچے رکھتے ہیں، بغیر رُپے کے کیسے زندگی بسر کریں، لیکن وعظ کی فیس مقرر کرنا اور چار چار سو، پانچ پانچ سو رُپے فیس مقرر کرنا نہایت نازیبا حرکت ہے۔ قدیم علما دین کو پیشہ نہیں بناتے تھے اور دینی علوم سے رپیہ نہیں کماتے تھے۔ رپیہ کمانے کے اور ذرایع

اختیار کرتے تھے - دین کی تعلیم کا معاوضہ لینا قدیم زمانے میں ناجائز سمجھا جاتا تھا - موجودہ حالات نے اُسے جائز ضرور کر دیا ہے، لیکن اتنا لینا چاہیے کہ ضروریات پوری ہو جائیں - رُوحانی معالجوں کو جسمانی معالجوں کی سطح پر نہیں آنا چاہیے، ورنہ وعظ کی محفلیں اور قوالی کی محفلیں ایک سطح پر آجائیں گی -

قرآنی ہدایت

فَاَیْنَ تَذْهَبُوْنَ ٥ . . . . . رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ٥ (سورہ ۸۱ آیات ۲۶ تا ۲۹) کدھر بہے جا رہے ہو - یہ (قرآن) سارے جہان کے لیے ہدایت نامہ (اور مکمل دستور العمل) ہے - جو تم میں سے راہِ مستقیم پر چلنا چاہے (اُسے قرآن راہِ مستقیم پر چلاتا ہے اور جسے راہِ مستقیم کی پرواہ نہ ہے اُسے ہدایت نہیں دیتا - وہ تو راندہ درگاہ ہے - اُس کو کج رَو رکھنے کا اللہ فیصلہ کر چکا ہے) تم (قرآن سے فایدہ اُٹھانا) جب ہی چاہو گے جب اللہ رب العالمین چاہے گا (کہ تم قرآن سے فایدہ اُٹھاؤ) اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ . . . . . وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ٥ (سورہ ۲ - آیات ۶ و ۷) - (اللہ نہ چاہے تو پیغمبر بھی انسان میں قرآن سے فایدہ اُٹھانے کی صلاحیت اور استعداد نہیں پیدا کر سکتے - جن لوگوں کی طبیعت مائل بہ الحاد ہے اور) جو (جبلّی سرکشی اور سوءِ تربیت کے سبب) اللہ کو (اور اللہ کے احکام کو) نہیں مانتے (اور ہمارے پیش کردہ راستے پر نہیں آتے) اُنھیں (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! تم نے (عذابِ الٰہی سے) ڈرایا (تو کیا) اور نہ ڈرایا (تو کیا - اُنھیں) دونوں برابر ہیں - وہ ایمان نہیں لائیں گے - اللہ نے اُن کے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر (غفلت کی) مُہر لگا دی ہے اور اُن کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے (حق و ناحق کو پہچاننے اور صحیح و غلط راستے میں فرق کرنے کی قابلیت اُن سے سلب کر لی گئی ہے) اُن کے واسطے تو سخت عذاب (تیار) ہے -

جس طرح جمادات میں بلور روشنی قبول کرتا ہے اور سنگِ موسیٰ روشنی قبول نہیں کرتا اور نباتات میں کھجور کا درخت پھل لاتا ہے اور سرو پھل پھول نہیں لاتا اور حیوانات میں طوطا انسانی بولیاں سیکھ جاتا ہے اور کوا کائیں کائیں سے آگے نہیں بڑھتا اسی طرح انسانوں میں بہ لحاظ اُفتادِ طبیعت بعض ایسے ہوتے ہیں جو ہدایت قبول کر لیتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ہدایت قبول نہیں کرتے -

طہارت کیا ہے

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ نے معلموں اور مرشدوں کو ہدایت فرمائی ہے کہ شاگردوں کو فقط کپڑے کی طہارت نہ سکھایا کرو، آنکھ، کان، زبان، ہاتھ اور تمام اعضا کی طہارت بھی سکھایا کرو۔ اگر شاگرد اعضا کی طہارت سیکھنے سے اُکتائے اور علم فتاوے اور علم کلام سیکھنے کی جلدی کرے تو سمجھو کہ وہ علم کا طالب نہیں ہے، جاہ کا طالب ہے۔ فَقَدِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوَاہُ۔ اُس نے اپنی خواہشات کو معبود بنالیا ہے۔ اُس کا شر بڑا خطرناک ہے۔ وہ شیطان سے لڑنا نہیں چاہتا، بلکہ حنفی ہے تو شافعی سے لڑنا چاہتا ہے اور شافعی ہے تو حنفی سے لڑنا چاہتا ہے۔ ایسے آدمی کو علم سکھانا راہزن کے ہاتھ میں تلوار دے دینا ہے۔ ایسے آدمی سے پناہ مانگنی چاہیے۔ جس عالم کا عمل قول کے مطابق نہ ہو وہ زہر قاتل ہے۔

امام غزالیؒ نے کہا

حضرت امام غزالیؒ ایک دفعہ مسلسل سال بھر گوشہ نشین رہے۔ اُن کا بیان ہے کہ سال بھر میں مجھے صرف تین باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ اللہ ایک ہے، دوسری یہ کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سچے تھے۔ تیسری یہ کہ قیامت برحق ہے۔

حضرت امام غزالی گوشہ نشینی سے قبل بھی امام تھے، مگر گوشہ نشینی سے قبل کا علم کچھ اور تھا اور گوشہ نشینی کے بعد کا علم کچھ اور۔ زبان سے ماننے اور دل سے ماننے میں فرق ہوتا ہے اور دل سے ماننے اور پوری کیفیت کے ساتھ ماننے میں مزید فرق ہو جاتا ہے۔ ماننے کی کیفیت ہر شخص کو میسر نہیں آیا کرتی، جسے میسر آئے وہی تو ولی اللہ ہے۔

حضرت امام غزالی فرماتے ہیں کہ علم دین پڑھے بغیر گوشہ نشینی اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ جاہل تو بیمار کی مثل ہے، بیمار اپنا علاج آپ نہیں کر سکتا۔ علم سکھانے والا بھی گوشہ نشین ہونے لگے تو دس دفعہ سوچے کہ اُس کے حق میں گوشہ نشینی بہتر ہے یا علم سکھائے جانا بہتر ہے۔ گوشہ نشینی میں علم نہیں سکھایا جا سکتا اور جاہل تو گوشہ نشینی میں عالم بن ہی کیسے سکتا ہے۔ جاہل تو بس اچھی صحبت کا متلاشی رہے اور بُری صحبت سے بچے۔ جاہل کا اندھا دُھند گوشہ نشینی اختیار کر لینا مستحسن فعل نہیں ہے۔

گوشہ نشینی

گوشہ نشینی میں جہاں اللہ تعالیٰ سے جی لگنا ممکن ہے، وہاں اللہ تعالیٰ سے جی اُچاٹ ہو جانے کا بھی امکان ہے۔ وسوسے آ آ کر گوشہ نشین کو تباہ کر سکتے ہیں۔

گوشہ نشینی کھیل نہیں ہے کہ ذرا بیوی بچّوں سے رُوٹھے اور گوشہ نشین ہو گئے۔ یہ تو بیوی بچّوں سے رُوٹھنا نہیں ہے اللہ سے رُوٹھنا ہے۔ جو شخص بیوی بچّوں اور جملہ خلقت کی جفا قفا پر صبر کرے اُس کا بڑا مرتبہ ہے۔ صبر کی ریاضت گوشہ نشینی سے بدرجہا افضل ہے، اور بیوی بچّوں کو بے سہارا چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کرنا تو گناہِ عظیم ہے۔ گوشہ نشینی فقط اُنھیں زیب دیتی ہے جو خلقت سے عارضی طور پر جدا ہوں تو اس جذبے کے ساتھ جدا ہوں کہ گوشہ نشینی سے اُس نور کا کوئی ذرہ حاصل ہو جائے جو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے غارِ حرا کی گوشہ نشینی میں پایا تھا۔ مستقل گوشہ نشینی تو ہمارے ہاں جائز ہی نہیں ہے۔ لَا رُھْبَانِیَّۃَ فِی الْاِسْلَامْ۔ انسان پیدا ہونے سے فایدہ کیا اگر انسان انسانوں کے دُکھ درد میں شریک نہ ہو اور انسانوں سے دُور جا بیٹھے۔ عارضی گوشہ نشینی اختیار کر کے بھی ثواب اور عذاب دونوں کمائے جا سکتے ہیں۔ گوشہ نشینی کی اہم ترین خرابیاں دو ہیں۔ ایک یہ کہ باہمی میل جول سے جو انسانی حقوق ادا ہُوا کرتے ہیں اُن سے گوشہ نشین محروم ہو جاتا ہے، دوسرے کبھی کبھی گوشہ نشین میں ایک جذبہ اُبھر آتا ہے کہ میں لوگوں کے پاس نہ جاؤں، لوگ میرے پاس آئیں۔ گوشہ نشینی بس بعض حالات میں ٹھیک ہے جس طرح بعض مجبوریوں کی وجہ سے نکاح نہ کرنا ٹھیک ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ انسان کو ملنے جُلنے میں بے حد محتاط رہنا چاہیے۔ ملنا جُلنا چھوڑا بھی نہیں جا سکتا اور ملنے جُلنے کے نقصانات سے بچنا بھی نہایت ضروری ہے۔

حضرت اسماءؓ اور ابن زبیرؓ

ہمارے جن بزرگوں نے ناحق کے آگے تادمِ مرگ سرِ تسلیم خم نہیں کیا، اُن میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بہت ممتاز ہیں۔ حضرت ابنِ زبیر کو بھی اس پلید شخص سے سابقہ پڑا تھا جس نے اسلامی نظام کا شیرازہ بکھیرنے کی بنیاد ڈالی تھی، یعنی یزید بن معاویہ۔

یزید حضرت ابن زبیر کو زیر نہیں کر سکا اور مر گیا، لیکن یزید کا ہم خاندان عبد الملک بن مروان تخت نشین ہوا تو اس نے چالیس ہزار فوج سے حضرت ابن زبیر پر چڑھائی کی۔ حجاج بن یوسف، مشہور ظالم و سفاک، فوج کا سپہ سالار تھا۔ حضرت ابنِ زبیر کے ساتھی اُس کے مظالم کی تاب نہ لا سکے اور گھبرا گئے۔ حضرت ابن زبیر اپنی والدہ حضرت اسما رضی اللہ عنہا کی خدمت میں آئے۔ حضرت اسما اُس وقت سَوْ سے اوپر تھیں۔ یہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وہ بیٹی ہیں، جنھوں نے انتہائی خطرہ مول لے کر حضور سرورِ کائنات ؐ اور حضرت ابوبکر رضؓ کو غارِ ثور میں کئی روز کھانا پہنچایا تھا۔ حضرت ابن زبیر رضؓ نے حضرت اسماء رضؓ سے عرض کیا۔ اماں! میرے ساتھیوں میں بھوک پیاس کی وجہ سے مقاومت کی طاقت نہیں رہی ہے۔ دشمن کہتا ہے۔ اب بھی اطاعت قبول کر لو تو اچھا سلوک کروں گا۔ آپ کے مشورے اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔ حضرت اسماء رضؓ کے سب بیٹا بیٹی مر چکے تھے اور زندگی کا یہ ایک ہی سہارا باقی تھے، مگر اسماء رضؓ نے فرمایا۔ بیٹا! حق کی خاطر لڑ رہے ہو تو کسی بات کی پرواہ نہ کرو۔ لڑو اور مر جاؤ۔ اطاعت کا کیا کام ہے اور معذوریوں کے کیا معنی ہیں۔ اور لڑائی حکومت حاصل کرنے کے شوق میں شروع کی تھی، تو تم بُرے آدمی ہو، تم نے اپنے تئیں بھی تباہ کیا اور اپنے ساتھیوں کو بھی تباہ کر دیا۔ اہل حق اِس بات کی فکر نہیں کیا کرتے کہ اُن کے مددگار کتنے ہیں اور کتنے اُن کا ساتھ دیتے ہیں۔ جاؤ تنہا لڑو اور موت کو لبیک کہو۔ اطاعت کا تصور بھی دل میں مت لاؤ۔

حضرت ابن زبیر نے عرض کیا۔ جان کی ہرگز پرواہ نہیں ہے۔ خیال صرف یہ ہے کہ میری لاش کا ناس بنایا جائے گا۔ ایک ایک عضو الگ کریں گے اور کتوں کو کھلائیں گے۔ آپ ان زیادتیوں کو کیسے دیکھ سکیں گی۔ حضرت اسما مسکرائیں اور بولیں۔ بیٹا! روح ہی تمھارے جسم میں نہ رہے گی تو پھر جسم کا جو چاہیں بنائیں۔ مجھے اِس سے اتنا دکھ نہیں ہوگا جتنا غیر حق کے آگے سر جھکانے سے ہوگا۔ حضرت ابن زبیر کھڑے ہو گئے اور میدانِ جنگ کی طرف چلے۔ حضرت اسما نے اُنھیں گلے لگایا اور پیار سے اُن کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا پیٹھ پر سخت سی چیز محسوس ہوئی۔ پوچھا، یہ کیا ہے؟ حضرت ابن زبیر نے عرض کیا۔ زرہ ہے۔ حضرت اسما نے فرمایا۔ تو ابوبکر کا نواسہ اور زبیر کا بیٹا ہو کر زندگی پر فریفتہ ہے۔ شہادت کے طالب کو زرہ کی کیا ضرورت ہے۔ زرہ پھینک ے اور بہادروں کی طرح مر جا۔ فرشتے

تیری روح حضورِ خداوندی میں پیش کرنے کے منتظر ہیں۔ حضرت ابنِ زبیر نے زرہ اُتار دی اور کشتوں کے پشتے لگا کر جامِ شہادت پیا۔ حجاج نے سر کاٹ کر عبد الملک کو بھیج دیا اور لاش لٹکا دی، اور خود حضرت اسما کے پاس پہنچا اور بولا: اسماء تم نے بیٹے کا حشر دیکھ لیا۔ حضرت اسماء نے فرمایا، ہاں دیکھ لیا۔ تو نے اس کی دنیا خراب کر دی اور اس نے تیری عقبیٰ بگاڑ دی۔

مسلمان حکومتوں کو ڈیفنس پر بے تحاشا روپیہ خرچ کرنے کی بجائے حضرت اسماءؓ جیسی عورتیں اور حضرت ابنِ زبیر جیسے مرد پیدا کرنے چاہئیں۔

علمائے حق اور حکمران

خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کے زمانے میں ایک بہت بڑے بزرگ تھے، حضرت ابو حازم رحمۃ اللہ علیہ۔ ایک دفعہ خلیفہ نے اُن سے پوچھا۔ بتاؤ، ہم موت سے کیوں گھبراتے ہیں۔ فرمایا، تم لوگوں نے دنیا کی رونق بڑھالی ہے اور آخرت ویران کر رکھی ہے رونق کی جگہ سے ویرانے کی طرف جاتے ہوئے ہر شخص گھبراتا ہے۔ خلیفہ نے پوچھا۔ لوگ حق تعالیٰ کے سامنے پہنچیں گے تو اُن کا کیا حال ہوگا۔ فرمایا۔ نیک اِس طرح آئیں گے، جیسے سفر ختم کر کے گھر آتے ہیں اور گھر والوں، عزیزوں اور دوستوں سے ملتے ہیں اور بد اس طرح آئیں گے، جیسے بھگوڑے غلام تھے اور پکڑ کر لائے گئے اور مالک کے رُو برو پیش کیے جا رہے ہیں۔ خلیفہ نے کہا، کاش میں جانتا کہ میرا حشر کیا ہوگا۔ فرمایا، قرآن مجید میں جواب موجود ہے، اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ۔ نیکو کار جنت میں ہوں گے اور گناہگار دوزخ میں۔ خلیفہ نے پوچھا۔ اللہ تعالےٰ کی رحمت کہاں ہوگی؟ فرمایا: قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ۔ نیکو کاروں کے قریب ہوگی۔

علمائے حق بادشاہوں کو اسی دبنگ پنے سے نصیحتیں کیا کرتے تھے، اور علمائے سُوء بادشاہوں کی حرکات کے شرعی حیلے تراشتے رہتے تھے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

حق بات کی تبلیغ کرنا اور تبلیغ کرنے میں تکلیف اُٹھانی پڑے تو اُس پر صبر سے کام

لینا مسلمان کی شان ہے اور ہمیشہ سچے مسلمانوں کا شعار رہا ہے، اور جو شخص حق بات اختیار کرنے کو کہے گا وہ ظاہر ہے کہ بُری بات کرنے سے روکے گا بھی، اسی کا نام اَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ ہے۔

ایک حدیث ہے، حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں، اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یا تو تمھیں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنا پڑے گا اور تم بدکار کا ہاتھ پکڑ لو گے اور اسے حق کی طرف پھیر دو گے، یا پھر اللہ کے قانونِ فطرت کا یہ نتیجہ ظاہر ہوگا کہ بدکاروں کا اثر تمھارے قلوب قبول کرلیں گے۔

تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ عہدِ صحابہ تک محدود نہیں رہا۔ بہت بعد کے مطلق العنان بادشاہوں کی بابت اس قسم کی روایتیں ملتی ہیں کہ وہ اہل اللہ سے خود درخواست کیا کرتے تھے کہ ہمیں کچھ نصیحت کیجیے۔

لیکن امر بالمعروف و نہی عن المنکر نماز روزے کے درجے کا فرض نہیں ہے، فرض کفایہ ہے۔ کسی جگہ ایک آدمی بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والا نہ رہے تو وہاں کے بے شک سارے مسلمان پکڑے جائیں گے، ورنہ حکم یہ ہے کہ ہر جگہ تم میں ایک جماعت ہونی چاہیے جو خیر کی دعوت دے، اچھے کاموں کے کرنے کو کہے اور بُرے کاموں کے کرنے سے روکے۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔

سارے کے سارے مسلمان اِس جماعت کے فرد کہلانے کے اہل بن جائیں تو سبحان اللہ، عہدِ صحابہ میں یہی صورت تھی، مگر آجکل یہ صورت ممکن نہیں ہے۔ غالباً امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو فرض کفایہ آجکل ہی کے سے زمانے کا خیال کرکے قرار دیا گیا، کیوں کہ اہلیت کے بغیر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض اپنے ذمّے لے لینا ایسا ہے جیسے نادان بچّے نے اُسترا اُٹھالیا، یا کوئی بے عقل شراب کے دھبّے کو نجس پانی سے دھونے لگا۔ زبان میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیئے اور سخت گیری اور سختی تو فقط اسلامی حکومت کے مقرر کردہ محتسب ہی کر سکتے ہیں۔

صحابہ ایک دوسرے کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر اس طرح کیا کرتے تھے جس طرح طالب علم مل کر اُستاد کا بتایا ہوا سبق دوہراتے ہیں اور امتحان کے لیے تیار ہوتے

ہیں۔ غیر اسلامی قوانین کی تعمیل کرانے میں جتنی سخت گیری اور سختی کی ضرورت پڑا کرتی ہے اُتنی اسلامی قوانین کی تعمیل کرانے میں نہیں پڑتی۔ سچے مسلمان اسلامی قوانین کی تعمیل کو ثواب سمجھتے ہیں۔

غیر سرکاری احتساب بالکل دو دوستوں کا سا ہونا چاہیے، بلکہ آپس میں طے ہی کیوں نہ کر لیا جائے کہ ہم ایک دوسرے کو صحیح راستے پر چلائیں گے اور بُرے راستے سے بچائیں گے اس صورت میں یہ شرط قطعی ضروری نہیں رہتی کہ انسان جس بات کی تلقین کرے اس پر خود پورا عامل ہو، ہاں یہ شرط ضروری ہے کہ اخلاق اور اخلاص سے تلقین کی جائے اور نفسانیت اور مشیخت کی چھینٹ نہ پڑنے پائے۔ تلقین کرنے والا یہ دعوے نہ کرے کہ میں معصوم ہوں، وہ تو یہ کہے کہ میں نے تمھیں راستہ دکھایا تم مجھے راستہ دکھاؤ۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو نیکی کرنے کو کہتے ہیں اور بدی کرنے سے روکتے ہیں۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے صحابہ نے دریافت کیا کہ ہم خود کسی بات کے پورے پابند نہ ہوں تو اُس کے لیے دوسروں سے کہیں یا نہ کہیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ ضرور کہو، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اپنے آپ بھی تو نیکی ہے۔

محتسب اور احتساب

معصوم انبیا کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ بعض احتساب ایسے ہیں کہ فاسق پر بھی واجب ہیں۔ مثلاً فاسق دیکھے کہ چند آدمی فساد کرانے کے درپے ہیں تو اُسے یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ میں فاسق ہوں، انھیں کیسے سمجھاؤں۔ نہیں وہ ضرور سمجھائے۔ ویسے اچھا یقیناً یہی ہے کہ محتسب کے اعمال اچھے ہوں اور محتسب زبان اور قلم سے زیادہ اپنے کردار سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرے۔

احتساب کے لیے ٹوہ میں رہنا درست نہیں ہے۔ چھُپ چھُپ کر عیب دیکھنے نہیں چاہئیں، یا پڑوسیوں سے نہیں پوچھنا چاہیے کہ فلاں شخص میں کیا فلاں عیب ہے۔ عیب محتسب کے علم میں سیدھے سبھاؤ، بغیر تجسّس کے آجائے تب ہی احتساب کیا جائے۔ حضور سرورِ کائنات

فرماتے ہیں کہ مجھے لوگوں کے دل چیر کر دیکھنے اور لوگوں کے بطون کے پیچھے پڑنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔

مسلمانوں کے مسلّمہ فرقوں میں جو مختلف طریقے برتے جاتے ہیں، اُن پر بھی ایک فرقے والا دوسرے فرقے کا احتساب نہیں کر سکتا، کیوں کہ اس سے فتنہ پیدا ہوتا ہے۔ علیٰ ہٰذا غیر مسلموں کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے میں نفسانیت کی آمیزش گناہ ہے بلکہ مسلمانوں کو چراغ، لیمپ، بجلی کے قمقمے کی طرح روشنی پہنچایئے تو غیر مسلم کے واسطے آفتاب و ماہتاب جیسے فیاض بن جایئے۔ للّٰہیت کی حدود سے باہر قدم نکالنے کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ نفسانیت کے شمول کے ساتھ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنا عذاب لینا ہے اور للّٰہیت کے ساتھ احتساب کرنے میں اگر جان بھی جاتی رہے تو جاتی رہے۔ احتساب کے آداب میں صبر شامل ہے۔ جو شخص رنج و مصیبت میں صبر نہیں کر سکتا وہ احتساب نہیں کر سکتا۔

آجکل نہ احتساب کرنے والے احتساب کرنا جانتے ہیں اور نہ احتساب برداشت کیا جاتا ہے۔ اچھّے زمانے میں لوگ احتساب سے ممنون ہُوا کرتے تھے۔ آپ میں سے بہت سوں نے دیکھا ہوگا کہ گلی کوچوں کے بزرگ چھوٹوں کو غلطی پر ٹوکتے تھے تو چھوٹے اُن کی بات سر جھکا کر سنتے تھے، اور احتساب کا طریقہ یہ تھا کہ مثلاً کوئی شخص مسجد میں آنا چھوڑ دیتا تو نمازی اُس کے گھر جاتے تھے اور بس اتنا کہتے تھے کہ آپ کئی وقت سے مسجد میں نہیں تشریف لائے۔ طبیعت کیسی ہے۔ تمام اسلامی شعاروں کی طرح امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا رنگ بھی بہ تدریج بدلا ہے۔

احتساب کی خوبی یہ ہے کہ جس کا احتساب کیا جائے وہ سمجھے کہ میرا مخلص مجھے انتہائی دلسوزی کے ساتھ سمجھا رہا ہے۔ کسی نے خلیفہ مامون الرشید عباسی سے سخت لہجے میں احتساب کیا تھا۔ خلیفہ نے فرمایا: تم سے بہتر شخص (حضرت موسیٰ علیہ السّلام) کو مجھ سے بد تر شخص (فرعون) کے پاس بھیجتے وقت اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی تھی کہ فرعون کو نرمی سے سمجھانا۔ فَقُوْلَا لَہٗ قَوْلاً لَّیِّنًا۔

کمانا اور خرچ کرنا

ہماری جان ہی ہماری ملکیت نہیں ہے تو ہمارا مال ہماری ملکیت کیسے ہو سکتا ہے

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ہمارے پاس جو کچھ ہے اُس کا مالک اللہ ہے۔ ہم جان و مال اللہ کی راہ میں خرچ کریں تو احسان کیا ہے۔ مال تو مرنے کے بعد عارضی ملکیت بھی نہیں رہتا اور ساتھ نہیں جاتا۔ نیز جیتے جی بھی لوگ مفلس ہو جاتے ہیں اور تیسری نسل تک عموماً مال ویسے ہی ٹھکانے لگ جاتا ہے۔ لہٰذا مال کا اللہ کی راہ میں خرچ کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے، مگر اللہ کا کرم ملاحظہ کیجیے، اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں، یعنی اپنے حکم کے مطابق اور اپنی مخلوق پر خرچ کرنے کو قرض سے تعبیر فرماتا ہے اور کہتا ہے: مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ...... وَلَہٗٓ اَجْرٌ کَرِیْمٌ (۲۷/۵۷) کون ہے ایسا، کہ اللہ کو قرض دے (مگر سودی قرض نہیں) قرض حسنہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت یہ خیال دل میں نہ لائے کہ اس کا بڑھ چڑھ کر نفع حاصل ہوگا، یہ سوچے کہ اللہ کا ہے، اللہ کے حضور پیش کر رہا ہوں) پھر اللہ (خود بغیر تمہاری طلب کے) اُسے (دنیا میں) دوگنا کر دے گا، اور (عقبےٰ میں) ثواب (جو) ملے گا اور عزت افزائی (جو) ہوگی (سو الگ)۔

ثواب اور عقبےٰ کی عزت ظاہر ہے اہل ایمان کا حصّہ ہے، لیکن دُنیا میں مال کا مضاعف در مضاعف ہونا ایمان کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ قانون الٰہی ہے، سب کے لیے عام۔

دیوان چند کی مثال

نئی دلی بنانے والوں میں ایک شخص دیوان چند تھا، پنجاب کا باشندہ، بہت تھوڑی سی پونجی لے کر دلی پہنچا اور چھوٹے چھوٹے ٹھیکے لینے شروع کیے۔ ٹھیکوں کے نفع کا پچیس فی صد وہ خیرات فنڈ میں ڈال دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے اتنا عروج بخشا کہ تھوڑی سی پونجی کروڑوں رُپے ہو گئی۔ دیوان چند کی ایک عظیم یادگار دیوان ہال چاندنی چوک کے نکڑ پر، لال قلعے کے سامنے میں نے دیکھی ہے اور نہ جانے چار آنے فی روپیہ سے کتنی اور عمارتیں وقف کی ہوں گی اور کتنا روپیہ نقد خیرات کیا ہوگا۔

"کنجوس" ہندوؤں میں اِس طبیعت کے دولتمند بکثرت ہیں، اور اہل مغرب کے

ملحدوں میں تو بے شمار ہیں، البتہ "شاہ خرچ" مسلمانانِ پاکستان میں مرحوم باوانی کے سوا مجھے کسی کا نام معلوم نہیں ہے۔ باوانی سُنتا ہوں کہ کمانے میں بھی محتاط تھے اور خرچ سچے مسلمانوں کی طرح کرتے تھے۔ اور بھی ضرور ہوں گے مگر زیادہ قطعی نہیں ہیں۔ حالاں کہ مسلمان کی شان یہ ہونی چاہیے کہ یَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ... ...... ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۵۷/۱۲) قیامت کے دن تم دیکھو گے کہ مومنین اور مومنات (کے خیر خیرات) کی روشنی ان کے آگے آگے اور اُن کے دائیں (بائیں) دوڑتی ہوئی چلتی ہے اور اُنھیں خوش خبری دی جاتی ہے کہ تمھارے واسطے اب باغ ہی باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ ان میں تم سدا سدا رہو۔ (مسلمانو!) بڑی کامیابی یہی ہے (کہ اللہ کے روبرو تم سرخرو جاؤ)۔

حضرت عمرؓ کی عظمت

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وفات پا گئے اور خلافت کا سوال اُٹھا تو حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے لیے اشارے اور کنائے سے بھی کوشش نہیں کی، بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام پیش کر دیا کہ اُنھیں خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین منتخب کرو۔ حضرت عمرؓ کا مرتبہ حضرت ابوبکرؓ سے کم نہیں تھا۔ حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ کم عمر بھی نہیں تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کا جلد انتقال ہو گیا، ورنہ شاید حضرت عمرؓ کو خلافت ملتی ہی نہیں۔ اُن کی خلافت کی نوبت نہ آتی۔

حقیقت یہ ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے ہم نشینوں کی تربیت ایسی فرمائی تھی کہ اُنھیں دوسروں کے بڑھانے میں مزا آتا تھا۔ وہ ایثار کر کے خوش ہوتے تھے، اعزاز کے پیچھے پیچھے پھر کر خوش نہیں ہوتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ تو عمر فاروقؓ ہیں، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا حال کیا نہیں پڑھا۔ اُن کو جب یہ خبر ہوا ہے کہ چچا نے اپنے بیٹے کی بجائے مجھے جانشین تجویز کیا ہے تو گھبرا گئے تھے اور چاہتے تھے کہ فیصلہ کسی طرح بدلوا دوں اور فیصلہ نہیں بدلا تو منبرِ خلافت پر اُنھیں زبردستی اور گھسیٹ کر بٹھایا گیا تھا۔

حضرت عمر فاروقؓ کی ذہنیت کا اندازہ اُس واقعے سے بھی ہوتا ہے کہ زندگی کی اُمید نہ رہی اور حضرت نے کہا کہ میرے نزدیک فلاں فلاں اس قابل ہیں کہ ان میں سے کوئی خلیفہ ہو

لوگوں کے توجہ دلانے کے باوجود ابنِ عمر کا نام اُس فہرست میں شامل نہیں فرمایا بولے کہ میں تو خلافت کے حساب کتاب سے نمٹ جاؤں تو اللہ کا کرم ہے بیٹے کو میں امتحان میں ڈالنا ہی پسند نہیں کرتا۔

حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہ کی بابت جو صاحبان سوچتے ہیں کہ انھیں خلیفہ اول نہ بننے کا رنج تھا وہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم نشینوں کی ذہنیت سے واقف نہیں ہیں۔ حضرت خالد بن ولید کمانڈری سے معمولی سپاہی کے درجے پر اُتار دیے گئے تو انھوں نے تو بُرا نہیں مانا تھا، حضرت علیؓ جن کی عمر حضور کی زیرِ نگرانی گزری تھی خلیفہ نہ ہونے کا بُرا مانتے، میری عقل میں تو بات آتی نہیں۔

خلفائے راشدین خلافت کو بڑی ذمّہ داری کا کام سمجھتے تھے، انھوں نے خدمت کے جذبے پر حکومت کے جذبے کو کبھی غالب نہیں کیا۔ اُن کی زندگیاں دیکھیے۔ بیت المال سے عیش کرتے کہیں دکھائی دیتے ہیں؟ حکومت کا نشہ تو اُس وقت چڑھتا ہے جس وقت حاکم خیال کرتا ہے کہ میرا ہاتھ پکڑنے کی کسی میں طاقت نہیں ہے۔ خلفائے راشدین کے پیشِ نظر ہاتھ پکڑنے والا ہر آن رہتا تھا۔ خلفائے راشدین نے اللہ کو فراموش نہیں کیا تھا اور اُن حضرات کو اپنے گرد جمع رکھا تھا، جن سے توقع تھی کہ ہم غلطی کریں گے تو یہ غلطی بتانے میں ہچکچائیں گے نہیں۔

خلفائے راشدین جیسی اسلامی حکومت ہو تو اپوزیشن پارٹی کی ضرورت نہیں پڑتی، صرف مخلص مشیروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ پارٹیاں غیر اسلامی یا فرضی اسلامی حکومتوں میں البتہ ضروری ہیں، اور یقیناً ضروری، ورنہ اسلامی حکومت میں تو اسلام ہی خود پارٹی ہے۔ ایک پارٹی کفر اور ایک پارٹی اسلام۔

میاں بشیر احمد اور دہلی والے

میاں بشیر احمد جو لیاقت علی خاں کے زمانے میں پاکستان کی طرف سے سفیر بنا کر ترکی بھیجے گئے تھے، جب بیرسٹری پاس کر کے لاہور واپس پہنچے تو انھوں نے بیرسٹری کا پیشہ اختیار نہیں کیا، بلکہ ہمایوں کے نام سے ایک ماہوار رسالہ نکالا، ہمایوں اُن کے والد میاں شاہ دین (جج ہائی کورٹ، پنجاب) کا تخلص تھا۔ ہمایوں جاری کر کے میاں بشیر احمد دلّی تشریف

لائے اور مجھ سے بھی ملنے آئے۔ باتیں کرتے کرتے فرمانے لگے۔ میں چاہتا ہوں کہ دلّی والوں کو دیکھوں۔ غالباً دلّی کا یہ پہلا سفر تھا۔ میں نے کہا۔ بالکل ٹھیک جگہ دلّی والوں کو دیکھنے کی خواہش کی ہے۔ کھڑکی سے سر باہر کر لیجیے اور سڑک پر نظر رکھیے۔ جامع مسجد سے دلّی دروازے تک دھوبیوں، سقّوں، مچھیروں اور چماروں، حلالخوروں کے کٹھرے بھی بہ کثرت ہیں اور جامع مسجد سے دلّی دروازے تک ٹھیٹ دلّی والے بھی بے شمار ہیں۔ متوسّلینِ قلعہ سے زیادہ دلّی والا کون ہو سکتا ہے۔ یہاں متوسّلین قلعہ ہی نہیں رہتے، خود اہلِ قلعہ یہیں ہیں اور صرف یہیں ہیں۔ اِدھر کا حصّہ چوں کہ قلعے کے قریب تھا، ۱۸۵۷ء کے بعد شہزادے یہیں آباد ہو گئے تھے۔ اب سڑک پر نظر رکھیے (اور ذرا سے مبالغے کے ساتھ میں نے کہا) جو مسلمان شیروانی پہنے گزرے، اُسے سمجھ لیجیے کہ خالص دلّی والا نہیں ہے۔ مفتی کفایت اللّٰہ دکھائی دیں تو اُن کا اصلی وطن شاہجہان آباد کب ہے شاہجہان پور ہے۔ مسٹر آصف علی دکھائی دیں تو وہ بے شک دلّی میں پیدا ہوئے اور دلّی میں پلے بڑھے، مگر اُن کی نانماں دلّی کی تھیں اور نہ آبا دلّی کے تھے۔ میرے جسم پر بھی شیروانی ہے، مجھے اپنے متعلق شبہ ہے کہ میری دہلویت میں کہیں نہ کہیں نقص ہوگا۔

اِس سڑک پر سے دھوبی، سقّے، مچھیرے، چمار، حلالخور اور ٹھیٹ دلّی والے سب ہی گزریں گے۔ جنھیں آپ چماروں اور حلالخوروں سے زیادہ خستہ حال اور دھوبی، سقوں اور مچھیروں سے زیادہ مضمحل پائیں، بس وہ ٹھیٹ دلّی والے ہیں، بادشاہوں کی اولاد اور امیروں وزیروں کی اولاد۔ ان کی دوسری پہچان مگر اچھی اور دل خوش کُن ہے۔ ٹھیٹ دلّی والے بولیں گے تو مُنھ سے پھول جھڑیں گے۔ دلّی کے دھوبی، سقّے، مچھیرے، چمار اور حلالخور اُن جیسی زبان نہیں بول سکتے۔ تھوڑے سے شہزادے بستی حضرت نظام الدین میں جا بسے تھے، خواجہ حسن نظامی نے اُن ہی کے بچّوں سے زبان سیکھی ہے۔

شاہجہاں نے دلی بساتے وقت تھوڑی سی پُرانی دلّی بھی اپنی دلّی میں شامل کی تھی وہ تھوڑی سی پُرانی دلّی اِدھر ہی ہے۔ کلاں مسجد اور رضیہ سلطانہ کی قبر وغیرہ شاہجہانی فصیل کے اندر ہیں۔ لہٰذا اِدھر فقط شاہجہاں کے زمانے کے لوگوں کی اولاد نہیں ہے، پٹھانوں کے زمانے کے لوگوں کی اولاد بھی ہے۔ مال دار ہندو اور مال دار مسلمان شہر کے وسط میں آباد ہیں اور غریب مدان شہر کے

کناروں پر پڑے ہیں۔ فصیلوں کے قریب غریب مسلمانوں ہی کی آبادی ہے۔ شہر کے اس کنارے
مرزا مظہر جانِ جاناں، خواجہ میر درد، حکیم مومن خاں مومن، سر سید احمد خاں کی قسم کے حضرات
نمودار ہوئے لیکن وہ بھی مالدار نہیں تھے۔

مسلمان اور مسلمان

ایک تو ہوتا ہے مسلمان، جو اللہ کو مانتا ہے اور اللہ کے پاس واپس جاکر حساب دینے
کو مانتا ہے، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے اللہ کے ضابطوں
قاعدوں کی پابندی کرتا ہے۔ ایک ہوتا ہے کافر، جو اللہ کے متعلق دل سے باتیں گھڑتا
ہے اور اچھائی برائی اور نیکی بدی کا معیار خود بناتا ہے۔ اور ایک ہوتا ہے منافق، خدا پرست
کی بجائے موقع پرست، یہ مسلمانوں سے فایدہ اٹھانے کے لیے اپنے تئیں مسلمان کہتا
ہے، حقیقتاً مسلمان نہیں ہوتا ہے۔ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا ج
وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ لا قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ لا إِنَّمَا نَحْنُ
مُسْتَهْزِئُونَ ۝ (سورہ ۲۔ آیت ۱۴) یہ جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں،
ہم مسلمان ہیں، اور جب اپنے شیطانوں کے درمیان تنہا بیٹھتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمھارے
ساتھ ہیں، مسلمانوں سے تو ہم تمسخر کیا کرتے ہیں۔ اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ
فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝ (سورہ ۲۔ آیت ۱۵) (منافق کیا تمسخر کریں گے) اللہ
نے انھیں خود فریب میں مبتلا کر دیا ہے۔ اللہ (ڈھیل دے دے کر) ان (عقل کے اندھوں)
کی سرکشی میں اضافہ کرتا رہتا ہے (اور) یہ بھٹکتے ہیں۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا
الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ ص فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا
مُهْتَدِينَ ۝ (سورۃ ۲۔ آیت ۱۶) یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے ہدایت کے بدلے
گمراہی مول لی ہے۔ (اللہ کے دیے ہوئے ضابطۂ حیات کو چھوڑ کر خود غرض اور نفس پرست
انسانوں کے ساختہ ضابطوں کو اپنا لیا ہے) لیکن ان کی تجارت نفع آور نہیں ہوئی اور (خالی
زبانی ایمان کا اقرار کرنے سے) انھیں (کوئی) راستہ (بھی) نہیں ملا۔ (دنیا میں خوار ہیں اور آخرت
میں تباہ ہوں گے۔ دنیا میں بھی دوغلے لوگوں کی کیا عزت ہو سکتی ہے۔ یہ کافروں سے بدتر ہیں)
مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ج فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ

ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ۝ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ (سورہ ۲- آیات ۱۷- ۱۸) منافقوں کی حالت اُس شخص جیسی ہے جس نے اندھیری رات میں جنگل کا راستہ دیکھنے کی غرض سے) آگ جلائی اور جب آگ نے اُس کے اِردگرد روشنی کردی (اور راستہ نظر آنے کو ہُوا) تو اللہ نے روشنی کو بجھا دیا اور اُنھیں اندھیرے (کے اندھیرے) میں رکھا (تاکہ جنگل میں بھٹکتے پھریں)۔ اب اُنھیں کچھ نہیں سُوجھتا (منافقوں نے کلمہ تو پڑھ لیا، کلمے کی روشنی اُنھیں میسّر نہیں آئی۔ روشنی میسّر آتی، تب ہی تو آنکھوں سے کام لیتے مگر) یہ (فقط آنکھوں کے اندھے نہیں ہیں، دل کے) بہرے، گونگے اور اندھے (بھی) ہیں (اِن میں نہ حق بات سننے کی صلاحیت ہے نہ حق بات کہنے کی اور نہ حق بات دیکھنے کی۔ یہ گمراہی سے راہ ہدایت کی جانب کیسے رُخ کر سکتے ہیں) یہ (راہِ ہدایت کی جانب) نہیں لوٹیں گے۔ (اِن سے راہ پر آنے کی توقع فضول ہے)۔ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (سورہ ۲- آیات ۱۹- ۲۰) یا منافقوں کی مثال ایسی سمجھو کہ آسمان سے زور کی بارش ہو رہی ہے، مگر گھنگھور گھٹا کے ساتھ (رات کا) اندھیرا بھی چھا گیا ہے اور گرج اور بجلی (کی چمک اتنی ہولناک) ہے کہ لوگ موت کے ڈر سے کڑک کے مارے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لیتے ہیں۔ (اسی طرح منافق دیکھتے ہیں کہ اسلام کے فیضان نے مسلمانوں کو ہرا بھرا کر دیا ہے تو سوچتے ہیں کہ اپنے تئیں مسلمان کہے جاؤ اور احکامِ خداوندی کی کڑک سنتے ہیں تو گھبرا اٹھتے ہیں کہ اِن سے کیوں کر نمٹیں، لیکن اللہ کی گرفت سے وہ بچیں گے نہیں) اللہ اُنھیں چاروں سمت سے گھیرے ہُوئے ہے، قریب ہے کہ اُن کی آنکھوں کو بجلی اُچک لے جائے۔ بجلی جب اُن کے سامنے چمکتی ہے تو اُس کی روشنی میں یہ چلنے لگتے ہیں (یعنی جب فایدے کی شکل دیکھتے ہیں تو مسلمان بن جاتے ہیں) اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے (یعنی امتحان کا وقت آتا ہے) تو کھڑے رہ جاتے ہیں۔ اللہ اگر چاہے تو انھیں کانوں اور آنکھوں سے (قطعی) محروم کر دے۔ (ابھی تو اسلام کے معاملے میں بہرے اور اندھے ہیں، پھر ہر معاملے میں بہرے اور اندھے ہو جائیں) اللہ ہر بات پر قادر ہے۔

محترم ناظرین! پہلے بھی ایک دو دفعہ لکھ چکا ہوں کہ قرآن مجید کی آیات کا تاثر، جو کبھی کبھی پیش کیا جاتا ہے، اُسے ہمیشہ تاثر ہی سمجھ کر پڑھیے گا۔ ترجمہ نہ سمجھیے گا۔ (د احدی)

حقیقی اقتدار کس کا ہے

ایک شادی کی تقریب تھی، سکندر مرزا اور حسین شہید سہروردی اُس میں مدعو تھے۔ انتظام یہ کیا گیا تھا کہ جس وقت سکندر مرزا اور سہروردی دہلیز پر قدم رکھیں، ٹھیک اُس وقت قومی نغمہ بجایا جائے تاکہ دونوں رُک کر کھڑے ہوں اور باراتی اُٹھیں اور وہ باراتیوں کو اچھی طرح دیکھ سکیں اور قومی نغمہ دونوں کی تعظیم بھی کرا دے، کوئی باراتی بے پرواہی سے بیٹھا نہ رہے۔

پہلے سکندر مرزا آئے، اور جب سکندر مرزا تھوڑی دیر ٹھہر کر واپس چلے گئے تو سہروردی تشریف لائے۔ قومی نغمہ بجانے والا بینڈ آنے جانے والوں کی نظروں سے ایسا پوشیدہ تھا کہ سکندر مرزا اور سہروردی بینڈ کی آواز سُن کر متحیر ہوئے۔

سکندر مرزا اُس زمانے میں کوس لِمَنِ الْمُلْک بجا رہے تھے، اور سہروردی وزیرِ اعظم تھے۔ دونوں کو اپنی عظمت کے اظہار کے اِس سے بڑھ کر مواقع روز ملتے ہوں گے لیکن میرے لیے نظارہ عجیب و غریب تھا۔

خیر میں نہ سکندر مرزا کو جانوں اور نہ سہروردی کو، مجھے تو قرآن مجید میں لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (سورہ ۵۷، آیت ۲) پڑھتے پڑھتے مندرجہ بالا واقعہ یاد آگیا۔ آیت کا مفہوم ہے کہ آسمان و زمین کا مالک حقیقی اللہ ہے (معمولی انسانوں کو ہی نہیں بادشاہوں کو) اللہ پیدا کرتا ہے اور موت دیتا ہے، (تختِ بادشاہت کے اوپر بٹھاتا ہے اور تختِ بادشاہت سے نیچے اُتارتا ہے) اور اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

سکندر مرزا آجکل پاکستان سے اور اہلِ پاکستان کے دلوں سے دور ہیں۔ سہروردی کراچی میں ہیں، مگر بحیثیت قیدی[1]۔ شاید رہا ہو جائیں اور دوبارہ عروج پائیں۔ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کو یوں ہی چڑھاتا اور اُتارتا رہتا ہے۔ کاش انسان اِس سے سبق حاصل کریں۔

---

[1] نوٹ: قرآنی وقت کا لکھا ہوا ہے جب سہروردی جیل میں تھے۔ اب وہ آزاد ہیں۔ میں تاثرات نوٹ وقت کو لکھنے میں دو دو فقرے بھیجتا ہوں، لیکن لکھتا رہتا ہوں ہر روز۔ تاثرات کا اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ انشاء اللہ میرے مرنے کے بعد بھی کسی پرچے میں یہ سلسلہ کچھ عرصہ چلے گا۔ یہ تاثر سہروردی صاحب کی رہائی سے قریباً مہینہ بھر پہلے لکھا گیا تھا۔ (ماجدی)

الف لیلہ میں ہے کہ خلیفہ نے کسی شخص کو بے ہوشی کی دوا سنگھا کر اپنے ہاں اُٹھوا بلایا تھا اور اُسے کئی دن بادشاہوں جیسی زندگی بسر کرا کر بالآخر اُس کے گھر پہنچا دیا تھا۔ خلیفہ نے جو معاملہ عام آدمی کے ساتھ کیا تھا وہی معاملہ اللہ بادشاہوں کے ساتھ کرتا ہے۔ بادشاہ عام آدمی کی نسبت ذرا زیادہ عرصے بادشاہی کا مزا لے لیتے ہیں۔ دوام نہ الف لیلہ کے فرضی بادشاہ کو نصیب ہوا اور نہ سچ مچ کے بادشاہوں کو نصیب ہے۔

بس اتنی ہی بات سمجھنے کی ہے۔ اتنی بات بادشاہ اور اہلِ اقتدار سمجھ جائیں تو دنیا میں امن ہو جائے۔

علم اور جہل میں فرق

ایک چیز ہے جہل، اور ایک چیز ہے علم۔ جہل علم کی ضد ہے اور علم جہل کی ضد۔ کسی بات کو تھوڑا بہت جان کر سمجھ بیٹھنا کہ میں اسے خوب جانتا ہوں، یہ بھی جہل ہے، اور کسی بات کو نہ جاننا اور اس کی بابت احساس کرنا کہ میں اس سے واقف نہیں ہوں، یہ بھی علم ہے، کم از کم اپنے جہل کا علم تو ہے ہی۔

جہل کے معنی ہلکے پن اور بے اطمینانی کے ہیں۔ لہٰذا علمِ حقیقی وہ ہوا جو بھاری بھر کم پن اور اطمینان پیدا کرے۔ اگر عالم کو اطمینان حاصل نہیں ہے تو وہ دراصل عالم نہیں ہے، کاریگر ہے جس طرح لوہار لوہے کا اور بڑھئی لکڑی کا کام کرتے ہیں، یہ عالم لکھنے اور پڑھنے کا کام کر لیتا ہے۔ اُسے اس بات کا یقین نہیں ہے جسے اُس نے کتاب میں پڑھا ہے۔ ممکن ہے کتاب کے مصنف کو بھی اپنی تحریر کردہ بات کا یقین نہ ہو۔ کسی بات کا یقین ہوتا ہے تو اُس بات کی بابت اطمینان ہو جاتا ہے۔ حقیقی علم اور یقین ایک شے کے دو نام ہیں۔ حقیقی علم اور یقین ایک ہی شے ہے۔

بے پڑھے لکھے لوگوں کو آپ نے پڑھے لکھوں کی نسبت زیادہ مطمئن دیکھا ہوگا۔ وجہ وہی ہے کہ بے پڑھے لکھے لوگ اگرچہ باتیں کم جانتے ہیں، مگر جتنی باتیں جانتے ہیں اُن کا اُنھیں یقین کامل ہوتا ہے، اور پڑھے لکھے لوگوں کو زیادہ باتیں جاننے کے باوجود باتوں کا کامل یقین نہیں ہوتا۔ پڑھے لکھے لوگوں کو شک لگا رہتا ہے۔ اسی کے لیے کہا کرتے ہیں۔ اَلْعِلْمُ حِجَابُ الْاَکْبَرُ۔ اُن کی عقلوں پر علم کا پردہ پڑ جاتا ہے، اور جس عالم

کی عقل پر سے علم کا پردہ ہٹ جائے اور جس عالم کا دگدا دُور ہو جائے وہ پھر جنید و بایزید کی صف کا آدمی ہے، خواہ صف کے آخر میں جگہ پائے۔ لیکن بے یقینوں اور بے اطمینانوں کے زُمرے سے وہ اہلِ یقین اور اہلِ اطمینان کے زُمرے میں پہنچ گیا۔

امام غزالیؒ کا قول

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ میں سال بھر مسلسل معتکف رہا تو مجھ پر تین حقیقتیں منکشف ہوئیں۔ ایک یہ کہ اللہ ایک ہے، دوسری یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت برحق ہے۔ تیسری یہ کہ اعمال کا حساب کتاب ضرور لیا جائے گا اور جزا و سزا دی جائے گی۔

یہ حقیقتیں امام غزالیؒ کو اعتکاف سے قبل معلوم تھیں، امام غزالیؒ اعتکاف سے قبل بھی امامِ علم تھے، لیکن اعتکاف کے بعد کے علم میں کچھ فرق ہی ہوگا جو انھوں نے اِس کا ذکر کیا بس میری مراد علم سے یہی علم اور یہی انکشاف ہے۔

اعتکاف سے قبل اور اعتکاف کے بعد کا علم شاید یوں سمجھا جاسکے کہ موت کا تصوّر ایک تو دس برس کا بچہ کرتا ہے اور ایک میں، اب گور بوڑھا کرتا ہوں۔ میرے تصوّر اور بچے کے تصوّر میں فرق ہے یا نہیں۔

بچہ بھی جانتا ہے کہ بچپن میں موت آسکتی ہے۔ بچے نے بچوں کو مرتے دیکھا ہے، لیکن میرے پیشِ نظر آسکتا نہیں ہے، میں اُسے آتا دیکھ رہا ہوں۔ بچہ دوسرے بچوں کی موت کا تصوّر کرتا ہے، میں خود اپنی موت کا تصوّر کرتا ہوں۔

بچوں پر اور جوانوں پر موت کے تصوّر کا بوڑھوں جیسا اثر نہیں پڑتا، اور اگر پڑے تو وہ بچے اور جوان ولی اللہ ہیں، لیکن بوڑھے اتنے تاثر سے ولی نہیں کہلاسکتے۔ بوڑھے اولیاء اللہ کا تصوّرِ موت عام بوڑھوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ تمام بوڑھے موت کے تصوّر سے یکساں اثر نہیں لیتے۔ علم، یقین اور ایمان کا عمل پر اثر مترتب ہونا چاہیے۔ تمام بوڑھوں کے عمل یکساں نہیں ہیں۔

اللہ کی رضا جوئی

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا ...... ثُمَّ یَکُوْنُ حُطَامًا (رکوع ۱۹/ب)

سمجھ لو کہ (تم نے) دنیا کی زندگی (کا مقصد) لہو و لعب اور ٹیپ ٹاپ اور ایک دوسرے پر بڑائی جتانا اور (مال و اولاد میں زیادتی چاہنا قرار دے رکھا ہے (یہ ٹھیک نہیں ہے، ان چیزوں کی بہار چند روزہ ہے) اس (قسم کی) زندگی کی مثال اُس بارش کی سی ہے جس سے (سبزہ لہلہا اُٹھتا ہے اور) پیداوار کسانوں کو مگن کر دیتی ہے۔ پھر وہ اور زور پکڑتی ہے (مگر انھیں خوشی مناتے زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ) پیداوار خشک ہونے لگتی ہے اور تم سبزے کو زردی سے بدلتا دیکھتے ہو اور آخر وہ روندن میں آجاتی ہے۔ (تم خود اُسے روندتے ہو اور جانوروں سے روندواتے ہو۔ پھر شادابی اور خوش نمائی کا پتہ نشان نہیں رہتا۔ یہی حال تمھارے لہو و لعب، ٹیپ ٹاپ اور آپس کے تفاخر کا ہے) (سورہ ۵۷۔ آیت ۲۰)

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ۔ عارضی بہار کے فریب میں پھنس کر عاقبت کو خراب نہ کرو۔ عاقبت میں صرف ایمان اور نیک اعمال کام دیں گے۔ یہ چیزیں کام نہیں دیں گی جنھیں تم نے اختیار کر رکھا ہے۔ وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ ۚ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ (جس طرح بارش سے اچھی زمین لالہ زار بن جاتی ہے اور خراب زمین میں کانٹے اُگتے ہیں ٹھیک اُسی طرح دنیا کے فریبوں میں پھنسنا) عاقبت میں سخت ترین عذاب (کا موجب ہوگا، اور ایمان اور نیک اعمال کے ساتھ زندگی بسر کرنا مغفرت و خوشنودی باری تعالیٰ (کا ذریعہ ہوگا کچھ شک نہیں کہ) دنیا کی زندگی دھوکے کا مال ہے، (ہوشمند اس کے نقصانات سے بچتے ہیں اور مدہوش مار کھا جاتے ہیں) (سورہ ۵۷۔ آیت ۲۰)

سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ۔ (لوگو!) اپنے پروردگار کی بخشش (اور رضاجوئی) کی طرف دوڑو (اور موت سے پہلے وہ کارنامے کر جاؤ جو عاقبت میں کام آئیں)۔ (سورہ ۵۷۔ آیت ۲۱)

پارسی اور مسلمان

ہندستان اور پاکستان میں ایک جماعت رہتی ہے، جو پارسی کہلاتی ہے، اس جماعت کی تعداد ہندستان اور پاکستان کی تمام جماعتوں سے کم ہے، لیکن یہ سب پڑھے لکھے اور

خوش حال لوگ ہیں، ان سے بڑھ کر منظم لوگ ہندستان اور پاکستان میں دوسرے نہیں ہیں۔ پارسی تنظیم کا ڈھول نہیں پیٹتے۔ اُن کی جماعتی جدّوجہد کی خبریں باہر نہیں نکلتیں۔ جو کچھ کرنا ہوتا ہے، خاموشی سے کرتے ہیں۔ اُنھیں انگریزوں سے یا ہندو مسلمانوں سے اپنی جماعت کے لیے حقوق مانگتے آپ نے شاید ہی کبھی سُنا ہو، پارسی جو کچھ کرتے ہیں اپنی جماعت کے لیے خود کرتے ہیں۔

دلّی میں پارسی بہت تھوڑے تھے، اُن کا مرکز نمبر اول بمبئی ہے اور نمبر دوم کراچی لیکن دلّی میں بھی پارسیوں کا وقار تھا۔ وہ نہ بھارت میں حکومت کے حصّہ دار ہیں اور نہ پاکستان میں، لیکن اُن کا وزن کہیں کم نہیں ہے۔

میں نے ہوش سنبھالا تو فرنگی تہذیب وتمدّن میں اور فرنگی ترقّی میں پارسیوں کو دلّی کی ہر جماعت سے پیش پیش دیکھا۔ پارسی قریب قریب انگریز تھے، مگر جتنے انگریز وہ ستّر پچھتّر برس پہلے تھے، اُتنے ہی انگریز آج بھی ہیں۔ تقلید فرنگ کی رفتار پارسیوں کی مسلمانوں کے برابر کیا، ہندوؤں کے برابر بھی تیز نہیں ہے۔ ہندوؤں میں گاندھی جی کی روک تھام کے باوجود خاصی تبدیلی آئی ہے اور مسلمانوں نے تو تقلیدِ فرنگ کا ریکارڈ قایم کر دیا ہے۔ مسلمان انگریزوں اور امریکنوں کو مات دے دیتے ہیں اور اُنھیں پیچھے چھوڑنے جاتے ہیں، لیکن پارسی جیسے ستّر پچھتّر برس پہلے تھے ویسے ہی اِس وقت ہیں۔ مسلمانوں نے ٹیڈی بوائے اور ٹیڈی گرل تک ترقی کرلی ہے، پارسی جماعت نے اِس اعتبار سے مطلق ترقی نہیں کی ہے۔

ستّر پچھتّر برس پہلے کے مرے ہوئے مسلمان اگر آج زندہ کر دیے جائیں تو اپنی قوم کو پہچان نہ سکیں اور پہچان لیں تو اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں عرض کریں کہ یا اللہ! ہم کو تو قبروں ہی میں بھیج دے۔

ستّر پچھتّر برس پہلے کے اکثر مسلمانوں کو اللہ کا یہ فرمان یاد تھا کہ (اے رسولؐ!) تم مسلمان مردوں سے کہہ دو کہ وہ (اخلاقی حالت درست رکھنی چاہتے ہیں تو نامحرم عورت پر نظر پڑتے ہی) اپنی نظر نیچی کرلیں۔ اور مسلمان عورتوں سے کہہ دو کہ (نامحرم مرد کا سامنا ہو جائے تو) وہ اپنی نظر نیچی کرلیں . . . . . . (اور مسلمان عورتوں کو اتنا اور سمجھا دو کہ، اپنے (بناؤ) سنگھار کو ظاہر کرتی نہ پھریں۔ (سورہ ۲۴۔ آیات ۳۰۔۳۱)

اب تو بناؤ سنگھار کیسا ہم جسم کا جوڑ جوڑ ظاہر کرتے پھرتے ہیں۔

پارسیوں کے پاس قرآن جیسا ضابطۂ حیات نہیں ہے، مگر وہ اپنے طور طریقوں کے پابند ہیں۔ ہم نے قرآن اور قرآنی طریقوں کو بھلا دیا ہے، پاکستان ہی میں نہیں، جملہ اسلامی ممالک میں، بلکہ پاکستان دیگر اسلامی ممالک سے ابھی پیچھے ہے۔ کاش اِن ممالک کے ساتھ اسلامی کا لفظ نہ لگایا جاتا اور اسلام کو بدنام نہ کیا جاتا۔

قیامت اور فلاح

جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر (صدق دل سے) ایمان رکھتے ہیں تم ان کو ایسے لوگوں سے یارانہ بڑھاتے (کبھی) نہیں پاؤ گے جو اللہ کے اور اُس کے رسولؐ کے مخالف ہیں، خواہ وہ (مخالف) اُن کے باپ ہوں، یا اُن کے بیٹے ہوں، یا اُن کے بھائی ہوں یا اُن کے (دُور و نزدیک کے) رشتہ دار ہوں۔ (حقیقت یہ ہے کہ سچّے مسلمانوں کے دلوں میں اللہ تعالےٰ نے ایمان کو نقش کر دیا ہے اور اپنی رحمت (خاص) سے اُن کی مدد فرمائی ہے (انھیں توفیق ایمان و عمل عطا کی ہے) اللہ انھیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں (اور ایک دو دن نہیں) وہ ہمیشہ اُن جنتوں میں رہیں گے۔ اللہ اُن سے راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے۔ یہ اللہ کا گروہ ہے اور سن لو کہ اللہ ہی کا گروہ (بالآخر) خیر و فلاح پانے والا ہے۔
(سورۂ ۵۹۔ آیت ۲۲)

اختصار نہ کرو

بعض صاحبان لفظ محمدؐ انگریزی میں یوں لکھتے ہیں: MOHD۔ غیر مسلم تو مختار ہیں لیکن مسلمانوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ انھیں پورا لفظ MOHAMMAD لکھنا چاہیے۔ لفظ محمد ہمارے اور آپ کے نام کا جزو ہونے کی صورت میں بھی قابلِ احترام ہے۔ اِس پر ص بنانا تو غلط ہے، مگر پھر بھی اسے کچھ نہ کچھ نسبت حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات سے ضرور رہتی ہے۔ لہٰذا ہجے کا یہ اختصار اچھی حرکت نہیں ہے۔ مجھے یاد ہے نواب وقار الملک، سکرٹری، مدرسۃ العلوم علی گڑھ نے اپنے کالج کے دفاتر میں سرکلر جاری کر دیا تھا کہ MOHD نہ لکھا جائے MOHAMMAD لکھا جائے۔

اسی طرح "سلام مسنون" اور "سلام ورحمۃ" بھی مجھے کھٹکتے ہیں۔ یہ السلام علیکم اور

سلام علیکم ورحمۃ اللہ لکھنے میں کون سا وقت صرف ہوجاتا ہے جو انہیں مختصر کیا جائے" سلام مسنون "مسنون نہیں ہے۔ سلام علیکم مسنون ہے اور سلام علیکم ورحمۃ اللہ مسنون ہے۔

ایک عیسائی بستی اور امریکی پادری

کراچی سے چھے سو میل دور صحرائے تھل میں، لوریٹو نام کی کوئی جگہ ہے، کچھ غریب عیسائی جھونپڑیاں ڈال کر وہاں آباد ہوگئے تھے۔ پرانی سی خشک نہر لوریٹو میں موجود تھی اور مرمت کر کے اُسے دریائے سندھ سے پانی دینے کا خیال تھا، لیکن پانی آتا نہیں تھا۔ صرف ایک ہینڈ پمپ سے ساری بستی پانی نکالتی تھی اور بمشکل اپنے بچوں اور اپنے مویشیوں کی پیاس بجھاتی تھی۔ نہانا دھونا لوگ بھول گئے تھے۔

جن افسروں کے ہاتھ میں پانی پہنچانا تھا، اُن کا تو کہنا کیا ہے، پاکستان کے پادری بھی اِن عیسائیوں کی مدد نہیں کرتے تھے یا نہیں کر سکتے تھے۔ آخر امریکا نے پادری بھیجا۔ اُس نے اوورسیر، سب ڈویژنل افسر، اگزیکیٹو انجینئر، سپرنٹنڈنگ انجینئر محکمہ نہر کے جملہ عملے کو ہلا ڈالا۔ چناں چہ فوراً نہر کی مرمت ہوگئی اور جس پانی کا دو سال سے انتظار تھا وہ چند دن کے اندر بہتا دکھائی دینے لگا۔

یہ حال کا قصہ ہے اور امریکن پادری نے امریکا کے مشہور رسالہ ریڈرز ڈائجسٹ میں خود لکھا ہے۔ آبادی کا سربراہ مہتاب افسران کو یاد دلاتا ہے کہ ہم یہاں آپ کے کہنے سے بسے تھے۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں پانی دیا جائے گا۔ دو سال انتظار کرتے کرتے گزر گئے اور ہم اندوختہ کھا پی بیٹھے لیکن افسران مہتاب کی باتیں تو ایک کان سنتے ہیں اور دوسرے کان اُڑا دیتے ہیں اور جب امریکن پادری ان باتوں کو دوہراتا ہے تو افسران فرماتے ہیں: مقدس باپ! دو سو آدمی سرکاری کام سے ہٹا کر حاضر کیے جائیں گے اور فلاں تاریخ تک پانی نہر میں دیکھ لیجیے گا۔

پانی کا آنا تھا کہ کھیت لہلہا اُٹھے، سال بھر میں جھونپڑیاں پختہ مکانوں سے بدل گئیں۔ لوگوں نے نہانا اور صاف ستھرا لباس پہننا شروع کر دیا۔ لوریٹو میں اب ہسپتال بھی ہے، اسکول بھی اور گرجا بھی۔ پہلا پادری لوریٹو کو گلزار بنا کر اور عیسائیت میں کشش پیدا کر کے امریکا واپس چلا گیا۔ دوسرا امریکن پادری اور تین امریکن ننیں اشاعت عیسائیت

کے لیے پورے ٹو پر قابض ہیں۔

جن مسلمان افسران محکمہ نہر نے غریب بستی والوں سے اغماض برتا تھا اور پانی دینے کا وعدہ پورا نہیں کیا تھا اور امریکن پادری سے مرعوب ہو کر پانی دے دیا تھا، انھیں سوچنا چاہیے کہ عیسائیت میں کشش پیدا کرنے کے وہ کتنے ذمہ دار ہیں۔ امریکن پادری مستحق تعریف ہے مگر اس قسم کے افسروں کی کیا تعریف کی جائے؟ جس دن اللہ ان سب کو (ان کی قبروں سے) اُٹھائے گا اس دن (انھیں اپنی غفلت اور کم عقلی کا حال معلوم ہو جائے گا) اللہ ان کو ان کے کرتوتوں سے (خوب) آگاہ کر دے گا، تمام کرتوت اللہ نے محفوظ کر رکھے ہیں اور یہ انھیں بھولے بیٹھے ہیں۔ (اللہ کے لیے اعمال کا محفوظ رکھنا مشکل نہیں ہے) اللہ کے سامنے تو ہر چیز (ہر وقت) آئینہ ہے۔ (سورہ ۵۸ آیت ۶)

پچاس سال پہلے اور اُترن

پچاس سال پہلے تک ہم لوگ لباس ایسا پہنتے تھے کہ وہ اپنے قابل نہ رہتا تھا تو کسی اور کے کام آجاتا تھا۔ سال دو سال خود پہنا، پھر دھوبی، سقے، حجام، حلال خور کسی کو دے دیا۔ لٹھے کا پاجامہ، ململ کا کرتہ، تن زیب کا انگرکھا۔ جاڑے میں ڈبل زین کا پاجامہ اور روئی دار انگرکھا۔

کوٹ پتلون مہنگے کپڑے کے بنتے ہیں، انھیں کون خیرات کر سکتا ہے اور خیرات لینے والے کوٹ پتلون کیا پہنیں گے۔ کرتے، پاجامے اور انگرکھے، تینوں کی لاگت پچاس سال پہلے تین رُپے سمجھ لیجیے، انگرکھا درزی سے سلوایا تو ڈیڑھ دو روپے اور سہی۔ ورنہ سب چیزیں گھر میں سل جاتی تھیں اور دوسرے تیسرے سال دھوبی، سقے، حجام اور حلال خور کے جسموں پر پہنچ جاتی تھیں۔ کوئی چیتھڑے لگائے نہیں پھرتا تھا، کوئی سردی میں نہیں ٹھٹرتا تھا، اُترنیں سب کا تن ڈھک دیتی تھیں اور سب کو گرم کر دیتی تھیں۔

ڈاکٹر مفتی کی یاد

ڈاکٹر مفتی وہ شخص ہیں، جنھیں ہنگامہ ۱۹۴۷ء میں دلی کے ہندوؤں نے بڑی سفاکی اور بے دردی سے شہید کیا تھا۔ جمعہ کی شام کو انھیں دلی میونسپلٹی کا ہیلتھ افسر بنایا گیا،

اور ہفتے کی صبح کو ایک ہندو اسسٹنٹ ہیلتھ افسر نے، جو ہیلتھ افسری کا اُمیدوار تھا اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کرا دیے، سر الگ، ٹانگیں الگ، دھڑ الگ، لیکن خیر میں جس وقت کا واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں، اس وقت ڈاکٹر مفتی قایم مقام ہیلتھ افسر تھے مستقل ہیلتھ افسر نہیں تھے۔

۱۹۴۵ء کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ میرے علاقے میں پبلک لیٹرین کی پندرہ دن صفائی نہیں ہوئی۔ میں ڈاکٹر مفتی صاحب سے تقاضے کرتا رہا اور وہ آج آدمی بھیجتا ہوں اور کل آدمی بھیجتا ہوں کرتے رہے۔ لیٹرین کے اِرد گِرد کی آبادی چیخ اُٹھی۔ آخر میں نے کہا: ڈاکٹر صاحب! شام تک خود صفائی شروع کر دوں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ سُنا تو رنگ فق ہو گیا اور فوراً حکم فرمایا کہ ابھی صفائی کی جائے۔ میں نے محض ڈرا وا دیا تھا مگر ڈاکٹر صاحب سمجھے کہ اس سے بعید نہیں ہے کہ سچ مچ پھاوڑہ لے کر پہنچ جائے۔ پھر ارد گرد کی آبادی بھی پل پڑے گی اور سارے شہر میں غُل مچے گا۔

میں دلّی میونسپلٹی کا بہت غریب ممبر تھا، اتنا غریب کہ درخواست ممبری کے ساتھ جو ضمانت کی رقم جمع کی جاتی ہے وہ علاقے والے بھرا کرتے تھے، لیکن علاقے والوں کا اس قدر تعاون میونسپل کمیٹی میں میری قوّت کا موجب تھا۔

یہ میونسپل کمیٹی کے ممبر اور علاقے کے لوگوں کے تعاون کی ادنٰی سی مثال ہے۔

عوام اور حکمران

کسی ملک کے حاکموں اور ملک بھر کی رعایا میں اسی قدر تعاون ہو تو دوسرا کوئی ملک اُس سے آنکھ نہیں ملا سکتا۔ حاکموں اور رعایا کے تعاون میں ایسی قوت ہے کہ انگلستان کی امریکا اور رُوس کے سامنے اب کچھ حقیقت اور حیثیت نہیں رہی ہے مگر پھر بھی امریکا اور رُوس انگلستان کی نگاہیں دیکھتے ہیں۔

تعاون کی پہل رعایا نہیں کیا کرتی، حکّام کا طرزِ عمل رعایا سے تعاون کراتا ہے، پہل حکّام کی طرف سے ہوتی ہے۔ درباریوں کے تعاون کا ذکر نہیں کر رہا ہوں، عامۃ النّاس کے تعاون کا ذکر کر رہا ہوں۔ درباریوں کا تعاون تو حاکموں کو عموماً غلط راستے پر ڈال دیتا ہے۔

اُسوۂ حسنہ

اوروں کے پاس نہ سہی، مسلمانوں کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اِس قسم کا اُسوہ حسنہ بھی موجود ہے۔ مسجد قبا کی تعمیر میں حضورؐ نے تمام صحابہ کی طرح کام کیا تھا۔ حضورؐ بھاری بھاری پتھر اُٹھا کر لاتے تھے۔ غزوہ خندق کے وقت حضورؐ خندق کھودنے میں برابر کے شریک رہے۔ غزوہ بدر میں تین تین اصحاب کے واسطے ایک ایک اُونٹ تھا۔ باری باری دو سوار ہوتے تھے اور ایک صحابی نکیل پکڑ کر چلتے تھے۔ حضورؐ نے اپنے واسطے الگ اونٹ نہیں لیا، اور نکیل تھامنے کی باری آتی تھی تو باوجود اصرار کے نکیل ضرور تھامتے تھے اور فرماتے تھے میں کمزور نہیں ہوں اور اجر و ثواب کا تم سب سے زیادہ خواہاں ہوں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متبعین نے محمد رسول اللہ کی جیتے جی جتنی عزت کی تھی اُتنی عزت اور رسولوں کی نہیں کی گئی، لیکن حضورؐ نے کامل اقتدار حاصل ہو جانے کے بعد اپنے زیر دستوں کو جتنا نوازا اُتنا اور اہل اقتدار اپنے زیر دستوں کو نہیں نوازتے۔ مسلمان اہلِ اقتدار حضورؐ کے اِن پاک نمونوں کی پیروی کریں تو آج بھی انشاء اللہ دنیا پر چھا سکتے ہیں۔ مسلمان اہل اقتدار کے سر پر اللہ کا ہاتھ آ سکتا ہے۔ مسلمان عوام کے تعاون میں بم بارود سے بڑھ کر طاقت ہے۔

بے بسم اللہ کی پیدائش

آج مجھے ستر برس پہلے کی ایک گالی یاد آرہی ہے، جس کا قصہ میرے بزرگ بھائی خواجہ فضل احمد خاں صاحب شیدا نے کبھی سنایا تھا۔ قصہ ہُو بہُو اُن ہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں:۔

اللہ گواہ ہے، مجھے خوب یاد ہے۔ یہ باتیں آج سے کم و بیش ستر برس پہلے کی ہیں۔ ہم مٹیا محل میں آپا امت اللہ، آپا امت الرحمٰن کے ہاں تھے۔ ایسی پاک دامن بیویاں اب کہاں، اللہ اُن کی مغفرت فرمائے۔ ہاں تو کہنے کی بات یہ ہے کہ اُن کے مکان کے سامنے دیکھٹی کا کارخانہ تھا۔ ہم کبھی کبھی تماشہ دیکھنے وہاں چلے جاتے تھے۔ پھٹ پھٹ ہو رہی ہے

اور پتلا تار چوڑا ہوتا جاتا ہے۔ ایک دن کسی شاگرد نے کچھ حرمزدگی کی تو کرخندار (کارخانہ دار) بولے۔"ابے بے بسم اللہ کی پیدائش"

بس یہی گالی مجھے یاد آرہی ہے جو کارخانہ دار نے اپنے شاگرد کو دی تھی اور بھائی فضل احمد نے جس کا قصّہ بیان کیا تھا۔ گالیاں اسی طبقے کے لوگ بکا کرتے تھے۔ یہ بالکل بے پڑھے لکھے لوگ ہوتے تھے، لیکن اس قسم کی گالیاں اِن کی زبان سے نکلتی تھیں کہ اُن میں سننے والوں کے لیے سبق ہیں۔ یہ بے پڑھے لکھے وہ باتیں جانتے تھے جو آجکل کے پڑھے لکھے (تعلیم یافتہ) نوجوان شاید سمجھیں گے بھی نہیں کہ کیا کہہ گئے۔

ماضی کا گھٹیا سے گھٹیا ذکر حال کے مفاسد کا علاج ہے۔

بھلائی کی طرف بُلانے والے

قرآن مجید کی ایک آیت ہے: وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط اس کا ترجمہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدّین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کیا ہے: "اور چاہیے کہ ہو تم میں سے ایک جماعت کہ بلاویں طرف بھلائی کے اور حکم کریں ساتھ اچھی چیز کے اور منع کریں نامعقول سے" (سورہ ۳۔ آیت ۱۰۴)

یہ لفظی ترجمہ ہے۔ آجکل کی زبان میں یوں کہیے: "ضرورت ہے کہ تم میں (اے مسلمانو!) کچھ آدمی ایسے رہیں جو بھلائی کی طرف لوگوں کو بلایا کریں اور اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے روکیں (اور اس فرض کی ادائگی کے لیے اپنے آپ کو وقف رکھیں)"

علما کے جھگڑے

علما اپنے آپ کو اِس آیت کا مصداق کہتے ہیں اور اِسے بطور سند لاتے ہیں کہ ہماری جماعت کی بقا ازروئے قرآن لازمی ہے۔ مگر ایسے بھی علما ہیں جو اس مفہوم کے قایل نہیں ہیں، اور دوسری آیتیں پیش کرتے ہیں جن میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ذمہ داری چند عالموں پر نہیں بلکہ پوری اُمّت پر ڈالی گئی ہے۔ مثلاً كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط

شاہ صاحب کا لفظی ترجمہ: "ہو تم بہتر اُمّت جو نکالی گئی ہو واسطے لوگوں کے، حکم کرتے ہو ساتھ اچھی طرح کے اور منع کرتے ہو بُرائی سے" (سورہ ۳-آیت ۱۱۰) یعنی (اے مسلمانو!) لوگوں کی ہدایت کے لیے جتنی اُمّتیں (آج تک) معرض وجود میں آئی ہیں تم ان سب سے بہتر اُمّت ہو۔ تم لوگوں کو اچھے کاموں کے کرنے کے لیے کہتے ہو اور بُرے کاموں کے کرنے سے روکتے ہو۔

مندرجہ بالا دونوں آیتیں ایک ہی سورہ میں ہیں اور بالکل قریب قریب ہیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ذکر دونوں آیتوں میں ہے۔ لہٰذا دوسری قسم کے علما وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ کے مِنْ کو تبعیضی کی بجائے تبیینی قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ساری امّت کے ذمّے ہے۔ امّت کے چند آدمی یہ فریضہ اپنے ساتھ مختص نہیں کر سکتے۔ نیز دوسری قسم کے علما کا خیال ہے کہ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ کے مِنْ کو تبعیضی ماننے سے قرآن کے بیان میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔

خیر تبعیضی اور تبیینی کی بحث کو تو اہلِ علم جانیں، لیکن مِنْ کو تبعیضی ماننے کی صورت میں بھی تضاد مجھے نظر نہیں آ رہا۔

میں دوسری قسم کے علما سے صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ پہلی قسم کے علما کب چاہتے ہیں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ وہی انجام دیں اور ساری قوم انجام نہ دے۔ بے شک امر بالمعروف و نہی عن المنکر ساری قوم پر فرض ہے اور مِنْ کے تبعیضی ہونے سے بھی قوم اس فرض سے بری الذمہ نہیں ہو جاتی۔ اگر ساری قوم اس فرض کی ادائگی کی اہل بن جائے جیسا کہ صحابہ کے زمانے میں تھی تو سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، مگر جس وقت تک ساری قوم میں دورِ صحابہ کی سی اہلیت و قابلیت عود نہیں کرتی اُس وقت تک چند آدمیوں کے ادائگی فرض میں کیا حرج ہے۔ آخر دوسری قسم کے علما بھی تبلیغ ہی کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ساری قوم مبلّغ بن جائے تو بڑی اچھی بات ہے، لیکن ساری قوم مبلّغ نہ بنے تو قوم کے چند آدمی جو تبلیغ کرتے ہیں وہ تبلیغ سے کیوں دست بردار ہو جائیں۔ یہ تو ایسی بات ہے کہ نماز ساری قوم پر فرض ہے، مگر ساری قوم نماز کی پابند نہیں رہی اس واسطے جو آدمی پابندی سے نماز پڑھتے ہیں وہ بھی نماز نہ پڑھیں۔

کوئی عالم غلط کار ہے تو آپ اُسے غلط کاری سے منع کیجیے لیکن سب عالم فریضہ تبلیغ ترک کر دیں یہ بات گلے نہیں اُترتی۔

علما سے کہیے کہ آپس میں لڑیں نہیں، کفر کے فتوے دینے میں احتیاط کریں۔ وعظ و پند کی فیس نہ لیں، گزر اوقات کا کوئی اور ذریعہ نکالیں، سادگی کے ساتھ رہیں سہیں، کرّ و فر سے بچیں، وغیرہ وغیرہ۔ دینی مدارس کا نصاب انگریزی مدارس کے نصاب کے برابر بُرا نہیں ہے لیکن ناقص ضرور ہے اُس کے نقایص دور کیے جائیں، لیکن علما سے یہ مت کہیے کہ قوم اللہ رسول کا نام کبھی سُن لیتی ہے، اُس سے بھی اُسے محروم کردو۔ آپ کو اپنے خیالات کی اشاعت کا حق ہے اور آپ کے خیالات کے مخالف علما کو اپنے خیالات کی اشاعت کا حق ہے۔ علما کا وجود نہ مٹائیے، اُن کی جگہ اپنے ہم خیال علما لائیے اور ساری قوم کو اپنے جیسا عالم بنا دیجیے۔ ساری قوم عالم نہ بنی اور علما کی جماعت ختم کر دی گئی تو قوم کا حشر کیا ہوگا، قوم بے مُہار ہو جائے گی۔ کوئی تو قوم کو بتانے والا رہنا چاہیے کہ اسلامی زندگی کیا ہے اور قوم کیسی زندگی بسر کرنے لگی ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ حکومت سنبھال لے تو کیا کہنے ہیں۔ اللہ وہ دن جلد دکھائے کہ مذہب اور سیاست ایک ہو جائے اور مذہبی کام کرنے والوں اور سیاسی کام کرنے والوں کی تقسیم مٹ جائے۔ لیکن جب تک حکومت قوم کی ذہنیت اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا فرض نہ سنبھالے تب تک علما ہی اس فرض کی ادائگی کریں گے۔ علما جتنی اور جیسی بھی فرض کی ادائگی کریں غنیمت ہے۔ کامل ادائگی اس فرض کی وہ حکومت ہی کر سکتی ہے جو حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی حکومت کی پیرو ہو حکام اپنی سیرت اور اپنے کردار کے نمونے پیش کر کے جیسی اچھی ادائگی اس فرض کی کر سکتے ہیں علما متحد اور واقعی ایک گروہ بن جائیں تب بھی ویسی اچھی ادائگی اس فرض کی نہیں کر سکتے۔ علما متحد اور ایک گروہ ہیں کہاں۔

نظام الملک طوسی اور حکمران

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ تو قریباً دوسرے عمر فاروقؓ ہی تھے۔ اُن کو خلفائے راشدین کی صف کا خلیفہ کہا جا سکتا ہے اور کہا جاتا ہے۔ اُنھیں خلافت کے لیے زیادہ زمانہ نہیں ملا، ورنہ خدا جانے کیا کیا کام کر جاتے۔ لیکن حضرت عمر بن عبد العزیز کے علاوہ بھی مسلمانوں میں ایسے بادشاہ، وزیر اور امیر بے شمار گزرے ہیں جن پر اسلام کو فخر ہے جنھوں

نے مال وزر اور اقتدار کی فراوانی کے باوجود اسلامی شان پوری طرح باقی رکھی۔

آج میں صرف ایک وزیر اور ایک امیر کا نام لیتا ہوں۔ وزیر نظام الملک طوسی ہیں اور امیر بخشی الملک شیخ فرید۔

نظام الملک طوسی کی شہرت بحیثیت عاقل و دانا اور مدبّر کے بھی ہے اور انھوں نے خدمت دین بھی بے حد کی تھی۔ حسن بن صباح کے باطنی فرقے کا فتنہ نظام الملک طوسی کے دورِ وزارت میں اُٹھا تھا۔ نظام الملک طوسی نے اُسے اتنا دبایا کہ بالآخر اُسی فرقے کے کسی شخص کے ہاتھوں وہ شہید ہوئے۔

حال میں مولانا عبدالرزاق کانپوری مرحوم کی معرکتہ الآرا تصنیف "نظام الملک طوسی" کا دوسرا ایڈیشن چھپا ہے۔ اُس کے چند اقتباس پڑھیے۔ بادشاہ اور رعایا کے تحت نظام الملک طوسی لکھتے ہیں:

"جب لوگ شریعت کی پابندی چھوڑ کر دین و مذہب کا خاکہ اُڑانے لگتے ہیں اور خدا کے احکام کی تعمیل نہیں کرتے ہیں، اُس وقت خدا ان کے اعمال کی سزا دینا چاہتا ہے اور (یہ سزا دیتا ہے کہ) بجائے عادل اور مہربان بادشاہ کے ظالم حکمراں مسلط کرتا ہے۔ اس دورِ انقلاب میں خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں اور گنہگار اپنے کرتوتوں کی سزا پاتے ہیں (اور چنوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں)۔ اِس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے کہ جب نیستاں میں آگ لگتی ہے تو اوّل وہ خشک چیزوں کو جلاتی ہے۔ پھر ہمسائگی کے طفیل تر و تازہ چیزیں بھی جل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔"

"بادشاہوں کو خدا کی رضامندی حاصل کرنا چاہیے، مگر یہ رضامندی جب ہی حاصل ہو سکتی ہے کہ بندگانِ خدا پر عدل و احسان کیا جائے۔ عدل کا ثمرہ بادشاہ کو یہ ملتا ہے کہ رعایا ٹھنڈے دل سے دعائیں مانگتی ہے، جس سے سلطنت میں استحکام اور اضافہ ہوتا ہے اور دین و دنیا کی نیک نامی نصیب ہوتی ہے اور آخرت کا حساب ہلکا ہو جاتا ہے۔ مشہور قول ہے: اَلْمُلْکُ یَبْقٰی مَعَ الْکُفْرِ وَلَا یَبْقٰی مَعَ الظُّلْمِ۔ یعنی سلطنت کفر کے ساتھ تو باقی رہ سکتی ہے مگر ظلم و ستم کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتی۔"

"بادشاہ پر واجب ہے کہ فرض و سنّت اور احکام شریعت کے قائم رکھنے کی کوشش کرے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ بادشاہ کے واسطے سب سے اچھی چیز اُس کا پاکیزہ

مذہب ہے، کیوں کہ مملکت اور مذہب مثل دو بھائیوں کے ہیں۔ جب مملکت میں انقلاب ہوگا تو مذہب میں بھی رخنہ پڑے گا اور جب مذہب میں رخنہ پڑے گا تو سلطنت پر بھی اُس کا اثر ہوگا۔ حضرت سُفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سب سے اچھا بادشاہ وہ ہے جو اہلِ علم سے صحبت رکھتا ہو اور سب سے بُرا وہ عالم ہے کہ جو بادشاہ سے ملتا ہو۔"

نظام الملک طوسی بیٹے کو نصیحت فرماتے ہیں:

"میرے بعد وزارت اختیار نہ کرنا اور جہاں تک ہو سکے دولت جاوید یعنی قناعت کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا اور دنیا کی چاپلوسی پر شیدا اور فریفتہ نہ ہونا، کیوں کہ اول کی لذتیں آخرت کی مسرتوں کی برابر قیمت نہیں رکھتیں۔ صبح سے شام تک بلا ناغہ لوگوں کے معاملات میں وزیر کو مختلف احکام صادر کرنا پڑتے ہیں اور حکم الٰہی یوں ہے: فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْعَدْلِ۔ یعنی جو حکم ہو وہ کانٹے کی تول ہو۔ ایسی صورت میں خدانخواستہ اگر اُن میں سے کوئی ایک حکم بھی حکمِ خداوندی کے خلاف صادر ہو جائے تو اُس ایک لحظہ کے نقصان کی تلافی سو برس کی حکومت میں نہیں ہو سکتی۔"

شیخ فرید اور جہانگیر

شیخ فرید وہ امیر ہیں جنھیں شہنشاہ جلال الدین اکبر کے مرتے وقت تمام باا ثر اُمرا نے اپنا نمایندہ بنا کر جہانگیر کے پاس بھیجا تھا کہ ہم آپ کی حمایت کے لیے تیار ہیں مگر یہ فرمائیے کہ باپ کی طرح کوئی نیا دین تو کھڑا نہیں کیجیے گا۔

روزانہ پانچ سو آدمی شیخ فرید کے دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے اور پانچ سو آدمیوں کو گھر پر کھانا بھیجا جاتا تھا۔ شیخ فرید باہر نکلتے تھے تو ملازمین رُپے اور اشرفیاں لیے ساتھ ہوتے تھے اور خیرات کرتے جاتے تھے۔

شیخ فرید نے جائدادیں نہیں بنائیں، حتےٰ کہ اُن کے رہنے کا مکان بھی معمولی سا تھا، لیکن غریب مسافروں کے لیے اُنھوں نے جگہ جگہ سرائیں تعمیر کیں۔ جو زندگی بھر رُپے میں کھیلا اس کے ہاں مرنے کے بعد صرف ایک ہزار اشرفیاں تھیں۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے کہ شیخ فرید کے حقوق کا میرے کل مریدوں کو خیال رکھنا چاہیے۔

شیخ فرید درویش صفت امیر تھے، جن پر بڑے بڑے مشایخ کو رشک آتا تھا۔
شیخ فرید نے شریفانہ عقل اور ایماندارانہ کارگزاری کے ذریعہ عروج حاصل کیا تھا۔
جہانگیر کے دوران حکومت میں شیخ فرید صوبہ گجرات اور صوبہ پنجاب کے صوبیدار (گورنر) رہے۔

شیخ فرید دلی میں پیدا ہوئے تھے اور دلی ہی میں مدفون ہیں۔ دلی میں جو سڑک قطب صاحب جاتی ہے، اُس پر منصور کے مقبرے اور بی بی نور کی درگاہ کے درمیان ایک راستہ چراغ دلی کی طرف مڑتا ہے اُس راستے میں سُرخ گنبد کے قریب پُرانا قبرستان ہے، وہاں لوہے کے کٹہرے کے اندر شیخ فرید کا مزار ہے۔ مزار کی لوح پر نام وغیرہ کندہ ہے۔

شیخ فرید کا پورا نام شیخ فریدالدین تھا۔ جہانگیر نے انھیں مرتضےٰ خاں اور صاحب سیف وقلم کے خطاب دیے تھے۔

نظامِ صلوٰة

اَللّٰہُ اَکْبَرُ ط اَللّٰہُ اَکْبَرُ ط اللہ ہر شے سے بڑا ہے، اللہ ہر شے سے بڑا ہے۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ ط اَللّٰہُ اَکْبَرُ ط اللہ ہی بڑا ہے، اللہ ہی بڑا ہے۔ یہ آواز میرے کانوں میں آئی اور میرے دل اور دماغ نے تسلیم کرلیا کہ اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ اللہ ہر شے سے بڑا ہے، بلکہ بڑا صرف اللہ ہی ہے ــــ سمندر سامنے تھا۔ پہاڑ سر کے اوپر کھڑا تھا۔ زمین پیروں کے تلے پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان نے چھت کی طرح سایہ کر رکھا تھا۔ روز پڑھتا ہوں کہ ان سے بھی بڑی بڑی چیزیں تلاش کرنے والوں نے تلاش کی ہیں، اتنی بڑی بڑی کہ جن چیزوں کے دیکھنے سے مجھ پر ہیبت اور حیرانی طاری ہوجاتی ہے وہ اُن کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ اور ساری کائنات تک ابھی کس کی نظر پہنچی ہے۔ ابھی تو علم کا ایک قطرہ ہاتھ آیا ہے۔ اِس عظیم کائنات کا خالق کتنا عظیم ہوگا۔ اُس کی عظمت کا تصور پانچ چھے فیٹ کا انسان اور انسان کا ڈیڑھ انچی دماغ کیوں کر کرسکتا ہے اور سُنیے، مُؤذّن اور کیا کہہ رہا ہے اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ط اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ط میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ میں

شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ ٹھیک کہا۔ اللہ کے سوا معبود اور
کون ہو سکتا ہے۔ اِن سب بڑی بڑی چیزوں میں بڑائی کہاں ہے، یہ تو اُس کی تابع اور فرماں بردار
ہیں۔ سورج کی مجال نہیں ہے کہ جس جگہ، جس وقت اُسے نکلنے کا حکم دیا جا چکا ہے اُس جگہ،
عین اُسی وقت نہ نکلے۔ ہر چھوٹی بڑی چیز کا یہی حال ہے۔ لہٰذا انسان کو بھی صرف اللہ ہی
کے آگے جھکنا چاہیے اور اُسی کی تابعداری اور فرماں برداری کرنی چاہیے۔ اَشْهَدُ اَنَّ
مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط میں گواہی دیتا
ہوں محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، میں شہادت دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، صرف رسول،
اللہ کے اوتار نہیں، اللہ کے بیٹے نہیں، صرف رسول۔ اللہ کا رسول ہونا کیا معمولی بات ہے۔
اللہ کے رسول کی عظمت، بعد از خدا بزرگ کی عظمت، جنھوں نے خوابیدہ انسانیت کو جگا دیا
تھا، جنھوں نے مُردہ دُنیا کو زندہ کر دیا تھا۔ جنھوں نے زمانے کی پیروی نہیں کی تھی، زمانے کو
اللہ کے حکم کا پیرو بنایا تھا، جنھوں نے ہوا کا رُخ بدل دیا تھا، جو چند سال میں ایسی قوم تیار
کر کے چھوڑ گئے تھے کہ ویسی قوم نہ پہلے کبھی گزری ہے اور نہ بعد میں پیدا ہوگی، جو ہمیں اللہ کی
وہ کتاب دے گئے ہیں، جس کے مطابق عمل کر کے اور عمل کرا کر اُس بے مثل قوم کو تیار کیا گیا
تھا۔ اُن کی رسالت میں شبہ وہی کر سکتے ہیں، جن کی عقلوں پر شیطان پہرہ دیتا ہے۔ اپنے
کام کا اُنھوں نے قوم سے صلہ نہیں لیا تھا۔ اُنھوں نے آدمی بنانے کے ساتھ اور اخلاق
سنوارنے کے ساتھ قوم کو بادشاہی دلا دی تھی لیکن بادشاہ کے لیے شرط لگائی تھی کہ بادشاہ
کو فقیر رہنا ہوگا، اور خود اُس کا نمونہ بن کر دکھایا تھا۔

حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ ط حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ ط آؤ نماز کے لیے، آؤ نماز کے لیے۔
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وَآلہٖ وسلم کے زمانے جیسی ترقی مطلوب ہے تو مسجدوں میں جمع
ہو جاؤ اور فقط رکوع و سجود پر اکتفا نہ کرو، پورا نظامِ صلوٰۃ قائم کرو۔ حضورؐ کے زمانے
میں نماز کے علاوہ، دوسرے جلسے بھی اَلصَّلٰوۃ، اَلصَّلٰوۃ کہہ کر بلائے جاتے تھے۔ نظامِ
صلوٰۃ قرآن میں موجود ہے اور حضورؐ اور خلفائے راشدین اُسے کامیاب کر کے دکھا چکے
ہیں۔

حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ ط حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ ط مسجدوں میں دین و دنیا کی فلاح
حاصل کرنے کے واسطے جمع ہو۔ مسجدوں میں دین و دنیا کی فلاح پانے کے لیے جمع ہو،

اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم ط اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم ط صلوٰۃ سوتے رہنے سے بہتر چیز ہے، صلوٰۃ سوتے رہنے سے بہتر چیز ہے۔ سوتے نہ رہو۔ فلاح سوتے رہنے سے نہیں ملے گی، صلوٰۃ اور نظامِ صلوٰۃ قایم کرنے سے ملے گی۔

اَللّٰہُ اَکْبَرُ ط اَللّٰہُ اَکْبَرُ ط لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ ط اللہ بڑا ہے، اللہ بڑا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اللہ کا نام بلند کر کے ہی مسلمان فلاح پا سکتے ہیں۔

ایک امیر اور ایک غریب

ایک چیز تو ہے راحت اور ایک چیز ہے سامانِ راحت۔ لوگوں نے راحت کے سامانوں کو راحت خیال کر لیا ہے، حالاں کہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ جسے راحت کے سامان حاصل ہوں اُسے راحت بھی حاصل ہو، اور ضروری نہیں ہے کہ جسے سامانِ راحت حاصل نہ ہوں اُسے راحت حاصل نہ ہو۔ راحت، اطمینانِ قلب کو کہتے ہیں اور اطمینانِ قلب سامانوں اور بے سامانی سے میسّر نہیں آتا، صرف اللہ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے میسّر آتا ہے۔

ذرا اِس دولت مند کو دیکھیے، اِس کے پاس رہنے کے لیے عظیم الشّان مکان ہے، تفریح کے لیے ذاتی باغات ہیں۔ کھانے کے لیے انواع و اقسام کی نعمتیں ہیں۔ نوکر ہیں چاکر ہیں، حسین بیوی ہے، سعادت مند بچّے ہیں۔ کاروبار خوب چل رہا ہے، رُپے کی ریل پیل ہے۔ بیوی واری صدقے ہوتی ہے۔ بچّے بچھے جاتے ہیں۔ تمام متعلّقین اور تمام متوسّلین نے معبودِ مجازی بنا رکھا ہے۔ لیکن یہ دائم المرض ہے، راحت کے اِن سامانوں سے لُطف نہیں اُٹھا سکتا، ہر وقت فکر مند اور پریشان رہتا ہے۔

اور اس غریب کو دیکھیے۔ اِسے اللہ نے فقط قناعت کی دولت دی ہے۔ باقی جملہ نعمتوں سے محروم ہے۔ روزی کمانے کی کوشش کرتا ہے، مگر روزی کافی نہیں ملتی اور روزی نہ ملنے کی وجہ سے بیوی بچّے اِسے خاطر میں نہیں لاتے، با ایں ہمہ یہ اپنا اطمینانِ قلب نہیں کھوتا اور سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ پچھلے گناہوں کی سزا ہے اور شکر کرتا ہے کہ سزا آخرت کی بجائے دنیا میں مل گئی ہے۔ اتنا سمجھنے اور سوچنے سے سزا کی تکلیف دُور ہو جاتی ہے۔

گندہ نالا

مجھے دیکھیے، سال بھر سے ایسی سڑک کے کنارے بیٹھا ہوں جس پر کراچی ڈیویلپمنٹ اتھارٹی (مجلس رفاہ کراچی) کی بے رفاہی کی وجہ سے مہینے میں بیس دن قریب کی آبادی کی گندگی گٹروں سے ابل کر بہا کرتی ہے۔ سال بھر میں بھی مجھے اس گندگی کے برداشت کرنے کی عادت نہیں پڑی" اور اُن صاحب کو دیکھیے جو سڑک کے موڑ پر رہتے ہیں جہاں گندہ نالا زیادہ چوڑا چکلا ہو جاتا ہے، یہ صاحب روزانہ بچے کو گود میں لے کر گندے نالے کی پٹڑی پر اس طرح ٹہلتے ہیں جیسے کنارِ آبِ رُکن آباد گلگشت فرما رہے ہیں۔ سڑک پر دو ہی مکان ہیں۔ میرا مکان سڑک کی ابتدا میں ہے اور اُن کا سڑک کے آخر میں۔ بیچ میں اور لوگ ہوتے تو ممکن ہے ہم دونوں سے قطعی مختلف اثر لیتے۔ میں گندے نالے کے سامنے بیٹھ کر کھانا کھاتا ہوں، پانی پیتا ہوں، تاثرات لکھتا ہوں، دوسرا شاید تماشاہ کی تقلید کرتا اور بدبُو سے مرجاتا۔

فضا خراب ہوگئی ہے

ماں باپ ہی نماز نہیں پڑھتے تو بچے کیا نماز پڑھیں گے۔ وہ نماز کو جانیں گے بھی نہیں کہ نماز کوئی چیز ہوتی ہے۔ سُنا ہے کراچی شہر سے باہر، کوٹھیوں کے رہنے والے ایک خاصے ہوشیار بچے کے کان میں پہلی دفعہ اذان کی آواز پہنچی تو اُس نے باپ سے پوچھا کہ یہ کون چیخ رہا ہے۔ ایسے مسلمانوں کے ہاں تو خدا معلوم اب پیدا ہونے کے بعد بچے کے کان میں اذان دلائی جاتی ہے یا نہیں، لیکن جو ماں باپ نماز کو ذریعہ نجات مانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے بچے نجات پائیں، جہنم میں نہ جلیں، جنت کے لطف اٹھائیں، جنھیں بچوں کی اخروی فلاح کی بھی فکر ہے، اس قسم کے ماں باپ کے بچے نماز نہ پڑھیں تو بڑے تعجب اور افسوس کی بات ہے۔ مگر تعجب کیجیے یا افسوس کیجیے، ہے یہ واقعہ۔ سب گھروں میں نہ سہی، اکثر گھروں میں یہی حال ہے۔ سب نہیں تو کچھ بچے نماز پڑھتے ہیں، کچھ بچے نماز نہیں پڑھتے۔ ایسا کیوں ہے۔ اس پر غور کرنا چاہیے۔ کیا قرونِ اوّل میں یہی حال تھا کہ کچھ بڑے اور کچھ بچے نماز کے پابند تھے اور کچھ بڑے اور کچھ بچے نماز کے پابند نہیں تھے۔

فضا خراب ہوگئی ہے۔ فضا کے بدلنے کی ضرورت ہے۔ اسلامی فضا واپس لاکر بھی زمانے کا ساتھ نبھایا جاسکتا ہے۔ نماز روزے کے پابند مسلمانوں کو اسلامی فضا واپس لانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خالی نماز روزے کی پابندی کافی نہیں ہے۔ ہم آپ تو معمولی مسلمان ہیں، فضا کی خرابی نے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے پر باپ کا رنگ چڑھنے نہیں دیا تھا۔ نئی مسجدیں بنانی ملتوی رکھیے، پہلے اسلامی فضا واپس لائیے۔ پہلے پرانی مسجدیں آباد کیجیے۔

بچے اور خالق

ہم اکیلے ہوتے ہیں، اور ہمیں کھانے، کپڑے اور رہنے سہنے کی مشکل پڑتی ہے تو ہم زیادہ پرواہ نہیں کرتے۔ ایک وقت کھالیتے ہیں، دوسرے وقت نہیں کھاتے۔ کپڑا جیسا مل جاتا ہے، پہن لیتے ہیں۔ دن باغوں میں تاش کھیل کر گزار دیتے ہیں، رات کو سڑک کے کنارے پٹڑی پر سو جاتے ہیں، لیکن بچوں کی موجودگی میں بے پرواہی نہیں چلتی۔ اُن کی خاطر ہاتھ پاؤں قطعی مارتے ہیں۔ نوکریاں کرتے ہیں۔ دکانوں پر صبح سے رات گئے تک جم کر بیٹھتے ہیں۔ رشوتیں لیتے ہیں۔ چوریاں اور چور بازاری کرتے ہیں اور طرح طرح سے لوگوں کی جیبیں کاٹتے ہیں۔ بچوں کے لیے انسان کیا کیا نہیں کرتا ہے۔ بچے کسی جرم میں پکڑے جائیں تو چاہتا ہے کہ خود پھنس جائے اور انھیں چھڑا دے۔ انسان اپنی بنی بنائی عزت بچوں کے لیے خطرے میں ڈال دیتا ہے، اپنی جان کھونے کو تیار رہتا ہے۔

ذرا سوچیے، بچوں سے کے دن کا تعلق ہے۔ اُن کے پیدا ہونے سے پہلے اُن سے کون سا تعلق تھا اور مر کر اُن سے جُدا ہو جائیں گے تو کون سا تعلق باقی رہے گا۔ یَآ اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ وَاخْشَوْا یَوْمًا لَّا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِہٖ اے لوگو! ڈرو اپنے خالق و مالک سے، اور اُس (ہولناک) دن سے کانپو جس دن باپ بیٹے کے لیے ایثار نہیں کرے گا۔ (جس دن ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی ہوگی)۔ (سورہ ۳۱۔ آیت ۳۳)

اَب ذرا حساب لگائیے کہ بچوں کے لیے ہم نے دنیا میں کیا کیا جتن کیے ہیں اور اُن کا صلہ بچوں سے کیا کیا پایا ہے اور خالق و مالک کے لیے کتنے کام کیے ہیں اور اُن کا صلہ کیا مل رہا ہے۔ خالق و مالک کہیں بغیر کام کیے ہی تو نہیں نواز رہا، تو اچھا پھر غور کیجیے کہ اگر ہم اُس کے لیے کام کرتے تو وہ ہمیں کتنا نوازتا۔

کائنات، خالق اور مصلحت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ..... وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۰

تعریف اُس اللہ ہی کو زیب دیتی ہے جس نے (تمام کائنات کی تخلیق کی ہے اور ہمارے) آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا ہے۔ وہ ایسے ایسے فرشتوں سے پیام رسانی (اور احکام کے نفاذ) کی خدمت لیتا ہے جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار بازو اور پر ہیں۔ وہ (جس چیز کی) ساخت میں جو اضافہ کرنا چاہتا ہے اضافہ کر دیتا ہے۔ بے شبہ اللہ ہر بات پر کامل قدرت رکھتا ہے۔ (اس کا ہاتھ پکڑنے والا اور ہاتھ روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس کے معاملات قدرت میں کوئی دخل انداز نہیں ہو سکتا) اللہ تعالیٰ لوگوں کے واسطے اپنی رحمت (ورافت کے دروازے) کھول دے تو کوئی دروازے بند کرنے والا نہیں ہے اور بند کر دے تو اللہ کے سوا پھر کھولنے والا کوئی نہیں ہے۔ (اللہ ہی کھولے تو کھولے) وہ زبردست (اور) صاحب حکمت (و تدبیر) ہے۔ (ہر کام کا طریقہ اور اُس کے کرنے نہ کرنے کی مصلحت کچھ وہی خوب جانتا ہے)۔ (سورہ ۳۵ - آیات ۱ و ۲)

دلی میونسپلٹی کی یاد

آج دلی میونسپل کمیٹی کی کہانی سنیئے۔ گھبرائیے نہیں، دلچسپ اور سبق آموز کہانی ہے۔

دلی چودہ علاقوں میں تقسیم تھی۔ ہر علاقے سے دو دو ممبر منتخب کیے جاتے تھے۔ ایک ہندو، ایک مسلمان۔ گویا اٹھائیس ممبروں کا عام انتخاب ہوتا تھا۔ چھ ممبر گورنمنٹ نامزد کرتی تھی، جن میں ایک شیعہ مسلمان لیا جاتا تھا، ایک سکھ، ایک اچھوت، ایک انگریز اور دو سرکاری افسر (سول سرجن اور سپرنٹنڈنٹ آف ایجوکیشن)۔ نامزد ممبروں کے علاوہ چھ ممبر فیکٹریوں اور خاص خاص جماعتوں کی طرف سے آتے تھے۔ پانچ ہندو اور ایک مسلمان۔ فیکٹریاں اور جماعتیں مسلمانوں کی تھیں ہی نہیں۔ خیر میزان چالیس ہوئی۔ سولہ مسلمان، اکیس ہندو۔ ایک انگریز اور دو سرکاری افسر، جن میں سول سرجن ہمیشہ انگریز رہا، سپرنٹنڈنٹ آف ایجوکیشن عیسائی تھا۔ غرض کہ چالیس ممبروں میں اکیس ہندو تھے، تین عیسائی اور سولہ مسلمان۔ عیسائی اور مسلمان مل بھی جاتے تو ہندوؤں کی اکثریت تھی، لیکن آپ شاید تعجب کریں کہ ہندوؤں سے پانچ کم ہونے کے باوجود مسلمانوں کا دلی میونسپل کمیٹی میں غلبہ

تھا۔ ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں کی چلتی تھی۔ علم اور دولت کے اعتبار سے بھی مسلمان ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ مسلمان ممتاز ممبروں میں کوئی ایم۔ اے، بی۔ اے نہیں تھا، ایس ایم عبداللہ، حاجی رشید احمد، حافظ محمد صدیق ملتانی اور شیخ حبیب الرحمٰن، چار ممتاز ممبر تھے۔ صرف حبیب الرحمٰن نے کالج کی شکل دیکھی تھی۔ پانچواں ممتاز ممبر مسٹر آصف علی کو سمجھ لیجیے وہ ضرور بیرسٹر تھے، لیکن کانگریس کی مصروفیتوں کی وجہ سے اُنھیں میونسپلٹی کے لیے وقت نہیں ملتا تھا۔

یہ چاروں معمولی تعلیم یافتہ مسلمان اتنے مدبّر تھے کہ دلّی کلاتھ ملز کے مالک سر شری رام اور اُن کے والد لالہ مدن موہن لال اور برلا ملز کے جنرل مینیجر مسٹر منڈیلیا اور مدن موہن مالوی کا مشٹنڈے لالہ دیش بندھو گپتا اور پروفیسر رام سنگھ جو آجکل صوبہ دلّی کی ہندو مہا سبھا کے کرتا دھرتا ہیں، اور دوسرے ایم۔ اے، بی۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی ہندو اِن کا لحاظ کرتے تھے اور ان کی بات مانتے تھے۔ اِن کے برتاؤ، اِن کی خوش معاملگی اور اِن کی سوجھ بوجھ نے ساری کمیٹی میں اِن کا وقار قایم کر رکھا تھا۔ کمیٹی میں اِن کا ڈنکا بجتا تھا۔

ایس۔ ایم۔ عبداللہ، حاجی رشید احمد، حافظ محمد صدیق مُلتانی، شیخ حبیب الرحمٰن، چاروں خان بہادر تھے، بلکہ رشید احمد اور حبیب الرحمٰن او۔ بی۔ ای بھی تھے، لیکن کیسے او۔ بی۔ ای؟ ڈپٹی کمشنر، جو میونسپل کمیٹی دلّی کا پریسیڈنٹ تھا، اُس کا مُنھ تکنے والے نہیں، انگریز ڈپٹی کمشنر اِن کے مُنھ تکتے تھے۔

آخری انگریز ڈپٹی کمشنر، مسٹر لابیلی کھدر پوش لالہ دیس راج چودھری سے اُلجھ رہے ہیں اور لالہ دیس راج اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔ لابیلی صاحب کو غصّہ آتا تھا تو اپنا پائپ چبانے لگتے تھے۔ چناں چہ پائپ چبنے لگا۔ دیس راج پر اس کا بھی اثر نہ پڑا تو لابیلی نے کہا: WHAT DO YOU SAY, KHAN BAHADUR خان بہادر! آپ کی کیا رائے ہے؟ خان بہادر حبیب الرحمٰن نے جواب دیا۔ دیس راج کی رائے صحیح ہے۔ بس اتنا سُننا تھا، لابیلی صاحب بتاشے کی طرح بیٹھ گئے، اور بولے، اچھا "NEXT ITEM" دوسرا مسئلہ شروع کرو۔

انگریز پریسیڈنٹ نے سیکرٹری میونسپل کمیٹی کو حکم دیا کہ نوٹس جاری کر دو۔ کچھ مشورہ کرنا ہے، سب ممبر فلاں دن، فلاں وقت میری کوٹھی آجائیں۔ خان بہادر

جیب الرحمٰن وائس پریسیڈنٹ تھے۔ پریسیڈنٹ نے اُنھیں نہیں بتایا تھا کہ نوٹس جاری کرا رہا ہوں۔ جب نوٹس موصول ہوا تو جیب الرحمٰن نے بھی سب ممبروں کو اُسی دن اور اُسی وقت کا بلاوا بھیج دیا۔ ممبر (ہندو مسلمان سب) جیب الرحمٰن کے ہاں پہنچ گئے، پریسیڈنٹ کے ہاں ایک بھی نہیں گیا۔ آخر ڈپٹی کمشنر صاحب نے معافی مانگی کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی۔

۱۹۴۶ء میں طے پایا کہ آیندہ ڈپٹی کمشنر میونسپل کمیٹی دلّی کا پریسیڈنٹ نہیں بنایا جائے گا۔ ہندو مسلمان ممبروں نے اتفاق کامل کے ساتھ خان بہادر جیب الرحمٰن کو پہلا ہندستانی صدر چُنا۔

۱۹۴۷ء میں جیب الرحمٰن نے دلّی چھوڑ دی اور پاکستان آ گئے۔ اُس وقت بھی اُن میں اتنی قوت تھی کہ اُنھوں نے اپنے سامنے اپنی پسند کے ہندو، ڈاکٹر یدھ ویر سنگھ کو صدارت کی کرسی دلوا دی تھی۔

علیٰ ہٰذا خان بہادر ایس۔ ایم۔ عبداللہ اور خان بہادر حاجی رشید احمد کے اسی قسم کے بہت سے واقعات ہیں۔

چیف کمشنر کی کوٹھی پر ایک میٹنگ تھی۔ چیف کمشنر نے کمیٹی کے پارٹی لیڈروں کو فورٹ ایریا کے نمایندوں سے پریڈ کے میدان کا قضیہ طے کرنے کے واسطے طلب کیا تھا۔ حاجی رشید احمد نے آنے میں دیر کر دی۔ فورٹ ایریا کے انگریز کرنیلوں اور جرنیلوں نے جلدی مچائی۔ چیف کمشنر نے کہا حاجی صاحب باہر برآمدے میں میرے چپراسی سے جانماز لے کر مغرب کی نماز پڑھ رہے ہوں گے۔ یہ کردار اور کیرکٹر ہی تھا، جس نے چالیس ممبروں کی کمیٹی میں سولہ ممبروں کا سر کبھی نیچا نہیں ہونے دیا۔

خان بہادری کے خطاب سے ذہن اِدھر جاتا ہے کہ انگریزوں کے خوشامدی ہوں گے، لیکن نہیں، اِن کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ خان بہادر ایس۔ ایم۔ عبداللہ جس رات مرے ہیں[۱] اُس کی شام کو باوا بچتر سنگھ ایک نئے ممبر میونسپل کمیٹی نے ایک ٹی پارٹی میں خان بہادر ایس۔ ایم۔ عبداللہ کے ساتھ ایسا گستاخانہ انداز اختیار کیا

---

[۱] ایس۔ ایم۔ عبداللہ نے ترکِ وطن نہیں کیا تھا۔ حاجی رشید احمد اور حافظ محمد صدیق ملتانی پاکستان میں مدفون ہیں۔ (واحدی)

کا ایس۔ ایم عبداللہ اُسے برداشت نہ کر سکے۔ دل کا دورہ پڑ گیا اور اُسی شب میں انتقال کر گئے۔ خوشامدی آدمی اتنا حساس نہیں ہوتا۔ یہ خان بہادر انگریزوں سے جھونک نہیں کھاتے تھے اور انگریزوں کی خاطر ہندو مسلمانوں کو نہیں لڑواتے تھے۔ بحیثیتِ مجموعی دلّی میونسپل کمیٹی میں ان کی موجودگی شہر کی عافیت کی ضامن تھی۔

میرا خیال ہے کاروباری دماغ سیاسی کام وکیلوں اور بیرسٹروں سے بہتر انجام دے سکتے ہیں۔ کاروبار کرنے والوں کو معاملات کے سلجھانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔

مولانا ابوالکلام کی یاد

مولانا ابوالکلام آزاد سے ایک ملاقات تو میری کانپور کے ریلوے اسٹیشن پر ہوئی تھی جہاں سے وہ مجھے اور خواجہ حسن نظامی کو حافظ محمد حلیم، تاجر چرم کی کوٹھی لے گئے تھے۔ اُس دن میں قریباً آٹھ گھنٹے مسلسل اُن کی باتوں سے اور بات کرنے کے غیر معمولی انداز سے لطف اندوز ہو سکا تھا، پھر ملا سیکڑوں دفعہ لیکن اتنی دیر ساتھ بیٹھنے کا موقع میسّر نہیں آیا۔ دوسری دفعہ دلّی میں مولوی عبدالاحد، مالک مطبع مجتبائی کے ہاں مِلا تھا۔

مطبع مجتبائی کی منزل زیریں مطبع اور کتب خانے کے لیے وقف تھی اور اوپر کی منزل میں اُن دنوں مہمان ہی مہمان تھے۔ ندوۃ العلما کا دلّی میں اجلاس تھا، جس کی صدارت کرنے مصر سے علامہ رشید رضا آئے تھے۔ مولانا شبلی، مولوی حبیب الرحمٰن شروانی اور مولانا ابوالکلام آزاد اور خدا معلوم کتنے بڑے بڑے علما مطبع مجتبائی میں مقیم تھے۔ مولانا ابوالکلام کا کمرہ مولانا شبلی اور مولوی حبیب الرحمٰن شروانی کے کمروں کے درمیان تھا۔ ایک طرف مولانا شبلی، دوسری طرف مولوی حبیب الرحمٰن شروانی، صرف دو ہی شخص ایسے تھے جن سے شاید مولانا ابوالکلام کبھی متاثر رہے ہوں، لیکن میں اور خواجہ حسن نظامی کئی مرتبہ مولانا شبلی اور مولوی حبیب الرحمٰن شروانی کے پاس گئے، مولانا ابوالکلام کو ایک مرتبہ بھی اِن دونوں کے کمروں میں قدم رکھتے نہیں دیکھا۔ شام کے وقت سب علما ٹکڑیاں بنا بنا کر صحن میں بیٹھا کرتے تھے، اُس وقت مولانا ابوالکلام بھی باہر نکلتے تھے اور مولانا شبلی اور مولوی حبیب الرحمٰن کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ میری دوسری ملاقات مولانا ابوالکلام سے اِسی شام کی مجلس میں ہوئی تھی۔ دوسری ملاقات کیا، متعدد ملاقاتیں۔ مولانا نہایت کم آمیز انسان

تھے، مگر جب سامنے پڑ جاتے تھے تو بے اعتنائی معمولی تعلق والوں سے بھی نہیں برتتے تھے
شگفتہ بلکہ شوخ ہو جاتے تھے۔ شوخی جوں جوں عمر بڑھتی گئی، بردباری اور ضبط و تحمل میں بدلتی
گئی، شگفتگی آخر عمر تک باقی رہی۔
شوخی کی مثال سن لیجیے۔ اُس زمانے کے ایک مشہور اور ممتاز مقرر تھے، جنھیں بہت
سی تقریریں حفظ تھیں، اکثر ان ہی کو دوہرایا کرتے تھے۔ ندوۃ العلما کے اجلاس میں مولانا
ابوالکلام کے برابر بیٹھا تھا۔ مقرر صاحب نے تقریر شروع کی۔ تقریر کے ابتدائی فقرے سن
کر مولانا ابوالکلام نے یہ کرنا شروع کیا کہ اگلا فقرہ مقرر کی زبان سے بعد میں ادا ہوتا تھا،
مولانا اُسے پہلے کہہ جاتے تھے۔
دوسرا واقعہ اُسی اجلاس کا مولانا کی طباعی اور حاضر دماغی کا نمونہ ہے۔ علامہ رشید
رضا نے خطبہ لکھا نہیں تھا۔ علامہ برجستہ بولے تھے۔ مولانا محمد فاروق چریا کوٹی (اُستادِ مولانا شبلی)
کے ذمے تھا کہ ترجمہ کریں گے۔ مگر ترجمہ کرنے لگے تو متبحر عالم ہونے کے باوجود سٹ پٹا گئے۔
مولانا شبلی نے فوراً مولانا ابوالکلام کو اشارہ کیا۔ مولانا اگلی صف سے اُٹھے اور اسٹیج پر پہنچے اور
حاضرین سے کہا۔ میں الگ الگ فقروں کا ترجمہ نہیں کروں گا۔ صاحب صدر کی تقریر ختم ہونے
دیجیے۔ پوری تقریر کا ترجمہ ایک ساتھ عرض کر دوں گا۔ چناں چہ تیئیس سالہ ابوالکلام نے ایسا مربوط
ترجمہ سنایا کہ بوڑھے اور متبحر علما کو متحیر کر دیا۔

ادھورے مُسلمان

جہاں تک ایمان کا تعلق ہے، کچھ باتوں کو ماننا اور کچھ باتوں کو نہ ماننا خطرناک حرکت
ہے یقینی باتیں اسلام نے بتائی ہیں، اُن سب پر ایمان ہونا مسلمان تسلیم کیے جانے کے لیے
لازمی ہے۔ اعمال میں بھی اس کی اجازت نہیں ہے کہ آپ ادھورے مسلمان بنیں۔ یاایّھا
الّذین اٰمنوا ادخلوا فی السلم کافہ۔ اے مسلمانو! اسلام پورا پورا اختیار
کرو (ادھورا اسلام کافی نہیں ہے) اس آیت کا شانِ نزول یوں بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت
عبداللہ ابن سلام رضی اللہ عنہ کو خیال ہوا کہ اونٹ کا گوشت کھانا فرض تو ہے نہیں، میں اگر
اونٹ کے گوشت سے پرہیز رکھوں تو اللہ کی کتاب توریت پر عمل ہو جائے گا۔ اللہ تعالےٰ
نے فرمایا، بس اتنا ماننا ضروری ہے کہ توریت و انجیل وغیرہ اللہ کی کتابیں ہیں، مگر اب تم ان

کتابوں کے مطابق عمل نہیں کر سکتے۔ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے پیرو ہو گئے ہو تو صرف اُن کے پیرو رہو۔

اونٹ کا گوشت کھانا بے شک فرض نہیں ہے۔ کھاؤ مچا ہے نہ کھاؤ ہندستان اور پاکستان میں بے شمار مسلمان ہوں گے، جنھوں نے اونٹ کا گوشت چکھا نہ ہوگا، لیکن اونٹ کے گوشت سے یہ سوچ کر پرہیز کرنا کہ توریت پر عمل کر رہا ہوں غلط ہے۔ اِس سے ایمان کا چھوڑا پن ظاہر ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا جو شے اللہ نے حلال فرما دی ہے اُسے ہم آپ کیا حرام کریں گے، خود رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم اُسے اپنے اوپر حرام نہیں کر سکتے۔ لم تحرمون ما احل اللہ لک۔

ایمان کی لذت حاصل کرنی ہے تو اسلام کو پورا پورا قبول کیجیے۔

شرک سے بچیے

جن اعمال و اقوال میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر اللہ کی شرکت کا ادنےٰ سے ادنےٰ شائبہ پیدا ہوتا ہو اُن سے ہمیں خود بھی بچنا چاہیے اور دوسروں کو بھی بچانا چاہیے، لیکن اس طرح بچائیے کہ فتنہ سر نہ اُٹھائے، شیطان شرک کے راستے سے تو گھس ہی رہا ہے فتنہ و فساد کے راستے سے بھی نہ گھس آئے۔ لڑئیے مت، محبّت سے سمجھائیے۔ دردمند بن کر سمجھائیے۔ ہمارے اندر لڑنے کی صورت میں وہ لِلّٰہیت کہاں ہوتی ہے جو حضرت ابوبکر صدیقؓ میں منکرین زکوٰۃ سے لڑتے وقت تھی ہم پر نفسانیت چھا جاتی ہے، اور للّٰہیت کی بجائے نفسانیت کا چھا جانا یا للّٰہیت میں نفسانیت کی آمیزش کیا شرک نہیں ہے؟

پھر زکوٰۃ کے انکار میں اور شرکِ خفی میں نیتوں کا فرق ہے۔ کوئی مسلمان قصداً اور ارادتاً شرک نہیں کیا کرتا۔ زکوٰۃ کے لیے اسلامی حکومت آج بھی مسلمانوں سے جنگ کرے تو بالکل ٹھیک ہے زکوٰۃ کے بغیر حکومت کیسے چل سکتی ہے لیکن کفرِ جلی اور شرکِ جلی تک تب ناقابل برداشت ہیں جب اہلِ کفر اور اہلِ شرک آپ سے جبراً توحید پرستی چھڑانی چاہیں، ورنہ انھیں صرف سمجھایا ہی جا سکتا ہے اور وہ نہ سمجھیں تو لکم دینکم ولی دین کہہ کر خاموش ہو جائیے۔

حضور سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلم کا اُسوہ حسنہ موجود ہے۔ حضورؐ تبلیغ کرتے

تھے۔ حضورؐ نے اہلِ کفر اور اہلِ شرک سے لڑنے میں پہل کبھی نہیں کی۔ اُن سے صلحیں رکھیں، اُن سے معاہدے کیے۔

برداشت شرک جیسے اہم ترین معاملے میں اچھی شے ہے تو اور معاملوں میں بدرجہ اولیٰ اچھی شے ہے۔ آپ اپنے خیالات کی اشاعت ضرور کیجیے، مگر ایسی اشاعت کیجیے کہ نتیجہ نکلے اور مقصد فوت نہ ہو جائے۔

پیشوائے اسلام کی تصویریں

سردار بہادر سردار سندر سنگھ دھوپیا دلّی میں بہت بڑے ٹھیکیدار تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے مجھے اپنے سفرِ یورپ کا دل چسپ واقعہ سنایا کہ بیرے سے کہا تھا گائے کا گوشت مت لائیو، وہ گائے کے بچھڑے کا گوشت لے آیا۔ گائے کے گوشت کو انگریزی میں بیف (BEEF) کہتے ہیں اور گائے کے بچھڑے کے گوشت کو ویل (VEAL)۔ سردار بہادر نے بیف کو منع کیا تھا، ویل کو منع نہیں کیا تھا۔ اُس کے ویل لانے میں معصومیت تھی، شرارت نہیں تھی، اُسے کیا معلوم کہ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو گائے کے گوشت اور گائے کے بچھڑے کے گوشت میں فرق نہیں کرتے اور دونوں کا کھانا گناہ سمجھتے ہیں۔

یورپ یا امریکا کے کسی پرچے میں جب کوئی تصویر ایسی چھپتی ہے جسے کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تصویر ہے تو دنیا بھر کے مسلمان چلّا اُٹھتے ہیں کہ ہمارے جذبات مجروح ہو گئے۔ آخر میں اعلان آتا ہے کہ تصویر چھاپنے والے کو خبر نہیں تھی کہ پیشوائے اسلام کی قیاسی اور فرضی تصویر چھاپنا مسلمانوں کے نزدیک بری بات ہے۔ یورپ اور امریکا والے اپنے پیشوا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی قیاسی اور فرضی تصویریں بناتے اور چھاپتے رہتے ہیں اس لیے انھوں نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تصویر بھی بنائی تھی اور چھاپ دی تھی۔ مسلمانوں کو دُکھ پہنچانا مقصود نہیں تھا۔

ہو سکتا ہے کہ گائے کے گوشت اور گائے کے بچھڑے کے گوشت کے قصّے کی طرح یورپ اور امریکا والے واقعی نہ جانتے ہوں کہ حضورؐ کی تصویر کا چھاپنا مسلمانوں کو ناگوار گزرتا ہے، لیکن اسے کیا کیجیے گا کہ اب خود مسلمانوں نے حضورؐ کی تصویر چھاپنے کی ابتدا کر دی ہے۔ نوائے وقت مورخہ ۱۱ اکتوبر ۹۲ء کی اشاعت میں خبر ہے کہ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ اینڈ کلچر، تہران کے

رسالہ گلبانگ کے سرورق پر حضور کی تصویر شایع ہوئی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ ہذا ایرانی وزارت تعلیم کے زیر انتظام قایم ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن۔

کچھ اسلامی فرقوں کے بارے میں

میرے ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء ش کے تاثرات میں ایک فقرہ ہے کہ "مسلمانوں کے مسلّمہ فرقوں کو آپس کے اختلافات پر احتساب نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ اِس سے فتنہ پیدا ہوتا ہے"۔ یہ فقرہ پڑھ کر سول لائنز، گجرات کے ایک صاحب نے مجھے متنبہ کیا ہے کہ "قرآن تو فرقہ سازی اور فرقہ پرستی کو شرک قرار دیتا ہے، پھر مسلمانوں میں مسلّمہ فرقے کہاں سے آگئے"، اور مجھ سے دریافت فرمایا ہے کہ "آپ کہیے' آپ کا کس فرقے سے تعلق ہے"۔

صاحب موصوف میری غلطیاں اکثر بتاتے رہتے ہیں۔ میں ان کی اس بات سے خوش ہوں اور ان کے ہر خط کا براہ راست جواب بھیج دیتا ہوں، لیکن تازہ خط کا جواب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نوائے وقت کے ذریعہ پیش کیا جائے۔

عرض ہے کہ میں اگر علم حاصل کرنے کی عمر میں علم حاصل کر لیتا اور پورا علم حاصل کر لیتا تو یقین کیجیے امام غزالی کی طرح پوچھا کرتا کہ فتویٰ اپنی رائے کے مطابق دوں یا ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور حنبل کی رائے کے مطابق، مگر چوں کہ میرا علم ناقص ہے، علم پر کنٹرول نہیں ہے، مجبور ہوں کہ آئمہ فقہ یا آئمہ حدیث میں سے کسی نہ کسی کا دامن پکڑوں، بالکل اُسی طرح جس طرح مستفسر صاحب نے پرانے نہ سہی، آجکل کے مجتہد کا دامن پکڑ رکھا ہے۔ علم کی کمی کی وجہ سے تقلید مجھے اور مستفسر دونوں کو کرنی پڑ رہی ہے۔ مستفسر صاحب شاید اپنے اُستاد کا اُستاد ہونا نہ مانیں، لیکن میں اقرار کرتا ہوں کہ حضرت امام ابو حنیفہ میرے اُستاد ہیں۔ صرف اُستاد، نعوذ باللہ رسولؐ کے ہم مرتبہ نہیں۔ انھوں نے مجھے رسولؐ تک پہنچایا ہے، رسولؐ سے چھینا نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ سے انحراف کو میں کفر نہیں سمجھتا، کفر اللہ اور اللہ کے رسولؐ سے انحراف ہے۔ میں بس یہ جانتا ہوں کہ امام ابو حنیفہ اور تمام آئمہ فقہ اور آئمہ حدیث، بلکہ میرے زمانے کے بہت سے علما قرآن و حدیث کو میری نسبت زیادہ جانتے تھے۔ اپنے زمانے کے علما کی بابت اِس قسم کے خیال کے معنی یہ نہیں سمجھے جاتے کہ میں نے انھیں رسولؐ کا مرتبہ دے دیا اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہ میں کوئی

اضافہ کر لیا ہے تو علمائے سلف کی بابت اس قسم کے خیال میں کیا حرج ہے۔

میرے نزدیک فرقوں کی حیثیت مختلف اسکولوں اور مختلف مدرسوں جیسی ہے جس طرح علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ اپنے آپ کو علیگ اور کیمبرج یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ کینٹب اور اکسفورڈ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ آکسن کہتے ہیں، اسی طرح میں حنفی ہوں، مگر حنفی ہونے کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتا، مکتب حنفیہ کا خوشہ چین ہونے کے باوجود دین میرا خالص اسلام ہے۔ نہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرتا ہوں اور نہ محمدؐ رسول کے ساتھ کسی کو شریک کرتا ہوں اور نیت یہ ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ہی کا پیرو رہوں۔ حنفی مکتب کی خوشہ چینی نے مجھ میں مالکیوں، شافعیوں اور حنبلیوں اور غیر مقلدوں، حتّٰی کہ مستفسر صاحب کے ہم عقیدگان سے کد پیدا نہیں کی ہے۔ مستفسر صاحب کے امام اور پیشوا کی بات دل کو لگ جاتی ہے تو اسے دل میں جگہ دیتا ہوں۔

مجھے اللہ مسٹر سہروردی جیسی طاقت اور ہمت دے دے تو وہ جس طرح صدارتی آئین کو جمہوریت کا جامہ پہنانے میں کوشاں ہیں، میں ملک کا کونہ کونہ چھانوں اور اس خیال کی اشاعت کروں کہ مذہبی فرقے فرقے نہیں ہیں مکتبۂ خیال ہیں، یا مجھے اللہ صدر ایوب جیسا اقتدار اور موقع عطا فرما دے تو عمر بن عبد العزیز بن جاؤں، جنھوں نے فرمایا تھا کہ صحابہ کے اختلاف رائے سے دین میں راہیں کھل گئی ہیں اور آسانی ہو گئی ہے۔ اصول میں متحد رہو، فروع میں جس صحابی کی تقلید کرو گے وہ ذریعہ نجات ہے، لیکن میں صاحب نفوذ و قوت نہیں ہوں، اس لیے اتنا لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے مسلّمہ فرقے آپس کے اختلاف رائے پر احتساب نہ کریں۔

مسلّمہ فرقوں سے مراد وہ فرقے ہیں جن کی جڑیں اتنی مضبوط ہو چکی ہیں کہ ان کا اکھاڑنا ہمہ شما کے بس کا نہیں ہے۔ ہمہ شما اتنی ہی بات مان لی جائے تو غنیمت ہے کہ آپس کے اختلاف رائے پر احتساب نہ کرو، اس سے فتنہ پیدا ہوتا ہے۔"

میں فرقہ بندی کا ہرگز قایل نہیں ہوں۔ مغربی سیاست نے جو پارٹی بازی ہمیں سکھائی ہے اسے بھی میرا دل قبول نہیں کرتا۔ میرے نزدیک دنیا میں دو ہی فرقے ہیں۔ ایک فرقہ مومنوں کا، ایک منکروں کا۔ اسلامی حکومت کا سربراہ قرآن وسنّت کے مطابق حکومت چلائے اور اس کے مشیر اسے اجرائے احکام میں غلطی نہ کرنے دیں۔

مغربی سیاست میں مشیروں کا کام یہ ہوتا ہے کہ غلط کو صحیح کہیں اور اپوزیشن پارٹیز کا کام یہ کہ حکومت پر قبضہ جمانے کی فکر میں لگے رہیں۔ لیکن میں مذہبی فرقوں کو تو تھوڑا بہت سمجھا دیتا ہوں، سیاسی فرقوں سے کچھ نہیں بول سکتا۔ مصر کے مشہور مصلح عالم شیخ محمد عبدہ کا قول مجھے یاد آجاتا ہے۔ فرماتے ہیں مَادَخَلَتُ السّیَاسَۃُ فِی شیٍٔ اِلَّا اَفْسَدَتْہُ،

میں اُس سیاست کا ذکر کر رہا ہوں جس کی عمارت ذاتی اقتدار اور ذاتی مفادات کی بنیاد پر کھڑی ہے، جس سیاست کی بنیاد میں للٰہیت ہو، اُس کا ذکر نہیں کر رہا، وہ تو عین اسلام ہے

دولت، خطرۂ ایمان

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم فرمایا کرتے تھے کہ مجھے مسلمانوں کے افلاس کا اتنا فکر نہیں ہے جتنا اس کا فکر ہے کہ جب مسلمانوں کے پاس دولت آئے گی تو انھیں اپنے آپ کو قابو میں رکھنا دشوار ہو جائے گا۔

فکر کی بجائے شاید ڈر کا لفظ حضور کی زبان سے نکلا تھا۔ بہر حال اسی سے ملتا جلتا مضمون حدیث کا ہے۔ حضورؐ نے ایک دفعہ فرمایا ہو یا کئی دفعہ فرمایا ہو، مطلب یہی تھا۔

حقیقتاً دولتمندی بڑا امتحان ہے ؎

چوں بہ دولت برسی مست نہ گردی مردی

اور انفرادی دولتمندی تو مسلمان کو قطعی سازگار نہیں ہے۔ انفرادی دولتمندی کا مسلمان پر خاص طور سے بہت خراب اثر پڑتا ہے۔

انفرادی دولتمندی کو اسلام نے حرام نہیں کہا ہے لیکن اسلام چاہتا یہی ہے کہ اُس کے سب ماننے والے خوش حال ہوں، اُس کے ماننے والوں میں شاہ و گدا کا فرق نہ ہے، اسلام قومی خوش حالی کا خواہاں ہے، اس لیے انفرادی دولت مندی مسلمان کے حق میں عموماً دوسروں کی نسبت زیادہ نقصان رساں بن جاتی ہے اور حضورؐ کے فکر یا ڈر کی پیشین گوئی سچی ثابت ہو جاتی ہے۔

انفرادی دولتمندی ہے کیا؟ سب کو خوش حال نہ ہونے دینا۔ حضور نے جو کچھ فرمایا تھا انفرادی دولتمندی کی بابت فرمایا تھا، سب کی خوشحالی تو اسلام کا منشا و مقصود ہے۔

مسلمان اور یہودی

آجکل تباہی ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ کا سماں ہے لیکن مسلمان خصوصیت کے ساتھ تباہ ہیں۔ یہ کیا ماجرا ہے کہ جنھیں سب سے بہتر حالت میں ہونا چاہیے تھا وہ سب سے بدتر حالت میں ہیں، جو بلا اترتی ہے مسلمانوں کو پوچھتی اُترتی ہے ؎

ہر بلائے کز آسماں آید　　گرچہ بر دیگراں قضا باشد
بر زمیں نارسیدہ می پُرسد　　خانۂ انوری کجا باشد

آخر خیر الامت سے اللہ اتنا خفا کیوں ہے؟ دوسری قومیں غلطیاں بھی کرتی ہیں اور سنبھلتی بھی ہیں، لیکن مسلمان غلطیوں پر غلطیاں کیے جاتے ہیں، سنبھلنے کا نام نہیں لیتے۔ گویا انھیں سزا ہی غلطیاں کرتے رہنے کی مل رہی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ مسلمانوں کو خصوصی سزا کیوں دی جا رہی ہے؟

قرآن مجید میں جہاں اور بہت کچھ ہے وہاں قوموں کے زوال کے تذکرے بھی ہیں۔ پڑھیے، جواب مل جائے گا۔ بڑھیا سے بڑھیا قوم جس کو زوال آیا وہ یہودیوں (اسرائیلیوں) کی قوم ہے۔ اسرائیلیوں کی بابت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ (سورہ ۵۔ آیت ۱۲) اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا (کہ تمھیں فلاں فلاں کام کرنے ہیں) اور اللہ نے اُن ہی میں سے (اُن کے) بارہ سردار مقرر کر دیے اور پھر اللہ نے فرمایا کہ (اب) میں تمھارے ساتھ ہوں (اور تم سے تمھاری تائید و نصرت کا عہد کرتا ہوں) "میں تمھارے ساتھ ہوں" کے فقرے کو نہ بھولیے۔ اس کے آگے عہد کا جامع بیان ہے۱، اور ارشاد ہے: فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ (سورہ ۵۔ آیت ۱۳) (بنی) اسرائیل نے اُن عہدوں کو توڑ ڈالا تو ہم نے

---

۱ عہد مختصراً یہ تھا کہ نظام صلوٰۃ قایم کریں گے اور نوعِ انسان کی بہبود کے لیے مالی مدد دیں گے۔ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ (سورہ ۵ آیت ۱۲)

(بھی) اُن کی عہد شکنی کے باعث اُن پر لعنت بھیجی۔ ہم نے اُن کے دلوں کو سخت کر دیا (تاکہ آئندہ غلطیوں پر غلطیاں کیے جائیں)۔

یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت ہیں۔ حضرت موسیٰ اس پائے کے پیغمبر تھے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے تئیں ان کا مثیل کہا ہے۔ حضرت موسیٰ کے علاوہ قوم یہود میں جتنے پیغمبر گزرے ہیں اُتنے پیغمبر اور کسی قوم میں نہیں گزرے۔ حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ علیہم السلام اس قوم کے اجداد ہیں، مگر اتنے اور ایسے ایسے پیغمبروں کی اولاد اور نام لیوا ہونے کے باوصف اور اللہ کی انتہا درجہ محبوب قوم ہونے کے باوجود جب اُس قوم نے اللہ سے باندھا ہوا عہد توڑا تو اللہ نے اُس قوم کو ٹھکرایا بھی اُسی درجے اور اُسی پیمانے سے۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ۔ اُن پر ذلت اور مسکنت طاری کر دی گئی، وہ اللہ کے غضب میں آ گئے۔ جس قوم میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان جیسے عالی مرتبت انسان پیدا ہوتے تھے کہ پیغمبر بھی تھے اور بادشاہ بھی، وہ قوم آج تک حکومت کی سعادت سے محروم ہے اور چند روز سے اُسے چھوٹی سی حکومت ملی بھی ہے تو فقط مسلمانوں کو ڈرانے کے لیے اور سبق سکھانے کے لیے۔ مگر مسلمانوں کی آنکھوں کا پردہ ہے کہ نہیں ہٹتا اور مسلمان وہی تمام باتیں اختیار کیے چلے جاتے ہیں جو یہودیوں نے اختیار کی تھیں اور جن پر یہودیوں کو سزا دی گئی تھی۔ مسلمان بھی اللہ سے باندھے ہوئے نہ جانے کتنے عہد توڑ چکے ہیں۔

اس وقت مسلمانوں کے سوا اللہ سے عہد باندھنے والی اور کوئی قوم نہیں ہے۔ اور قوموں نے عہد باندھا ہوگا تو اپنے خیال اور تصور کے معبودوں سے باندھا ہوگا یا بتوں، پیپل، پہاڑ اور دریاؤں سے باندھا ہوگا۔ لیکن مسلمان اب بھی اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ سے عہد باندھتے ہیں اور پھر اُسے توڑتے ہیں، لہٰذا اللہ کی خفگی غیر مسلموں کے ساتھ ایک نوعیت کی ہے اور مسلمانوں کے ساتھ دوسری نوعیت کی۔ اللہ ہم سے اس طرح خفا ہے جس طرح ہم اپنے بچوں سے خفا ہوا کرتے ہیں۔ ناگواری ہمیں دوسروں کے بچوں کی غلطی سے بھی ہوتی ہے لیکن اپنے بچوں کی غلطی پر ہمارا غصہ بھڑک جاتا ہے۔ انھیں ہم عاق تک کر دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی بے وفائی پر اللہ کا غصہ

بھڑک اٹھا ہے۔ مسلمانوں کو اللہ نے بے مثل ضابطۂ حیات دیا تھا اور اُسے اُن کا نصب العین بنا دیا تھا اور عہد لیا تھا کہ اس ضابطے سے منھ نہیں موڑو گے اور یہ نصب العین حاصل کرنے کی کوشش کرو گے اور کہہ دیا تھا کہ بنو اسرائیل کی مثال تمھارے سامنے ہے۔ ہم عہد شکنوں کے ساتھ بہت سخت ہو جاتے ہیں۔

قرآن مجید اور مثالیں

قرآن مجید میں قرآن کے نزول سے پہلے کے جو واقعات درج ہیں، یہ صرف اس واسطے نہیں ہیں کہ آپ انھیں تاریخی واقعات کی طرح پڑھ لیجیے اور معلومات بڑھا لیجیے؛ یہ اس واسطے ہیں کہ ان سے سبق لیا جائے اور ان سے عبرت حاصل کی جائے۔ قدیم پیغمبروں نے اپنی قوم سے کچھ کہا ہے تو یہ نہ سمجھیے کہ مخاطب بس اُن کی قوم تھی؛ نہیں، آجکل کے مسلمانوں اور نا مسلمانوں کو بھی توجہ دلائی جا رہی ہے، اور قیامت تک کے مسلمانوں اور نا مسلمانوں کی توجہ دلانے کا ان واقعات میں سامان ہے۔ آجکل کے لوگ ذرا اپنے حال پر نظر ڈالیں، شاید اُن ہی سے خطاب ہو۔ مثلاً ارشاد ہے:-

"ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کے پاس بھیجا۔ (انھوں نے ہماری ہدایت کے بموجب قوم سے کہا، بھائیو!) میں تمھیں کھلے طور پر (تمھاری بد اعمالیوں کے نتائج سے) ڈراتا ہوں اور (بتاتا ہوں) کہ اللہ کے سوا کسی کو معبود نہ بناؤ، (نہ اپنی خواہشات کے آگے جھکو اور نہ دیگر غیر اللہ کی دھونس میں آؤ۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو) مجھے ڈر ہے، تم پر ایک دن عذابِ دردناک نازل ہونے والا ہے۔ سردارانِ قوم (گھبرائے کہ اس شخص نے تو ہماری دھونس ختم کی) بولے (جناب!) ہمیں آپ ہم ہی جیسے آدمی نظر آتے ہیں، نیز ہم دیکھتے ہیں کہ جتنے لوگ آپ کی پیروی کر رہے ہیں وہ ہمارے کمین ہیں (ان میں سوچنے سمجھنے کی قابلیت نہیں ہے) سطحی نظر (رکھنے کی وجہ) سے (آپ کے پیچھے ہو لیے ہیں) ہم آپ میں اپنے سے فائق کوئی شے نہیں پاتے، ہمارے نزدیک تو آپ دروغ گو ہیں۔ نوح نے کہا (تم سوچنے سمجھنے کی قابلیت کے مدعی ہو تو تم ہی) غور سے کام لو، مجھے میرے رب نے واضح (اور سیدھے) راستے پر چلایا ہے (جس کی صداقت روشن ہے۔ اللہ نے) اپنے فضل سے مجھے نعمت (پیغمبری) عنایت فرمائی ہے۔ تمھیں ایسی (بدیہی) چیز نہیں سوجھتی (تو اس کا کیا

علاج ہے) اِس حالت میں کہ تم اللہ کی رحمت سے متنفر ہو، اُسے کیوں کر تمھارے دماغ میں بٹھا دوں۔ (میرا کام فقط سمجھانا ہے، ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے)۔ اے میری قوم کے لوگو! میں (تمھاری بھلائی کا خواہاں ہوں اور) اس (بھلائی) کے صلے میں مال و دولت کا طالب نہیں ہوں۔ میرا صلہ اللہ دے گا۔ (ہاں) میں (تمھارے چھینٹے اڑانے سے یا تمھاری خاطر سے) اُن لوگوں کو خارج نہیں کر سکتا جو ایمان لا چکے ہیں۔ تمھیں ایمان لانا ہے تو اُن کی موجودگی میں ایمان لاؤ، یہ تمھارے نزدیک کمین سہی، حقیقتاً) یہ وہ ہیں کہ اپنے رب سے (عزّت کے ساتھ) ملاقات کریں گے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ (ان کے) اِس (شرف) کو تم نہیں جانتے (تم جہالت میں مبتلا ہو)۔ اے میری قوم کے لوگو! میں اِن (غریب مسلمانوں) کو (تمھاری خاطر سے اگر) نکال دوں تو (قیامت کے دن جب مجھ سے باز پرس کی جائے گی، اُس وقت) مجھے اللہ کے مقابلے میں کون مدد دے گا (کیا تم بچا لوگے) کیا تم (اتنی سی بات بھی) نہیں سمجھتے۔

میں یہ دعوا نہیں کرتا کہ میرے قبضے میں اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ (دعوا کرتا ہوں) کہ میں غیب کا حال جانتا ہوں اور نہ یہ (دعوا کرتا ہوں) کہ میں فرشتہ ہوں (لیکن یہ دعوا نہ کرنے کے باوجود) میں اِن (غریب مسلمانوں) کی نسبت جو تمھیں حقیر (و ذلیل) دکھائی دیتے ہیں یہ نہیں کہتا کہ اللہ تعالےٰ اِن پر (کبھی) فضل نہیں کرے گا۔ (اللہ کا فضل تمھاری مصنوعی شرافت پر موقوف نہیں ہے اور میں یہ نہیں مانتا کہ یہ لوگ اندھا دھند ایمان لائے ہیں ان کے دلوں کا حال اللہ جانتا ہے' (میں ان کی نسبت بدگمانی کروں گا تو) یقیناً اس بدگمانی پر میرا شمار ظالموں میں ہوگا۔

سرداران قوم نے کہا۔ اے نوح! بحث تو نے ہم سے کرلی اور بحث بہت کافی کرلی۔ (اب بحث موقوف کرو، اور) سچے ہو تو جس (عذاب کا ڈراوا دیتے ہو اُسے لے آؤ۔

نوح نے جواب دیا۔ عذاب تم پر اللہ چاہے گا تو (ضرور) نازل کرے گا، اور اسے تم عاجز نہ کرسکو گے (اُس کا عذاب روکنا تمھاری طاقت سے باہر ہے) اور (لوگو! اصل حقیقت یہ ہے کہ) میں تمھیں (خواہ کتنی بھی) نصیحت کروں، اللہ کی مشیّت تمھیں گمراہ رکھنے کی ہے تو میری نصیحت تم کو فایدہ نہیں دے گی، وہی تمھارا مالک (و مختار) ہے، اور اُسی کی طرف تمھیں لوٹ کر جانا ہے (بالآخر اُس سے واسطہ پڑنا ہے) (سورہ ۱۱۔ آیات ۲۵ تا ۳۴)

یا ارشاد ہے: علیٰ ہذا ہم نے موسیٰ (علیہ السّلام) کو اپنی نشانیاں اور واضح دلیلیں دے کر فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس بھیجا (انھوں نے انبیائے سابق کی مانند حق پرستی کی تلقین اور باطل پرستی کی مذمت کی، لیکن) فرعون کے ساتھی فرعون ہی کا کہا کرتے رہے حالاں کہ فرعون (گمراہ تھا، اُس) کی کوئی بات صحیح نہیں تھی۔ قیامت کے دن فرعون اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور (اپنے ساتھ پوری) قوم کو (جہنّم کی) آگ میں پہنچائے گا۔ (جہنّم) جس میں یہ لوگ اُتارے جائیں گے بڑی جگہ ہے۔ (مزید برآں) لعنت (اور پھٹکار) اِس دنیا میں بھی فرعون اور فرعونیوں کے پیچھے لگا دی گئی ہے۔ قیامت کے دن بھی (اُن پر لعنت اور پھٹکار کی جائے گی اور دنیا میں لعنت اور پھٹکار ہوتی رہے گی۔ یہ) نہایت خراب انعام ہے جو (اُن کے اعمالِ بد کے بدلے) اُنھیں دیا جائے گا۔ (اے رسولؐ!) مذکورہ بالا واقعات جن کو ہم تمھارے گوش گزار کر رہے ہیں (چند اُجڑی ہوئی) بستیوں کے کچھ حالات ہیں۔ اُن بستیوں میں بعض (اب بھی) قائم (اور آباد) ہیں اور بعض مِٹ گئیں۔ اُن (بستیوں کے باشندوں) پر ہم نے ظلم نہیں کیا تھا، انھوں نے اپنی جانوں پر (خود) ظلم توڑا تھا (ایسی حرکتیں کی تھیں، جن سے ان پر تباہی آگئی) سو (اے رسولؐ!) جب تمھارے رب کا حکم (عذاب) صادر ہوگیا تو جن معبودوں کو اللہ کی بجائے وہ لوگ مدد کے لیے پکارا کرتے تھے وہ اُن کے خاک کام نہ آئے (کام کیا آتے) ان کی بربادی میں (اور) اضافہ کر دیا۔ (اے رسولؐ!) تمھارے رب کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے۔ تمھارا رب بستیوں کو (بداعمالی کے حد سے گزر جانے کے بعد) جب ظلم (اور زیادتیاں) کرنے کی حالت میں پکڑتا ہے تو پھر برباد ہی کر کے چھوڑتا ہے۔ لاریب اُس کی پکڑ سخت ہے اور تکلیف دہ ہے۔ ان (برباد شدہ بستیوں کے واقعات) میں اُس شخص کے واسطے جو عذابِ آخرت سے خوف کھاتا ہے عبرت (کا بڑا سامان) ہے۔ (سورہ ۱۱ - آیات ۹۶ تا ۱۰۳)

قرآن مجید انشاء اللہ صراطِ مستقیم دکھائے گا اگر قرآن مجید کو پڑھتے وقت یہ خیال رکھا جائے کہ ہمارا ذکر تو نہیں ہو رہا اور ہم سے تو خطاب نہیں کیا جا رہا۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ تحقیق اُتاری ہے ہم نے طرف تمھارے کتاب بیچ اس کے مذکور ہے تمھارا کیا پس نہیں سمجھتے تم۔ (ترجمہ حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ)۔ (سورہ ۲۱ - آیت ۱۰)۔ ہمیں اُن لوگوں میں شامل نہ رہنا چاہیے

جن سے اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کہا جا رہا ہے۔

فتح و نصرت اللہ کے قبضے میں

قرآن مجید کی سورہ ۲۲ سامنے کھول لیجیے۔ آیات ۳۸ تا ۴۱ کا مفہوم عرض ہے:
اللہ تعالیٰ (بے دینوں کی ڈالی ہوئی مصیبت سے اہل ایمان کو بچا لے جاتا ہے، اور) اہل ایمان سے مصیبت دور کر دیتا ہے۔ (لیکن ایمان کی شرط ملحوظ رہے) اللہ کسی (دغاباز) خائن اور ناشکرے کا دوست نہیں ہے۔ اہل ایمان کی خوں ریزی کی جائے تو یہ ظلم برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اُنھیں اذن اور اجازت ہے کہ مقابلہ کریں۔ (اور اپنی قلت اور بے سروسامانی سے نہ گھبرائیں) اللہ ان کی مدد فرمانے پر قادر ہے، جنھیں خواہ مخواہ (وطن سے بے وطن اور گھر سے بے گھر کیا گیا تھا) اُن کے گھروں سے بھگایا گیا تھا، صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے اللہ ہمارا پروردگار ہے۔ (اینٹ پتھر ہمارے پروردگار نہیں ہیں)۔ اللہ انسانوں کی زیادتیاں انسانوں ہی کے ہاتھوں سے دور نہ کراتا رہتا تو درویشوں کے خلوت خانے، نصاریٰ کے گرجا، یہودیوں کے معابد اور مسلمانوں کی مساجد سب ڈھا دیے جاتے۔ (اپنی ہستی برقرار رکھنے کے لیے جنگ بھی ناگزیر شے ہے) البتہ (پھر سن لو کہ) اللہ اس کی مدد کرے گا جو اللہ کو مدد دے گا، (یعنی جو اللہ کی خاطر اور بدی کے مٹانے کی نیت سے لڑے گا) اللہ زبردست اور زور دار ہے۔ (مٹھی بھر فاقہ مستوں کو دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں پر غالب کر سکتا ہے۔ بدی کی طاقتیں کتنی ہی مجتمع ہو جائیں نیکی کی مقدس قوت سے اُن کی مدافعت کرائی جا سکتی ہے)۔

اہل ایمان کی تعریف یہ ہے کہ اُنھیں اگر ہم اقتدار بخشیں تو وہ ملک میں نظامِ صلوٰۃ کو فروغ دیں۔ زکوٰۃ ادا کریں۔ بھلائیاں پھیلائیں اور دنیا کو برائیوں سے روکیں، اور (اس بات پر ایمان رکھیں، کہ) تمام کاموں کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے۔ (یعنی کوئی کتنا ہی زور مارے اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ فتح و نصرت اور عزت و حکومت اللہ کے قبضے میں ہے۔ کثرت تعداد اور زیادت دولت و ثروت پر موقوف نہیں ہے)

اسلامی نظامِ معیشت

اسلامی نظامِ معیشت میں بے حد جاذب قلوب چیز دولت کی صحیح تقسیم ہے۔

اللہ پسند نہیں کرتا کہ دولت کچھ خاندانوں میں رُک کر رہ جائے اور کچھ خاندان بھوکے مریں۔ یہ بات قرآن مجید نے صاف صاف بتا دی ہے، اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا عمل اس معاملے میں کیا تھا وہ کتب احادیث میں محفوظ ہے اور اس واقعے سے خوب سمجھا جا سکتا ہے کہ جب حضورؐ کے خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا گیا کہ سابقون الاوّلون بعد کے مسلمانوں کی نسبت زیادہ وظائف کے مستحق ہیں، کیوں کہ انھوں نے کٹھن وقت میں اسلام کا ساتھ دیا تھا، وہ حضور کے مصائب میں شریک رہے تھے۔ انھیں بیت المال سے نسبتاً زیادہ رقمیں ملنی چاہئیں تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا بے شک سابقون الاوّلون کا حق زیادہ ہے، لیکن دولت دنیا میں نہیں، دولت آخرت میں۔ آخرت کا اجر اُن کا منتظر ہے۔ یہاں میں سابقون الاوّلون اور بعد کے مسلمانوں میں تقسیم دولت کے اعتبار سے فرق نہیں کر سکتا۔ دنیا کی دولت عورت، مرد، آزاد، غلام سب پر یکساں تقسیم کروں گا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مشورہ دینے والوں میں تھے، حضرت ابوبکر صدیق نے اُن تک کا مشورہ قبول نہیں فرمایا۔ حضرت عمر فاروق نے خلیفہ ہو کر اپنی رائے کے مطابق عمل کیا، یعنی سابقون الاوّلون کے وظیفے بڑھا دیے اور بعد کے مسلمانوں کے وظیفے نہیں بڑھائے۔ مگر جس سال حضرت عمر فاروق کا انتقال ہوا ہے، اس سال اُن کی رائے بھی بدل گئی تھی۔ کہنے لگے تھے کہ اگلے سال سے وظیفے برابر کر دوں گا۔ رائے ابوبکر ہی کی صحیح تھی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اِس تبدیلی کی ضرورت ذرا کم محسوس کی، اور حضرت علی مرتضےٰ کرم اللہ وجہ حضرت ابوبکر صدیق کی روش واپس لائے تو مخالفوں کو مخالفت کا موقع مل گیا۔ غیر مساوی تقسیم جڑیں پکڑ چکی تھی۔ بہرحال اسلامی نظامِ معیشت دولت کی صحیح تقسیم کا طلب گار ہے ایسی صحیح تقسیم کا جو غالباً روس اور چین میں ابھی نہیں ہے۔

کمیونزم اس اعتبار سے اسلام کے قریب ہے، لیکن اسلامی نظامِ معیشت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بشرطیکہ اسلامی نظامِ معیشت کہیں موجود ہو۔ مسٹر برنارڈ شا کا قول ہے کہ کمیونزم میں خدا پرستی شامل کر لی جائے تو کمیونزم اسلام ہے، مگر افسوس ہم خدا پرستوں نے اپنا ایسا خراب نمونہ پیش کر رکھا ہے کہ کمیونسٹ خدا پرستی کی طرف نہیں آتے۔ یہی بات جو میں کہہ رہا ہوں مولانا عبید اللہ سندھی علیہ الرحمۃ نے روس جا کر اسٹالن سے بالتفصیل کہی تھی اور اسٹالن نے جواب دیا تھا کہ اسلامی نظامِ معیشت کسی جگہ کامیاب کر کے دکھایئے

تو وہ اسے قبول کرے گا۔ خالی خولی باتوں سے کام نہیں چلتا۔

اللہ کی خوشنودی

اللہ کو راضی رکھے بغیر نجاتِ اُخروی حاصل کرنی ممکن نہیں ہے، اور لوگوں کو راضی رکھے بغیر دنیا کا اطمینان حاصل ہونا محال ہے۔ محض عام آدمی ہی کو نہیں، خاص آدمیوں کو بھی، اہل دول اور اہل اقتدار کو بھی۔

لوگوں کو اللہ کی خوشنودی کی نیت سے راضی رکھیے تو دنیا کا اطمینان بھی حاضر ہے اور نجات اُخروی کی بھی توقع ہے۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ ط ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّہٗ ہ لوگوں کو راضی طاقت کے زور سے یا زبان کے زور سے نہیں رکھا جا سکتا، ان کی رضامندی کے سامان فراہم کرنے پڑتے ہیں۔ رضامندی ٹھونسنے کی چیز نہیں ہے۔ رضامندی کے بیج بوئے جاتے ہیں اور رضامندی کے پودے لوگوں کے دلوں میں اُگتے ہیں۔ نفرت و حقارت کی بجائے دلوں میں شکر و سپاس اور احترام کے پھل لگنے چاہئیں۔

حضرت ابوبکر کا فیصلہ

جو صحابہ غزوہ بدر سے قبل ایمان لے آئے تھے، جنھوں نے مشرکینِ مکہ کے ہاتھوں بڑی بڑی تکلیفیں سہی تھیں اور جنھوں نے پہلی جنگ (غزوہ بدر) میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ساتھ دیا تھا، اُن کا مرتبہ اللہ تعالےٰ نے بعد کے صحابہ پر فائق رکھا ہے لیکن کس اعتبار سے؟ صرف عزت اور اجر آخرت کے اعتبار سے۔ دوسرے اعتبارات سے وہ برابر تھے حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی نے جب مشورہ پیش کیا کہ بدری صحابہ کو تقسیمِ دولت میں فوقیت ملنی چاہیے تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا تھا کہ فوقیت عزت اور اجر آخرت کے اعتبار سے ہے۔ کفالت اور تقسیم دولت کے اعتبار سے نہیں ہے۔

حضرت عمر نے اپنے زمانۂ خلافت میں تھوڑی سی فوقیت تقسیم دولت کے اعتبار سے دی تھی لیکن پھر اُن کی بھی رائے یہی ہوئی کہ حضرت ابوبکر کی رائے صحیح تھی۔ آسایش تمام مسلمانوں کو یکساں ملنی چاہیے۔

فطرتِ انسانی بدل نہیں سکتی۔ صحابہ بے شک دنیا کے آرام و آسایش سے بے نیاز

تھے، مگر قرآن صحابہ ہی کے واسطے نہیں اُترا تھا، قیامت تک کے انسانوں کے واسطے اُترا تھا، مگر غیروں سے کیا کہا جائے، مسلمانوں نے حضرت ابوبکر کی پیروی نہیں کی۔

کوئی حکومت چلائے نہیں چل سکتی اگر محکوم اُس سے مطمئن نہ ہوں۔ ہم مذہبوں کی حکومت کا ذکر نہیں، غیر مذہب والوں کی حکومت کی خاطر لوگ جان کی بازی لگا سکتے ہیں، بشرطیکہ لوگ اُس حکومت سے آرام اور آسایش پا رہے ہوں۔ انگریز نہ ہندوؤں کے ہم مذہب تھے اور نہ مسلمانوں کے ہم مذہب، مگر جن ہندوؤں اور مسلمانوں کو ان سے فایدہ پہنچ رہا تھا وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ انگریز ہندستان سے جائیں۔ انگریز اگر سارے ہندوؤں اور مسلمانوں کو آرام اور آسایش پہنچاتے تو اُن کے ہندستان سے جانے کا نام بھی نہ لیا جاتا۔ لیکن بے انتہا سمجھ دار ہونے کے باوجود انگریز تک وہ راز نہ سمجھ سکے جسے حضرت ابوبکر سمجھ گئے تھے۔

اہلِ اقتدار

اہلِ اقتدار تاریخ پڑھتے ہیں اور اپنے زمانے میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ آج اِس کی پگڑی اُتر گئی اور کل اُس کی کرسی چھن گئی، مگر ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ وہ اقتدار کی کرسی پر بیٹھتے ہی اندھے ہو جاتے ہیں، کم از کم عوام انھیں نہیں دکھائی دیتے۔ وہ بدمست ہو جاتے ہیں اور عوام کی پرواہ نہیں کرتے۔ اقتدار کے مزے خود لوٹتے ہیں اور اپنے ہم درجہ و ہم حیثیت طبقے کو لُٹواتے ہیں، عوام کو، عوام کے مسایل کو، اور عوام کے جذبات و احساسات کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ کسی ذی ہوش شخص کا قول ہے کہ جس بُری طرح تاریخ کے سبق آموز واقعات نظر انداز کیے گئے ہیں اس طرح دوسری باتیں نظر انداز نہیں کی گئیں۔

انگریز حاکم کو مشورہ

میں نے دلّی میں ایک انگریز حاکم سے کہا تھا کہ آپ کے مخالف جن چیزوں کی توقع دلاتے ہیں کہ ہم حاکم ہو گئے تو یہ کریں گے اور وہ کریں گے، آپ میں اُن چیزوں کو فراہم کر دینے کی اس وقت طاقت موجود ہے، آپ وہ چیزیں فراہم کیوں نہیں کر دیتے؛ مگر حکومت کی بدمستی کا کیا علاج، سمجھ دار انگریزوں نے عوام کے دل مطمئن نہیں کیے

اور مخالفوں کو کچلنے اور مخالفتوں کو دبانے ہی کی پالیسی جاری رکھی اور بالآخر اس وسیع سلطنت کا چراغ بجھ گیا جس میں آفتاب چوبیس گھنٹے کہیں نہ کہیں روشنی اور چمک ضرور دکھاتا تھا۔

مسلمان اور بنی اسرائیل

یٰبَنِیٓ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَوۡفُوۡا بِعَہۡدِیۡٓ اُوۡفِ بِعَہۡدِکُمۡ ج وَاِیَّایَ فَارۡہَبُوۡنِ ۝ اے بنی اسرائیل! میں نے تم پر جیسے جیسے احسان کیے ہیں انھیں (فراموش نہ کرو، انھیں) یاد رکھو اور مجھ سے جو وعدہ کیا تھا وہ ایفا کر کے دکھاؤ۔ میں بھی اپنا وعدہ ایفا کروں گا (تمھارے عمل کا بدلہ دوں گا۔ تم غیر اللہ سے مت ڈرو) مجھ سے ڈرو۔ (سورہ ۲۔ آیت ۴۰)

اللہ کا یہ خطاب کیا بنی اسرائیل ہی سے ہے۔ اُن مسلمانوں سے نہیں ہے، جنھوں نے پاکستان مانگا تھا اور جنھیں اللہ نے پاکستان دلوا دیا۔ پاکستان مانگتے وقت مسلمان لیڈر اللہ سے قول وقرار کرتے رہتے تھے کہ پاکستان میں تیرا قانون نافذ کریں گے۔ کیا مسلمان لیڈر اُس قول وقرار سے پھر نہیں گئے۔ وہ آج وعدہ ایفا کر دیں تو اللہ آج بھی اپنے قانون کے نفاذ کے نتائج برآمد کرنے کے لیے تیار ہے، لیکن ہم آجکل کی غالب اقوام سے اتنے متاثر اور مرعوب ہیں کہ اللہ کا ڈر ہمارے دل سے نکل گیا ہے، حالاں کہ ڈرنا فقط اللہ سے چاہیے۔

اللہ تعالےٰ بنی اسرائیل سے فرماتا ہے:۔ وَاٰمِنُوۡا بِمَآ اَنۡزَلۡتُ ......

وَاَنۡتُمۡ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ۝ اس قرآن پر ایمان لاؤ جو میں نے نازل کیا ہے، جو تمھارے پچھلے صحیفوں کا مُصدّق ہے، قرآن کے مُنکرِ اوّل نہ بنو (اور اپنے پیروؤں کے انکار کا وبال اپنے اوپر نہ لو) اور چند پیسیوں کی خاطر میری آیتوں کی کاٹ چھانٹ مت کرو (دنیا کے دن اور دنیا کے معاوضے اور فایدے کے دن کے آخر سابقہ مجھ سے پڑنا ہے) میرے غضب سے بچو۔ حق میں باطل کو مت ملاؤ اور حق کو دیدہ و دانستہ چھپاؤ اور دباؤ نہیں، نظام صلوٰۃ قایم کرو۔ زکوٰۃ دو اور رکوع وسجود کرنے والوں کے ساتھ رکوع وسجود کرو۔

یہ کون سی خوبی کی بات ہے کہ دوسروں کو اچھے کام کرنے کی تلقین کرتے ہو اور (اپنے آپ اچھے کاموں سے بھاگتے ہو) اپنے تئیں بھولے ہوئے ہو (دیگراں را نصیحت وخود را فضیحت) تم

تو اس کے مدعی ہو کر کتاب اللہ پڑھتے ہو۔ (پھر یہ بے عنوانیاں کیوں ہیں) سوچتے کیوں نہیں۔ صبر اور صلوٰۃ کے ذریعے (ہماری) مدد حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ (حُبِّ مال اور حبِ جاہ کو مقصود نہ جانو، ضبط کی عادت ڈالو، تحمّل کی مشق بڑھاؤ۔ مصائب کے مقابلے کی قوّت پیدا کرو اور قوّتِ برداشت کو ترقّی دو۔) لیکن صبر و صلوٰۃ پر بھروسہ کرنا ہے کارِ دشوار۔ اِن چیزوں پر وہی بھروسہ کرتے ہیں جو اپنے آپ کو عاجز بندہ سمجھتے ہیں اور جنھیں خیال ہے کہ ایک دن اللہ کے سامنے جانا ہے اور اللہ کے پاس واپس پہنچنا ہے۔

(سورہ ۲۔ آیات ۴۱ تا ۴۶)

اے آجکل کے مسلمانو! کیا اللہ یہ سب کچھ بنی اسرائیل ہی سے کہہ رہا ہے، مجھ سے اور تم سے نہیں کہہ رہا؟

ہم مسلمانوں نے بھی جب اللہ کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کی تھی تو ہم بنی اسرائیل سے زیادہ نوازے گئے تھے، ہمیں اللہ نے بنی اسرائیل سے زیادہ سرسبز و شاداب کیا تھا، اور جب ہم نے اللہ کے قوانین سے بے رُخی برتی اور بے اعتنائی کی تو ہمارا حال اور بنی اسرائیل کا حال جیسا ہے ظاہر ہے۔

اسلامی آدابِ طعام

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم زندگی کے ہر شعبے میں ہمارے لیے ڈگر بنا گئے ہیں۔ اسلام سے پہلے عرب میں دستر خوان بچھا کر کھانا کھانے کا دستور نہیں تھا۔ اسلام نے دستر خوان بچھوا کر تمیز اور سلیقے کے ساتھ کھانا کھانے کا راستہ کھول دیا۔ کچھ عرصے بعد مسلمانوں نے چوکیوں پر رکھ کر کھانا کھانا شروع کیا۔ کھانے کو فرش سے اونچا مسلمانوں ہی نے پہنچایا ہے چوکیوں پر رکھ کر کھانا کھانا مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ مسلمانوں کے ہاں کھانے پینے کے اتنے آداب ہیں کہ انشاء اللہ آجکل کی ترقی یافتہ قوموں کے ہاں اُتنے آداب نہیں ملیں گے۔ بنیاد تمام آداب کی کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا پر ہے، یعنی پاک روزی کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ پھر جو مسلمان اس نیّت سے کھائے پیئے گا کہ زندگی کھانے پینے پر منحصر ہے اور کھانے پینے سے حصولِ علم، عملِ خیر اور راہِ آخرت پر چلنے کی قوت رہے گی، اس کا کھانا پینا عبادت ہے۔ مسلمان کے ہر فعل کا اجر ملے گا، بشرطیکہ وہ عمل حکم باری تعالیٰ کے خیال سے

کیا جائے۔

غیر مسلمانوں کے ہاں کھانا کھانے کے آداب یہ ہیں جو حضرت امام غزالیؒ نے بیان فرمائے ہیں :۔

(۱) کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے چاہئیں، بلکہ وضو کر لیا جائے تو اور اچھا ہے۔ حضور سرور کائنات ؐ کا ارشاد ہے کہ جو شخص کھانا کھانے سے قبل ہاتھ دھو لیتا ہے وہ فقر و فاقہ سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

(۲) کھانا جانوروں کی طرح نہیں کھانا چاہیے کہ جہاں بیٹھے ہیں یا کھڑے ہیں وہاں کھانے لگے۔ کھانا دستر خوان پر یا چوکی پر (یا آجکل میز کرسی کا رواج ہے، میز کرسی پر) کھانا چاہیے۔ (کھڑے ہو کر کھانا کھانا اسلامی شعار اور اسلامی کلچر کے خلاف ہے)

(۳) دستر خوان پر کھائیے تو دایاں زانو اٹھا لیجیے اور بائیں پنڈلی پر بوجھ دے کر بیٹھیے کھاتے وقت تکیے کا سہارا مت لیجیے۔ حضور سرور کائنات ؐ فرماتے ہیں: میں بندہ ہوں، بندوں کی طرح بیٹھتا ہوں اور بندوں کی طرح کھاتا ہوں۔

(۴) حضور سرور کائنات ؐ فرماتے ہیں :۔ اتنا کھانا کھانا چاہیے جو انسان کی کمر سیدھی رکھے زیادہ سے زیادہ ایک تہائی پیٹ کھانے سے بھرا جائے۔ ایک تہائی پانی سے اور ایک تہائی سانس لینے کے لیے خالی چھوڑ دیا جائے۔

(۵) بے بھوک کے کھانا کھانا مکروہ ہے۔ بھوک نہ ہو تو کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھانا چاہیے۔ جو شخص رغبت کی صورت میں کھانا کھاتا ہے اور للدھڑ ہو کر دستر خوان سے نہیں اٹھتا، بلکہ کسی قدر بھوکا اٹھتا ہے، اُسے طبیب کی احتیاج نہیں رہتی۔

(۶) لذیذ کھانوں کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے حقیقی لذت تو بھوک میں ہے۔ بھوک کے وقت جو مل جائے اُسے خوشی خوشی کھانا چاہیے اور اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ روٹی ہے اور لگاون نہیں ہے تو بھی کھا لیا جائے۔ بھوک اور روٹی کی موجودگی میں نماز مؤخر کر دی جاتی ہے۔ پہلے روٹی کھاتے ہیں، پھر نماز پڑھتے ہیں: تو لگاون نماز سے بڑھ کر شے نہیں ہے، جو اُس کا انتظار کیا جائے۔ حضور سرور کائنات ؐ روٹی کا احترام فرمایا کرتے تھے۔ احترام یہی تھا کہ روکھی روٹی کھا لیتے تھے۔ لگاون ہے تو واہ واہ، ورنہ اصل شے روٹی ہے۔ انسان کا قوام روٹی سے ہوا ہے۔

(۶) اکیلے نہیں کسی کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھانا افضل ہے۔ تنہا خوری اچھی بات نہیں ہے۔ حضور سرور کائنات ﷺ کبھی تنہا نہیں کھاتے تھے۔ دسترخوان پر جتنے آدمی ہوتے ہیں اتنی کھانے میں برکت ہوتی ہے۔ کھانا کھانے میں ندیدہ پن نہ جھلکنا چاہیے۔

یہ تو ہوئے کھانا کھانے سے قبل کے آداب۔ کھانا کھاتے وقت کے آداب یہ ہیں:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر کھانے کی ابتدا کی جائے اور ہر لقمے پر بسم اللہ کہا جائے۔ بسم اللہ کہنے کو دوسرے سنیں تو اچھا ہے۔ دوسروں کو اس سے بسم اللہ کہنے کی ترغیب ہوگی۔ جب کھانا کھایا جا چکے تو الحمدللہ کہنا چاہیے۔ تیسری بیچ میں کھانی چاہیے۔ شروع بھی نمکین سے کیا جائے اور ختم بھی نمکین پر کیا جائے۔ لقمہ چھوٹا لینا چاہیے اور اسے خوب چبانا چاہیے۔ ایک لقمہ نگل لیا جائے، تب دوسرا لقمہ اٹھایا جائے۔ کھانا گھبرا گھبرا کر اور جلدی جلدی نہیں کھانا چاہیے۔ کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہیے۔ حضور سرور کائنات ﷺ نے بعض دفعہ بدذائقہ کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا ہے مگر زبان سے کھانے کی مذمت حضور نہیں کیا کرتے تھے۔ کھانا اپنے آگے سے اور رکابی کے کنارے کے پاس سے کھانا چاہیے۔ رکابی کے بیچ میں یا چاروں طرف ہاتھ نہیں دوڑانا چاہیے، اور ایک رکابی میں ایک سے زیادہ آدمی کھا رہے ہوں تب تو چاروں طرف ہاتھ چلانا نہایت نازیبا ہے۔ ایک رکابی میں کئی کئی مل کر کھانا بھی جائز ہے اور الگ الگ رکابیوں میں کھانا بھی جائز ہے۔

میوے کو ہاتھ بڑھا کر اٹھا لینے کی اجازت ہے کیوں کہ میوہ متعدد اقسام کا ہوتا ہے۔ روٹی کنارے سے توڑنی چاہیے، بیچ میں سے نہیں توڑنی چاہیے، اور روٹی اور گوشت کو چھری سے کاٹ کاٹ کر نہیں کھانا چاہیے۔ روٹی کے اوپر روٹی کے سوا کچھ نہیں رکھنا چاہیے۔ روٹی سے ہاتھ نہیں پونچھنا چاہیے۔ نوالہ ہاتھ سے گر پڑے اور صاف رہے تو اسے کھا لینا چاہیے۔ پاکیزہ بھور تک ضایع نہ ہونے دینا چاہیے۔ (ضایع شدہ بھورے ہی جمع کر لیے جائیں تو بہت سے آدمیوں کا پیٹ بھر سکتا ہے)۔ انگلیوں میں کھانا لگا ہو تو انگلیاں چاٹ لینی چاہئیں اور پھر ہاتھ دھونے چاہئیں۔ گرم کھانے کو پھونکیں مار مار کر ٹھنڈا نہیں کرنا چاہیے۔ کھانے کو ٹھنڈا ہونے دینا چاہیے۔ (پھونکیں مارنے سے کھانے میں پھونکیں مارنے والے کے جراثیم داخل ہو جاتے ہیں اور اہل سائنس کو حال میں پتہ لگا ہے کہ گرم چائے پینے سے گلے اور حلق کے اندر کینسر جیسا مہلک مرض جنم لے لیتا ہے)۔

ایسے پھل جن کا گننا آسان ہے طاق کھانے چاہئیں۔ مثلاً ساٹ یا نو یا گیارہ یا اکیس۔
پھلوں کے چھلکے، گٹھلیاں اور بھوک پھلوں کے برتن میں نہ ڈالنے چاہئیں۔ ہاتھ میں بھی نہ
لیے رہیں، دوسرے برتن میں ڈال دیں۔
کھانا کھانے کے درمیان پانی بہ کثرت نہ پینا چاہیے۔

پانی پینے کے آداب

پانی پینے کے آداب یہ ہیں:
کٹورے یا گلاس کو دائیں ہاتھ سے پکڑا جائے اور پانی آہستہ آہستہ تین سانس سے
کر پیا جائے۔ ہر دفعہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر شروع کیا جائے اور ہر سانس پر الحمد للہ
کہا جائے۔ سانس پانی میں نہیں لینا چاہیے، باہر لینا چاہیے۔ پانی پیتے پیتے ڈکار آئے تو منہ پھیر کر
ڈکار لینی چاہیے، پانی میں ڈکار نہ لینی چاہیے۔ پانی کھڑے کھڑے یا لیٹے لیٹے پینا منع ہے، بیٹھ کر
پینا چاہیے۔ پانی پینے سے پہلے دیکھ لیا جائے کہ پانی صاف ہے، اُس میں کوئی چیز پڑی ہوئی
تو نہیں ہے۔ پانی پینے کے بعد کہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَهٗ عَذْبًا فُرَاتًا (الخ)
کم از کم الحمد للہ تو ضرور ہی کہے۔ بسم اللہ اور الحمد للہ مسلمان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ جس برتن سے
پانی پینا ہے اُسے دیکھ لینا چاہیے کہ ٹپکتا تو نہیں ہے۔
کھانا کھانے سے قبل کے اور کھانا کھاتے وقت کے آداب اور پانی پینے کے آداب
آپ نے پڑھ لیے۔ اب کھانا کھانے کے بعد کے آداب ملاحظہ کیجیے:۔
روٹی کے ٹکڑے اور بھورے ضایع نہ ہونے دیے جائیں تو حضور سرورِ کائنات فرماتے
ہیں کہ اس سے رزق میں وسعت ہوتی ہے، اولاد سلامت اور بے عیب رہتی ہے۔ روٹی
کے یہ ٹکڑے اور بھورے حوروں کا مہر بنیں گے۔ برتن کو بھی انگلیوں سے پونچھ لینا چاہیے۔ برتن
اتنا صاف کر دیا جائے کہ اس کا دھونا آسان ہو جائے۔ خلال سے جو غذا نکلے اُسے ناپاک سمجھا
جائے۔ کھانے کے بعد پڑھے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَکَفَانَا وَ
آوَانَا (الخ)

اکلِ حلال کھایا ہے تو خوش ہونا چاہیے اور اللہ کا شکر کرنا چاہیے اور اکلِ حلال
ہونے میں شبہ ہے تو غمگین ہونا چاہیے۔

حضور سرور کائنات ؐ کے زمانے میں صابون، اُبٹنا اور کھلی وغیرہ نہیں تھے۔ ایک مٹی ہے جسے اشنان کہتے ہیں وہ ہاتھ کو صاف کر دیتی ہے، حضور ؐ اُس سے ہاتھ دھوتے تھے۔

مندرجہ بالا آداب تنہا کھانے والوں یا اپنے گھر میں کھانے والوں کے واسطے ہیں کہیں باہر دوسروں کے ساتھ کھانا کھایا جائے تو سات آداب کا اور اضافہ ہو گا۔

(۱) محفل میں جو شخص عمر، علم، عمل اور تقوے میں فایق ہو اُسے کھانا شروع کرنے دیا جائے، خود پیش دستی نہ کی جائے اور وہ فایق شخص تکلف نہ برتے اور دوسروں کو انتظار نہ کرائے فوراً کھانا شروع کر دے۔

(۲) کھانا کھانے میں خاموش رہا جائے، یا اگر بولا جائے تو حکمت و موعظت کی گفت گو کی جائے، اچھے لوگوں کے اذکار سنائے جائیں۔ فضول گوئی اور بیہودہ گوئی تو کسی وقت بھی جائز نہیں ہے۔

(۳) رکابی میں کوئی شریک ہو تو اُس سے زیادہ نہیں کھانا چاہیے دوسرے کا ناحق غصب کرنا بھی حرام ہے اور دوسرے کے لیے ایثار کرنا مستحسن۔ شریک طعام کو بہتر اور زیادہ کھانا کھلانا چاہیے، لیکن اتنا اصرار بھی نہیں کرنا چاہیے کہ وہ پریشان ہو جائے۔

(۴) کھانا ایسی تمیز سے کھانا چاہیے کہ دوسروں کو ناگوار نہ گزرے۔ کھائے کھلائے کھوانے سے بھی تکلیف ہوا کرتی ہے اور کم خوری کا مظاہرہ کرنے کی نیت سے کم کھانا ریا اور گناہ ہے۔ تمیز سے کھانا کھانے کی عادت گھر میں ڈالنی چاہیے۔ تمیز محفلوں کے ساتھ مختص نہیں ہے۔

(۵) کھاتے وقت نگاہ نیچی رکھنی چاہیے۔ دوسروں کو تکنا نہیں چاہیے۔ دوسروں سے پہلے ہاتھ نہیں روکنا چاہیے۔ محفل میں جو بزرگ ترین شخص ہو اُسے کھانا ختم کرنے دیا جائے اور اُس کی تقلید کی جائے۔ کم خور سست رفتار سے کھائے۔ تاکہ آخر تک دوسروں کا ساتھ نباہا جا سکے۔

(۶) کوئی حرکت کھانا کھانے میں اس قسم کی نہ کیجیے جس سے دوسرے گھن کھائیں۔

(۷) طشت یا سلفچی میں ہاتھ دھونے چاہئیں۔ کلّی اس طرح کرنی چاہیے کہ لوگ دیکھ نہ سکیں۔ بزرگوں کو پہلے ہاتھ دھونے دیے جائیں اور جن سے پہل کرنے کے لیے کہا جائے وہ بحث میں وقت نہ کھوئیں۔ طشت یا سلفچی دائیں رُخ سے پھرانی چاہیے۔

چند اور ہدایتیں بھی ہیں:۔

(۱) کھانے کے اوقات میں کسی کے ہاں نہیں جانا چاہیے۔ بن بلائے ایسے شخص کا مہمان بننا فسق ہے، جو آپ سے غیر معمولی تعلق نہیں رکھتا۔

(۲) کوئی کھانے کی صلاح کرے تو صلاح کرتے ہی کھانا نہیں شروع کر دینا چاہیے۔ سوچیے کہ صلاح دل سے ہے یا اوپری۔ جو بے تکلفی سے خوش ہوں اُن سے ضرور بے تکلفی برتیے لیکن دوسرے پر بے تکلفی بار ہو تو اس سے بے تکلفی نہ برتیے۔ دوستوں کو کھانا کھلانا بڑی خوبی ہے۔ ماں باپ کے کھلانے کا حساب لیا جائے گا، دوستوں کے کھلانے کا حساب نہیں لیا جائے گا۔ تاہم کھلانے والے دوستوں کے بھی فرائض ہیں۔

(۳) دعوت کھلانا اور کھانا اتباعِ سنّت اور ازدیادِ محبت کی غرض سے ہونا چاہیے۔

(۴) میزبان کو انتظار نہیں کرانا چاہیے اور میزبان جہاں بٹھلائے وہاں بیٹھ جانا چاہیے زنانہ مکان سے ملحق نہ بیٹھا جائے اور جدھر سے کھانا آرہا ہو اُدھر نگاہ نہ کی جائے۔

(۵) مہمان جب جانے لگے تو میزبان گھر کے دروازے تک جا کر اُسے رخصت کرے۔

آخر میں گزارش ہے کہ آداب ایسی شے نہیں ہیں کہ انھیں کبھی ذرا سا بھی نہ پلٹایا جا سکے۔ جیسا کہ میں کسی مضمون میں غالباً لکھ چکا ہوں کہ مسلمان دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں، جہاں وہ رہتے ہیں وہاں کی خصوصیات کو یکسر نظر انداز کر دینا ممکن نہیں ہے، تاہم بعض خصوصیات ہیں جن سے مسلمان اور نا مسلمان میں امتیاز کیا جاتا ہے ملکی خصوصیات کو اُن خصوصیات سے نہیں ٹکرانا چاہیے۔ دوسرے اس کا خیال رکھیے کہ نقّال تو نہیں بن رہے۔ رسم و رواج میں ہم اپنے ملک کی غیر مسلم اقوام کے مشابہ ہوں تو یہ نقّالی نہیں ہے، ملکی رسم و رواج اور ملکی خصائص کے مسلم و غیر مسلم دونوں حصہ دار ہیں، لیکن دُور پرے کے رسم و رواج اور خصائص مرعوب ہو کر اختیار کرنا ہنسنے کے قابل حرکت ہے، بلکہ رونے کے قابل۔ فرنگی مسلمان میں فرنگیت رہ سکتی ہے، بھارتی مسلمان میں بھارتیت اور پاکستانی مسلمان میں پاکستانیت، مگر ایک ملک کے تھوڑے سے مسلمان دور پرے کے غیر ملکیوں کی خصوصیات کو اپنا نہیں کہہ سکتے۔ فرنگی اور امریکی اور روسی مسلمان کو بھی اپنے ہاں کی ایسی حرکتوں سے اجتناب کرنا چاہیے جیسی بیٹھنے کی جگہ ہوتے ساتے کھڑے ہو کر کھانا کھانے کی حرکت ہے۔ اسلامی کلچر میں لچک ہے لیکن

اتنی نہیں کہ اسلامی کلچر کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا جائے ۔

اِنسان کا محاسبہ

یٰحَسۡرَةً عَلَى الۡعِبَادِ ج ..... جَمِيۡعٌ لَّدَيۡنَا مُحۡضَرُوۡنَ ہ

(مجھے اپنے) بندوں پر بڑا افسوس ہے کہ اُن کے پاس جو رسول (اور ڈرانے والا) پہنچا اُنھوں نے اس کا مذاق ہی اُڑایا۔ کیا (آجکل کے لوگوں کو دکھائی نہیں دیتا کہ ہم ان سے پہلے کتنی قومیں غارت کر چکے ہیں۔ وہ قومیں پھر (نہیں اُبھریں اور) پلٹ کر اِن کے رُوبرُو نہیں آئیں (نام و نشان تک مٹ گیا)۔ ہاں (ایک دن) یہ سب (اگلے اور پچھلے زندہ ہونے والے ہیں اور) ہمارے حضور پیش کیے جانے والے ہیں۔ (گزشتہ قوموں سے بھی محاسبہ ہوگا اور موجودہ قوموں سے بھی محاسبہ ہوگا)۔ (سورہ ۳۶۔ آیات ۳۰ تا ۳۲)

ڈاکٹر سیّد محمود کا ایک واقعہ

پچھلے دنوں پاکستان کے طالب علموں نے دھڑا دھڑ مظاہرے کیے تو مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ میرے چچا زاد بھائی سید منظور احمد مرحوم علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے۔ یکایک وہ علی گڑھ سے دلّی پہنچے۔ میں نے پوچھا خیریت تو ہے۔ بے وقت چھٹی کیسے ملی۔ کہنے لگے اسٹرائک ہوگیا ہے۔ اُس وقت میں واقف نہیں تھا کہ اسٹرائک کسے کہتے ہیں؟ یہ غالباً ۱۹۰۵-۱۹۰۶ء کی بات ہے۔ سرسید احمد خاں کے پوتے سید مسعود (سر راس مسعود) اُس وقت علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے۔ میں نے سوال کیا۔ اسٹرائک کیا بلا ہے؟ منظور احمد بولے، انگریز پرنسپل سے طالب علموں کو چند شکایتیں تھیں۔ طالب علموں نے شکایتیں رفع کرانی چاہیں۔ پرنسپل نے طالب علموں کے لیڈر کا پتّا کاٹ دیا۔ اُسے کالج سے نکال دیا۔ سید محمود اُس لڑکے کا نام ہے اور عرف قوم۔ طالب علموں میں سب سے زیادہ قومی کام کرنے والا لڑکا ہے۔ خیر اُس کے نکالے جانے پر کالج کے تمام لڑکوں نے اسٹرائک کر دیا ہے کہ یا تو محمود کو کالج میں دوبارہ داخل کرو، ورنہ ہم بھی کلاسوں میں نہیں بیٹھتے۔ پڑھاؤ کسے پڑھاتے ہو۔

آپ سیّد محمود کو پہچانے؟ بھارت کے ڈاکٹر سیّد محمود۔ ڈاکٹر صاحب علی گڑھ کالج

میں واپس نہیں لیے گئے تھے۔ انگلستان جا کر بیرسٹر اور پی۔ ایچ۔ ڈی بنے۔ انقلاب ۴۷ء تک کانگریس کے چوٹی کے لیڈروں میں تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ستارہ اقبال ڈوب سا گیا ہے۔ نمایاں اب بھی ہیں، مگر اتنے نہیں، جتنے ہونے چاہییے تھے۔

نماز اور زبان

سول لائنز، گجرات کے جن صاحب نے مجھ سے پوچھا تھا کہ آپ کا کس فرقے سے تعلق ہے اور جنھیں میں نے ۲۷/۱۱/۶۲ کے نوائے وقت میں جواب دیا تھا، ان کا خط پھر آیا ہے۔ اس میں مجھے مشورہ دیا گیا ہے کہ جس طرح کی نماز غیر عرب ملکوں میں پڑھی جارہی ہے (یعنی قرآن مجید کی زبان سمجھے بغیر) اُس طرح کی نماز پر اصرار نہ کیا جائے۔ لکھتے ہیں:

"تاثرات مطبوعہ ۴ ارنومبر میں نماز کو آپ نے ذریعہ نجات بتایا ہے۔ کیا قرآن مجید اس اعتقاد کی تصدیق کرتا ہے۔ نماز تو ایک ذریعہ ہے نیک سیرت اور نیک کردار بننے کا اور فحشا و منکر سے بچنے کا۔ مگر ہزارہا آدمی ہیں جو باقاعدہ نماز پڑھتے ہیں، لیکن اُن کا کردار قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اُنھیں اس تکرار سے کہ نماز ذریعۂ نجات ہے دھوکا ہوتا ہے کہ ہم نماز پڑھ کر جنت کے مستحق ہو گئے ہیں۔ عربی زبان کے الفاظ بغیر سمجھے دوہرا لینا جیسا کہ غیر عربی ملکوں میں ہو رہا ہے کیسے اچھا نتیجہ پیدا کر سکتا ہے۔ میرے خیال میں اس طرح کی نماز پر زور دینا سراسر بے معنی ہے۔"

ممکن ہے بعض اور حضرات نے بھی نماز کو ذریعہ نجات لکھنے کا مطلب یہی لیا ہو کہ میں خالی نماز کو نجات کے واسطے کافی مانتا ہوں۔ خالی اور خالص ذریعہ نجات تو فقط اللہ کا کرم ہے ؎

تو اگر مجھے نوازے تو ترا کرم ہے ورنہ
تری رحمتوں کا بدلہ مری بندگی نہیں ہے

لیکن نماز اچھے اعمال میں پہلی اور بنیادی چیز ضرور ہے۔ نماز پڑھنے سے مسلمان پہچانا جاتا ہے کہ مسلمان ہے اور اسے اللہ سے اور اللہ کے دین سے تھوڑا بہت تعلق ہے۔ جو مسلمان چوبیس گھنٹے میں پانچ دفعہ کر کے چند منٹ نہیں قربان کر سکتا، وہ بچت کا ڈھائی فی صدی کیا قربان کرے گا، رمضان میں بھوکا پیاسا رہنے اور خواہشات کو دبانے کی مشق کیا کرے گا،

اور جہاد کے وقت جان کی قربانی کیا دے گا۔

نماز سے قربانی اور ایثار کی تربیت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نمازیں زیادہ تر غربا اور غیر تعلیم یافتہ طبقے میں محدود رہ جانے کی وجہ سے آجکل بے جان ہیں اور اُن کے وہ نتائج بیّن طور پر نظر نہیں آتے جن کا قرآن مجید نے دعوےٰ کیا ہے۔ مگر غریب اور غیر تعلیم یافتہ طبقے میں بھی بے نمازیوں کی کمی نہیں ہے، ذرا غریب اور غیر تعلیم یافتہ نمازی کا غریب اور تعلیم یافتہ بے نمازی سے مقابلہ د موازنہ کیجیے۔ قرآن مجید کا دعوےٰ سچا ثابت ہو گا۔ نمازی کچھ نہ کچھ بے نمازی کی نسبت بہتر نکلے گا۔

ہر طبقے کے نمازی کا اُسی طبقے کے بے نمازی سے موازنہ کر ڈالیے۔ پاکستان کے سیاست دانوں میں دیکھیے کہ خواجہ ناظم الدین اور مولوی تمیز الدین پر نماز پڑھنے کا کوئی اثر ہے یا نہیں؟ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو جب پھانسی کا حکم ملا تھا تو ان کا صبر و استقلال آپ نے ملاحظہ فرمایا تھا؟ بے جان نماز بھی کچھ نہ کچھ اثر قطعی دکھاتی ہے۔ اثر میں جتنی کمی ہے اُس کا سبب امیر اور تعلیم یافتہ طبقے کا نماز نہ پڑھنا ہے۔ امیر اور تعلیم یافتہ طبقہ نماز پڑھنے لگے، مسجدوں میں آنے لگے اور غریب اور غیر تعلیم یافتہ طبقے کی ٹریننگ کرنے لگے تو نتائج حسب دل خواہ برآمد ہوں گے۔ اسلام کی مکمل عمارت نماز کی بنیاد پر کھڑی کی جاتی ہے۔ ہمارے اعمال کا اللہ کی منشا اور مرضی کے مطابق رہنا نظام صلوٰۃ پر منحصر ہے۔ لہٰذا نماز کو معمولی چیز نہ خیال فرمایئے۔ اُسے چھوڑیے نہیں، اُسے بہتر بنائیے۔ ورنہ یہ بالکل ایسی بات ہو گی جیسے کوئی کہے کہ مسلمانوں کے مسلمان رہنے کا کون سا اچھا نتیجہ نکل رہا ہے، وہ اسلام کی پابندی تو کرتے ہی نہیں، لہٰذا مسلمان رہنے پر زور دینا سراسر بے معنی ہے۔ نماز کی اہمیت کا اس ایک واقعے سے اندازہ لگا لیجیے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نماز کے بعد کے رکن زکوٰۃ نہ دینے کو ارتداد کہا تھا اور زکوٰۃ نہ دینے والوں پر جہاد کیا تھا۔

مفید اور مُضر

آج جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی بابت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ مُضر ہے یا مُفید۔ بیسیوں دفعہ کا تجربہ ہے کہ انسان نے جس چیز کو مُضر سمجھا وہ مفید نکلی اور جس چیز کو

مفید سمجھا وہ مُضر نکلی ہمیں اپنے اعمال اور اپنے کردار پر نظر رکھنی چاہیے اور واقعات اور اُن کے نتائج اللہ پر چھوڑ دینے چاہئیں۔ کسے خبر تھی کہ "روسی ہندی بھائی بھائی" اور "چینی ہندی بھائی بھائی" کی آوازیں عارضی ہیں اور کون جانتا تھا کہ امریکا اور انگلستان جن پر پاکستان ناز کرتا ہے یوں آنکھیں دکھائیں گے۔ بھارت کے ساتھی اور ہمنوا بھارت سے بھر جائیں گے اور پاکستان کے ساتھی اور ہمنوا پاکستان کو دھتا بتائیں گے۔

ایفائے عہد

ایفائے عہد کی اسلام میں کتنی اہمیت ہے، وہ سورہ بقر کی اِس آیت سے ظاہر ہوتی ہے جس کا مفہوم ہے کہ نیکی اسے ہی نہ سمجھو کہ (نماز کے لیے) مشرق یا مغرب کی طرف مُنھ کر لیا، نیکی یہ بھی ہے، یہ بھی ہے اور یہ بھی کہ جب (اللہ سے یا اللہ کے بندوں سے) کوئی عہد باندھا جائے تو اُسے نبھایا جائے۔ سورہ بقر کی آیت لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ (الخ) ملاحظہ فرمائیے۔

سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے، وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا۔ عہد کو ایفا کیا کرو۔ عہد کی بابت (قیامت کے دن) پوچھا جائے گا (کہ ایفا کیا تھا یا نہیں۔)

سورہ نحل میں ہے :-

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ (الخ) جب تم (اللہ سے کسی بات کے پورا کرنے کا قول و قرار اور) عہد (و پیمان) کر لو تو اللہ کے عہد کو (یعنی اُس وعدے کو جو تم نے اللہ سے کیا ہے) پورا کرو اور کبھی عہد شکنی نہ کرو۔ اور (نیز اپنی) قسموں کو اُن کے پکا کرنے (یعنی اللہ کی قسمیں کھانے) کے بعد توڑا نہ کرو۔ (بھلا) ایسی حالت میں کہ تم (کسی بات کے پورا کرنے کے وعدے کا) اللہ کو گواہ کہہ چکے ہو (تو پھر اُس بات کو پورا نہ کرنا اور اللہ کے نام کی پروا نہ کرنا کس قدر نادانی ہے) بے شبہ اللہ تمھارے (تمام) اعمال و افعال سے باخبر ہے (اللہ قیامت کے دن ہر نیکی کی جزا اور ہر بدی کی سزا دے گا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ ہوتے ہی جو خطبہ دیا تھا، اس کا خلاصہ

یہ تھا کہ میں اللہ اور رسولؐ کے احکام کے مطابق کام کروں تو میرے احکام ماننا اور اللہ اور رسولؐ سے رُوگردانی برتوں اور مصالحِ اسلام کے خلاف مجھ سے کوئی کام سرزد ہونے لگے تو مجھے ٹوکنا۔ اللہ اور رسولؐ سے رُوگردانی کی صورت میں میری اطاعت تم پر لازم نہیں ہے۔ ایسی صورت میں تو تم مجھے معزول کر سکتے ہو۔ ہاں میں اسلام کے مطابق منصوبے لے کر اٹھوں تو میرے ساتھ تعاون کرنا تمہارا فرض ہے۔ گویا امیر المومنین اور مومنین کے درمیان معاہدہ ہو گیا کہ میرا عمل اس نوع کا ہوگا اور تمہارا عمل اس نوع کا، پھر امیر المومنین اور مومنین نے عہد کو کیسا ایفا کیا، تاریخ اس کی گواہ ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق کو خلیفہ ہوتے ہی جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ اتنی خطرناک تھیں کہ مومنین یک دلی سے امیر المومنین کی اعانت نہ کرتے تو ضعیف الایمان دہقانی مسلمان تو ارکانِ اسلام کے پیچھے پڑ گئے تھے اور چالاک لوگ پیغمبری کے دعوے کر رہے تھے، لیکن جنھوں نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو قریب سے دیکھا تھا، اور جنھیں حضورؐ نے براہِ راست اسلام سکھایا تھا، انھوں نے حضرت ابوبکر صدیق کی بیعت اس مستعدی سے نبھائی کہ اسلامی نظام بچ گیا، ورنہ اس کے متزلزل ہو جانے میں کسر باقی نہیں تھی۔ امیر المومنین اپنے عہد پر قایم رہے اور مومنین اپنے عہد پر۔ دونوں کا عہد ایک ہی تھا کہ اسلامی نظام برقرار رکھیں گے اور جس ڈگر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ڈال گئے ہیں اس پر چلیں گے۔

مسلمان راعی اور مسلمان رعایا کو ایک دوسرے سے خلفائے راشدین کے زمانے کی طرح وابستہ کر دینے والی چیز قرآن و سنت ہی ہو سکتی ہے۔ وطن، نسل، زبان، سب دوسرے اور تیسرے درجے کی چیزیں ہیں۔ گوند جیسی جوڑ دینے والی چیز فقط قرآن و سنت ہے۔ آجکل کے مسلمان راعی ایک دفعہ اس کا تجربہ کر کے تو دیکھیں۔ راعی اللہ سے اور اللہ کے بندوں سے عہد کریں کہ ہم تمام کاموں میں اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کے طریق کو ملحوظ رکھیں گے، انشاء اللہ رعایا بے چون و چرا اس قسم کے صاحبِ امر کے پیچھے پیچھے چلے گی یعنی عمل کریں، محض ڈھنڈورا نہ پیٹیں۔ محض ڈھنڈورا پیٹنے کا اُلٹا اثر ہوتا ہے۔

مسلمان غیر مسلموں سے بھی معاہدے کر سکتے ہیں اور غیر مسلم معاہدے نہ توڑیں تو انھیں بھی نبھانا چاہیے لیکن غیر مسلموں سے معاہدے کرتے وقت اسلام اور اہلِ اسلام

کی فلاح وبہبود کو نہ بھلایا جائے اور اپنے آپ کو صدقے کا بکرا نہ تصور کیا جائے۔

مغربی و میکاوُلی سیاست میں مکر و فریب، جھوٹ بولنا اور دغا دینا جائز ہے۔ اسلامی سیاست میں کردار نہیں بگاڑا جاتا اور اللہ پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ اللہ کے واسطے دوستی اور دشمنی کی جاتی ہے، ہارنے جیتنے کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اسلامی سیاست میں ہتھکنڈوں، چالاکیوں اور دھوکہ بازیوں کی بجائے راست بازی، انصاف اور ایمان داری ہے۔ اسلامی سیاست اختیار کیجیے، انشاء اللہ ساری اُلجھنیں دُور ہو جائیں گی۔ ہم پاکستانیوں نے سولہ برس ضایع کر دیے۔ سولہ برس میں تو اسلام کی جڑیں خدا معلوم کہاں سے کہاں پہنچ جاتیں۔

پاکستان اور نئی نسل

برِصغیر کے جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اُنھیں ویسے بھی غلبہ حاصل تھا، انھیں پاکستان بنوانے کی محتاجی نہیں تھی۔ پاکستان بنانے کی تائید اور حمایت انھوں نے فقط اِس لیے کی تھی کہ پاکستان بن جائے گا تو مرنے سے پہلے اسلامی شان کی ایک حکومت دیکھ لیں گے۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت تھی وہ کہتے تھے کہ اسلام کے عروج کی خاطر ہم ہندوؤں سے بگاڑنے کو تیار ہیں۔ ہندوؤں کے ہاتھوں تکلیفیں اُٹھانے سے ہمیں صحابہ کرام کی تقلید کا شرف ملے گا۔ لیکن افسوس اسلامی شان کی حکومت دیکھنے کی تمنّا اور حسرت پوری نہیں ہوئی البتہ بھارت کے چار پانچ کروڑ مسلمان ضرور ابتلا اور امتحان میں مبتلا ہیں۔

جن کے وعدوں پر اعتبار کیا گیا تھا اُن کو اللہ نے بلا لیا اور اگر کچھ زندہ ہیں تو ان کے صفحۂ دل سے وعدے مٹ مٹا چکے۔ اب حالت یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے جوان بوڑھے ہوتے جاتے ہیں اور ۱۹۴۷ء کے بوڑھے مرتے چلے جاتے ہیں اور مسلمانوں کی نئی نسل واقف ہی نہیں ہے کہ پاکستان کیوں بنا تھا۔ اور واقف ہے تو اُس "کیوں" کا مذاق اُڑاتی ہے۔ مسلمانوں کی نئی نسل کو ہندستان میں ہندو حکومت نے اپنے رنگ پر کر لیا ہے اور پاکستان میں عیسائیوں کے اسکولوں نے مغربی سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ پاکستان کے نوجوان مسلمان سے بات کیجیے تو اُلٹا سمجھانے لگتا ہے کہ خدارا سیاست اور مذہب کو الگ الگ رکھیے۔

دیکھیے نا ملکہ انگلستان محافظ عیسائیت کہلاتی ہیں مگر انگلستان کی حکومت لادینی ہے۔ مذہبی رسوم گرجا میں ادا کی جاتی ہیں، سیاسی امور پارلیمنٹ اور دفاتر میں انجام پاتے ہیں۔ آج کون مان سکتا ہے کہ اسلام مذہب اور سیاست دونوں کا مجموعہ ہے۔ اگر دنیا کے ساتھ رہنا ہے تو ایسی بات زبان سے نہ نکالیے جو دنیا کے نزدیک انوکھی ہو۔

انگریز سو برس میں جتنی منازل طے نہیں کرا سکے تھے اُن سے زیادہ منازل مشن اسکولوں کی تربیت اور مسلم اسکولوں کی عدم تربیت نے سولہ برس میں طے کرا دی ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں مغربیت کی جڑیں اس قدر کمزور پڑ گئی تھیں کہ انہیں اُکھیڑ پھینکنا ممکن تھا۔ ۱۹۶۲ء میں اُکھیڑنا آسان نہیں رہا ہے اور جو جو دن اور گزریں گے مشکل اور مشکل تر ہوتا جائے گا۔

ایک انسائیکلو پیڈیا میں!

ہمارے بچے کیا پڑھتے ہیں اس کا معصوم سا نمونہ ملاحظہ فرمائیے: کولنز نیو ایج انسائیکلو پیڈیا کے صفحات ۵۷۰-۶۹۲ نکال لیجیے۔ ارشاد ہوتا ہے: "موہامت، بانئ محمڈنزم۔ ایک عرب۔ مکے کی پیدائش۔ ان کے اقوال کو جمع کر کے قرآن ترتیب دے لیا ہے۔" کولنز نیو ایج انسائیکلو پیڈیا نصاب کی کتاب نہیں ہے لیکن ایسی کتاب ہے جسے پڑھنا مغرب زدہ طبقہ بڑائی خیال کرتا ہے اور اُس کے بیانات کو مستند مانتا ہے۔

نیکی اور بدی

اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا ......

...... كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ ؕ (اللہ نے) آسمان سے (حق کا) مینہ برسایا اور (دلوں کے ندی) نالے اپنی وسعت کے مطابق (اُسے لے کر) بہہ پڑے (قبول حق کے بعد قلوب جاری ہو گئے اور باطل کا میل کچیل جھاگ بن کر پانی کی سطح پر آ گیا) پھر (جب بارانِ حق کی کثرت ہوئی تو حق کے پانی کے) ریلے نے (اُس سطحی اور) اوپری جھاگ کو اُٹھا کر (آگے کر) لیا (اور آگے کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا، بالکل اُسی طرح جس طرح دھاتوں کا حال ہے) جنہیں زیور یا (دوسرے) سامان (تیار کرنے) کے لیے

لوگ آگ میں تپاتے (اور گلاتے) ہیں (اُن میں بھی) ویسا ہی جھاگ (یعنی کھوٹ ملا) ہوتا ہے (اور تپانے اور گلانے سے الگ ہوجاتا ہے) اللہ تعالیٰ نے حق وباطل کی (یہ) ایسی مثال دی ہے (کہ ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہے) غرض (پانی کا) جھاگ تو فنا ہوکر مٹ جاتا ہے اور جو چیز کہ لوگوں کے لیے نافع ہے زمین میں جاگزین ہوجاتی ہے۔ (انسانوں میں بھی جو نوعِ انسان کو فائدہ پہنچاتا ہے بقا اُسی کو میسّر آتی ہے۔ لوگو! تمھیں سمجھانے کی خاطر) اللہ کیسی کیسی مثالیں بیان کرتا ہے۔

(سورہ ۱۳ - آیت ۱۷)

یہ آیت بار بار پڑھیے :- وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ . . . . اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (اے مسلمانو!) جب تم (اللہ سے کسی قسم کا قول قرار اور) عہد (وپیمان) کرلو تو اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرو (عہد شکنی تو کسی کے ساتھ بھی اچھی نہیں ہے پھر اللہ کے ساتھ کیسے اچھی ہوسکتی ہے۔ نیز (اپنی) قسموں کو اُن کے پکا کرنے (یعنی اللہ کی قسمیں کھالینے) کے بعد توڑا نہ کرو۔ (بھلا) یہ حرکت کہ تم (کسی بات کے پورا کرنے کے وعدے کا) اللہ تعالیٰ کو گواہ قرار دے چکے ہو (تو اُس بات کو پورا نہ کرنا کس قدر نادانی ہے)۔ اللہ تمھارے (تمام) افعال کو اچھی طرح جانتا ہے (اور ہر نیکی کی جزا اور ہر بدی کی سزا دے گا)۔ (سورہ ۱۶ - آیت ۹۱)

زندگی کا اِرتقا

امیر خانم لاہور کی ایک خاتون ہیں۔ اُنھوں نے اپنی کتاب فلسفۂ زندگی میں انسانی اور حیوانی زندگی کا نقشہ خوب کھینچا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے ہماری زندگی کو پہلے مٹّی میں چھپایا، پھر اُسی کے حکم سے زندگی مٹّی سے نکلتی ہے اور نباتات کی صورت اختیار کرتی ہے، گویا دوسرا قدم اُٹھاتی ہے۔ پھر حیوانات میں اور انسانوں میں آتی ہے۔ اسے تیسرا یا چوتھا قدم کہیے۔ بندر والی تھیوری سے زندگی کی اِن ترقیوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بندر میں اور انسان میں سوائے چہرے کے اور کون سی چیز مشابہ ہے۔ شاید مولانا رومی کا شعر "ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ ام ۔ ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام" مصنّفہ کے پیشِ نظر ہو۔

دارالجزا

خیر اس بحث اور تفصیل میں نہیں پڑتا۔ پانچواں قدم زندگی کا موت کو قرار دیا گیا ہے
زندگی بڑھتے بڑھتے دوسرے عالم میں پہنچتی ہے جو بات مٹی میں رہنے کے وقت حاصل
نہیں تھی، وہ نباتات کی صورت اختیار کر کے حاصل ہوئی، اور حیوانات میں پہنچ کر زندگی
نے اور ترقی کی۔ اور انسان میں پہنچ کر اور زیادہ، اور دوسرے عالم میں پہنچ کر اور زیادہ۔
موت کے بعد بھی ترقی رُکتی نہیں، اہلِ جہنم تک کی آنکھیں زیادہ کھل جاتی ہیں۔ جو وہ
اس عالم میں نہیں دیکھتے تھے وہ اُس عالم میں دیکھ لیتے ہیں۔

جانوروں اور انسانوں میں جتنا فرق ہے، ہر شخص جانتا ہے، لیکن اہلِ جہنم اپنی
حرکتوں کو دیکھنے کے لیے جیسی آنکھیں دارالجزا میں پائیں گے ویسی آنکھیں اُنھیں یہاں
دارالعمل میں میسّر نہیں ہیں۔

انسان کے ہاتھ میں خون بھرا پیالہ دیجیے اور کہیے کہ شربت ہے، پیو۔ انسان
خون اور شربت کا امتیاز کرے گا اور خون نہیں پیے گا۔ خواہ پیاس کے مارے مر جائے،
لیکن انسان دوسروں کا مال لوٹ کر، دوسروں سے سو فی صدی اور ہزار فی صدی نفع
کما کر اور دوسروں کے کھانے میں زہر ملا کر دوسروں کا خون پی جاتا ہے، اُس کی جسمانی
آنکھیں وہ خون نہیں دیکھتیں، مگر دارالجزا میں جو آنکھیں ملیں گی اُن سے وہ خون دکھائی
دے گا، اور پھر اُسی خون، اُسی پیپ اور اُسی غلاظت سے اہلِ جہنم کی مہمانداری کی
جائے گی اور کہا جائے گا کہ تم نے دنیا میں خون کو شربت اور پیپ کو شہد سمجھا تھا۔
تو یہ ہیں تمھاری من بھاتی غذائیں، انھیں کھاؤ پیو۔

عاقبت میں اس قسم کی آنکھیں مل جائیں گی جن پر غفلت کا پردہ نہیں پڑ سکے گا، عاقبت
کی آنکھیں ہر شے کو اُس کی اصلی شکل میں دیکھ سکیں گی۔

انسان جب انسان ہوتا ہے تو نبات پن اور حیوان پن کی بہت سی باتیں پیچھے
چھوڑ دیتا ہے، اسی طرح انسان جب اِس مادی عالم سے جاتا ہے تو یہاں کا ساز و سامان
گوشت پوست اور چمڑے کا قالب یہیں چھوڑ جاتا ہے، عالمِ آخرت میں صرف رُوح
اور رُوح کے اعمال لے جاتا ہے۔

من وسلویٰ اور شہری زندگی

انسان کو کتنی ہی اور کیسی ہی نعمتیں مل جائیں، وہ اُن پر قناعت نہیں کرتا۔ بنی اسرائیل فرعون اور فرعونیوں کے پنجے سے نکل کر اور غلامی سے چھٹکارا حاصل کر کے ایک جنگل میں جا بستے ہیں، وہاں اللہ انھیں ابر کا سایہ رکھ کر دھوپ سے بچاتا ہے۔ من وسلویٰ کھانے کے لیے نازل فرماتا ہے، اور بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے ہیں۔ اللہ بارہ چشمے جاری کر دیتا ہے تاکہ ہر قبیلہ بغیر کشمکش کے پانی لے سکے۔ کھانے، پینے اور رہنے کی طرف سے کامل بے فکری اور اطمینان ہے۔ اعلا قسم کی غذا، اعلا قسم کے پانی، اعلا قسم کی ہوا سے اس قدر تندرست اور مضبوط ہو گئے ہیں کہ فرعون اور فرعونی دوبارہ بھی جی اُٹھیں تو اب انھیں گزند نہیں پہنچا سکتے۔ تربیت اور تعلیم دینے والے حضرت موسےٰ اور حضرت ہارون موجود ہیں۔ فوجی چھاؤنی کی سی زندگی ہے۔ یکایک آسمانی غذا سے جی گھبراتا ہے۔ کہتے ہیں:۔ اے موسیٰ! ہم سے (روز روز) ایک کھانا نہیں کھایا جائے گا۔ اپنے پروردگار سے کہیے کہ (من وسلویٰ کی بجائے) ہمیں ایسی چیزیں کھلائے جو زمین سے اُگتی ہیں، جیسے ساگ ہے، کھیرا ککڑی ہے، گیہوں ہے، مسور ہے، پیاز ہے۔ (حضرت موسےٰ نے) کہا، (ارے نادانو!) ان چیزوں کے عوض جو اعلا ہیں وہ چیزیں مانگتے ہو جو ادنےٰ ہیں (اچھا تمھاری مرضی) چلو شہر چلو (وہاں) تمھاری مطلوبہ چیزیں ہوں گی۔ اور خواری و محتاجی اُن کے پیچھے چمٹا دی گئی۔ (شہری زندگی نے اولوالعزمی کی زندگی کا خاتمہ کر دیا) اور (وہ) اللہ کے غضب میں آ گئے۔

شہری زندگی نے اُن کا اخلاق اتنا گرا دیا تھا کہ بالکل اپنے نفس کے بندے بن گئے تھے۔ اللہ کے احکام سے منحرف ہو جاتے تھے اور ایک دو نسلوں کے بعد تو نوبت بہ ایں جا رسید کہ انبیا کو قتل تک کر ڈالتے تھے۔ (سورہ ۲۔ آیت ۶۱)

جب من وسلویٰ کھایا جا رہا تھا اور چشموں کا پانی پیا جا رہا تھا اور کھلی ہوا میسر تھی تو کہا گیا تھا کہ اللہ کے عطا کردہ رزق کو کھاؤ پیو، اور زمین پر فساد مچاتے نہ پھرو۔ (سورہ ۲۔ آیت ۶۰) لیکن اُنھوں نے بہ غیر معمولی نعمتیں ہاتھ سے دے دیں اور فساد ہی مچایا۔ قناعت نہ کرنے اور فساد مچانے کا نتیجہ ضرور بھگتنا پڑتا ہے، افراد کو بھی اور اقوام کو بھی۔ نتایج تاریخوں میں محفوظ ہیں، مگر بے قناعتی اور فساد پھیلانے کا جن سر پر چڑھتا ہے تو پھر تاریخ کی کون پرواہ کرتا ہے اور پچھلی

قوموں سے کون سبق سیکھتا ہے۔

فتح مکہ پر

حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مکہ فتح کیا، اور اُس مکے میں فاتح بن کر داخل ہوئے جس مکے سے مجبوراً ہجرت کرنی پڑی تھی، تو حضورؐ کی فاتحانہ شان کیا تھی، یہ کہ گردن جھکی تھی اور سورہ فتح کی تلاوت کر رہے تھے۔ اِسے شانِ فاتحانہ کہیے گا یا شانِ عبدیت؟ عبد اپنے آپ کو واقعی عبد سمجھتا ہے تو عبدیت اُس کے دل سے کسی وقت فراموش نہیں ہوتی۔ حضورؐ سے زیادہ احساس عبدیت کسے ہو سکتا تھا۔ وہ الفاظ بھی یاد کیجیے جو اُس دن حضورؐ کی زبان مبارک سے نکلے تھے۔ حضورؐ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہہ نے کہا کہ عثمان بن طلحہ کو کعبے کی کنجی نہ دیجیے۔ اِس سے ابتدائے نبوت میں آپ نے ایک دفعہ خواہش کی تھی کہ ذرا کعبے کا قفل کھول دے تو اس نے صاف جواب دے دیا تھا، اور آپ نے جب فرمایا کہ عثمان! قفل کی کنجی کبھی میرے ہاتھ میں ہوگی اور میں جسے چاہوں گا دوں گا تو یہ بولا تھا کہ قریش کیا اتنے بے جان اور ذلیل ہو جائیں گے، مگر حضورؐ نے فتح مکہ کے دن حضرت عباس سے فرمایا۔ اَلْیَوْمُ یَوْمُ الْبِرِّ وَالْوَفَا۔ آج کا دن اچھا برتاؤ کرنے اور انعام بانٹنے کا دن ہے۔ کنجی حضور نے عثمان بن طلحہ ہی کو عطا کر دی اور ارشاد کیا کہ تم سے کنجی وہ لے جو ظالم ہو (میں ظالم نہیں ہوں)۔ چناں چہ کلید کعبہ آج بھی عثمان بن طلحہ کی اولاد کے پاس ہے۔

پھر اُن تمام عمائد مکہ سے، جنھوں نے تیرہ برس مکے میں ستایا تھا، اور سات آٹھ برس مدینے میں بے چین رکھا تھا، ہجرت کرا کر بھی پیچھا نہیں چھوڑا تھا، خطاب فرمایا کہ "جاؤ تم آزاد ہو، تم سے بدلہ نہیں لیا جائے گا۔"

بنی اسرائیل اور نافرمانی

قوم بنی اسرائیل کو قوم فرعون سے آزادی ملی اور حضرت موسےٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے شام چلے اور راستے میں انھیں من و سلویٰ کھلایا گیا اور من و سلویٰ سے اُن کا جی بھر گیا تو حکم ہوا کہ اچھا فلاں شہر میں جاؤ۔ وہاں تمھاری مرغوب غذائیں ملیں گی۔ خوب فراغت کے ساتھ کھانا پینا، لیکن دیکھو شہر میں اکڑ کر نہ گھسنا، بندوں کی طرح سجدے کرتے داخل ہونا،

اور زبان سے بھی کہنا کہ یا اللہ! ہمارے گناہ بخش دے۔ ہم گناہ بخش دیں گے۔ بلکہ تم نیک ہے تو تمہیں اور نعمتیں عنایت کریں گے (سورہ ۲۔ آیت ۵۸) حضور سرور کائنات کا عمل فتح مکہ کے دن اس حکم کے مطابق تھا۔ یہ شان عبدیت انبیا اور اُن کے مخلص متبعین ہی دکھاتے ہیں۔ ہر شخص کو اپنے آپ پر اتنا قابو کہاں ہے۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے دن اسلامی لشکر کے سالار تھے۔ انھوں نے مکے میں داخلے سے پہلے کہیں کہہ دیا کہ آج گھمسان کا دن ہے۔ آج کعبے میں خوں ریزی جائز ہے۔ حضورؐ نے فرمایا، نہیں آج کعبے کی عظمت کا دن ہے۔ اور یہ فرما کر عَلَم اُن سے لے لیا اور اُن کے بیٹے کو دے دیا کہ تم سالاری کے قابل نہیں ہو، تم چڑھائی باتیں کرتے ہو۔

حضرت موسےٰ کی قوم نے حسب معمول نافرمانی کی تھی۔ سورہ ۲۔ آیت ۵۹ میں نافرمانی کا ذکر ہے۔ حکم تھا کہ شہر میں حِطَّۃٌ کہتے داخل ہونا، یعنی اللہ سے گناہوں کی معافی مانگتے، وہ شہر میں داخل ہوئے حِنطَۃٌ کہتے، یعنی گیہوں، گیہوں پکارتے۔

حسن نظامی، اجمل خاں اور محمد علی

لیڈر قسم کے تین بڑے آدمیوں سے میرے تعلقات بہت زیادہ رہے ہیں۔ ان تینوں کی وجہ سے مجھے آج کل کے لیڈروں کے ماموؤں، چچاؤں اور داداؤں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مثلاً محمد علی چودھری آف بوگرا کے دادا نواب علی چودھری کو میں نے دیکھا ہے۔ آج کل کے لیڈروں کی صورت نہیں پہچانتا، لیکن پچاس پچپن برس پہلے کے لیڈر، مولوی اور مشایخ خوب یاد ہیں۔ سب خواجہ حسن نظامی، حکیم اجمل خاں اور مولانا محمد علی کے پاس آتے تھے اور مجھے اُن کے دیکھنے کا اچھی طرح موقع ملتا تھا۔ خصوصاً مولانا محمد علی کا گھر ہندو مسلمان لیڈروں کا مرکز تھا، اور گھر دلی میں میرے اور مولانا کے آمنے سامنے تھے۔ ہر وقت کا آنا جانا۔ جمعہ کی نماز پڑھ کر اور جامع مسجد میں تقریر کر کے مولانا سیدھے میرے ہاں تشریف لایا کرتے تھے اور پھر قریباً عشا تک ٹھہرتے تھے۔ میں خدا معلوم اُن کے ہاں ہفتے میں کتنے پھیرے لگاتا تھا۔ اتنا قریب سے دیکھنے کے باوجود مجھے مولانا محمد علی میں سوائے غصے کی زیادتی کے کوئی عیب نظر نہیں آیا۔ اور غصے کو عیب کہنا بھی غلط ہے۔ غصے نے مولانا سے وہ وہ کام کرا لیے جو غصہ نہ ہونے کی صورت میں شاید انجام نہ پاتے۔

حکیم اجمل خاں کی لیڈری پر طبابت اور حذاقت غالب تھی۔ خواجہ حسن نظامی کی لیڈری پر پیری اور ادبیت غالب تھی۔ مولانا محمد علی خالص لیڈر تھے۔ پیدائشی لیڈر (BORN LEADER) اُن کی لیڈری اُن کی دوسری قابلیتوں پر چھائی ہوئی تھی۔ کسی کو دولت لیڈر بنا دیتی ہے۔ کسی کو خاندانی اثر و رسوخ۔ کسی کو انگریز لیڈر بنا دیتے تھے اور اب بھی بناتے ہیں۔ مولانا محمد علی کو اللہ نے لیڈر بنایا تھا۔ جیسے لیڈر تحریکِ خلافت کے دور میں دیکھ لیے ویسے لیڈر اب نہیں دکھائی دیتے۔ خلافت کے دور کا چھوٹے سے چھوٹا لیڈر مخلص تھا اور مولانا محمد علی تو بانیٔ تحریکِ خلافت تھے، اور اُس تحریک کے عظیم ترین لیڈر تھے۔ بحیثیت لیڈر اُن کا مرتبہ مسلمانوں ہی میں نہیں ہندوؤں میں گاندھی جی کے بالکل برابر تھا۔

مسلمانوں میں سیاسی بیداری

مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کی ابتدا مولانا حسرت موہانی وغیرہ نے کر دی تھی۔ مگر کامیابی نہیں ہوتی تھی۔ کامیابی کا سہرا مولانا محمد علی کے سر پر بندھا، اور اُن کے بعد مولانا ابوالکلام اور مولانا ظفر علی خاں کے سر پر۔ مولانا ابوالکلام نے خواص کو متاثر کیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے عوام کو جھنجھوڑا، اور مولانا محمد علی نے خواص و عوام دونوں کو جگایا اور انگریزوں کے ساختہ لیڈروں کا چراغ بجھا دیا۔

رہنماؤں کے اوصاف

مولانا محمد علی جامع صفات لیڈر تھے۔ مولانا حسرت موہانی کا سا خلوص، شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی سی دین داری، علامہ اقبالؒ کا سا تفکر، حکیم اجمل خاں کی سی فراست اور نہ جانے کیا کیا اوصاف اکیلے مولانا محمد علی میں جمع تھے۔ دنیا سے جلد نہ چلے جاتے تو دنیا کا نہ سہی ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی دین سے بے گانہ نوجوانی میں بھی نہیں تھے لیکن مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا مرید ہو کر دونوں بھائیوں نے ظاہری وضع قطع اور شکل صورت بھی مسلمانوں کی اختیار کر لی تھی، یعنے کہ ڈاڑھیاں رکھ لی تھیں۔ ڈاڑھیاں ان کی دیکھا دیکھی ڈاکٹر انصاری اور مسٹر آصف علی وغیرہ نے بھی رکھیں، مگر اُن کی ڈاڑھیاں منڈ گئیں۔ ان دونوں بھائیوں کی ڈاڑھیاں تا دمِ مرگ سلامت رہیں۔ دونوں بھائی اسلام کے پورے پابند تھے۔

مولانا محمد علی میں تصنع نہیں تھا۔ دل اور زبان ایک تھی۔ ضابط، صابر اور راضی برضا مسلمان تھے۔ بیٹی کو ٹی۔ بی ہو گئی۔ چھندواڑے کی قید کا زمانہ تھا۔ بیٹی کے علاج اور تیمار داری کے لیے بھی نہیں چھوڑا گیا تو مولانا نے بیٹی کے نام خط لکھا۔ خط منظوم تھا۔ اُس کا ایک شعر ہے سے

تیری صحت مجھے مطلوب ہے، لیکن جو اُسے
نہیں منظور، تو پھر مجھ کو بھی منظور نہیں!

راضی برضا کا اِس سے آگے کون سا درجہ ہے۔

غصے سے کبھی کبھی مغلوب ضرور ہو جاتے تھے، لیکن غصے کے متعلق بھی مولانا ہی کا ایک شعر سُن لیجے۔ فرماتے ہیں سے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے!!
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے!

ویسے باغ و بہار انسان تھے۔ خشک سیاسی مباحث کو خشک نہیں رہنے دیتے تھے۔ میں نے ایک دفعہ کہا۔ آپ کا فلاں مضمون طویل بے حد ہے۔ فرمایا۔ مگر بوجھل نہیں ہے۔ واقعی مولانا کی تحریر اور تقریر سے انسان اُکتاتا نہیں تھا۔

حاکم کے فرائض

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ فقرہ اس قابل ہے کہ مسلم اور غیر مسلم، جملہ حکام اُسے لکھوا کر اور فریم کرا کر اپنے اپنے کمروں میں آویزاں کر لیں۔ فرماتے ہیں، "لوگو! اللہ نے مجھے اس بات کا ذمہ دار بنایا ہے کہ میں اللہ کے حضور جانے والی دعاؤں کو روکوں۔"

مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگ دعائیں کرنا اور اللہ سے مانگنا چھوڑ دیں مطلب یہ ہے کہ میں اس بات پر مامور ہوں کہ لوگوں کو ظالموں سے بچاؤں اور مظلوموں کو مجبور نہ ہونے دوں کہ اللہ سے انصاف کے طالب ہوں اور لوگوں کو اتنا مستغنی کر دوں کہ ہر وقت حاجات اور ضروریات ہی کی دعائیں نہ مانگتے رہیں۔ اللہ سے مانگنے کی اور بہت سی چیزیں ہیں۔ مظلوم نے اللہ کو پکارا اور انسان حاجات اور ضروریات کے لیے فریاد کو اُٹھا تو حاکم کی خیر نہیں ہے، حاکم سے باز پرس کی جائے گی کہ تو کس مرض کی دوا تھا۔ ہماری نیابت سنبھل نہ سکتی تھی تو نیابت کی گدی پر کیوں بیٹھ گیا تھا۔ غیر مسلم حکام شاید کہہ دیں کہ سرکار اچھاں سو، وہاں سوا سو، ہمیں تو جہنم کا کندہ

ہونا ہے لیکن مستقم حکام کیا کہیں گے۔

حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی حدیث ہے کہ جسے اللہ عزوجل مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنائے (اُسے لازم ہے کہ واقعتاً نگرانی کرے) وہ اگر مسلمانوں کی محتاجی اور فقر سے بے پرواہ رہا تو اللہ خود (اُس نگراں کو محتاج اور فقیر کر دے گا اور) اُس کی محتاجی اور فقر کی پروا نہیں کرے گا۔ ایک اور حدیث ہے کہ جس کو اللہ نے حکمراں بنایا اور اُس نے محکوموں کی پوری پوری خیر خواہی نہیں کی وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکے گا۔

کچھ اپنی کچھ دلّی کی یاد

میں ۱۷، رمضان ۱۳۰۵ ہجری کو پیدا ہوا تھا۔ ستتر سال سے جی رہا ہوں۔ پیدا ہوا دلی میں، لیکن ہوش سنبھالا کانپور یا اٹاوہ کے کسی جنگل میں۔ میرے والد محکمہ نہر کے اسسٹنٹ انجینئر تھے۔ گاؤں سے بھی دور، نہر کے کنارے، ایک تنہا کوٹھی تھی، اُسی میں والد صاحب کا دفتر تھا اور اُسی میں ہم سب کا قیام تھا۔ کوٹھی کا کمپاؤنڈ بے حد وسیع تھا۔ کمپاؤنڈ کیا تھا، آموں اور امرودوں کا طویل وعریض باغ تھا۔ دن بھر اُدّا کی دال اور ہٹی ہٹی بجّاں بولنے والے مزدوروں، ٹھیکیداروں اور عملے کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ رات کو عملے کے کچھ آدمی خیموں میں بغرض حفاظت سوتے تھے۔ سواری کے لیے گھوڑے تھے۔ دودھ، دہی، گھی، مکھن کے لیے بھینسیں تھیں۔ سچ مچ دودھ کی نہریں بہتی تھیں۔ ہوش سنبھالا تو اپنے آپ ہی کو سب کچھ پایا اور اپنی کوٹھی ہی کو دنیا سمجھا۔ چھ سال کی عمر تھی، جب پہلی دفعہ دلّی دیکھی۔ دلّی کا باؤلوں کی طرح حیران ہو ہو کر دیکھنا یاد ہے۔ دس سال کی عمر تک دلّی کے متواتر پھیرے کیے۔ لیکن دس سال کی عمر میں مجھے اور میری والدہ کو مستقل طور سے دلّی چھوڑ دیا گیا، کیونکہ جنگل میں تعلیم کا وہ انتظام ممکن نہیں تھا جس کی اب ضرورت تھی۔ پھر باون سال دلّی میں ایسے مسلسل گزرے کہ جنگل کی کوٹھی کی طرح دلّی میری دنیا بن گئی۔ میں نے باقی دنیا نہیں دیکھی، یا دیکھی تو نہ دیکھنے کے برابر دیکھی۔ دنیا کو پڑھا، دنیا کو آنکھوں سے نہیں دیکھا۔

دلّی آکر پتہ چلا کہ ہم ہی ہم نہیں ہیں، اور بھی ہیں۔ اونٹ پہاڑ تلے پہنچ گیا۔ آہستہ آہستہ اپنی اور مسلمان قوم کی خستہ حالی کا احساس ہونے لگا۔ احساس دلّی پہنچنے سے پہلے شروع ہو گیا تھا۔ ایک روز میرے والد اور انگریز اگزکٹو انجینئر اس شان سے جا رہے تھے کہ انگریز

گھوڑے کے اوپر سوار تھا اور والد اپنے گھوڑے سے اُتر کر انگریز کے ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ گھوڑا موجود تھا، لیکن انگریز سے گھوڑے پر سوار ہو کر بات نہیں کر سکتے تھے۔ یہ انگریز کی گستاخی تھی، میں نے اِسے محسوس کیا۔

دلی پہنچا تو وعظ کی محفلوں اور تقریر کے جلسوں سے واسطہ پڑا۔ واعظوں کو تو یہی کہتے سنا کہ دُنیا سے دل نہ لگاؤ، حالانکہ واعظ اپنے آپ دُنیا سے خوب دل لگاتے تھے لیڈروں نے البتہ بتایا کہ مسلمانوں کی حالت کبھی اچھی بھی تھی۔ اب خراب ہو گئی ہے۔ اقبال زوال سے بدل گیا ہے، لیکن لیڈر خوب بے شک اقبال کی طرف بڑھے، مسلمانوں کو اور زوال کی طرف دھکیل گئے ہیں ابتدا میں ہر لیڈر کے متعلق سمجھتا تھا کہ یہ مقرر، یہ لیڈر، یہ مُصلح ہمیں قعرِ مذلت سے قطعی نکال لے جائے گا۔ پھر تجربہ ہوا کہ لیڈر بھی دوا نہیں کرتا، مرض کو بڑھاتا جاتا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد کی قسم کے واعظ اور مقرر چند ہی نظر سے گزرے، عام واعظوں اور مقرروں سے عقیدت جاتی رہی۔ جو علما دینی مدرسوں میں اور جو ٹیچر اور پروفیسر اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم دیتے ہیں وہ مجھے پسند ہیں، اور جو وعظ کہتے اور تقریریں کرتے پھرتے ہیں اُن سے طبیعت گھبرا گئی۔

ساٹھ ستر برس قبل دلی کے خواص دلی کے عوام کے ساتھ جتنا سلوک کر دیا کرتے تھے، وہ سلوک ۱۹۴۷ء کے بعد کیا رہا ہوگا، ۱۹۴۷ء میں بھی نہیں رہا تھا۔ ساٹھ ستر برس قبل دلی کے عام مسلمان آپ بھی اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی طاقت رکھتے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں ہنر تھے۔ ساٹھ ستر برس قبل اُن کے ہنروں کی سرپرستی کی جاتی تھی۔ بعد میں قدیم اُمرا کی بجائے نئے اُمرا اُبھرے، جنھوں نے سرپرستی کی بجائے ہنروں کو مٹا دیا۔ وہ تجارت پیشہ اُمرا تھے، انگلستان اور یورپ کے دوسرے ملکوں کی مصنوعات مسلمان دست کاروں کی مصنوعات کے مقابلے میں لا کر بیچنے لگے اور دست کاروں اور دست کاری کا خاتمہ کر دیا۔

ساٹھ ستر برس قبل کم از کم سکون میسّر تھا۔ صرف اونچے طبقے کے مسلمانوں کو وضع نبھانی مشکل تھی، اُن کے اثاثے ۱۸۵۷ء میں لُٹ گئے تھے، باقی اوسط طبقہ اور نچلا طبقہ نسبتاً بہت مطمئن تھا۔ تھوڑا کھاتے تھے اور سُکھی رہتے تھے۔ سستا سماں تھا۔ سات آٹھ پیسے سیر خالص دودھ، سات آٹھ پیسے سیر تندرست بکری کا گوشت، رُپے کا ڈیڑھ پونے دو سیر اصلی گھی۔ بیس سیر اعلا درجے کے گیہوں، چار پانچ سیر اعلا درجے کے چاول۔ خیر خالص اور نقلی کا ذکر فکر نہیں

تھا۔ چار آنے گز بڑھیا لٹھا، چار آنے گز بڑھیا ململ۔ ٹھنڈی شیروانی ڈھائی تین رُپے میں تیار ہو جاتی تھی۔ رُپے سوا رُپے کا کپڑا۔ ڈیڑھ، پونے دو رُپے سلائی۔ کرتے پاجامے گھروں میں سلتے تھے۔ دِلی کی آبادی لاکھ سوا لاکھ تھی، شاید اس سے بھی کم ہو۔ جن سڑکوں پر اب پیدل اور سواری میں نکلنا مشکل ہے اُن سڑکوں پر لوگ مونڈھے اور کرسیاں ڈال کر بیٹھتے تھے۔ شہروں کی بے حد و حساب آبادی دلوں کا سکون کھو دیتی ہے۔

نچلا طبقہ

بہر حال نچلا طبقہ موجودہ زمانے کی نسبت مگن تھا اور زیادہ تعداد نچلے طبقے کی ہوا کرتی ہے۔ نچلا طبقہ مگن ہے تو ساری قوم مگن ہے۔ نچلا طبقہ بے چین ہے تو زر و جواہر میں کھیل کر بھی آپ کو چین نہیں مل سکتا۔ بے چین ہی رہیئے گا۔ یہ نچلا طبقہ ساٹھ ستر برس میں آسمان سے زمین پر آگرا۔ اونچا طبقہ بے چین ہے مگر نچلے طبقے کو اُٹھانے کا خیال نہیں کرتا۔ اُسے بے چینی قبول ہے لیکن یہ قبول نہیں ہے کہ دولت مند سے دولت مند تر ہونے کی رفتار بگڑ جائے۔ ساٹھ ستر برس میں اگر کسی چیز نے ترقی کی ہے تو فقط اس رفتار نے کی ہے، اور اوسط طبقہ جسے ریڑھ کی ہڈی کہا جاتا ہے وہ تو مٹ ہی گیا۔ اب یا نہایت دولت مند ہیں یا نہایت افلاس زدہ۔

میں عنقریب اللہ کے ہاں جانے والا ہوں۔ افسوس ہے کہ میں اپنے پیش روؤں اور اپنے سے پہلی نسل کو یہی خبر دوں گا کہ مسلمانوں کی حالت تمہارے زمانے سے بھی بدتر ہے۔ اور بہتری کے مطلق آثار نہیں ہیں۔

شاہ جہان کا زمانہ

میں کبھی شاہجہان کے زمانے کا تصوّر جماتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے مسلمان کتنے خوش نصیب تھے۔ شاہجہان کا زمانہ ہندوستان میں مسلمانوں کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ ہندوستان پر مسلمانوں نے آٹھ سو برس حکومت کی، لیکن جو اطمینان شاہجہان کے زمانے میں تھا وہ نہ شاہجہان سے قبل دکھائی دیتا ہے اور نہ شاہجہان کے بعد، شاہجہان کے زمانے میں مسلمانوں کا ایسا اقبال تھا جس کے بعد زوال شروع ہو جاتا ہے۔ شاہجہان کو اللہ تعالیٰ نے دین و دنیا دونوں کی نعمتوں سے نوازا تھا۔ اُس کے جشنِ ماہتابی میں بھی آپ

نقش نہیں پائیں گے۔ اُسے شوق جامع مسجد اور روضہ تاج محل جیسی عمارتیں تعمیر کرنے کا دیا گیا تھا۔ خیر شاہ جہان کا زمانہ مسلمانوں کی انتہائی خوش نصیبی کا زمانہ تھا اور جو زمانہ ہمیں اور آپ کو نصیب ہوا ہے اُس سے زیادہ بد نصیبی کا زمانہ بحیثیت مجموعی ممکن ہے آگے آئے۔

گراوٹ یہی نہیں ہے کہ مسلمان مفلس ہیں، گراوٹ در حقیقت یہ ہے کہ ہم دین سے بالکل بیگانہ ہو گئے ہیں۔ اُلٹے سیدھے اسلام کا دامن بھی ہم نے چھوڑ دیا ہے۔ ہمارا کیرکٹر اسلامی نہیں رہا ہے۔ مفلسی نے ہماری صورتیں اتنی مسخ نہیں کی ہیں جتنی بے دینی نے سیرتیں مسخ کر دی ہیں، ساٹھ ستّر برس قبل ہم اتنے مسخ نہیں تھے۔

زمانے کی شکایت غلط حرکت ہے۔ زمانے کی شکایت ممنوع بھی ہے۔ فرماتے ہیں۔ لَا تَسُبُّوا الدَّهرَ۔ زمانے کو بُرا مت کہو۔ لہٰذا میں زمانے کی شکایت ہرگز نہیں کرتا۔ ہمیں زمانے سے شکایت کا کیا حق ہے، زمانے کو ہم سے شکایت ہونی چاہیے کہ ہم جیسے مسلمان اُس میں پیدا ہوئے ہیں۔

سماع کے بارے میں

آپ پتھر پر لوہے کی ہتھوڑی ماریے، پتھر سے آگ نکلے گی، اِتنی آگ کہ جنگل کے جنگل جلا کر بھسم کر دے۔ یہی حال انسان کے دل کا ہے، اُس پر بھی چوٹ پڑتی ہے تو خالی نہیں جاتی۔ انسانی دل پر چوٹ لگانے والی چیزوں میں ایک چیز خوش گلوئی اور موزوں و مناسب ترنم بھی ہے۔ انسانی دل میں آگ چھپی ہوتی ہے، وہ خوش گلوئی اور ترنم سے بھڑکتی ہے، یا انسان کا عالم ارواح اور اُس کے عجائبات کے ساتھ جو تعلق ہے وہ تعلق حرکت میں آجاتا ہے۔ حسن و جمال اور خوش گلوئی عالم ارواح کے عجائبات سے مشابہ ہیں، عام انسان نہیں سمجھتا کہ ہو کیا رہا ہے لیکن اہل محبت محسوس کر لیتے ہیں کہ پھونک مار کر کسی نے محبت کی آگ بھڑکا دی۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سماع اُن کے لیے جن کے دل میں اللہ کی محبت نہ ہو بلکہ غیر اللہ کی محبت ہو زہر قاتل ہے، لیکن جن کے دل میں اللہ کی محبت ہو، اُن کے لیے سماع ضروری ہے تاکہ اللہ کی محبت تیز تر ہو جائے۔

علما کے ایک گروہ نے سماع کو قطعاً حرام قرار دیا ہے۔ اللہ کی محبت کے معنی اُن کی رائے میں اِس سے زیادہ کچھ نہیں ہیں کہ اُس کے احکام کی تعمیل کر دو، اور بس، وہ کہتے ہیں کہ

محبت تو انسان صرف اپنی جنس سے کر سکتا ہے۔ اللہ سے نہیں کر سکتا۔ اللہ انسان کا ہم جنس نہیں ہے۔

دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ اس کا فیصلہ دل سے کرانا چاہیے۔ دل پر سماع کا بُرا اثر پڑتا ہے تو بے شک سماع حرام ہے لیکن اچھا اثر پڑے تو صرف حلال نہیں بعض حضرات کے واسطے ضروری ہے۔

جنس اور غیر جنس کی بحث چھوڑیے۔ جن کے دل میں اللہ کی محبت نہیں ہے وہ گانا ہرگز نہ سنیں، لیکن اگر گانا کسی کو خلاف شرع حرکات کرنے پر آمادہ نہیں کرتا تو پھر گانا سننا جائز ہے، اور گانا موافق شرع اعمال کرنے کی آمادگی بڑھائے تو گانا سننا ضروری ہے۔

یہ سب حضرت امام غزالی کے خیالات ہیں۔ گویا سماع اُس کیفیت کو اُبھارتا ہے جس کا دل میں پہلے سے مادہ ہوتا ہے۔ غیر اللہ کے عشق و محبت کو بھڑکانے کے لیے گانا سننا دوسرے گروہ کے نزدیک بھی حرام ہے۔

امام غزالی کے ارشادات

حضرت امام غزالی نے سماع کی تین قسمیں کی ہیں:۔ ایک وہ سماع جو تماشے اور کھیل کے طور پر سنا جائے۔ حضرت امام غزالی فرماتے ہیں کہ تماشہ اور کھیل ناجائز جب ہے جب اُس میں ضرر کا امکان ہو۔ ناک خوشبوئیں سونگھ سکتی ہے، دماغ عقل و حکمت کی باتوں سے لُطف لے سکتا ہے، زبان لذیذ کھانے کھا سکتی ہے، آنکھیں آبِ رواں اور گل و شگوفہ کا نظارہ کر سکتی ہیں تو کانوں نے کون سا قصور کیا ہے جو اُنھیں لذت سے محروم رکھا جائے۔ حضرت امام غزالی فرماتے ہیں، تماشہ اور کھیل محض دل بہلانے کی غرض سے دیکھنا مُباح ہے تو گانا بھی محض دل بہلانے کی غرض سے سننا مُباح ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:۔ "عید کے دن میرے گھر کے سامنے حبشی کھیل تماشے دکھا رہے تھے، حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلّم نے مجھ سے پوچھا تم دیکھنا چاہتی ہو، میں نے کہا۔ ہاں۔ حضورؐ دروازے کے پاس کھڑے ہو گئے اور میرے ساتھ خود بھی دیکھتے رہے، بار بار پوچھتے حضورؐ تھے کہ دیکھ چکیں یا اور دیکھو گی، مگر میں جب تک دیکھا کی حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ دیکھنا ختم کرو۔"

حضرت عائشہؓ ہی کی ایک اور روایت ہے کہ عید کے دن دو کنیزیں میرے ہاں دف بجا رہی تھیں اور گا رہی تھیں۔ حضورؐ تشریف لائے تو کنیزوں کی طرف پشت کر کے لیٹ گئے (خود حضورؐ نے گانے سے کوئی دلچسپی نہیں لی) اتنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آ پہنچے۔ اُنھوں نے کنیزوں کو ڈانٹا کہ رسول اللہؐ کے گھر میں یہ کیا۔ اِس پر حضورؐ نے فرمایا "اِن سے تعرض نہ کرو۔ آج عید ہے۔" یعنی خوشی کے مواقع پر گانا بجانا کر لیا جائے تو مضائقہ نہیں ہے۔ گانے بجانے کی طرف حضورؐ متوجہ نہیں تھے مگر گانے بجانے کی آواز حضورؐ نے کانوں میں بہرحال جا رہی تھی اور حبشیوں کے کھیل تماشے کے وقت تو حضورؐ کی آنکھیں بھی اُدھر تھیں، البتہ کھیل تماشے کے طور پر گانے بجانے کو اوڑھنا بچھونا بنا لینے کا جواز کہیں نہیں ملتا اور حضرت ابوبکرؓ کے روکنے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ سماع بڑی احتیاط کی چیز ہے اور صرف اُن ہی کے لیے ضروری ہے جو اس کے ضرورت مند ہوں، حضرت ابوبکرؓ کے درجے کے بزرگ سماع کے محتاج نہیں تھے۔

دوسری قسم سماع کی سب کے نزدیک مذموم ہے اور وہ یہ ہے کہ عورت یا لڑکے سے محبت ہو اور اُس کی موجودگی میں ازدیادِ لطف کی نیت سے گانا سُنا جائے، یا محبوب موجود نہ ہو، محبوب کی یاد کو دوبالا کرنے کے لیے سماع کی محفل جمائی جائے۔ اشعار میں زلف و خال و جمال کے اذکار ہوں اور سننے والا محبوب کا تصور باندھے تو ایسا سماع حرام قطعی ہے۔ محبتِ باطل کی آگ کو تو بجھانا واجب ہے نہ کہ اُسے مشتعل کیا جائے، ہاں بیوی کی محبت ہو یا شوہر کی محبت ہو اور یہ محبت سماع سے ترقی کرے تو مباح ہے، جیسے دنیا کی اور بے شمار چیزوں سے متمتع ہوا جاتا ہے، ایک یہ بھی سہی۔

تیسری قسم سماع کی حضرت امام غزالی کے بیان کے مطابق وہی ہے جس سے اچھے اعمال کرنے کی آمادگی بڑھتی ہے اور نیک اوصاف ترقی پاتے ہیں۔ اِس قسم کے سماع کے حضرت امام غزالی نے چار درجے بتائے ہیں:- (۱) حاجی حج کے راستے میں، یا حج کو چلتے وقت، یا خانہ کعبہ پہنچتے وقت ذوق و شوق میں اشعار گائیں، یا کوئی شخص حج کرنے نہ جا سکے اور بے تاب ہو کر خانۂ کعبہ کی یاد میں اشعار گائے، یا جہاد کے وقت مجاہد رجز یہ اشعار خوش الحانی سے پڑھیں۔ (۲) رقّت اور گریہ لانے کے لیے اشعار گائے جائیں۔ گناہوں کو یاد کر کے رونا اور اللہ رسولؐ کی محبت میں رونا نعمت ہے، البتہ عزیزوں

اور دوستوں کے مرنے پر بُکا کرنا اور رُلانے والے اشعار پڑھنا منع ہے۔ قضائے الٰہی سے اندوہ گیں ہونا خراب بات ہے۔ اللہ کا حکم ہے۔ لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ۔ جو مر گیا اُس پر نوحہ مت کرو۔ (۳) شادی بیاہ، ولیمہ، عقیقہ، ختنہ، بچّے کی پیدائش، سفر سے واپسی وغیرہ تمام مسنون تقریبات میں گانا سنایا جا سکتا ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم مکّے سے ہجرت کر کے مدینے میں داخل ہوئے تو مدینے کے مسلمان حضورؐ کے آگے آگے دف بجاتے چل رہے تھے اور یہ اشعار گا رہے تھے ؎ طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا (الخ)

عید کے دن کے گانے کا ذکر پہلے آ چکا۔ دو دوست مل کر بیٹھیں، کھانا کھائیں اور ساتھ کے ساتھ سماع سے بھی ایک دوسرے کو خوش کرنا چاہیں تو جائز ہے۔

چوتھی قسم کا سماع صرف مُباح نہیں، ضروری ہے۔ جس کے دل میں اللہ کی محبت نے گھر کر لیا ہو تو اُسے گانا ضرور سننا چاہیے۔ صوفیائے عظام کا سماع چوتھی ہی قسم کا تھا۔ سماع اچھائی اور بُرائی دونوں کو اُبھارتا ہے۔ جو جیسی نیت سے گانا سنے گا اُسے ویسا پھل ملے گا۔ حضرت امام غزالی فرماتے ہیں کہ صوفیا میں ایسے بزرگ گزرے ہیں کہ حالت سماع میں اُنھیں وہ نعمت مِل جاتی تھی جو بغیر سماع کے اُن کے خواب و خیال میں نہیں آتی تھی۔ سماع میں صوفیا کو مکاشفے ہوتے تھے اور عجیب و غریب کیف حاصل ہوتا تھا۔ اُن کے وجد کی کیفیت کا عوام تصور نہیں کر سکتے۔ جس طرح چاندی آگ میں ڈالنے سے نکھر جاتی ہے اُسی طرح سماع سے صوفیا کے قلوب مصفّے ہو جاتے تھے۔ دل کی کدورتیں دُھل جاتی تھیں۔ بڑی بڑی ریاضتیں سماع کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ جیسا کہ ابتدائے مضمون میں کہا گیا ہے کہ روحِ انسانی کو عالمِ ارواح سے سرّی مناسبت ہے۔ سماع اس مناسبت کو حرکت میں لاتا ہے۔ حتّٰے کہ بعض اوقات روح اس عالم سے بالکل بے خبر ہو جاتی ہے، اسے اس عالم کی مطلق خبر نہیں رہتی۔

علی حلاجؒ شیخ ابوالقاسم گورگانی کے مرید تھے۔ اُنھوں نے شیخ سے گانا سننے کی اجازت مانگی۔ شیخ نے کہا، تین دن مسلسل فاقہ کرو، اور چوتھے دن دسترخوان پر عمدہ عمدہ کھانے چنواؤ، مگر اُنھیں کھاؤ نہیں، دسترخوان سے اُٹھ جاؤ اور سماع میں مشغول ہو جاؤ۔ اگر یہ کر سکو تو سماع کی تمہیں اجازت ہے۔ سماع تمہارے لیے حلال ہے، لیکن دل پر کیفیات کی فقط جھلکی پڑ گئی ہے اور خواہشات کا بُت ٹوٹا نہیں ہے تو پیر مرید کو سماع کی اجازت نہیں دے سکتا۔ مضمون ہٰذا کے ایک ابتدائی فقرے پر پھر غور کر لیجئے کہ اس کا فیصلہ دل سے کرانا چاہیے کہ دل پر سماع کا اچھا اثر پڑے گا یا بُرا۔

حضرتِ امام غزالیؒ فرماتے ہیں :- جو صاحبان سماع و وجد کے خلاف ہیں اُنھیں ہم الزام نہیں دیتے۔ جس شے سے اُنھیں سابقہ ہی نہیں پڑا اُسے اُن کے قلوب کیونکر مان لیں۔ عورتوں سے اور حسین امرد لڑکوں سے گانا سننے کو ہم بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ کوئی شخص اللہ تعالےٰ کی محبت میں غرق ہو تب بھی وہ عورت اور حسین امرد لڑکے سے گانا نہیں سُن سکتا۔ عورت کے لیے حسین ہونے کی قید نہیں ہے۔ نا محرم عورت خوبصورت ہو یا بدصورت، اُسے دیکھنا حرام ہے، کجا اُس سے گانا سُننا۔ نیز سازوں کے ساتھ گانا سننے کی اجازت حضرت امام غزالی نہیں دیتے، بہ استثنائے طبل و شاہین و دف۔ سازوں کے ساتھ گانا سننا تو صوفیوں نے چند صدیوں سے شروع کیا ہے۔ حضرت سلطان المشایخ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے سامنے حضرت امیر خسروؒ تک سازوں کے ساتھ نہیں گا سکتے تھے۔ حضرت امیرؒ ضرور سازوں کے شوقین تھے مگر حضرتِ سلطان المشایخؒ کے سامنے بغیر سازوں کے گاتے تھے۔

یہ بھی واضح رہے کہ فقط اچھی قسم کے اشعار سُنے جا سکتے ہیں۔ بے ہودہ، فحش اور ہجو یہ اشعار کا تو کہنا بھی گناہ ہے اور سننا بھی گناہ ہے۔ بُرے مضامین کے لکھنے، پڑھنے اور سننے کی اجازت نہ نثر میں ہے اور نہ نظم میں۔

سماع میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ شعر کا مضمون کچھ ہے اور سننے والے کا ذہن اُسے کہیں کا کہیں لے جا رہا ہے۔ لہٰذا جوان العمر لوگوں کو سماع سے بچنا ہی مناسب ہے، جوانی میں عشق کے معنی عموماً عشقِ مجازی ہوتے ہیں۔ سماع کا معاملہ بڑا نازک ہے۔

سماع میں تین باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ ایک یہ کہ حاضرینِ مجلس ہم مشرب ہوں۔ دوسرے یہ کہ نماز کا وقت نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ سماع کے لیے ایسی جگہ بیٹھا جائے جہاں کامل سکون اور اطمینان ہو۔

سماع کے وقت ایک دوسرے سے باتیں نہیں کیا کرتے، بلکہ ایک دوسرے کی طرف نظر بھی نہیں اُٹھاتے۔ گردن جھکا کر، دوزانو، مودب بیٹھتے ہیں اور اللہ تبارک و تعالےٰ سے لَو لگاتے ہیں اور منتظر رہتے ہیں کہ اللہ کب کچھ عنایت فرماتا ہے۔ وَجَد کے معنی ہیں "پایا"۔ سماع میں جو وجد آتا ہے اُسے وجد اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ کوئی شے ملتی ہے، کوئی شے پائی جاتی ہے۔ کسی کیفیت کا انکشاف ہوتا ہے۔ وجد آنے پر انسان اگر ضبط نہیں کر سکتا اور اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکتا اور مستانہ وار کھڑا ہو جاتا ہے تو حاضرین بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔

حضرت امام غزالیؒ کے نزدیک بھی یہ بدعت ہے لیکن ایسی بدعت جس سے شریعت کو ٹھیس نہیں لگتی۔ حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے کہ ہر شخص کے ساتھ اُس کی عادت اور خُو کے مطابق زندگی بسر کرو۔ صحابہ حضورؐ کی تعظیم کو نہیں کھڑے ہوتے تھے، کیونکہ حضورؐ یہ تعظیم نہیں کرانی چاہتے تھے، لیکن جہاں کھڑے ہونے سے کسی کا جی خوش ہو وہاں کھڑا ہو جانا ارشاد مذکورہ بالا کی رو سے مستحسن ہے۔ عرب اور عجم کی عادتیں یکساں نہیں ہیں۔

دِل سے نِکلی ہُوئی بات

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کا مضمون کسی پرچے میں پڑھا تھا۔ پورا مضمون تو یاد نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ تاتاری مغل جو ہندستان پر کئی سو سال حکومت کر گئے، اُن کے اجداد کس طرح مسلمان ہوئے تھے۔ تاتاریوں کی قوم بڑی زور دار قوم تھی۔ اُسے جھکانا اور رام کرنا آسان کام نہ تھا، لیکن ایک بزرگ کے دو فقروں نے تاتاری سلطنت کے ولی عہد کا رُخ اِدھر سے اُدھر موڑ دیا۔ ولی عہد شکار کھیلتا پھر رہا تھا۔ اُس نے حکم کر رکھا تھا کہ شکار گاہ میں اور جس جس راستے سے میں گزروں، وہاں کوئی مسلمان نظر نہ آئے۔ تاتاری لوگ مسلمانوں کو اور خصوصاً ایرانی مسلمانوں کو بہت بُرا اور منحوس سمجھتے تھے۔ لیکن اتفاقاً، بالکل بے ارادہ، ایک درویش، جن کا اسم مبارک شیخ جمال الدین تھا، شکار گاہ کے اندر پہنچ گئے۔ تاتاریوں نے انھیں پکڑ لیا اور مشکیں کس کر ولی عہد کے سامنے پیش کیا۔ ولی عہد بولا۔ اِس پیوند لگے فقیر نے میری منزل کھوٹی کر دی پوچھا۔ تم کون ہو۔ جواب ملا۔ مسلمان ہوں اور ایران کا باشندہ ہوں۔ پوچھا۔ تم اچھے یا میرا کتّا اچھا۔ فرمایا۔ ایمان کے ساتھ مروں تو میں اچھا ہوں، ورنہ کتّا مجھ سے بہتر ہے۔ پوچھا ایمان کیا چیز ہے۔ فرمایا۔ ایمان اِس کا نام ہے کہ انسان اپنے خالق کو جانے۔ اُسے نہ بھولے۔ اُسی سے ڈرے، اُسی سے اُمیدیں باندھے، اور اُسی کی عبادت کرے۔ ایمان کی نعمت میسر آجائے تو پھر کتّا کیا معنی، مومن کا مرتبہ بادشاہوں سے اُونچا ہے۔ ولی عہد مبہوت ہو گیا اور اُس نے درخواست کی کہ آپ جب سُنیں کہ تغلق تیمور تخت پر بیٹھا ہے تو مجھے اپنی زیارت سے مشرف فرمایئے گا۔

حضرت شیخ جمال الدین نے لمبی چوڑی تقریر نہیں کی تھی۔ چند جملے اور سیدھے سادے

جملے زبان حق ترجمان سے نکلے تھے۔ جملے مثل تیر کے نشانے پر لگے اور ولی عہد کے دل میں اُتر گئے۔ ولی عہد کا لہجہ بدل گیا اور طنطنہ جاتا رہا۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ چند جملوں نے اتنا اثر کیوں دکھایا۔ وجہ ظاہر ہے کہ حضرت شیخ جمال الدین کی زبان اُن کے دل کی ترجمانی کر رہی تھی۔ انھوں نے جس وقت ایمان کی تعریف میں کہا کہ انسان صرف اللہ سے ڈرے تو اُن پر ولی عہد کا ڈر مطلق طاری نہیں تھا۔ اُنھوں نے پوری بے باکی کے ساتھ فرمایا کہ مسلمان میں ایمان موجود ہو تو بادشاہ بھی اُس سے خایف نہیں ہے۔ تغلق تیمور کو حضرت شیخ جمال الدین کی قوتِ ایمانی نے گھائل کر دیا۔ تغلق تیمور کی تخت نشینی تک حضرت شیخ جمال الدین زندہ نہیں رہے۔ حضرت کے بیٹے نے تغلق تیمور سے بیعت لی اور بادشاہ کے اسلام نے ساری قوم کو اسلام کی طرف متوجہ کیا، اور پھر بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہ جہان اور اورنگ زیب جیسے بادشاہ اُس قوم نے ہندستان کو دیے۔

چاند ستاروں سے سبق

دن کے بعد رات، اور رات کے بعد دن دیکھتے دیکھتے مجھے پون صدی بیت گئی۔ چاند اور سورج کو روز نکلتے اور ڈوبتے دیکھتا ہوں۔ چاند کی روشنی دھیمی پڑتی ہے تو ستارے دمکنے لگتے ہیں۔ یہ نظام ایسی باقاعدگی سے چل رہا ہے کہ اس میں ذرّہ برابر فرق نہیں آتا۔ آج ۱۶ جنوری ۱۹۶۲ء ہے۔ چاند اور سورج کے طلوع و غروب کا وقت دنیا بھر میں جگہ جگہ آج جو کچھ تھا، بعینہٖ وہی ۱۶ رجنوری کے لیے ہر جگہ ہمیشہ سے ہے۔ چاند کی روشنی بھی حساب سے گھٹتی ہے اور ستاروں کی چمک دمک بھی حساب سے بڑھتی ہے۔

میں چاند، سورج اور ستاروں کے متعلق ان کی باقاعدگی کے علاوہ اور باتیں نہیں جانتا۔ شاید دریاؤں کے ملاح اور دیہاتوں کے کسان چاند، سورج اور ستاروں کے اثرات سے بہ نسبت میرے زیادہ واقف ہوں، اور علمائے فلکیات کی معلومات کا تو ٹھکانا کیا ہے۔ بے پڑھے لکھے ملاحوں اور کسانوں سے نہیں پوچھتا، لیکن پڑھے لکھے علمائے فلکیات سے ضرور معلوم کرنے کی آرزو ہے کہ قرآن مجید کی آیت وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ط وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهٖ [1] ط اُنھوں نے کبھی پڑھی ہے

---

[1] مفہوم: اُسی نے شب و روز اور آفتاب و ماہتاب کو تمھارے (منافع اور فوائد) کے تابع کر دیا اور ستارے بھی اُس کے حکم سے (تمھارے تابع رہتے ہوئے) ہیں۔

تو اُن پر اس نے کیا کیفیت پیدا کی ہے۔ اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ؀[1] یہی لوگ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ توقع کرتا ہے کہ ان چیزوں کے ذریعہ اُسے پالیں گے۔

مسلمان عوام

مسلمانوں سے بہتر عوام دنیا کی کسی قوم کے پاس نہیں ہیں — ہم آج اپنے کسی طبقے پر فخر کر سکتے ہیں تو وہ طبقہ ہمارے عوام کا ہے۔ انگلستان اور جرمنی کی لڑائی میں انگلستان کے مشہور ناولسٹ کانن ڈائل اور انگلستان کے شاعرِ اعظم رڈیارڈ کپلنگ کے بیٹے مارے گئے تھے تو دونوں باپوں کے دماغ خراب ہو گئے تھے لیکن آپ نے مسلمانوں کے اس طبقے کے متعلق کبھی نہیں سنا ہوگا کہ فلاں غریب مسلمان کے بیٹے نے اللہ رسولؐ کے لیے جان دی اور باپ کا پیمانہ صبر چھلک گیا۔ ہمارے عوام میں قرونِ اولٰے جیسے مسلمان بننے کی صلاحیت باقی ہے۔ اسلام اسی طبقے سے شروع ہوا تھا اور اسی طبقے سے اسلام پھر عروج پائے گا۔ اسلام کا مستقبل اِن ہی کے ہاتھوں میں ہے۔ آج بھی آپ اللہ رسولؐ کا نام لے کر انھیں بلائیے تو یہ توپ کے سامنے سینے کھول دیں گے۔ کاش اللہ تعالیٰ اِن کا بے پڑھا لکھا پن اس طرح دور کرائے کہ یہ توپ سے لڑ جانا نہ بھولیں اور اسلام کے لیے فقط جانیں نہ دیں؛ اسلام کی ایک ایک شق کو اپنائیں۔

اللہ کی نشانیاں

(جو چیزیں نگاہوں سے اوجھل ہیں، وہ آسمان کی ہوں یا زمین کی، انھیں کوئی نہیں جان سکتا۔ جب تک اللہ کسی کو نہ بتائے) آسمان اور زمین کی مغیبات (فقط) اللہ کے علم میں ہیں۔ (قیامت بھی ایک پوشیدہ اور غیب کی چیز ہے۔ قیامت کیا، انسان خود اپنی بابت بے خبر ہے کہ اُسے کب مرنا ہے، لیکن اللہ کے سامنے) قیامت کا آنا ایسا ہے گویا پلک کا جھپکنا بلکہ اِس سے زیادہ قریب۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، (جس آن چاہے قیامت قایم کر دے) اللہ (کی قدرت کا اتنا احساس تو تمھیں بھی ہونا چاہیئے کہ اُس) نے تم (سب) کو تمھاری ماؤں کے پیٹ سے (باہر) نکالا۔ (اُس وقت تم ہی مطلق سمجھ نہیں

---

[1] مفہوم بے شبہ عقلمند لوگوں کے لیے ان (چیزوں) میں (اللہ کی قدرت کی بڑی بڑی) نشانیاں موجود ہیں۔

تھی (اُس نے تمھیں سمجھ عطا فرمائی) تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل (جیسے آلات) بنائے تاکہ (اُن کے ذریعہ سنو، دیکھو اور سوچو، اور دوسری باتوں کے ساتھ اپنے خالق و مالک کو پہچانو اور اُس کی عطا کردہ نعمتوں کا) شکر ادا کرو۔ (اللہ کا پتہ لگنا قیامت کے آنے پر تھوڑا ہی منحصر ہے، جو چیزیں اوجھل نہیں ہیں، اللہ کا پتہ تو وہ بھی دے رہی ہیں۔ اللہ کے باغی ذرا اوپر نگاہ اٹھائیں) کیا انھیں پرندے نہیں دکھائی دیتے جو فضائے آسمانی میں (قدرت باری تعالیٰ کی تابعداری کرتے ہیں (بالکل مسخر ہیں) ان کو اللہ ہی تو سنبھالتا ہے (کہ ادھر اُڑتے پھرتے ہیں) اہلِ ایمان کے واسطے اسی (معمولی سی بات) میں (اللہ کی قدرت کی نشانی نہیں) نشانیاں (موجود) ہیں۔ (مفہوم سورہ ۱۶۔ آیات ۷۸ تا ۷۹)

طلوع و غروب اور نماز

آفتاب طلوع ہونے لگے تو حکم ہے سجدہ مت کرو، کہیں آفتاب پرست سمجھیں کہ مسلمان بھی آفتاب کو پوجتے ہیں[1]۔ پھر آفتاب طلوع ہو جانے کے بعد زوال آفتاب تک کوئی فرض نماز نہیں ہے۔ زوال آفتاب کے بعد پے در پے فرض نمازیں ہیں۔ ابھی ظہر پڑھی، ابھی عصر آگئی۔ ذرا سا غروب آفتاب کا انتظار کر کے مغرب کی نماز ادا کی۔ ڈیڑھ گھنٹے میں عشاء کا بلاوا پہنچ گیا۔ صرف ایک فرض نماز ان پے در پے نمازوں سے الگ ہے، یعنی نماز فجر، سو نماز فجر چاند اور ستاروں کے ڈوبنے پر پڑھی جاتی ہے۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْهُوْدًا ۝ آفتاب کے زوال کے بعد رات کی تیرگی و تاریکی تک نمازیں پڑھو، اور صبح بھی قرأت قرآن کرو۔ صبح کی قرأت قرآن (یعنی نماز فجر) میں طبیعت حاضر ہوتی ہے۔

منشاء یہ ہے کہ آفتاب جسے ہر کس و ناکس بڑا مانتا ہے اور ستارے تو آفتاب سے بڑے ہیں، جب دیکھو کہ ان بڑے بڑوں کا طلوع زوال سے بدل گیا تو ان ہی کا نہیں ہر چیز کی بڑائی کا تصور مٹا ڈالو، اور زبان سے کہو اور دل میں بٹھا لو کہ بڑا اللہ ہے، جس نے ایسی بڑی بڑی چیزیں پیدا فرمائی ہیں اور جو ان بڑی بڑی چیزوں پر اتنا تصرف رکھتا ہے کہ اُس کے حکم سے وہ بال برابر روگردانی نہیں کر سکتیں۔ لہٰذا، چار، ساڑھے چار فٹ کے انسان! تیری کیا ہستی

---

[1] آفتاب پرستوں کے ہاں آفتاب کی پرستش طلوع آفتاب اور نصف النہار کے درمیان کی جاتی ہے۔ (واحدی)

ہے۔ تو عارضی دولت، عارضی اقتدار اور عارضی سوجھ بوجھ کا زور نہ دکھا، اللہ کے حضور سر جھکا اور اللہ کی تابعداری کے لیے تیار ہو جا اور کہہ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔

ولایت کی پہچان اور ایمان کی کسوٹی

قُلْ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○ (اے محمدؐ! یہودیوں سے) کہو کہ یہودیو، تمہیں اگر دعویٰ ہے کہ تمام بندوں میں فقط تم اللہ کے دوست اور ولی ہو تو (اس کی پہچان بہت آسان ہے) (اللہ کے نام پر) مرنے کی تمنا کرو۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو (تو مرنے سے گھبراؤ نہیں)

گویا ولایت کی پہچان کیا ٹھہری۔ مرنے سے نہ گھبرانا اور مرنے کے لیے آمادہ رہنا ——— اور مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ وہی اللہ کا ولی اور دوست نہیں ہوتا۔ اللہ بھی اُس کا ولی اور دوست ہوتا ہے۔ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اللہ اہل ایمان کا دوست ہے۔ وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ اللہ مومنوں کا دوست ہے۔ لہٰذا مرنے سے نہ گھبرانا اور مرنے کے لیے آمادہ رہنا محض ولایت کی پہچان نہیں، ایمان کی کسوٹی ہے۔

اسلام نے خودکشی اور اقدام خودکشی کو حرام قرار دیا ہے۔ زندگی کی کھکیڑوں اور مصیبتوں سے گھبرا کر موت کی تمنا کرنا بھی اسلام جائز نہیں رکھتا لیکن ویسے اگر موت کے لیے تیار رہا جائے اور موت کے تصور سے خوش ہوا جائے تو ایمان کی نشانی ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے کوئی ملنے والے تھے (اللہ تعالےٰ اُن تینوں پر اپنی رحمت نازل فرمائے) اُن ملنے والے نے حاجی صاحب سے عرض کیا کہ حضرت آج کل مرنے کو اس قدر جی چاہنے لگا ہے کہ مجھے ڈر ہوتا ہے کہیں خودکشی نہ کر لوں۔ حاجی صاحب نے کہا۔ مبارک ہو۔ اللہ نے تمہیں ولایت دے دی۔

مجھے کامل یقین ہے کہ مرنے کے بعد میرا قصہ ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ میں اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے کے حضور میں حاضر کیا جاؤں گا تو مرنا کیا گھبرانے کی چیز رہے گی۔ گھبرانا صرف بداعمالی سے چاہیے۔ اللہ کے سامنے کالا منہ لے کر پہنچنا واقعی فکر کی بات ہے بداعمالیوں کو یاد کر کے جتنا پریشان ہوا جائے کم ہے۔ لیکن بذاتِ خود مرنا گھبرانے کی بات نہیں ہے مرنا

تو بالکل ایسا ہے جیسے بال کٹروا لیے یا ناخن ترشوا لیے۔ جسم کے اندر سے بھی فاضل اجزا روز خارج ہوتے رہتے ہیں اور جسم باہر سے بھی برابر بدلتا رہتا ہے۔ اندرونی اجزا کے اخراج سے انسان تسکین پاتا ہے اور جسم کی بیرونی تبدیلیوں کا بھی اُس کی صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔

بچپن میں میرے ٹخنے پر ایک پھوڑا نکلا تھا۔ جس کا نشان اب تک باقی ہے لیکن نشان جتنا نمایاں ساٹھ پینسٹھ برس پہلے تھا، اُتنا اب نہیں ہے۔ وہ کھال بدل گئی جو پھوڑا نکلنے کے وقت تھی۔

جسم کے اندر کی مشینری ہم نہیں دیکھ سکتے اس واسطے بیرونی اعضاء ہاتھ، پاؤں، آنکھ، ناک وغیرہ کے مقابلے میں اندرونی مشینری سے ہمیں کم دلچسپی ہے۔ جب تصور کرتے ہیں بیرونی جسم کے مٹنے کا کرتے ہیں۔ مگر ذرا سوچیے کہ بیرونی جسم ایک حال پر قائم کہاں ہے۔ بیرونی جسم بھی ایک حال پر قائم نہیں ہے اور اندرونی مشینری بھی ایک حال پر قائم نہیں ہے۔ اور موت سے جسم خاک میں ملے گا۔ روح کو تو خاکی جسم کی بجائے نورانی جسم یا کسی اور قسم کا جسم حاصل ہو جائے گا۔ موت سے گھبرائیں وہ جنھیں حیات بعد الموت میں شبہ ہو۔ موت تو حیاتِ ابدی کا دروازہ ہے۔ علامہ اقبالؒ نے خوب کہا ہے ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم   چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

ویسے جسم ایک دفعہ قبر میں رہ بھی چکا ہے، اور روح سمیت رہ چکا ہے۔ کیا ماں کا پیٹ قبر نہیں تھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۝ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

یاد رکھو، اولیاء اللہ (اس قدر مطمئن رہتے ہیں کہ اُن) پر (آنے والے کھٹکوں کا) خوف طاری نہیں ہوتا۔ اور وہ (گزشتہ مصائب کو یاد کر کر کے) نہیں کڑھتے۔ جو لوگ (واقعی اور حقیقتاً اللہ اور اللہ کے رسولؐ پر) ایمان لائے اور (پھر اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی نافرمانی سے) بچا کیے، اُن کے لیے دُنیا کی زندگی میں بھی (راحت و آسائش کی) بشارت ہے اور آخرت میں بھی (راحت و آسائش کا وعدہ ہے) (اللہ کے وعدے اور) اللہ کے کلمات (اللہ کے قول و فعل) بدلا نہیں کرتے (اللہ اور اللہ کے رسولؐ پر واقعی اور حقیقتاً ایمان لا کر اور اللہ اور اللہ

کے رسولؐ کا فرماں بردار بن کر دیکھو اور تجربہ کر لو کہ دنیا اور آخرت کی راحتیں اور آسائشیں ملنا)، یہی عظیم کامیابی ہے ؎

جب میں کہتا ہوں کہ یا اللہ میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ
اکبر الٰہ آبادی

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۔ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ ۝ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

جو (دل سے) کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اور (اس قول پر) قائم رہتے ہیں اُن پر (مرتے وقت) نزولِ ملائکہ ہوتا ہے ملائکہ (طمانیت اور سکون) بے خوفی اور بے غمی اُن پر طاری کر دیتے ہیں اور بشارت دیتے ہیں کہ اُس جنّت کی خوشیاں مناؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمھارے مدد و معاون تھے اور آخرت میں بھی تمھارے دوست ہیں۔ اس حیاتِ بہشتی میں تمھیں (ترسنا نہیں پڑے گا) جس شے کو تمہارا جی چاہے گا اُسے مہیا کر دیا جائے گا۔ جو نعمت مانگو گے وہ پاؤ گے۔ اب تم غفور و رحیم کے مہمان ہو۔ اور اُس کی بات سے کیا کہنے جو (لوگوں کو) اللہ کی طرف بُلائے اور اچھے عمل کرے اور (برملا) کہے کہ میں مسلمان ہوں۔

ایمان اور ولایت کے مدارج بے شک ہیں لیکن قرآن مجید ایمان اور ولایت کو کسی خاص طبقے میں محدود نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ ہر مسلمان کا ایمان اتنا ہو کہ اُسے اللہ کا اور اللہ کو اس کا ولی کہا جائے۔

بیماری کا کرب محسوس کرنا اور بات ہے اور مرنے سے گھبرانا اور بات۔ بیماری کا کرب تو انبیاء بھی محسوس کرتے تھے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وفات سے ایک دن قبل اتنا کرب تھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زبان پر اس قسم کا جملہ آگیا کہ ہائے میرے ابّا کو کتنا کرب ہے۔ لیکن معلوم ہے، حضورؐ نے پھر کیا فرمایا تھا۔ فرمایا بیٹی! تیرا باپ

آج کے بعد کبھی کرب میں مبتلا نہیں ہو گا۔

حضور جب بیمار پڑا کرتے تھے تو اَذْهِبِ الْبَاسِ رَبَّ النَّاسِ پڑھ کر ہاتھوں کے اوپر پھونکتے تھے اور ہاتھ سینے اور پشت پر پھیر لیتے تھے۔ آخری بیماری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہی دعا پڑھ کر حضورؐ کے ہاتھوں پر پھونکی اور چاہا کہ حضورؐ کے ہاتھوں کو حضورؐ کے جسم اقدس کے اوپر پھیریں۔ حضورؐ نے ہاتھ سکیڑ لیے اور کہا: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ وَ اَلْحِقْنِیْ بِالرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی۔ الٰہی! میری مغفرت فرما اور مجھے اپنے سے واصل کر۔ رفیق الاعلا سے مراد اللہ کی ذات ہے۔

حضورؐ دوا استعمال کرنے کے قائل تھے۔ مگر مرض آخر کا انتہائی زور ہوا تو حضورؐ نے دوا پینے کی ضرورت نہیں سمجھی ۔

یہ موت کیا ہے کسی کے وصال کا پیغام
یہ زندگی کے عوض مل رہی ہے سستی ہے

موت تو ایسی چیز ہے کہ جب کسی کو آئے تو اُسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَهُوَ الَّذِیْ اَحْیَاكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ

اللہ تمہیں عدم سے وجود میں لاتا ہے اور پھر تمہیں موت دیتا ہے اور پھر تمہیں دوسری زندگی بخشتا ہے۔ (لیکن اتنی عنایتوں کے باوجود) انسان ناشکر گزار ہے۔ یعنی موت ایسی چیز ہے کہ اپنی موت پر انسان کو شکر گزار ہونا چاہیئے۔ جس طرح نیست سے ہست ہونا ایسی بات ہے کہ اللہ کا جتنا شکر کیا جائے کم ہے۔ اسی طرح اپنی موت پر انسان کو شکر کرنا چاہیئے، کیوں کہ موت عارضی زندگی کے عوض مستقل زندگی دلاتی ہے۔ موت کی گھاٹی طے کیے بغیر مستقل زندگی میسر نہیں آسکتی۔ ایک قبر (یعنی ماں کے پیٹ) میں رہنے سے وجود عطا ہوتا ہے۔ دوسری قبر میں جا کر مستقل زندگی میسر آتی ہے۔ سورج ایک جگہ ڈوبتا ہے اور دوسری جگہ اُبھرتا ہے۔

جس طرح دوسروں کی موت پر غمگین ہونا سُنّت ہے اسی طرح خوشی خوشی جان دینا سُنّت ہے۔

خوشی خوشی جان دینے کا مطلب یہ ہر گز نہیں ہے کہ انسان موجودہ زندگی سے

بیزار ہو جائے اور خود کشی کر لے۔ مندرجہ بالا آیت میں موت اور اس کے بعد کی زندگی اور موجودہ زندگی، تینوں کا ذکر بطور عنایت کیا گیا ہے موجودہ زندگی کا عنایت ہونا عیاں ہے جب تو وقت حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے، پھر اس زندگی سے بیزار کیسے ہوا جا سکتا ہے۔ اس زندگی سے بیزار ہونا خلاف اسلام ہے۔ لیکن اس کے ساتھ بس ایسا تعلق رکھیے جیسا وطن سے بہت دور کی ملازمت کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ پچیس تیس برس بہت دور رہنے کا اثر اتنا قطعی ہو گا کہ وہاں سے گھر واپس آتے وقت آپ تھوڑی سی تکلیف محسوس کریں گے لیکن وہاں کی کشش پر گھر کی کشش غالب آئے گی۔ دور کی جگہ سے جتنا دل لگایا جاتا ہے اُتنا اس زندگی سے دل لگایئے اور دور کی جگہ کے قیام کو جس طرح عارضی سمجھا جاتا ہے اُس طرح اِس زندگی کو عارضی سمجھیے۔ وطن پہنچنے اور قدیم اعزاو احباب سے ملنے کا تصور جس طرح لطف دیتا ہے اسی طرح ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی کے ملنے، حضور سرکار کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زیارت اور اللہ کے دیدار کے تصور سے لطف لیجیے۔

ایمان خوف اور توقع کی درمیانی کیفیت کو کہتے ہیں۔ اَلاِیمَانُ بَینَ الخَوفِ وَالرِّجَا۔ اللہ کے غضب سے ڈرتا رہنا چاہیے اور اللہ کی رحمت سے اُمیدیں باندھنی چاہئیں۔

سائنس اور مذہب

میرے بچپن میں سائنس کے متعلق مشہور تھا کہ جو شخص سائنس پڑھتا ہے اُسے دین سے لگاؤ نہیں رہتا۔ یہی رائے فلسفے اور منطق کی بابت تھی۔ قدیم طرز کے فلسفی اور منطقی بھی زیادہ دین دار نہیں سمجھے جاتے تھے۔

خیر قدیم طرز کے فلسفیوں اور منطقیوں کو آنکھوں سے دیکھ لیا۔ انسان کا نفس نہ بگڑ چکا ہو تو فلسفہ اور منطق دین کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ فلسفہ اور منطق سے قوت حاصل کر کے دین کی زیادہ اور بہتر خدمت انجام دی جا سکتی ہے۔

سائنس دانوں کو آنکھوں سے نہیں دیکھا، لیکن آجکل ماہنامہ فیض الاسلام راولپنڈی میں کئی مہینوں سے حضرت مولانا عرشی امرتسری کا ایک مسلسل مضمون چھپ رہا ہے، جس کا عنوان ہے "سائنس خدا کے حضور"، یعنی سائنس بھی خدا کے سامنے سربسجود ہو گئی۔ عرشی صاحب نے سینکڑوں سائنس دانوں کے بیانات پیش کر دیے ہیں۔ دو چار بیانات آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

مارلن بکس کریدر، ماہر عضویات عمر بھر کی سائنسی تحقیق کے بعد کہتا ہے : "میرا ایمان ہے کہ خدا ہے ۔ نہ صرف ایک عام انسان کی حیثیت سے بلکہ ایک سائنس داں کی حیثیت سے جس کی ساری عمر سائنس کے مطالعہ و تحقیق میں گزری ہے مجھے خدا کے وجود میں ذرہ برابر شک و شبہ نہیں ہے ۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ نظام کائنات کو وجود بخشنے اور حرکت میں لانے والی چیز نہ تو لافانی توانائی یا مادہ ہے اور نہ اس کا سبب اساسی عناصر کا کوئی اتفاقی اجتماع ہے ، اور نہ یہ کوئی عظیم نامعلوم محرک ہے ، بلکہ یہ درحقیقت خدائے عظیم و برتر کا کرشمۂ قدرت ہے ۔ اور میں یقین رکھتا ہوں کہ میرے اس موقف سے زیادہ قرینِ عقل اس باب میں کوئی موقف نہیں ہو سکتا ۔"

جارج ایک عالمِ طبیعیات کہتا ہے : " میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وجودِ باری کے متعلق میرے عقیدے کی بنیاد (بچپن کے مذہبی عقیدے کی نسبت) زیادہ مضبوط تجربات اور مشاہدات پر ہے ۔ ایک عالمِ طبیعیات کی حیثیت سے مجھے کائنات کے ایسے پیچیدہ نظام کو مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا ہے اور میں نے ایک ایک ذرے اور بڑے بڑے ستاروں میں حیرت انگیز ضابطہ اور تنظیم پایا ہے ۔ اس کائنات میں روشنی کی ہر شعاع ، ہر طبیعیاتی و کیمیائی ردِ عمل اور ہر ذی حیات شے کی ہر خصوصیت اسی ضابطے اور تنظیم کے تابع فرمان نظر آتی ہے ۔ یہ اس کائنات کی وہ تصویر ہے جسے سائنس کے انکشافات نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے ، آپ سائنس کا جتنا گہرا مطالعہ کریں گے اتنا ہی کائنات کے پُر پیچ اور دل کش نظام سے مسحور ہوتے چلے جائیں گے ۔"

ٹامس ڈیوڈ پارکس ، محقق کیمیا ، پانی کی عجیب و غریب باتیں دیکھنے کے بعد کہتا ہے : " اس کے علاوہ پانی کی اور کئی انوکھی خصوصیات ایسی ہیں جو مجھے یہ ماننے پر مجبور کرتی ہیں کہ پانی نہ صرف کسی بڑے حکیم و دانا کی تخلیق ہے ، بلکہ وہ خالق اپنی جملہ مخلوق کا (جس کے کام میں پانی آتا ہے) بڑا خیر خواہ ہے ۔ میں نے نوان معجزات فطرت کی اطمینان بخش توجیہہ یہ پائی ہے کہ یہ بے مثل تنظیم و ضابطہ کسی حکیم و دانا کا کرشمہ ہے اور اس کائنات کا وجود کسی عظیم خالق کا شاہکار ہے ۔ اس کائنات میں فقط مکمل اور نہایت جامع منصوبہ بندی ہی نہیں ہے بلکہ منصوبہ بندی کے پیچھے خالق کائنات کی اپنی مخلوق کے لیے

رحمت و شفقت اور محبت و خیر خواہی بھی پوری طرح نمایاں ہے۔"

جارج ویلیم کلاٹز، ماہر حیاتیات و عضویات کہتا ہے:" یہ بات میری عقل کسی طرح تسلیم نہیں کرتی کہ ہماری دنیا کو اتفاقی حادثے کی صورت میں وجود دل گیا ہے۔ اس کائنات کی گوناگونی اور پیچیدگیاں اتفاق کا نتیجہ نہیں ہو سکتیں۔ سائنس نے ان گتھیوں کو سلجھانے میں ہماری مدد کی ہے اور ہمیں عرفانِ خداوندی کی نعمت دی ہے۔ خدا کے ہر کام میں مصلحت موجود ہے۔ اس نے نظام عالم میں جو توازن و اعتدال قایم فرمایا ہے وہ بے حد دُور اندیشی پر مبنی ہے۔ انسان اُس میں دخل اندازی کر کے اپنا نقصان کرتا ہے۔ انسان کو یہ حماقت نہیں کرنی چاہیے کہ خدائی نظام میں اصلاح کی کوشش کرے۔ انسانی عقل قدرت کی حکمتوں اور مصلحتوں کی گرد کو بھی نہیں پا سکتی۔"

اسکربیو برائٹ ماہر طبیعیات و کیمیا آغازِ کائنات پر بحث کر کے کہتا ہے:" یہ ہمارا کرۂ زمین آخر کہاں سے آ گیا۔ سورج جو نظام شمسی کا سب سے اہم اور بڑا رکن ہے اس کا حجم زمین کے مقابلے میں تین لاکھ تیس ہزار گنا زیادہ ہے۔ زمین کا وزن چھے ہزار چھے سو بلین ٹن ہے (ایک بلین کے معنی ہیں ایک ہزار ملین یا ایک ارب) تو سورج کا وزن کرنے کے لیے کس پیلنے کو لایا جائے گا۔ پھر یہ کہکشاں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے اس میں کم از کم ایک بلین (یعنی ایک ارب) سورج ہیں، جن میں سے ہر ایک کا اوسط حجم ہمارے سورج سے کہیں زیادہ ہے۔ نیز ماہرین کا اندازہ ہے کہ اس کائنات میں کم از کم ایک لاکھ کہکشاں ہماری کہکشاں جیسی موجود ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ کائنات لاتعداد سماوی اجسام پر مشتمل ہے۔ ان سب اجسام کے وزن کے تصور سے انسان کانپ اُٹھتا ہے۔

آخر یہ اتنے بڑے بڑے کُرّے کیوں کر معرضِ وجود میں آ گئے؟ دو ہی جواب ممکن ہیں یا تو یہ قدیم (یعنی ابدی) ہیں یا حادث (یعنی نو پیدا شدہ)، علومِ طبیعی کی رُو سے ابتدا کا نقطۂ آغاز ضرور ہے، تغیّر و ارتقا اس کا ثبوت ہیں۔ لہٰذا قدامت و ابدیت کا نظریہ ناقابل قبول ہے۔ دوسرا نظریہ ایک خالق کے وجود کا متقاضی ہے۔ خالق کے بارے میں مختلف تصوّر ہیں، علم الاصنام کا تصوّر کچھ اور ہے، روایات اور قصّے کہانیاں کچھ اور کہتی ہیں فلسفہ بھی بہت سے مفروضات و نظریات پیش کرتا ہے، علوم طبیعی بھی اپنے رنگ میں راستہ بتاتے ہیں۔ آخری طریقہ وحی و الہام کا ہے۔ سائنس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کائنات کسی علیم و خبیر

کی پیدا کردہ ہے اور اُس نے نہایت پیچیدہ نظام کو باقی رکھنے کے لیے بہت سے ضابطے اور قوانین مقرر فرمائے ہیں لیکن اس علیم و خبیر ہستی کی معرفت ہمیں صرف وحی الہٰی کے ذریعے نصیب ہوتی ہے، جو صحفِ آسمانی میں محفوظ ہے۔ جب ہم کائنات کے وسیع اور پیچیدہ طلسم کو قوانین طبیعی میں جکڑا دیکھتے ہیں تو ہماری عقل باور نہیں کرتی کہ یہ سب کچھ خالق کے بغیر ہو رہا ہے۔ ہمیں اُن لوگوں پر تعجب آتا ہے جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں اور ذاتِ باری کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ خدا کو ماننے سے انسان میں ایک نئی روح جاگتی ہے انسان کا ضمیر پاک اور مصفیٰ ہو جاتا ہے اور اُس کے دل میں عدل و انصاف کے احساسات پرورش پاتے ہیں اور وہ حق سے محبت کرنی شروع کر دیتا ہے۔ الحاد جنگ و جدل کا دوسرا نام ہے۔ بحیثیت سائنس داں میں الحاد کو قبول نہیں کر سکتا میرے نزدیک الحاد عملی اعتبار سے تباہ کن ہے۔"

عرشی صاحب کے مضمون میں عیسائی سائنس دانوں اور یورپ کے سائنس دانوں کے خیالات مجھے پڑھنے کو ملے۔ ہندستان اور پاکستان کے مسلمان سائنس داں شاید ابھی اس منزل تک نہیں پہنچے ہیں۔ میں اُن کے خیالات مضمون میں ڈھونڈتا رہا۔ مل جاتے تو میرا ایمان اور تازہ ہو جاتا۔ ہم کم علم لوگ اہلِ علم کے خیالات سے متاثر ہوتے ہیں۔

سرشری رام دہلوی

سرشری رام کے والد لالہ مدن موہن لال صاحب سے میری شناسائی ۱۹۰۱ء سے تھی، جب کہ میں تیرہ چودہ برس کا تھا۔ میرے والد دلّی کلاتھ مل کے حصہ دار تھے۔ والد کا انتقال ہو گیا تو اپنی جائداد کا کرایہ اگاہنے والے کے ساتھ مل کا سالانہ منافع لینے مجھے خود جانا پڑتا تھا۔ منافع لالہ مدن موہن لال دیا کرتے تھے۔ لالہ جی اُس وقت مل کے مالک نہیں تھے۔ مل چھتا مل والوں کا تھا اور لالہ جی مل میں ملازم تھے۔ گرمی کا موسم ہوتا تھا۔ میں پہنچتا تو لالہ جی تخت پر سفید برّاق چاندنی بچھائے، ڈیسک کے آگے بیٹھے نظر آتے، پہلے شربت پلاتے اور مٹھائی کھلاتے اور پھر منافع دے دیتے۔ یہ بزرگانہ وضع لالہ جی نے مرتے دم تک نبھائی۔ مل کا مالک ہو جانے کے بعد نئی دلّی میں رہائش اختیار کر لی تھی، مگر روزانہ علی الصباح پرانی دلی کا ایک پھیرا پابندی سے کیا جاتا تھا اور جامع مسجد

کے زیرِ سایہ ایڈورڈ پارک کے لان پر پرانے محلّے بازار سیتا رام کے ساتھیوں کے ساتھ گھنٹہ آدھ گھنٹہ ضرور گزارتے تھے۔ میں علی الصباح پرانی دلّی سے نئی دِلّی کی طرف ہوا خوری کرنے جایا کرتا تھا۔ راستے میں مُٹھ بھیڑ ہو جاتی تو موٹر رکواتے، نیچے اُترتے اور اپنی کوٹھی کرزن ہاؤس کے باغ کے خوشبودار پھول عنایت فرماتے۔

۳۵-۱۹۳۴ء میں میرا اور لالہ مدن موہن لال کا سنجوگ میونسپل کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے رہا۔ وہاں بھی اُن سے اور سر شری رام سے مجھے ہمیشہ مدد ملی۔ باپ بیٹے، دونوں میونسپل کمیٹی کے ممبر تھے، اور دونوں کا ہندو ممبروں پر تو بالکل قبضہ ہی تھا، مسلمان ممبروں پر بھی کافی اثر تھا۔ میں سر شری رام سے پانچ چھے سال چھوٹا ہوں گا، اِس لیے لالہ مدن موہن لال مجھ سے اُسی طرح برتاؤ کرتے تھے جس طرح بزرگ چھوٹوں سے کیا کرتے ہیں، لیکن مولانا صاحب کہتے منھ بھی خشک ہوتا تھا۔ میں میونسپل کمیٹی کے کاموں میں مدد مانگتا تو حکّام کمیٹی سے فرماتے کہ بھائی! مولانا صاحب کے علاقے کا کام تو کرنا ہے۔ مولانا صاحب ہم سے کبھی غلط کام نہیں لیتے۔

سر شری رام سے کمیٹی میں تعلّقات اور بڑھ گئے تھے۔ ان سے میں کمیٹی کے اجلاس میں اکثر اختلاف کرتا تھا، لیکن وہ بُرا نہیں مانتے تھے۔

سر شری رام نے زندگی غربت کی حالت سے شروع کی تھی۔ جیسا کہ اُوپر عرض کر چکا ہوں، اُن کے والد دلّی کلاتھ مل میں معمولی ملازم تھے اور سر شری رام لڑکپن میں نئی سڑک کے ایک بزاز کے ہاں کپڑا نکالتے اور گاہکوں کو دکھایا کرتے تھے۔ مگر سر شری رام کے کوئی حقیقی یا رشتے کے چچا خاصے دولت مند تھے۔ وہ لاولد تھے اور اِن بھتیجے سے اُنھیں خاص اُنس تھا، شاید بیٹا بنا رکھا تھا۔ اُن کا انتقال ہُوا تو سر شری رام کے گھر میں یکایک دولت آ گئی۔ اُس دولت کا سر شری رام نے نہایت ہوش مندانہ استعمال کیا۔ باپ سے کہا، ملازمت چھوڑیے اور مِل کے حصّے خریدیے اور مِل کا ڈائرکٹر منتخب ہونے کی کوشش کیجیے۔ اور تھوڑے دن میں سر شری رام نے باپ کو دِلّی کلاتھ مِل کا ڈائرکٹر منتخب کرا دیا۔

سر شری رام کا دماغ کاروبار کے معاملے میں لاجواب تھا۔ چچا کی دولت اتنی نہیں تھی کہ اُس سے دلّی کلاتھ مل کے تمام حصّے خرید لیے جاتے، مگر سر شری رام

کے دماغ کا کرشمہ تھا کہ اب صرف دِلی کلاتھ مِل اس خاندان کے پاس نہیں ہے، خدا معلوم دلّی کلاتھ مِل کی کتنی شاخیں اور کتنے دوسرے مِل اس خاندان کی ملکیت ہیں۔ دلّی کی حکومت کا آدھا خرچ سارے شہر کے اِنکم ٹیکس سے چلتا تھا اور آدھا خرچ تنہا دلّی کلاتھ مل کے اِنکم ٹیکس سے۔ چھوٹے سے بزاز کی دکان پر کپڑا دکھانے والا لڑکا ہندستان کے اوّل درجے کے دولت مندوں کی صف میں یوں ہی نہیں پہنچ گیا تھا، سر شری رام میں دولت کو ترقی دینے کی برلا اور ٹاٹا سے زیادہ عقل تھی۔

دوسرے اعتبار سے بھی وہ سمجھ دار انسان تھے۔ غرور و تکبر نام کو نہیں تھا۔ اُن کے والد چھنّا مل والوں کے چوں کہ ملازم رہ چکے تھے، چھنّا مل والوں کے سربراہ کا وہ ادب کرتے تھے ؎

چوں بہ دولت برسی مست نہ گردی مَردی

انفرادی دولت مندی کو اسلام پسند نہیں کرتا، لہٰذا میں سر شری رام کے بے تحاشا دولت مند ہو جانے کی مدح نہیں کر سکتا: تاہم میں اُن کے دولت سے بے آپے نہ ہو جانے کا مدّاح ہوں۔

آزادی کی خاطر

شری رام نے دولت کا بُرا استعمال عمر کے کسی دَور میں نہیں کیا۔ اچّھا اِستعمال کسی نہ کسی قدر کرتے تھے۔ قومی اور مُلکی انجمنوں کو خاصا روپیہ دیتے تھے۔ اُن کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں جو ایک دفعہ مسٹر آصف علی کے مکان پر میری موجودگی میں اُن کی زبان سے نکلے تھے۔ کہا کہ میں ملک کی آزادی کی خاطر اپنا سارا اندوختہ خرچ کرنے کو تیار ہوں۔

دلی کلاتھ مِل کے ہزارہا مزدور دلّی کلاتھ مل کے زیر اہتمام رہتے تھے، اُنھیں انتہائی آسائش سے رکھا جاتا تھا۔ ہندو مسلمان کا دلّی کلاتھ مِل میں اِمتیاز نہیں تھا۔

یہ خاندان دلّی کا قدیم خاندان ہے، قدامت کی خوبیاں لالہ مدن موہن لال میں موجود تھیں۔ بیٹے، یعنی سر شری رام اور سر شنکر لال باپ کے قدم بہ قدم چلے، اور

پوتا مرلی دھر باپ اور چچا سے بازی لے گیا۔ لالہ مرلی دھر کے بھائیوں بھرت اور چرت سے میں واقف نہیں ہوں۔ وہ ۱۹۴۷ء میں غالباً بہت کم عمر تھے۔ لالہ مرلی دھر لائل پور کاٹن ملز کے سلسلے میں کراچی آتے تھے تو غریب خانے پر تشریف لاتے تھے۔ انھیں ادب سے بے حد دلچسپی تھی۔ شاعر تھے۔ شاد تخلص تھا۔ جناب بیخود دہلوی سے شرف تلمذ تھا۔ بیخود صاحب کا ذکر چھڑ جاتا تھا تو منہ سے پھول جھڑنے لگتے تھے۔ حضرت اُستاد حضرت اُستاد کہتے تھے نام نہیں لیتے تھے۔ اللہ کا لفظ زبان پر چڑھا ہوا تھا، پرمیشور یا پرماتما کیا، خدا کا لفظ بھی ان کی زبان سے نہیں سنا جب کہا اللہ ہی کہا۔

دادا کے بعد دنیا سے جانے کی ابتدا لالہ مرلی دھر شاد نے کی۔ پھر سر شنکر لال گئے، اور اب سر شری رام نے بھی دلی کو سونا کر دیا۔ دلی میں پرانی وضع کے ہندو بھی خال خال رہ گئے ہیں، سر شری رام اور سر شنکر لال کی وضعداری کا یہ عالم تھا کہ ان بھائیوں نے انگریزی لباس زندگی بھر نہیں پہنا۔

ایمان اور نیک عمل

اللہ کے وجود اور اللہ کے معبود اور اقتدار اعلا ہونے پر ایمان رکھنا، نیک عمل کرنا، یعنی اللہ کے قوانین پر چلنا اور مکافاتِ عمل اور یومِ حساب کو ماننا، ان سب باتوں کی بابت بتایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد ان کا اجر دیا جائے گا، انسان مرنے کے بعد خائف نہیں ہوگا اور ہاتھ نہیں ملے گا کہ ہائے ہائے میں نے اللہ پر ایمان کیوں نہ رکھا۔ نیک عمل کیوں نہ کیے اور یومِ آخر کو کیوں نہ مانا، خواہ وہ انسان مسلمان ہو یا حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل کا سچا یہودی، سچا نصرانی، سچا صابئی ہو۔[1]

دنیا میں بھی ایسا انسان خوف و حزن سے مامون رہتا ہے۔ اب کسی صاحبِ ایمان کا غیر صاحبِ ایمان سے مقابلہ کر کے دیکھ لیجیے، انشاء اللہ ہر طبقے کے صاحبِ ایمان کو اُس طبقے کے غیر صاحبِ ایمان کی نسبت مطمئن پائیے گا۔ باقی یہ خیال غلط ہے کہ ہمارا فلاں قوم یا فلاں نسل سے تعلق کافی ہے، ہم فلاں کی اولاد ہیں، ہم خواہ کچھ کریں ہیں

---

[1] دیکھیے سورہ بقر کی ۶۲ ویں آیت۔

قطعی جنتی۔ یہ خیال یہودیت اور نصرانیت کی پیداوار ہے[1]۔ مسلمان تو نیک عمل کرکے اور اللہ کے قوانین پر چل کر اللہ کے رحم و کرم کی دعائیں مانگتے ہیں۔ نجات اُخروی اللہ کے رحم و کرم پر منحصر ہے۔ نیک عملی کی توفیق خود بہت بڑی عنایت ہے۔ اِسی عنایت کے دوام اور ازدیاد کے لیے ہمہ وقت دست بہ دعا رہنا چاہیے۔

اِسلامی اور میکیاولی سیاست

اہلِ اقتدار کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے تو پھر کوئی ان کا نام نہیں لیتا، یہ کیا ماجرا ہے کہ خلفائے راشدین کے زمانے کو قریباً چودہ سو برس گزر چکے ہیں، اُن کے نام آج تک لیے جاتے ہیں اور خطبوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ وہ بھی تو حکمراں اور بادشاہ تھے۔ اور کسی حکمراں اور بادشاہ کی اتنی عزت کیوں نہیں کی گئی، اور کسی حکمراں اور بادشاہ سے اتنی محبت کیوں نہیں ہوئی۔ بادشاہ محبت سے تو یکسر محروم ہیں۔ صرف حضرت عمر بن عبدالعزیز ایک بادشاہ ہیں جنھیں خلفائے راشدین کی طرح سراہا جاتا ہے، لیکن خلفائے راشدین کی سی عالمگیر شہرت انھیں بھی حاصل نہیں ہے۔ خاص خاص لوگ حضرت عمر بن عبدالعزیز سے واقف ہیں، اور خلفائے راشدین کو مسلمانوں کا بچہ بچہ جانتا ہے، اور غیر مسلم بھی جانتے ہیں۔ گاندھی جی جب کہتے تھے، یہی کہتے کہ میں عمرؓ جیسے حکمراں چاہتا ہوں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حکمرانی کا ہر تاریخ داں معترف اور قایل ہے، خواہ ہندو ہو یا عیسائی، یورپین ہو یا ایشیائی۔

یہ خلفائے راشدین کا ڈنکا کیسے بجے جا رہا ہے۔ حکمرانوں اور بادشاہوں کا ملک پر اور ملک کے رہنے والوں پر تسلط ہوتا ہے، قلوب پر تسلط نہیں ہوتا، خلفائے راشدین کا تسلط اپنوں، بیگانوں سبھوں کے قلوب پر ہے۔ یہ کس بات کا نتیجہ ہے۔ کیا خلفائے راشدین بہت بڑے سیاست داں تھے کہ ایسا سکہ جما گئے کہ مٹائے نہیں مٹتا۔ اور کس کس بڑے سیاست داں کا سکہ چل رہا ہے۔ ذرا بتائیے تو کون کون سا بادشاہِ جم جاہ اور کون کون سا وزیر با تدبیر آپ کو یاد ہے۔ میں نے بچپن میں انگریز وزیر اعظم گلیڈ اسٹون کا چرچا سنا تھا۔ پھر اُس کے جانشینوں کی لنگتار دیکھی، کیسی عارضی نکلی اُن سب کی دھاک۔ چرچل تو کل وزیر اعظم تھے، اور عظیم ترین وزیر اعظم تھے۔ ابھی زندہ ہیں، مگر اب کہیں پرسش نہیں

---

[1] دیکھیے سورہ بقر کی ۱۱۱ویں آیت اور سورہ مائدہ کی ۱۸ویں آیت۔

ہے۔ کتنے وائسرائے کا ہندوستان میں غل مچا۔ فقط لارڈ مونٹ بیٹن کا ذکر کبھی کبھار آتا ہے۔ باقی گورنر جنرل اور وائسرائے نسیاً منسیا ہو گئے۔ مونٹ بیٹن کا ذکر بھی اچھائی کے ساتھ نہیں آتا، خلفائے راشدین میں کیا وصف تھا کہ چودہ سو برس گزر جانے کے باوجود اُن کا ذکر اچھائی ہی کے ساتھ کیا جاتا ہے، اُنھیں افضل البشر بعد الانبیا سمجھا جاتا ہے۔ بادشاہ اور افضل البشر بعد الانبیا؟ وصف یہ تھا کہ اُنھوں نے سیاست حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سیکھی تھی۔ اُن کی سیاست نعوذ باللہ چالاکی کی سیاست نہیں تھی، اُن کی سیاست اسلامی سیاست تھی۔ اُن کی سیاست عین اسلام تھی۔ اسلامی کارخانے کے چھوٹے بڑے پُرزوں کو بقائے دوام عطا کیا گیا ہے۔ جنیدؒ و شبلیؒ، شیخ عبدالقادرؒ جیلانی اور خواجہ معین الدین چشتیؒ پرزے تھے اور خلفائے راشدین اسلامی کارخانے کی مکمل مشین تھے۔ اسلامی سیاست آج بھی جو اختیار کرے گا اُس کا نام مدتوں دلوں پر نقش رہے گا۔ میکاؤلی سیاست سر تا سر ناپاک ہے۔ بقا پاکی کو ہے، ناپاکی کو نہیں ہے۔

مسلمانوں کا چالاکی کی سیاست میں ماہر ہونا مشکل ہے۔ مسلمانوں کی گھٹی میں اسلام کی رمق موجود ہے، یا تو اُس رمق کو بھی باہر کر دیا جائے یا از سرِ نو ویسا مسلمان بنا جائے، جنھیں بشارت دی گئی تھی کہ گھبراؤ نہیں اور خوف مت کھاؤ، غالب تم ہی رہوگے، بشرطیکہ تم مسلمان ہو۔ لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ مسلمان ہونے کی شرط پر غور کیجیے۔ خطاب حقیقی مسلمانوں سے ہے، نام کے مسلمانوں سے نہیں ہے۔ آپ اگر اپنے نفس کی خاطر بے چین ہیں تو بے چینی اور بڑھے گی اور اللہ کے دین کی خاطر بے چین ہیں تو یقین کیجیے اللہ فلاح و کامیابی کی وہ راہیں کھولنے والا ہے کہ آپ کو اُن کا تصور بھی نہیں ہے۔ اللہ مسلمانوں کو موقعوں پر موقعے دے رہا ہے، اللہ نہ کرے کہ اس قسم کا وقت آ جائے کہ اللہ موقعے دینا موقوف کر دے۔ لیکن ہماری بداعمالیاں نہ رکیں تو اس قسم کا وقت ایک نہ ایک دن آئے گا قطعی۔

ابولہب

ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ ہلاک ہوا اُس کی دولت اور کمائی

اُسے (عذابِ الٰہی سے) نہیں بچا سکی۔ عنقریب وہ شعلہ زن آگ میں جھونکا جائے گا اور (اُس کے ساتھ) اُس کی کانٹے لاد کر لانے والی جورو (بھی ہوگی جو کانٹے لا لا کر رسول اللہؐ کے راستے میں رات کے وقت بچھایا کرتی تھی) اُس (عورت) کی (متکبر) گردن میں کھجور کی چھال کی بٹی ہوئی رسی ڈالی جائے گی (اُس کا تکبر خاک میں ملے گا)۔

یہ سورۃ اللہب، تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ وَّ تَبَّ (الخ) کا مفہوم ہے۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سورۃ اللہب ابولہب کے متعلق نازل کی گئی تھی، لیکن کیا ابولہب پر بات ختم سمجھ لینی چاہیے، کیا بس اتنا ریکارڈ رکھنا کافی ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے ایک چچا جہاں ابوطالب تھے جنھوں نے حضورؐ کی باپ کی طرح سرپرستی کی تھی وہاں ایک چچا ابولہب بھی تھا جو حضورؐ کا اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا، اور اُس کی جورو اُس سے زیادہ تیز تھی۔ نہیں، پوری سورۃ آجکل کے اور قیامت تک کے بولہبیوں پر بھی صادق آتی ہے۔ علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے نے کہا ہے ؎

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

جو حضور سرورِ کائناتؐ سے کتراتا ہے وہ ابولہب کی صف کا آدمی ہے۔ جس طرح نمرودوں اور فرعونوں کی دنیا میں کمی نہیں ہے۔ اسی طرح بولہبی اور بولہبیوں کی بھی کمی نہیں ہے۔

قرآن مجید قیامت تک کے لیے ہے تو اس کے معنی ہیں کہ قرآن کی ایک ایک آیت قیامت تک کے لیے ہے۔ کوئی آیت ایسی نہیں ہے کہ آپ اُس پر NOTED "نوٹ کر لیا" لکھ کر آگے بڑھ جائیں۔

رسمیں، بیہودگی اور بربادی

اللہ روپیہ دے تو روپیہ خرچ کرنے ہی کی چیز ہے۔ میں انفرادی دولت مندی کا قایل نہیں ہوں، پوری قوم دولت مند ہو تو خاصی پچاس ساٹھ رسمیں ہیں، جن سے پیدایش اور موت کے درمیان سابقہ پڑتا ہے، سب رسمیں پوری کیجیے بلکہ پیدا ہونے سے مہینے دو مہینے پہلے کی اور مرنے کے بعد کی رسمیں جاری رکھیے۔ بچے

مُنڈے بنلاٹے، یعنی مٹھیاں کھولنی شروع کرے تو اس کی ننھیال سے مُرمُروں کے لڈّو پہنچنے چاہئیں۔ مَسیں بھیگیں تو مونچھوں کے کُونڈے کو کس نے روکا ہے۔ بڈّھا مرے تو اس کا سوم بھی ٹھیک ہے اور دسواں، بیسواں، چالیسواں، سب ٹھیک ہے، تبارک مناسب اور دیوسہ جائز۔ عروج کی حالت میں بہت کم رسمیں ناجائز ہوا کرتی ہیں۔ مال دار آدمی مرے اور اُس کی اولاد فاتحہ درود نہ کرے تو کہتے ہیں، مر گئے مردود، جن کی فاتحہ نہ درود۔ لیکن عروج کی باتیں زوال کے زمانے میں اور دولت مندی کی حرکتیں مفلسی کے دَور میں زیب نہیں دیتیں، یہ ایسی ہیں جیسی خواب کی باتیں، یا جیسی پیری میں خضاب کی باتیں۔ آج ہم میں درحقیقت نہ کھلانے کی اہلیت ہے نہ کھانے کی۔ کھلانے والا صرف اس خیال کو سامنے رکھ کر کھلاتا ہے کہ دنیا اُسے اُس کی حیثیت سے بڑھ کر رُپے والا تسلیم کر لے اور کھانے والے اس غرض سے کھاتے ہیں کہ تھوڑی بہت حیثیت کھلانے والے کی جو رہ گئی ہے وہ جلد ٹھکانے لگے اور یہ ہمارے برابر یا ہم سے بھی نیچے درجے پر آجائے۔

بھیڑیوں کا قاعدہ ہے کہ جب انھیں شکار ملنا موقوف ہو جاتا ہے تو بھٹ میں اکٹھّے ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو گھورتے رہتے ہیں۔ جہاں کسی بھیڑیے کو غنودگی آئی اور اُس کی آنکھ جھپکی، تمام بھیڑیے چڑھ دوڑے اور تکّا بوٹی کر ڈالی، اور پھر اور بھیڑیے کی غنودگی کا انتظار کرنے لگے۔ بعینہٖ یہی حالت اب ہماری ہے، ہم آپس میں ایک دوسرے کو کھانے کے لیے وقت کے منتظر رہتے ہیں۔ مثلاً بنیے نے دیکھا کہ فصل تیار ہے اور جاٹ کے پاس اس سے سال بھر گزارنے کا انتظام ہو جائے گا۔ بنیا آیا اور بولا، چودہری! چھوٹے کا کوئی کاج کر ڈال۔ چودہری نے جواب دیا۔ سیٹھ جی! کاج کہاں سے کروں۔ سیٹھ جی نے فرمایا، میرا رُپیہ کس کا ہے۔ رُپے کا فکر نہ کر۔ اتنا بیگانہ مت بن۔ ہے رام رام۔ غرض سیٹھ جی کی مہربانی سے چودہری کے ہاں پندرہ بیس دن اتنی رونق رہی کہ چودہری صاحب پھُولے نہ سماتے تھے، مگر سیٹھ جی فصل پر قبضہ جمانے کے علاوہ جس وقت اچھّی موٹی سی رقم چودہری صاحب کے ذمّے نکالیں گے اس وقت اُنھیں دن کو تارے دکھائی دے جائیں گے۔ یہ تو دیہاتوں کی کیفیت ہے، شہروں میں بھی بے وقوف کھلاتے ہیں اور عقل مند کھاتے ہیں۔ دیہاتوں اور قصبوں میں صرف بنیا ہوتا ہے، شہروں میں نواب صاحب اور حضور و سرکار کہنے والے بھی ہیں، شہروں میں مسلمان، جن کے ہاں سود حرام

ہے، سودی قرض لے کر اماں ابا کی روح کو ثواب پہنچاتے ہیں، سودی قرض لے کر دیگیں کی سنت ادا کرتے ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ دعوتیں کھا کر عموماً مذمت کی جاتی ہے۔ پان کی گلوریاں منھ میں دبا دبا کر باہر نکلے اور کسی نے کہا گوشت خراب تھا، کسی نے کہا روٹیاں چم چچڑ تھیں کوئی بولا چاول بنولا سے تھے، کوئی بولا گھی برائے نام تھا۔ کسی نے انتظام میں کیڑے ڈالے، کسی نے پیشین گوئی کر دی کہ چار دن کی چاندنی ہے، مکان گروی رکھ کر دعوت کی ہے۔ چھے مہینے کا وعدہ کیا ہے۔ بھلا چھے مہینے میں روپیہ آسمان سے تھوڑا ہی ٹپک پڑے گا۔ چھے برس بھی ادا نہیں کر سکتے، باپ نے کیسے کیسے جتن کر کے دو کھنڈلے چھوڑے تھے، صاحبزادے انھیں ٹھکانے لگا دیں گے، غرض مرغی اپنی جان سے گئی اور کھانے والوں نے اس کا مذاق اڑا دیا۔

وہ حضرات جن کی برادریاں ہیں اُن کی مصیبت کا تو کچھ ٹھکانا نہیں ہے۔ برادری بات بات پر کھانا مانگتی ہے۔ شادی ہو تو کھلاؤ، غمی ہو تو کھلاؤ۔ کوئی قصور کرو تو کھلاؤ — قصور واری کا کھانا کھلانا تو خیر سزا ہے ہی، شادی غمی کے کھانے کھلانے میں بھی خاصی سزا مل جاتی ہے۔ جان جان کر کھانے والے کھانا برباد کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا تو نہیں، مگر سنا ہے کہ شکرانہ کھایا جاتا ہے تو بعض بعض بگڑے دل کھانے کے برتن میں سوراخ کر دیتے ہیں اور کھلانے والے سے چاولوں پر گھی اور شکر ڈلوائے جاتے ہیں اور گھی سوراخ میں سے بہتا رہتا ہے۔ کھانا غایب کرنے کی عادت بھی شہروں اور دیہاتوں میں عام ہے، چوری کی نیت سے نہیں، کھلانے والے کو ذلیل کرنے کی نیت سے کھانا غائب کیا جاتا ہے، تاکہ کھانا تھڑے اور تھڑی تھڑی مچے۔

مثل ہے کہ اندھے کو نیوتا دینا دو کو بلانا ہے، لیکن دعوتوں کے موقع پر آنکھوں والے بھی آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ کھلانے والے نے فقط ہمیں دعوت دی ہے، ہم اور کو کیوں لے جائیں، لیکن انھیں ایک تو اپنی شان ظاہر کرنے کی سوجھتی ہے، بغیر ملازم یا ملازمہ کے جانا بے عزتی معلوم ہوتا ہے، گھر میں چاہے بیوی صاحب خود روٹیاں تھوپتی ہوں مگر دعوت میں جائیں گے تو میاں محلے کے ایک نہ ایک بڈھے ٹھڈے کو ساتھ لے لیں گے اور ایک برقع والی بیگم صاحبہ کے ساتھ ہو جائے گی۔ چالوں کی دعوت میں سمدھیانے سے پچاس آدمیوں کا بلاوا آتا ہے اور پہنچتے ڈیڑھ سو ہیں یا اگر خبر لگ جاتی ہے

کہ بیٹی والے نے دُور اندیشی سے پچاس کی بجائے پچھتر کا انتظام کر لیا ہے تو پھر پچاس میں بھی کمی کر دی جاتی ہے۔

میں رسموں کا مخالف نہیں ہوں، حامی ہوں، اور یہ تو میرے نزدیک بے حد بُرا ہے کہ اپنی رسمیں ہم مٹا دیں اور انگریزوں یا امریکنوں کی رسمیں اختیار کر لیں، مگر مجھے اپنی رسموں کی بقا کے لیے ضرورت محسوس ہُوا کرتی ہے کہ ان کی اصلاح ضرور کی جائے اور انھیں ذرا سوچ سمجھ کر برتا جائے۔ کھانا کھلانا مسلمانوں کا قدیم شیوہ ہے، اسے کون روک سکتا ہے، کسی میں کھانا کھلانے کی ہمت ہے اور وہ محبت سے اور محبت بڑھانے کی نیت سے کھلاتا ہے، قرض دام کیے بغیر کھلاتا ہے۔ اسامی باز اُس کے گرد جمع نہیں ہیں۔ اُس کی تباہی اور بربادی کا اندیشہ نہیں ہے۔ اُس کے کھانا کھلانے سے غریبوں میں حرص نہیں پیدا ہوتی، غریب دل مسوس کر نہیں رہ جاتے تو ایسا شخص کھانا کھلائے، البتہ قرض دام لے کر اور نمایش کی خاطر کھانا کھلانا خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ کا مصداق بنتا ہے۔ کوئی مذہب بھی اجازت نہیں دیتا کہ انسان حیثیت سے زیادہ خرچ کرے، وہ خرچ روزمرّہ کا ہو یا شادی غمی کا، کم از کم اسلام کا فیصلہ صاف ہے۔ اسلام چادر سے باہر پاؤں پھیلانے کو قطعی منع کرتا ہے، فضول خرچوں کو شیطان کا بھائی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ فضول خرچ لوگ اللہ کے محبوب نہیں ہو سکتے۔ اُن کی جگہ جہنّم ہے۔ اسلام کنجوسی کی بھی تعلیم نہیں دیتا۔ اسلام کو ہر معاملے میں اعتدال پسند ہے۔ روپیہ ہمیشہ ایسے کاموں میں خرچ کرنا چاہیے کہ خرچ کر کے رُوحانی کیف حاصل ہو، جیسے اللہ کے ہاں سے رسید آگئی کہ اللہ نے خرچ کو قبول کر لیا۔ روپیہ پیسہ اور جو جو نعمتیں ہمیں اللہ تعالےٰ نے دے رکھی ہیں سب کا قیامت کے دن ہمیں حساب دینا ہے۔ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝ روز پڑھتے ہو۔ اپنا ہاتھ نہ اتنا سکیڑو کہ گویا گردن میں بندھا ہے اور نہ بالکل پھیلا دو۔ ایسا کرو گے تو تم یوں بیٹھے رہ جاؤ گے کہ لوگ تمھیں ملامت بھی کریں گے اور تم خالی ہاتھ بھی ہو جاؤ گے یہ بھی قرآن مجید کی آیت کا مفہوم ہے۔

بے پردگی کا زور

انگریزوں کے زمانے میں بے پردگی کا اتنا زور نہیں تھا، جتنا انگریزوں کے جانے اور آزادی

ملنے کے بعد سے ہُوا ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں مغلئی تمدّن آہستہ آہستہ بدل رہا تھا مگر اب بدلنے کی رفتار کے پَر لگ گئے ہیں۔ میں نے چوں کہ مُغلئی تمدّن کا عروج دیکھا ہے، میری آنکھوں کو اور میرے دل و دماغ کو یہ تبدیلی بے حد کھٹکتی ہے۔ میں جن کے لیے روز دُعا مانگا کرتا ہوں، اُن کی ذراسی تبدیلی مجھ سے دعا کا جذبہ چھین لیتی ہے۔

۱۸۵۸ء میں جب دلّی والے دلّی واپس آکر دوبارہ دلّی میں بسے تو اُن کے پاس مُغلئی تمدّن کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ایک آدھ خاندان کو مستثنیٰ کر دیجیے۔ باقی سارے مسلمان خاندان تباہ اور پریشان حال تھے، لیکن اُنھوں نے اپنے تمدّن کا دامن نہیں چھوڑا۔ اُسے سینے سے چمٹائے رکھا۔

جو تمدّن صدیوں میں بنا تھا، وہ میری پیدائش کے وقت، یعنی ۱۸۸۸ء میں درجہ کمال کو پہنچ چکا تھا اور پھر دلّی کے دارالسلطنت قرار پانے (۱۹۱۱ء) تک اُسے خاصا فروغ ہی رہا۔ ۱۹۱۱ء سے قبل کوئی طوائف بھی بازاروں میں اس طرح دندنا نہیں پھرتی تھی، جس طرح آج ہم شرفا کی بہو بیٹیاں پھرتی ہیں۔

انگریزوں کو ہم غیر جانتے تھے، لہٰذا اُن کا عمل ہمارے واسطے نمونہ نہیں تھا، لیکن اب حکومت غیروں کی نہیں ہے، اپنوں کی ہے، موجودہ حکّام کا عمل ہمارے واسطے نمونہ ہے۔ اب اَلنَّاسُ عَلیٰ دِینِ مُلُوکِھِمْ کے ہم صحیح مصداق ہیں۔

لیاقت علی خاں کی زندگی کی بات ہے۔ ایک بڑی بی سے میں نے پوچھا، تم تو تعلیم یافتہ نہیں ہو، تم نے کس حق سے پردہ اُٹھا دیا۔ بولیں۔ لیاقت علی، وزیرِاعظم کی بیوی بھی پردہ نہیں کرتیں۔ کیا بیگم لیاقت علی ہم سے کم شریف ہیں۔ میں اُنھیں کیا جواب دیتا۔

واقعی بے پردگی مسلمان حکّام کی بیویوں کی وجہ سے بڑھی ہے۔ لیڈی ولنگڈن اور لیڈی لنلتھگو سے ہماری عورتیں واقف نہیں تھیں مگر بیگم لیاقت علی اور اُن کی ساتھنوں کے بلند مراتب سے واقف ہیں اور اُنھیں نمونہ سمجھتی ہیں۔

کاش غریب شرفا کی عورتیں ایک بات سوچیں کہ بیگم لیاقت علی کے مرتبے والیاں سڑکوں پر اور بسوں میں ماری ماری نہیں پھرتیں۔ تمھارا بے برقعہ پھرنا تو شاہ بڑے کا اجتماع یاد دلا دیتا ہے۔ دِلّی میں جمنا کے کنارے شاہ بڑے کا مزار ہے۔ وہاں خدا معلوم کب سے چرسیے اور بھنگڑ دن بھر جمع رہتے ہیں۔ میں نے تو گھٹیا قسم کی عورتوں کو اتنا بے پردہ

صرف وہاں دیکھا ہے۔

۱۹۴۸ء تک میں برقعے سے فقط منہ باہر نکلا تھا۔ اب پورا جسم باہر نکل آیا ہے۔ اور جسم پر لباس ایسا پہنا جاتا ہے کہ بیگم لیاقت علی نے ویسا لباس کبھی نہیں پہنا، بلکہ ویسا لباس شاہ بڑے جانے والی گھٹیا عورتیں بھی نہیں پہنتی تھیں۔

مغلئی پردہ ترک کر دو، لیکن اسلامی پردہ تو ترک نہ کرو۔ پردے اور حجاب کا حکم قرآن میں ہے اور تمھاری طرح بازاروں میں پھرنے کو قرآن نے منع فرمایا ہے۔ اسے تبرج جاہلیہ کہا ہے۔ تم ترقی نہیں کر رہی ہو، اسلام سے قبل کے دور کی طرف جا رہی ہو۔ دورِ جاہلیت کی طرف۔

دیوانے، زنجیر اور شریعت

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ ہمارے ایسے بزرگ ہیں، جو اوائل اسلام میں پیدا ہوئے تھے اور جنھوں نے ۱۸۰ ہجری میں وفات پائی تھی، جن کی بابت ہمیں یقین ہے کہ اسلام کے منشا کو خوب سمجھتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں: "دنیا ایک بیمارستان ہے اور لوگ اس میں دیوانوں کی مانند ہیں اور دیوانوں کے لیے بیمارستان میں قید و زنجیر ہوتی ہے"۔

اس کا یہ مطلب نہیں لینا چاہیے کہ حضرت فضیل ترکِ دنیا کی تعلیم دے رہے ہیں، حضرت فضیل صرف یہ فرماتے ہیں کہ یہاں شریعت کی پابندی ضروری ہے۔ قید و زنجیر سے مراد شریعت ہے۔ شریعت کا عمل دخل دیوانوں کا دیوانہ پن دبائے رکھتا ہے اور شریعت کا عمل دخل نہ ہو تو دیوانگی اُبھر آتی ہے اور انسان باؤلے کتوں کی طرح کاٹنے لگتا ہے اور باؤلا پن پھیلاتا ہے۔

حضرت فضیل کے قول کی صداقت میں آج سے پہلے بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن آج تو قید و زنجیر یعنی شریعت کے فقدان کا اثر اور نتیجہ بالکل عیاں ہے۔ مسلمانوں کے گھروں میں آبِ حیات (قرآن مجید) موجود ہے، لیکن جس طرح سگ گزیدہ پانی سے ڈرتا ہے اور پانی نہیں پیتا اور پیاس نہ بجھنے کی وجہ سے مر جاتا ہے اسی طرح مغرب زدہ مسلمان آبِ حیات قرآن مجید سے بھاگتے ہیں اور اس کے قریب نہیں آتے اور روز بروز موت کے قریب پہنچتے جا رہے ہیں۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو مغرب زدگی نے اسلامی پابندیوں سے آزاد کر دیا ہے اور غیر تعلیم یافتہ مسلمانوں کو جہالت نے۔ پوری ملتِ اسلامی پر بے راہ روی مسلط ہے

گھر کے رہے ہیں نہ گھاٹ کے، بقول ایک بزرگ کے دنیا نے ان کے ایمان کو اس طرح کھا لیا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا لیتی ہے، اور ایمان کو کھا کر دنیا نے اِن سے اپنا مُنھ چھپا لیا ہے۔ انھیں دنیا ملی نہیں ہے ؎

چیست دنیا از خدا غافل شُدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن (مولانا رومی)

نفس کُشی

جتنے اقوال بزرگانِ سلف کے دنیا کی مذمت میں ہیں وہ سب اس دنیا کے متعلق ہیں جو خدا سے غافل کر دیتی ہے، جو دنیا خدا سے غافل نہ کرے وہ ایمان کو کیا کھائے گی، وہ تو عین ایمان ہے، عین دین ہے، عین اسلام ہے، اُسے کون بُرا کہہ سکتا ہے۔

حضرت ذوالنُّون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔ زندگی میں اپنے نفس کو مردہ بنا لو تاکہ موت کے بعد مُردوں میں تم زندہ نظر آؤ۔ حضرت شیخ احمد خضرویہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔ اپنے نفس کو مار ڈال تاکہ خود زندہ ہو جائے۔

نفس کو مارے بغیر خدا کو پانا مشکل ہے۔ نفس کو مارنے کے معنی خود کشی نہیں ہیں نفس کو مارنے کے معنی ہیں نفس کو خدا کا بندہ بنانا، دنیا کا بندہ نہ بنانا۔ دنیا کا حاکم ہونا، دنیا کا محکوم نہ ہونا۔ اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَ اِنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ۔ دنیا تمھارے واسطے ہے (تم دنیا کے واسطے نہیں ہو) تم اُس کے واسطے ہو، جس سے دائمی سابقہ پڑنا ہے۔ بالکل صاف صاف بات ہے۔ گلے اُترنی چاہیے۔

یہ دنیائے دنی کی مذمت کرنے والے اور نفس کو مار ڈالنے والے یعنی نفس کو قابو میں رکھنے والے ہی تو تھے جو خلافِ اسلام حکم دینے والے بادشاہوں سے ٹکرایا کرتے تھے اور مطابقِ اسلام حکم دینے والے بادشاہوں کے ساتھ جا کر جہاد کیا کرتے تھے۔ دونوں صورتوں میں انھیں جان کی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ اللہ کی خوشنودی کے مقابلے میں مال کی اور جان کی پرواہ کی جائے، ایسی دنیا کیا مدح و ثنا کے لائق ہے؟ ایسی دنیا کی مذمت سے ہرگز خیال نہ کیجیے کہ مذمت کرنے والے مسلمانوں کو رہبانیت کی طرف لا رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمان دنیا کی جاذبیتوں سے نفرت کریں اور دنیا سے دُور بھاگیں۔ اُن کا عقیدہ وہی ہے کہ

لَا رُھبَانِیَّۃَ فِی الْاِسْلَامِ۔ اسلام دنیا کو ترک کرنے کا حکم نہیں دیتا، دُنیا کو مسخر کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مگر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُسوہ حسنہ اُن کے سامنے یہ ہے کہ حضور ملت کو مالا مال کر گئے اور اپنے لیے دُعا مانگتے رہے کہ مجھے زندگی بھر مسکین رکھیو، موت مجھے حالتِ مسکینی میں آئے اور میرا حشر مسکینوں کے ساتھ ہو۔ اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّ اَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَّ احْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ۔ اس اُسوہ حسنہ کی خلفائے راشدین نے پیروی کی۔ خلفائے راشدین کے پیروی کرنے سے ظاہر ہے کہ یہ اُسوہ حسنہ پیروی کے واسطے ہے۔

انگریزوں کا رویّہ

دہلی میونسپل کمیٹی کا ہفتہ وار اجلاس گرمی میں جمعرات کی صبح کو ہُوا کرتا تھا اور جاڑے میں بُدھ کی رات کو، بعد مغرب۔ گرمی کے ایک اجلاس کے لیے ممبران میونسپل کمیٹی میٹنگ ہال کے باہر جمع تھے اور اجلاس کے وقت کا انتظار کر رہے تھے کہ یکایک ڈسٹرکٹ کورٹ کا کوئی چپراسی آیا اور اُس نے لالہ مدن موہن لال، ممبر میونسپلٹی (مالک دہلی کلاتھ مل) سے کہا۔ یہ آپ کا سمن یا وارنٹ ہے۔ سب جج کا حکم ہے کہ آپ فوراً اُن کے گھر پر پیش ہوں۔ میرے ساتھ چلیے۔

لالہ مدن موہن لال دہلی کے سب سے بڑے دولت مند ہندو تھے۔ کسی دوسرے دولتمند ہندو نے انھیں سُبک کرنے کی غرض سے معمولی سی رقم کا دعویٰ کر دیا تھا اور ایسا انتظام کیا تھا کہ سمن یا وارنٹ میونسپلٹی میں اجلاس شروع ہونے سے ذرا سی دیر پہلے پہنچے تاکہ تمام ممبر بھی دیکھیں اور انگریز ڈپٹی کمشنر بھی دیکھے، جو میونسپلٹی کا صدر تھا۔ جب چپراسی پہنچا ہے تو اتفاق سے مدن موہن لال ڈپٹی کمشنر (مسٹر لیٹر ڈی) ہی کے ساتھ ٹہل رہے تھے اور مصروف گفت گو تھے۔ چپراسی نے سمن یا وارنٹ ڈپٹی کمشنر کے سامنے بے دھڑک تھما دیا، جسے ڈپٹی کمشنر نے پڑھا۔ مدن موہن لال ڈپٹی کمشنر سے بولے "تو پھر میں ہو آؤں"۔ ڈپٹی کمشنر نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔ ہاں، جائیے۔ چناں چہ مدن موہن لال چپراسی کے ہمراہ اپنی موٹر کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔

انگریز حکام ہندستانیوں کے آپس کے معاملات میں مطلق دخل نہیں دیتے تھے، انگریز دوستوں اور انگریز قوم کے معاملات میں اُن کا رویّہ کچھ اور تھا اور ہندستانی دوستوں کے معاملات میں کچھ اور۔

ایک واقعہ

صرف ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ اُسے مداخلت سمجھا جا سکتا ہے، لیکن خدا معلوم کیا گزری کہ وہ مداخلت بھی رُک گئی۔

سُنّی مجلس اوقاف دہلی کے صدر کا انتخاب ہونا تھا۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں جو بعد میں پاکستان کی وزارتِ عظمیٰ کی کُرسی پر بیٹھے اور خان بہادر حاجی وجیہہ الدین (مالک پانیر آرمز کمپنی) صدارت کے اُمیدوار تھے۔ اور انتخاب کرنے والے تھے، یعنی ممبران اوقاف کمیٹی، سید حسین امام (سابق صدر کونسل آف اسٹیٹ) ڈاکٹر ذاکر حسین (موجودہ نائب صدر حکومت بھارت)، مسٹر زاہد حسین (جو پھر پاکستان کی طرف سے بھارت میں ہائی کمشنر رہے) خواجہ حسن نظامی۔ مولوی سید احمد، امام جامع مسجد دہلی وغیرہ وغیرہ۔ میں بھی اوقاف کمیٹی کا ممبر تھا۔ چیف کمشنر دہلی نے حکم دیا کہ ڈپٹی کمشنر اوقاف کمیٹی کے ممبروں کو اپنے کچہری کے دفتر میں بلائے اور ووٹ لے لے۔ کسی اللہ کے بندے نے سب جج کی عدالت سے حکم امتناعی حاصل کر لیا کہ جلسہ خلاف قانون ہے، منعقد نہ کرنا چاہیے اور ڈپٹی کمشنر کے دفتر کے دروازے پر چپراسی کھڑا کرا دیا تاکہ ممبران اندر قدم رکھنے سے قبل سب جج کا حکم وصول کرتے جائیں۔ ہم لوگ اندر داخل ہوئے تو ہم نے مسٹر لابیلی (ڈپٹی کمشنر) کو بتایا کہ سب جج نے جلسے کو خلافِ قانون قرار دے دیا ہے۔ مسٹر لابیلی مستثنےٰ قسم کے انگریز تھے اور غصیل آدمی تھے۔ وہ بھڑک اُٹھے۔ سکریٹری مجلس اوقاف سے کہا چپراسی بھیجو سب جج کو لائے۔ چپراسی سب جج کی بجائے اطلاع لایا کہ سب جج صاحب گھر جا چکے۔ مسٹر لابیلی نے کہا، میرے پاس چیف کمشنر کا حکم ہے میں جلسہ کروں گا۔ غالباً چیف کمشنر کے حکم کی وجہ سے مسٹر لابیلی مجبور تھے، ورنہ اُن کی بلا سے جلسہ ہوتا یا نہ ہوتا، اور ممبران مجلس اوقاف چیف کمشنر کے حکم کی وجہ سے قیر تھے۔ چناں چہ جلسہ کیا گیا اور نواب زادہ صاحب کا انتخاب کرایا گیا۔ لیکن دوسرے یا تیسرے دن تمام ممبران (حاضر جلسہ) کے نام نوٹس صادر ہو گئے کہ حکم امتناعی کی خلاف ورزی کر کے توہین عدالت کی ہے۔ فلاں تاریخ حاضر ہو کر صفائی دو۔ مسٹر لابیلی کا غصہ دودھ کا اُبال تھا، اور انھیں نہ حکم امتناعی ملا تھا اور نہ نوٹس ملا تھا، انھوں نے پھر سب جج کے احکام میں مداخلت نہیں کی۔ خدا معلوم کیونکر قصہ رفع دفع ہوا۔ میرے سوا سب کو وکیل تو کرنے ہی پڑے تھے۔

انگریزی انصاف اور بے انصافی

انگریزوں کی عدالتیں ویسی آزاد تو نہیں تھیں جیسی قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی عدالتیں آزاد تھیں، تاہم بہت آزاد تھیں۔ مگر یہی انگریز جو ہندوستانی ہندوستانی کے معاملات میں اتنے غیر طرفدار اور بے تعلق تھے اگر انگریز اور ہندوستانی کا معاملہ ہوتا تھا تو انتہا درجے طرفدار اور غیر منصف بن جاتے تھے۔ ہندوستانی انگریز کے ہاتھ سے مر بھی جاتا تھا تو اُسے پھانسی نہیں چڑھاتے تھے۔ کہہ دیتے تھے کہ ہندوستانی کی تلّی کا قصور تھا، انگریز کی معمولی ضرب برداشت نہ کر سکی۔

حیرت شملوی کی غزل

طبیعت لکھنے کی طرف مائل نہیں ہے اور میں جس طرح بغیر بھوک کے کھانا نہیں کھاتا اسی طرح لکھتا تب ہی ہوں جب طبیعت لکھنے پر آمادہ ہوتی ہے لہٰذا آج کے تاثرات جناب حیرت شملوی کی ایک غزل سنا کر ختم کرتا ہوں:۔

گو کثرتِ اموال ہے پہلے سے زیادہ
الفت کا مگر کال ہے پہلے سے زیادہ

یہ منزلِ دشوار، یہ بازی گرِ اُلفت
بازیچۂ اطفال ہے، پہلے سے زیادہ

اغراض ہی اغراض کا پوشیدہ و ظاہر
پھیلا ہوُا اک جال ہے پہلے سے زیادہ

جو کچھ بھی کہے کوئی، مگر واقعہ یہ ہے
سرکار کا اقبال ہے پہلے سے زیادہ

ظاہر کوئی آزاد اگر ہے بھی تو کیا ہے
محرم پہ وبال ہے پہلے سے زیادہ

جادہ ہے، نہ منزل ہے، نہ منزل کا تصوّر
اب شامتِ اعمال ہے، پہلے سے زیادہ

حالات کی اصلاح بھی ہو جائے گی حیرت
کوشش تو بہر حال ہے، پہلے سے زیادہ

یہ غزل حیرت صاحب نے ۱۹۴۲ء میں کہی تھی۔

مایوسی کفر ہے

بعض آدمی ہوتے ہیں کہ انھیں ہر بات کا روشن پہلو نظر آتا ہے۔ ہر بات سے اچھی اُمید باندھتے ہیں۔ ایسے آدمی کو انگریزی میں OPTIMIST اوپٹی مسٹ کہا جاتا ہے۔ اور بعض آدمی ہوتے ہیں کہ انھیں ہر بات کا تاریک پہلو نظر آتا ہے۔ وہ ہر بات سے بُرا اثر لیتے ہیں پتّا کھڑکا اور بندہ بھڑکا۔ ایسے آدمی کو انگریزی میں PESSIMIST پیسی مسٹ (قنوطیت پسند) کہا جاتا ہے۔

پیسی مسٹ آدمی ہمیشہ اذیت میں مبتلا رہتا ہے۔ بچے کو بخار چڑھا اور اس نے سوچنا شروع کر دیا، کہیں میعادی بخار نہ ہو۔ بیٹی داماد میں ذراسی کشیدگی دیکھی اور یہ گھبرایا کہ نہ جانے نوبت کہاں تک پہنچ جائے۔ افسر نے تیوری پر بل ڈالا اور اس نے سمجھا کہ نوکری کی خیر نہیں ہے۔

اسلام اپنے پیروؤں سے رجائیت (اوپٹی مزم OPTIMISM) کا طلب گار ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان اللہ سے اچھی توقع رکھیں، اور پیسی مزم PESSIMISM کے اتنا خلاف ہو کہ مایوسی کو ایک قسم کا کفر بتاتا ہے۔ اَلْیَاسُ مِنَ الْکُفْرِ۔ پیسی مزم میں کفرانِ نعمت اور ناشکری تو بالکل عیاں ہے، اور اس قسم کا کفر مضمر ہے کہ اللہ کے متعلق تصور کیا جا رہا ہے کہ اللہ ہماری مصیبت ٹال نہیں سکتا اور دور نہیں کر سکتا۔

انتہائی بڑی مصیبت انسان کے نزدیک انسان کی اپنی موت ہے۔ اسلام نے اپنی موت کو بھی محبوب اور مرغوب بنا دیا ہے، پھر مسلمان اگر اپنی موت سے محبت اور رغبت کر سکتا ہے تو اُسے اور مصیبتیں کیا ستائیں گی۔ مسلمان تمام مصیبتوں سے مردانہ وار صبر و آزما ہوگا۔ اللہ سے مدد ضرور مانگے گا، اور اللہ اُس کو اس طرح مدد دے گا کہ سجھائے گا کہ اوسان نہ کھوؤ اور فلاں فلاں تدبیر کرو۔ مصیبت تم پر غلبہ نہیں پائے گی، تم مصیبت پر غلبہ پاؤ گے۔

کام یاب اِنسان

دنیا میں جتنے آدمی، مسلم و غیر مسلم کامیاب ہیں، سب اوپٹی مسٹ طبیعت کے

ہیں۔ غیر مسلم کا اوپٹی مزم طبیعت تک محدود ہے۔ مسلم کو عقیدہ بھی مدد دیتا ہے۔ بشرطیکہ وہ عقیدے کے مطابق عمل پیرا ہو۔ پلپسی مسٹ طبیعت کا مسلمان صرف عقیدے کی وجہ سے دل مضبوط کر لیتا ہے، ورنہ پلپسی مسٹ طبیعت کے آدمی کامیاب نہیں ہوا کرتے، خواہ اُن میں اور قابلیتیں کتنی ہی ہوں۔ کامیابی رِسک (RISK) لینے اور خطروں کا مقابلہ کرنے سے حاصل کی جاتی ہے۔

دنیاوی اعتبار سے بھی پلپسی مسٹ آدمی کی کامیابی دشوار ہے اور دینی اعتبار سے اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اللہ پر بھروسہ نہ کرنا اور اللہ سے نااُمید ہو جانا کس قدر خراب حرکت ہے۔ اسلام نے ہمیں سکھایا ہے کہ اللہ سب مشکلیں آسان کر دیتا ہے۔ سب اُلجھنیں سلجھا دیتا ہے، اگر اُس کی عطا کردہ عقل سے اُس کے قوانین کے تحت اُن کا حل تلاش کیا جائے اور اُس کی سجھائی ہوئی تدبیروں کو برتا جائے، اور ناکامی کی صورت میں ہمت نہ ہاری جائے۔ ناکامی برداشت کر لی جائے اور دوبارہ، سہ بارہ کمر ہمت کسی جائے۔

مسلمان کو حکم ہے کہ خود مصائب کو دعوت نہ دے۔ اپنا طرزِ عمل نہ بگاڑے، پھر بھی مصائب کا نزول ہو تو اپنے اوپر خوف و پریشانی طاری نہ کرے۔ خوف سے مامون رہنا اللہ کا عظیم احسان ہے، ایسا احسان کہ اللہ نے اُسے جتایا ہے:۔ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ، اور خوف سے مامون رہنا جنتیوں کی نشانی ہے۔ اہلِ جنت کے متعلق ارشاد ہے:۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ وہ نہ خوف کھائیں گے کہ ہائے آئندہ کیا ہونا ہے اور نہ پچھلی کسی بات کی یاد اُنھیں دُکھ پہنچائے گی کہ ہائے ہم نے کیا حماقت کی تھی۔ اکثر مصیبتیں اپنی حماقتوں سے آتی ہیں۔ دنیا میں بھی جنت اُتارنی ہے تو لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کا مصداق بنو۔ بے دھڑک آتش نمرود میں کود جاؤ اور اُسے گلزار کر دو۔

مزاج کی مناسبت

بھینس کے آگے بین بجانا مشہور محاورہ ہے۔ بین کی آواز سے سانپ جیسا جانور لہرانے لگتا ہے۔ مگر بھینس پر بین مطلق اثر نہیں کرتی۔ اثر کے واسطے مناسبت لازمی شے ہے۔

میرے سامنے کا واقعہ ہے۔ اجمیر شریف میں عرس کے موقع پر ایک شعر سن کر مولانا محمد حسین الہ آبادی کی روح پرواز کر گئی تھی۔ میں اُس وقت نوجوان تھا۔ میں نے اُس شعر

کو سُن کر بھلا دیا۔ اس واسطے کہ مناسبت نہیں تھی۔

شعر سُن کر جان دے دینے کے واقعے اور بھی ہیں، اور شعر سُن کر کچھ نہ کچھ اثر تو سب ہی قبول کرتے ہیں۔ شعر سے متاثر ہونے والے بے شمار ہیں۔ البتہ اب فلمی گیتوں سے مناسبت بڑھتی جاتی ہے۔ ہمیں تربیت فلموں، فلمی افسانوں اور فلمی گیتوں کے ذریعہ مل رہی ہے، اس لیے ہماری طبیعتوں کو مناسبت پاکیزہ شعروں سے زیادہ بے ہودہ گیتوں سے ہو گئی ہے۔ مناسبت نہیں ہے تو قرآن سے نہیں ہے، جس کی بابت حق تعالےٰ کا ارشاد ہے:- ہم یہ قرآن اگر پہاڑ پر اتارتے تو تُو دیکھ لیتا کہ پہاڑ دب جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کے خوف سے۔ لیکن انسان اس سے مناسبت پیدا نہیں کرتا تو متاثر کیا خاک ہو گا۔

حضرت ابوبکر کا ایمان

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایمان کس قدر قابلِ رشک ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔ مجھے اللہ نے اپنا پیغمبر بنا دیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ اپنے اور آپ کے بچپن سے آپ کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔ آپ جو کہہ رہے ہیں ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ جھوٹ نہیں بول سکتے۔ پیغام یہی ہے نا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔ میں ایمان لاتا ہوں اور کہتا ہوں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ۔

حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو معراج کا شرف ملا۔ حضرت ابوبکرؓ سے پہلے مشرکین نے اس خبر کو سُن لیا۔ وہ حضرت ابوبکرؓ کے گھر پہنچے اور بولے۔ لیجیے، آپ کے پیغمبر صاحب آج رات آسمانوں کی سیر کر آئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا۔ کون کہتا ہے۔ مشرکین نے جواب دیا کہے گا کون۔ خود وہی کہہ رہے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا۔ وہ کہہ رہے ہیں تو سچ کہہ رہے ہیں۔ تعجب کی کیا بات ہے۔ اُن کے پاس اللہ روزانہ اپنا ایلچی بھیجتا ہے، ایک دن اللہ نے انھیں اپنے پاس بلا لیا تو حیران کیوں ہوتے ہو۔ اُن کا بیان ہے تو بیان بالکل صحیح ہے۔ وہ اللہ پر بہتان نہیں باندھ سکتے۔

ہجرت کے چھ سال بعد حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مکّے چلے کہ عمرہ کریں گے۔ چودہ سو صحابہ ہمرکاب تھے مکّے کے قریب، حدیبیہ میں مشرکین مکّہ کے قاصد نے روکا کہ قدم آگے نہ بڑھانا۔ ہم اسے توہین سمجھتے ہیں کہ تمھیں مکّے میں گھسنے دیں۔ اس سال واپس

جاؤ۔ ہماری اجازت کے بغیر آنا نہیں چاہیئے تھا۔ اب اگلے سال آنے کی اجازت ہے۔ لیکن تلوار کے سوا کوئی ہتھیار مت لانا۔ تلواریں بھی میان میں رہیں، اور تین دن سے زیادہ حرم میں مت ٹھہرنا۔ اور دیکھو یہ وعدہ کرو کہ مکے میں جو مسلمان اِس وقت موجود ہیں وہ مدینے نہیں جائیں گے۔ مدینے چلے جائیں تو انھیں واپس کرنا پڑے گا، اور مدینے کا مسلمان مکے میں بسنا چاہے تو تم منع نہیں کر سکتے اور اُسے ہم سے واپس نہیں مانگ سکتے۔ غرض اِس شان کا صلح نامہ حضورؐ کے سامنے ہے اور حضورؐ اُسے منظور فرما رہے ہیں۔ اِسی اثنا میں ایک مسلمان مشرکین مکہ کی قید سے کسی طرح نکل کر بیڑیاں پہنے حدیبیہ پہنچ جاتے ہیں اور حضورؐ شرط صلح نامہ کے مطابق اُن مسلمان کو واپس کر دیتے ہیں۔ ہم رکاب صحابہ کو ایک ایک کر کے اس صلح سے اختلاف ہے۔ لیکن حضرت عمر فاروقؓ جب حضرت ابوبکرؓ کی رائے پوچھتے ہیں تو اُن کا جواب وہی ہوتا ہے کہ اللہ کا رسولؐ جو کر رہا ہے اللہ کے حکم سے کر رہا ہے۔ صرف ایک آواز صلح کی تائید میں اُٹھی اور وہ حضرت ابوبکرؓ کی آواز تھی۔

وفات سے چند روز قبل حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ حضرت اسامہ بن زیدؓ کی سرکردگی میں شام کے نصرانیوں کی سرکوبی کے لیے لشکر جائے۔ اتنے میں حضورؐ کی وفات ہو گئی، اور وفات کے بعد ایک طرف اُن بادیہ نشینوں نے فتنۂ ارتداد برپا کر دیا جن کی بابت اللہ تعالےٰ فرما چکا تھا کہ تم مسلمان ضرور ہو، لیکن مومن نہیں ہوئے ایمان ابھی تمہارے دلوں میں نہیں اُترا ہے (سورہ حجرات)۔ وہ کہنے لگے، ہم نماز تو پڑھیں گے۔ مگر زکواۃ نہیں دیں گے، دوسری طرف کئی شریر نبی بن کر کھڑے ہو گئے۔ خلافت کا کام سنبھالتے ہی حضرت ابوبکرؓ کو ان فتنوں سے سابقہ پڑا۔ حضرت عمرؓ وغیرہ اکابر صحابہ نے مشورہ دیا کہ فی الحال شام کی مہم ملتوی کیجئے۔ گھر کی آگ بجھانی مقدم ہے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا۔ حضورؐ کی تجویز کردہ مہم کیسے ٹالی جا سکتی ہے۔ حضورؐ کے حکم کو ٹالنا ممکن نہیں ہے۔ میں مانعین زکواۃ اور مدعیان نبوت سے بھی نمٹوں گا اور شام کی مہم بھی بھیجوں گا۔ مجھ پر جنگلی درندے چڑھ آئیں تب بھی اس لشکر کی روانگی ملتوی نہیں کر سکتا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر دشمنوں اور منافقوں نے بہتان اٹھایا تو حضرت ابوبکرؓ اُن کے باپ تھے اُنھیں اُس بہتان سے پریشان ہونا چاہیئے تھا۔ حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بحیثیت شوہر متاثر تھے اور حضرت ابوبکرؓ بحیثیت باپ متاثر تھے۔

لیکن پریشان دماغی میں بھی حضرت ابو بکرؓ کی زبان پر خلاف ایمان لفظ نہیں آیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُس بہتان کی تردید کر دی اور فرمایا کہ بہتان اُٹھانے والے کی مالی مدد بند نہ کی جائے تو حضرت ابو بکرؓ ہی اُسے مدد دیا کرتے تھے، حضرت ابو بکرؓ نے اُس کی مدد جاری رکھی۔ یہ معمولی ایثار نہیں تھا، ایمان کے انتہائی استحکام کی دلیل تھی۔

حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی وفات کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے اعلان کیا کہ میں اُن کھٹے کھنوں پر چلوں گا جو حضورؐ نے بنا دیے ہیں، اُن سے سرِ مو نہیں ہٹوں گا۔ فرامین و احکام کے اجرا میں ہی نہیں، طریقۂ جنگ میں بھی حضرت ابو بکرؓ حضور سرورِ کائنات کی تقلید کرتے تھے اور نئے تجربات سے گریز فرماتے تھے۔

حضرت ابو بکرؓ کی اس پختہ ایمانی کا نتیجہ تھا کہ دو سال اور چند ماہ کے اندر وہ جزیرہ نمائے عرب کو پھر اُسی حال پر لے آئے جس حال میں حضورؐ نے اُسے چھوڑا تھا۔ مانعین زکوٰۃ اور مدّعیان نبوت پر اتنی کم مدّت میں قابو پالینا افضل البشر بعد الانبیا ہی کا کام تھا۔

حضرت ابو بکرؓ نے رحلت کے وقت اپنی مملوکہ زمین حکومت کو دے دی، اور حکومت کی جانب سے ایک اُونٹنی اور ایک قبابلی ہوئی تھی، وہ لوٹائی تو حضرت عمر فاروقؓ رو پڑے اور بولے:۔ ابو بکرؓ نے اپنے جانشینوں کے واسطے بڑا کٹھن معیار پیش کیا ہے۔

اسلامی ترکش کے تیر

مسلمانوں میں بادشاہی کے بانی امیر معاویہؓ تھے۔ اُدھر خلافتِ راشدہ کا خاتمہ ہوا اِدھر غیر اسلامی طرزِ حکومت مسلمانوں میں گھس آیا۔ لیکن بادشاہی کے وقت بھی ایمان او یقین محکم کی حالت یہ تھی کہ محمدؐ بن قاسم، سترہ سال کا نوجوان صرف پانچ ہزار مسلمانوں کو لے کر اپنے ہم مذہب بھائیوں کی مدد کے لیے جنھیں والئ سندھ نے پکڑ رکھا تھا سندھ پر چڑھ آیا۔ صرف پانچ ہزار مسلمان لے کر دوسرے کے ملک پر چڑھائی کرنا اور پھر کامیاب ہو جانا بڑے پختہ ایمان اور یقین محکم کی دلیل ہے۔

اس ترکش کا آخری تیر احمد شاہ ابدالی تھا، جس کے زمانے کو دو سو ایک برس گزرے ہیں، اُس نے پچاس ہزار کے لشکر کے ساتھ پندرہ کروڑ کی آبادی پر حملہ کیا۔ مقابلے میں مرہٹے تھے۔ مرہٹوں کی فوج کا پچھلا حصہ دلّی سے آٹھ میل، بادلی کے مقام پر تھا، اور

اگلا حصہ پانی پت ہیں، جو دلّی سے باون میل دور ہے۔ گویا چوالیس میل تک مرہٹے ہی مرہٹے تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے سب کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ شخصی حکومتیں قایم ہو جانے اور عیش و نشاط میں پڑ جانے کے باوجود کوئی نہ کوئی مردِ صالح ایسا پیدا ہو جاتا تھا کہ مسلمانوں کا بھرم اور وقار مٹنے نہ دیتا تھا جس میں بُرائی کو اپنے قوّت بازو سے روکنے کی ہمّت ہوتی تھی۔

قرآن پر اگر ہمارا واقعی ایمان ہے اور ہم مانتے ہیں کہ قرآن مجید کلام ربّانی ہے — دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے، اِس میں جو کہہ دیا گیا ہے اُس میں بارِق فرق ممکن نہیں ہے، وہ اٹل ہے، تو اِس آیت کو بار بار پڑھو۔ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ٥ یعنی اگر تم مسلمان ہو تو تم سربلند ہو گے۔ آج ہمیں سربلندی میسّر نہیں ہے تو ہمارے ایمان کا قصور اور فتور ہے۔ رو دیجئے اور اپنے ایمان کو درست کیجئے۔

حضرت شیخ علی ہجویری جب ہندوستان تشریف لائے تھے تو یہاں کتنے مسلمان تھے۔ اُن سے پہلے اُن کے پیر بھائی حضرت حسین زنجانی اور اُن کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتی پہنچے تھے تو یہاں کتنے مسلمان بستے تھے، اور یہ حضرات تو تنہا آئے تھے۔ ایمان کے سوا اِن کے پاس کوئی بھی سامان نہیں تھا۔ بس سچے مسلمان تھے اور اللہ پر کامل بھروسہ تھا، اللہ کا کام کرتے تھے، اللہ اُن کی مدد کرتا تھا۔

ہمیں حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی کا حُکم ہے، لیکن اب ہم حضورؐ کے خوشہ چینوں کے نقوشِ قدم پر بھی نہیں چلتے، کہتے ہیں کہ بزرگوں کی برابری کیسے کریں۔

اچھا بزرگوں کو جانے دیجئے، معمولی اسلاف کی تو تقلید کیجئے۔ چوتھی صدی ہجری میں ایک مسلمان سیّاح ابن حوقل نامی نے ہندوستان کی سیاحت کی تھی۔ چوتھی صدی میں سندھ کا تعلق مرکز سے منقطع ہو گیا تھا، سندھ میں چھوٹی چھوٹی مسلمان نوابیاں رہ گئی تھیں اور اندرونِ ملک میں مسلمانوں کے قدم نہیں جمے تھے، البتہ ساحلی مقامات پر تھوڑے سے مسلمان تاجر آباد تھے۔ حکومت ہندو راجاؤں کی تھی، لیکن ابنِ حوقل لکھتا ہے کہ مسلمان تاجروں کا ہندو راجہ بہت احترام کرتے ہیں اور مسلمان تاجروں کے اخلاق کے اتنے معترف ہیں کہ ہندو اپنے آپس کے جھگڑوں میں مسلمانوں کی گواہی تسلیم

کی جاتی ہے۔ مسلمان اپنے معاملات حکومت کی عدالتوں میں نہیں لے جاتے، خود نمٹاتے ہیں۔ کاش آج کل کے مسلمان اُن جیسے عام مسلمان ہی بن جائیں۔

جنّت اور آرزوئیں

اُن دس حضرات کے سوا، جنھیں حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جنت کی بشارت دے دی تھی اور جو عشرہ مبشرہ کہلاتے ہیں، انگلی رکھ کر کسی صحابی کے متعلق بھی نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں صحابی نے اللہ کے ہاں کہاں جگہ پائی۔ صحابہ اور اولیاء اللہ کے ایمان اور عمل سے فقط قیاس کہہ سکتے ہیں کہ جنت میں ایسے حضرات نہیں جائیں گے تو پھر کون جائے گا۔ ننانوے فی صدی انھیں جنتی کہہ لیجیے، سو فی صدی کا علم اللہ کو ہے۔ تمام بزرگوں کے جنتی ہونے کا گمان ہے، جنتی ہونے کا علم نہیں ہے۔ البتہ اتنی بات یقینی ہے کہ کٹ پٹ کر ہر مسلمان جنت میں جائے گا، اور ممکن ہے مجھ جیسے گھانس پھونس قسم کے مسلمانوں کو کٹنے پٹنے کی نوبت بھی نہ آئے۔ میں خود سر جھکا کر سوئے جہنم چلنے لگوں اور مولا میری یہ ادا پسند فرمالیں، یا جب پیشی ہوں تو کہا جائے کہ پیش کرنے کے قابل آدمی لاؤ۔ اِسے ٹھوکر مارو اور جنت میں دھکیل دو۔ میری کم حیثیتی میرے کام آجائے۔ بہر حال توقع ہے کہ ایمان تادمِ مرگ سلامت رہا تو انشاء اللہ ایک نہ ایک دن جنت میں ہوں گا۔ ڈرتے صحابہ تھے۔ ڈرتے عشرہ مبشرہ تھے۔ ڈرتے انبیاء تھے، اور سب اللہ کے رحم کے امیدوار تھے۔ میں بھی لرزتا ہوں لیکن آس لگائے ہوئے ہوں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَا۔ ایمان نام اسی کا ہے کہ مسلمان خوف سے لرزے اور رحم کی توقع رکھے۔ مگر جب اپنے جنت میں ہونے کا تصور کرتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ وہ تمام لوگ بھی وہاں ملیں جن سے دنیا میں ملنا جلنا، واسطہ اور تعلق رہا ہے۔ بعض غیر مسلم دوستوں تک کے لیے دل تڑپتا ہے، لیکن اُن کی دعائے مغفرت کی اجازت نہیں ہے۔ جتنے غیر مسلم دوست زندہ ہیں، دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ انھیں روشنی دکھا دے۔ وہ آپ تو اسلام کو جان نہیں سکتے اور موجودہ مسلمانوں کی حالت سے کیا اچھا اثر لیں گے۔ اے اللہ! انھیں تو ہی روشنی دکھا۔ الغرض غیر مسلم دوست یاد ہیں تو مسلم دوست کیوں یاد نہ آئیں گے۔ مسلم دوستوں کو، ماں باپ کو، بیوی بچوں کو، خالہ، ماموں، پھوپی، چچا، بھائی، بھائی کی اولاد، بہن کی اولاد حتّےٰ کہ دادا، دادی، نانا نانی جن کی دید سے

مشرف نہیں ہوا، اُن سے جنت میں ملنا چاہتا ہوں۔ جس کے ساتھ جتنا زیادہ وقت گزرا ہے اُس کے لیے اتنا دل تڑپتا ہے۔

خدا معلوم مجھ ہی پر یہ کیفیت طاری ہے، یا سب پر یہ کیفیت طاری رہتی ہے۔ کم ازکم اتنا تو سب چاہتے ہوں گے کہ اولاد جنت میں ہو۔ وہاں پہنچ کر ممکن ہے ان جذبات میں فرق آجائے، یہاں یہ جذبات میرے دل میں ضرور اُبھرتے ہیں۔

صُلح وجنگ کے اِسلامی نمونے

کسی دشمن سے سابقہ پڑ جائے تو مسلمانوں کو صُلح اور جنگ، دونوں کے نمونے دکھا دیے گئے ہیں۔ صلح کا نمونہ صلح حُدیبیہ ہے کہ چودہ سو صحابہ حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ساتھ، ہجرت کے چھٹے سال، پہلی مرتبہ مدینے سے مکّے عمرہ کرنے جا رہے تھے۔ لڑنے نہیں، عمرہ کرنے۔ مگر جب مکّے کے قریب، اُنیس میل دُور، مقام حُدیبیہ پہنچے تو مشرکینِ مکّہ کا پیغام آیا کہ آگے مت بڑھنا۔ ہم تمھیں مکّے میں قدم نہیں رکھنے دیں گے۔ خود حضورؐ نے دریافت کرایا تھا کہ ہمارے عمرہ کرنے پر اعتراض تو نہیں ہے۔ مشرکینِ مکّہ نے جواب بھیجا کہ ہم یہ کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ دشمن مکّے میں داخل ہو جائے یہ ہماری توہین ہے۔ اور پھر حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے مشرکین کی ایسی شرطیں منظور کر لیں جو چودہ سو صحابہ میں، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سوا، ایک کو بھی پسند نہیں تھیں۔ صحابہ کہتے تھے کہ ہمیں عمرہ نہیں کرنے دیا جاتا تو ہم لڑیں گے۔ مگر حضورؐ نے فرمایا۔ لڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ صلح کا حکم ہے۔ خواہ کیسی ہی شرطیں کی جائیں۔ صحابہ بے حد رنجیدہ تھے اور صلح کو بدترین سُبکی اور شکست سمجھ رہے تھے کہ سورہ فتح نازل ہوئی اور صلح حدیبیہ کو سُبکی اور شکست کی بجائے فتحِ مبین قرار دیا گیا۔ فرمایا، "ہم نے (صلح حدیبیہ کے ذریعہ) تمھیں فتحِ مبین بخشی ہے۔" اور واقعی صلح حدیبیہ فتحِ مبین نکلی۔ صلح سے فتح کے دروازے کھُل گئے اور اشاعتِ اسلام کی رکاوٹیں ہٹ گئیں۔ المختصر صلح حدیبیہ ہمارے لیے صلح کا نمونہ ہے۔ دوسری طرف ارشاد ہے:۔ اے اہلِ ایمان! جب (صلح نہ ہو سکے اور) کافروں سے تم بھڑ جاؤ تو پھر اُنھیں پیٹھ نہ دکھانا۔ جو مسلمان میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھائے گا تو (جان لو) وہ (پیٹھ پھیر کر نہیں چلا) اللہ کا غضب لے کر چلا ہے۔ (وہ اللہ کے غضب کا نشانہ بن گیا) اُس کی جگہ جہنم ہے اور جہنم بہت بُری

جگہ ہے۔ بجز اس صورت کے کہ جنگی مصلحت سے کوئی پسپائی اختیار کرے یا پسپائی سے اپنی مرکزی فوج میں جا ملے۔ (جان بچانے کی خاطر میدانِ جنگ سے فرار سیدھا جہنم پہنچاتا ہے)

(سورہ ۸ - آیات ۱۵، ۱۶)

یہ دو نسخے ہیں، جو حالات کے پیشِ نظر استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ طبیب اگر حالات کے مطابق نسخہ تجویز کرتا ہے تو حاذق طبیب ہے اور حالات کے خلاف نسخہ دے دیتا ہے تو اللہ ایسے طبیب سے بچائے۔

حضرت عمرؓ کی دلیری

حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اپنا پیغمبر ہونا نہیں چھپا سکتے تھے۔ حضورؐ کو حکم تھا کہ علے الاعلان نبوت کا اظہار کریں۔ حضورؐ کیسے اپنی پیغمبری چھپاتے، یا اللہ کی طرف سے جو پیغام آ رہے تھے، انھیں نہ پہنچاتے۔ حضورؐ پیغام پر پیغام پہنچا رہے تھے اور جنھیں پیغام پہنچایا جاتا تھا اُن سے طرح طرح کی ایذائیں اُٹھا رہے تھے۔ لیکن حضورؐ کی پیغمبری اور پیغاموں پر ایمان لانے والوں کے لیے شروع شروع لازم نہیں تھا کہ وہ اپنے ایمان کا چرچا کرتے پھریں، کیونکہ اُس وقت شبہے شبہے ہی میں جان پر بن جاتی تھی۔ لوگوں کو حضرت ابوبکرؓ صدیق جیسے اکابر کے ایمان لانے کا علم تھا، عام صحابہ کے ایمان لانے کا علم نہیں تھا، اور تھا تو شبہے کی شکل میں تھا۔ کوئی پوچھتا تو عام صحابہ بھی جھوٹ نہیں بولتے تھے، مگر خود اذیتوں کو دعوت نہیں دیتے تھے۔ ابتدائی زمانے کے مسلمان بیشتر غریب بلکہ غلام تھے غلاموں میں اتنی جرأت پیدا کر دینا کیا معمولی بات تھی کہ اُن کے آقا پوچھیں کہ تم مسلمان ہو تو کہہ دیں کہ ہاں ہم مسلمان ہیں اور پھر اذیتیں سہیں، اذیتوں سے گھبرا کر ایمان کا دامن نہ چھوڑیں۔ کسی غلام مسلمان نے انتہائی اذیتیں پانے کے بعد بھی ایمان ترک نہیں کیا۔ آپ آج کسی ایسے شخص ہی میں اتنی جرأت پیدا کر کے دکھا دیجئے جو کبھی انگریزوں کا غلام کیا نمک خوار تک نہ رہا ہو، فقط انگریزوں سے ہاتھ ملا لینے پر فخر کرتا رہا ہو، انگریزوں کے عطا کردہ خطابات کو طرّہ امتیاز سمجھتا رہا ہو، ایسا شخص آزادی حاصل ہونے کے بعد انگریزوں سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر معاملہ نہیں کر سکتا۔

پہلے مسلمان، جنھوں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے ایمان کا اعلان فرمایا اور

خانہ کعبہ میں نماز ادا کرکے اعلان فرمایا، وہ حضرت عمر فاروقؓ تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے ایمان لانے سے قبل مسلمان چھپ چھپ کر عبادت کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے تمام صحابہ کو حوصلہ دلایا کہ حرم کعبہ میں جمع ہوں اور کھلم کھلا، بغیر جھجک کے نماز پڑھیں۔ اسلام کو راز نہ رکھیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کی فعال شخصیت نے مشرکین کے حوصلے پست کر دیے۔ مشرکین میں آزار دینے کی ہمت کم ہونے لگی۔ حضرت عمر فاروقؓ کا اسلام لانا ایک صحابی، حضرت ابن مسعود کے قول کے بموجب اسلام کی فتح تھی اور اُن کا دورِ خلافت دورِ رحمت و سعادت تھا۔

تکلیف کو راحت بنانے کا طریقہ

مسلمان اپنے ہر فعل اور اپنے ہر قول میں اللہ کی رضا جوئی ملحوظ رکھے تو اُسے پھر اور کچھ نہیں چاہیئے۔ اللہ کی رضامندی اور خوشنودی سب سے بڑی چیز ہے۔ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔ تمام عبادتیں اور ریاضتیں اسی غرض سے کی جاتی ہیں کہ اللہ کی رضوان حاصل ہو۔ یہ کیفیت اور یہ جذبہ پیدا کر لینے کے بعد کسی نوع کی تکلیف باقی نہیں رہ سکتی۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۔ جو ہوتا ہے اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اِس کے بعد مسلمان یہ جذبہ رکھے کہ میں اللہ کے فیصلے پر دل میلا نہیں کروں گا۔ اللہ کا کوئی فیصلہ مجھے نقصان پہنچانے کے لیے نہیں ہوگا۔ اللہ میرا دشمن نہیں ہے، دوست ہے، اور دوست جس بات کو مناسب سمجھتا ہے کرتا ہے۔ سزا بھی مل رہی ہے تو میں اِس کا مستحق ہوں ؎

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

ایک قدم اور آگے بڑھایئے کہ جس سے اللہ راضی اُس سے میں راضی۔ اِن جذبات کے پیدا ہو جانے کی صورت میں تکلیف کے باقی رہنے کا کیا کام ہے۔ یہ جذبات تو تکلیف کو راحت سے بدل دیتے ہیں۔

عذاب کو دعوت نہ دو

اللہ (تمھیں سمجھانے کے واسطے) ایک بستی کی مثال بیان فرماتا ہے کہ (اُس کے

رہنے والے) امن (اور) چین سے (زندگی بسر کرتے) تھے۔ اُس (بستی) کا رزق فراغت کے ساتھ چاروں طرف سے آجاتا تھا۔ تو (دیکھو) اُس (بستی) کے لوگوں نے اللہ کا شکر کرنے کی بجائے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی (اور بجائے اِس کے کہ اللہ کے فرماں بردار اور اطاعت گزار بندے بنتے، سرکشی اور بغاوت پر اُتر آئے، سمجھنے لگے کہ یہ سب کچھ ہم نے اپنے زورِ بازو سے حاصل کیا ہے)۔ سو اُن کے (بُرے) اعمال کے بدلے اللہ نے (دنیا ہی میں سزا دے دی) بھوک اور خوف (اُن کا) اوڑھنا بچھونا کر کے اُنھیں (بھوک اور خوف کا) مزا چکھا دیا۔ (ساری فراغ بالی اور سارا اطمینان چھین لیا) اور (یہ عذاب اُنھوں نے اس طرح مول لیا تھا کہ جب) اُن کے پاس اُن میں کا (ایک) رسول (ہمارے حسب الحکم اُنھیں سمجھانے) پہنچا (اور اُس نے بُرے اعمال سے روکا اور اللہ کی فرماں برداری اور اطاعت گزاری کی تلقین کی) تو اُنھوں نے (اُس کی بات نہیں سنی، اُلٹا) اُسے جھوٹا بتایا۔ اِس پر (ہمارے) عذاب نے اُن کو آن پکڑا۔ اُنھوں نے (بداعمالیوں کی وجہ سے اپنے اوپر آپ) ظلم کیا تھا۔ (اُنھوں نے ہمارے عذاب کو دعوت دی تھی) [سورہ ۱۶۔ آیات ۱۱۲۔۱۱۳]

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ (الخ) اور ہم تمھیں آزماتے ہی رہیں گے (کبھی) خوف سے (کبھی) بھوک سے اور (کبھی) مال اور جان اور پیداوار کی کمی سے۔ (کبھی تم دشمنوں کے خوف سے ہراساں ہو گے، کبھی قحط کی وجہ سے فاقے کرو گے۔ کبھی کاروبار میں گھاٹا آئے گا، کبھی جانوں کا نقصان ہو گا) [سورہ ۲۔ آیت ۱۵۵]

بھوک پیاس اور لباس کا انتظام ہوتے چلے جانا معمولی نعمت نہیں ہے، اللہ تعالےٰ نے اسے جنّت کا وصف قرار دیا ہے کہ وہاں تمھیں اِس امتحان سے واسطہ نہیں پڑے گا کہ بھوکے پیاسے رہو اور ننگے پھرو۔ جنّت میں تم کھانے کو نہیں ترسو گے اور نہ لباس کو ترسو گے اور وہاں پیاس سے بلبلاؤ گے اور نہ (تڑاخے کی) دھوپ کھاؤ گے۔

(سورہ ۲۰۔ آیات ۱۱۸۔۱۱۹)

لباس الجوع والخوف، یعنی بھوک اور خوف کا عذاب کفرانِ نعمت اور سامانِ زیست کے غلط استعمال کی سزا ہے، جنّت میں عذاب کا کیا کام، جنّت تو جنّت ہے، وہ معاشرہ اسلامی معاشرہ نہیں کہلا سکتا جس میں کسی فردِ واحد کو پیٹ بھرنے کے لیے روٹی اور تن ڈھکنے کے لیے کپڑا نہ ملے۔

کل کی خبر نہیں

آج ہم جس بات سے خوش ہو رہے ہیں، کیا معلوم ہے کل اسی بات پر ہمیں رونا پڑے اور آج جس بات سے رنجیدہ ہیں کل ممکن ہے ہمیں کہنا پڑے کہ وہ بات تو خوشی کی تھی ساٹھ برس پہلے اپنا دلی کا رہائشی مکان میں نے دس روپے ماہوار کرائے کے عوض دے رکھا تھا۔ اُس وقت ہاؤس ٹیکس کا وجود نہیں تھا۔ جب میں مکان میں خود بسنا اور ہاؤس ٹیکس شروع ہوا تو تخمینہ کرنے والوں نے مکان کا کرایہ ستر روپے تجویز کیا اور اُسی کے مطابق ٹیکس لیا۔ مجھے بہت ناگوار گزرا۔ ستر روپے بڑھتے بڑھتے سو تک جا پہنچے۔ مگر اب پاکستان میں ہندستان کی جائدادوں کے معاوضے ملے تو پتہ چلا کہ ستر روپے اور سو روپے کا رنج غلط تھا۔ کاش ٹیکس اور زیادہ لگ گیا ہوتا تو معاوضہ زیادہ ملتا۔

یہ ایک موٹی سی مثال ہے۔ روز اس قسم کے واقعے پیش آتے ہیں کہ انسان اُن کی لم اور حقیقت نہیں سمجھتا۔ ہم کیا سمجھیں گے، حضرت موسےٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر نہیں سمجھے تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام کے ہاتھ سے اللہ تعالےٰ نے چند ایسے کام کرائے کہ حضرت موسےٰ گھبرا اُٹھے۔ انسان کی فطرت ہے کہ بعض دفعہ ناخوش ہونے والی باتوں سے خوش ہو جاتا ہے اور خوش ہونے والی باتوں سے ناخوش ہو جاتا ہے۔

کیسی کیسی رونقیں ان آنکھوں نے دیکھی ہیں اور پھر رونقوں کی جگہ خاک اُڑتی دیکھی ہے۔ ۱۹۱۱ء کا دربار، لال قلعے کے نیچے دریائے جمنا کے کنارے جنگل میں منگل ہونا۔ شہنشاہ جارج پنجم کا جھروکوں سے درشن دینا اور علماء، مشائخ، پنڈتوں اور سادھوؤں کے سلام قبول کرنا اور اُس ڈرامے کے بعد بقول اکبر الہ آبادی "وہی دریا کی ریتی اور وہی جمنا کا پانی" رہ جانا، سب یاد ہے۔

انگریز جن کے عروج کی کبھی یہ حالت تھی اب تیز رفتاری سے زوال کی طرف جا رہے ہیں۔ بیگم اکرام اللہ کا بیان ہے کہ "یہاں کے عوام جو کسی زمانے میں نہایت محنتی، جفاکش اور دیانت دار تھے، انتہائی سست، کام چور، بے ایمان اور لالچی ہو گئے ہیں اور اس کا اثر ملک کی اقتصادیات پر اس قدر بُرا پڑ رہا ہے کہ حکومت پریشان ہے اور خود عوام کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ عوام کو ملک کے مجموعی فائدے

نقصان سے غرض نہیں رہی ہے۔ اپنے فوری مفاد کے سامنے قومی مفاد انھوں نے بھلا دئے ہیں۔ المختصر یہ ملک جو کسی زمانے میں دنیا کا متموّل ترین ملک تھا زبردست اقتصادی کش مکش میں مبتلا ہے پچھتیس سال میں، یعنی جب سے میں انگلستان آتی رہتی ہوں، ان لوگوں کے کردار میں اتنا تنزّل ہوا ہے کہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ ہر وہ بات جو ان کی خصوصیت کہی جاتی تھی مٹ رہی ہے۔ محنت، جفاکشی، دیانت داری، ذمہ داری، پابندیٔ وقت، خوش اخلاقی، ایک ایک وصف ختم ہو رہا ہے، وَتُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ ط اللہ جسے چاہے عزّت دے اور جسے چاہے ذِلّت دے۔

بیگم اکرام اللہ نے رسالہ عصمت میں نو کالم کا مضمون لکھا ہے۔ پورا نقل نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ انگریز بھی بہر حال انسان ہیں۔ عروج کے زمانے میں انگریز اُن حرکتوں سے خوش ہوتے تھے جن کا تصوّر آگے چل کر اُنھیں آٹھ آٹھ آنسو رلوائے گا۔ بیگم اکرام اللہ نے اپنے مضمون میں اکبر الہ آبادی کی حسبِ ذیل پیشین گوئی نقل کی ہے ؎

اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے

ہمیں انگریزوں کے زوال سے خوش نہیں ہونا چاہیئے۔ عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔

اللہ کی بے شمار نعمتیں

اللہ نے زمین میں تمہارے واسطے مختلف (شکل و صورت اور) رنگ (روپ) کی جتنی چیزیں بھی پیدا کی ہیں، ایک ایک چیز میں (اللہ کو پہچاننے کی) علامت دھیان کرنے والے لوگوں کو مل سکتی ہے۔ اُسی نے (دریا اور) سمندر پر (تمھارا) تسلط بٹھایا ہے تاکہ اُس میں سے تازہ (تازہ مچھلیوں کا) گوشت (نکال نکال کر) کھاؤ اور اُس میں سے زیور (موتی وغیرہ) نکالو، جنھیں تم (عورت مرد یا تھوں اور گلے میں) پہنتے ہو۔ اور (اے انسان!) تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ دریا میں (پانی کو) چیرتی (پھاڑتی) چلی جاتی

ہیں ۔ اور (دریا کو اس لیے بھی تمہارے قبضے میں کر دیا ہے) کہ تم (اُس کے ذریعے دور دراز ملکوں میں پہنچ کر تجارت کرو، اور) اللہ کا فضل (یعنی روزی) تلاش کرو۔ یہ (سب عنایتیں) اس لیے (ہیں) کہ (تم حقیقی انسان بنو اور) اللہ کا شکر بجا لاؤ۔ اور اُسی نے زمین میں پہاڑ (میخ کی طرح) ٹھونک دیتے ہیں تاکہ زمین تمھیں اٹھائے اٹھائے ڈگمگانے نہ لگے، اور (اُسی نے) نہریں اور راستے (جاری کیے) تاکہ تم (منازلِ مقصود تک) پہنچ سکو۔ اور (راستوں کا پتہ چلانے کی غرض سے پہاڑوں اور درختوں وغیرہ کی نشانیاں (کر دیا) اور ستاروں سے بھی لوگ راستے کا پتہ چلاتے ہیں۔ تو کیا جس نے (ایسی ایسی چیزیں) پیدا فرمائی ہیں، وہ اُن جیسا ہے جو کچھ پیدا نہیں کر سکتے۔ کیا (اتنا سمجھانے پر بھی) تم (نہیں سمجھو گے، اور) نصیحت کا اثر نہیں لو گے۔ (تمھاری سرکشی کا تو یہ عالم ہے) اور (اللہ کی نعمتوں کا یہ حال کہ) اگر اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو (وہ بے شمار ہیں) انھیں تم گن نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ (بڑا) معاف کرنے والا اور رحیم ہے (کہ تمھاری سرکشیوں اور حماقتوں کے باوجود نعمتیں دیے جاتا ہے۔ (لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا کہ اللہ کو تمھاری سرکشیوں اور حماقتوں کی خبر نہیں ہے۔) اور اللہ تمھاری مخفی باتوں تک سے واقف ہے اور ظاہر باتوں سے تو واقف ہے ہی (وہ قیامت کے دن تمھاری ہر حرکت کا بدلہ چکائے گا) (سورہ ۱۶۔ آیات ۱۳ تا ۱۹)

دو سنّتیں

بے شمار سنتوں میں سے ایک سنت بھوک سے کم کھانا بھی ہے اور دوسری سنت اسی قسم کی دانتوں کو صاف رکھنا ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھوک سے زیادہ کبھی نہیں کھایا، اور حضورؐ دانتوں کی صفائی کا تو اتنا خیال رکھتے تھے کہ وفات سے ذرا پہلے تک مسواک کی تھی۔

بھوک سے زیادہ، یعنی ڈٹ کر کھانا نہ کھایا جائے اور دسترخوان پر سے ایسی حالت میں اُٹھ جایا جائے کہ ہلکی سی اشتہا باقی ہو تو انسان ہمیشہ تن درست اور چُست رہتا ہے اور پانچ مرتبہ وضو کرتے وقت مسواک کر لی جائے تو یہ سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہے۔

کھانا کھانے کے بعد اچھی طرح کلی کر لینے اور دانتوں سے بچے ہوئے اجزائے غذا نکال دینے کی عادت بچپن سے پڑ سکے اور بچپن ہی سے مسواک کی جانے لگے تو پھر کسی منجن وحجن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بھوک سے کم کھانے اور دانتوں کو صاف رکھنے کی صرف دو سنتیں اختیار کر کے منجن اور تمام قسم کی دواؤں سے چھٹکارا پا لیں اور ان دو سنتوں کا تجربہ دوسری سنتوں پر چلنے کا شوق آپ کے دل میں ڈال دے تو ہم خرما و ہم ثواب ہوگا۔ ہر سنت کی پیروی موجودہ زندگی اور آخرت کی زندگی دونوں کے لیے مفید ہے۔

انسان مفلسی کی وجہ سے فاقے کرے اور کھانا کئی دن مسلسل اس کے پیٹ میں نہ اُترے تو وہ ضرور مر جائے گا، لیکن کھاتے پیتے اور مالدار لوگوں کو کم کھانے سے مرتے نہیں دیکھا، ہاں زیادہ کھانے سے مرتے دیکھا ہے۔

زیادہ کھانے ہی سے پایوریا ہوتا ہے۔ اور پھر پایوریا معدے کو اور خراب کرتا ہے۔ کھانا کم کھایا جائے اور دانتوں اور مسوڑھوں کی غلاظت معدے میں نہ پہنچے تو دیکھیے طبیعت کیسی ہشاش بشاش اور پھول سی رہتی ہے، اور عمر کتنے لطف سے گزرتی ہے۔

اکبر الٰہ آبادی کا مشن

اکبر الٰہ آبادی خدا شناس اور خدا پرست شاعر تھے۔ علامہ اقبال کی طرح اُن کی شاعرانہ صلاحیتیں ہمیشہ کام کی باتوں میں صرف ہوئیں۔

اکبر الٰہ آبادی آج سے ایک سو سترہ برس پہلے اِس دنیا میں آئے تھے۔ شاہ ولی اللہ سے شاہ اسمٰعیل شہید کے زمانے تک ہندستان میں مسلمانوں کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اکبر الٰہ آبادی کے سامنے وہ چراغ بجھ گیا۔ اکبر پر اُس انقلاب کا وہی اثر تھا جو کسی دین دار اور مخلص مسلمان پر ہونا چاہیے تھا۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ اکبر مسلمانوں کو حالات کے ساتھ چلنے سے روکتے تھے اور مسلمانوں کے آگے بڑھنے میں مزاحم تھے۔ اکبر نے اپنے پیغام کا خلاصہ چار مصرعوں میں خود بیان فرما دیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

سید صاحب سکھا گئے ہیں جو شعور کہتا نہیں تم سے کہ ہو اس سے نفور
سوتوں کو جگا دیا اُنھوں نے لیکن اللہ کا نام لے کے اُٹھنا ہے ضرور

ایک اور رباعی ہے :-

کچھ منع نہیں ہر ایک کی تحریر پڑھو
لیکن قرآن کی بھی تفسیر پڑھو
عظمت دنیا کی جب دبائے اکبر
خالق کا کرو خیال تکبیر پڑھو

حالات کے ساتھ چلنے اور آگے بڑھنے سے اسلام نہیں روکتا تو اکبر کیسے روک سکتے تھے۔ اُن کی خواہش فقط اتنی تھی ؎

دینی پہلو کو اے برادر دیکھو
کانٹوں سے ہو محترز گلِ تر دیکھو

وہ مسلمانوں کو کانٹوں سے بچانا چاہتے تھے، گلِ تر سے محروم رکھنا ہرگز نہیں چاہتے تھے۔
سر سید احمد خاں کی رحلت کے بعد اکبر نے ایک نظم لکھی تھی۔ اُس کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

ہم اپنی قومی زندگی کے نئے دَور میں قدم رکھ چکے ہیں۔ ہمارا راستہ اب ہمارا راستہ ہے۔ اب ہمیں غیروں کے راستے پر نہیں رہنا چاہیے۔ ہمیں اُس راستے پر چلنا چاہیے جو اللہ اور رسولؐ کی منشا کے مطابق ہو، اللہ اور رسولؐ کی منشا کے خلاف نہ ہو۔ اللہ اور رسولؐ کی اجازت کی حد تک ہمیں زمانے کا اور اہلِ زمانہ کا ساتھ دینا ہے۔ اثم اور عدوان میں ہم زمانے اور اہلِ زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتے ؎

اب تو سب آپ کے اپنے ہی ہیں، کم رہ گئے غیر
معترض کون ہے جب آپ کی نیت ہے بخیر (اکبرؔ)

آپ گلِ تر سے قطعی مستفید ہوجیے، بس کانٹوں سے بچیے۔ لیکن اغیار نے کچھ ایسا جادو کیا ہے اور کمال دکھایا ہے کہ ہمیں کانٹوں میں تو پھنسا دیا اور گلِ تر ہمارے حصے میں نہیں آیا۔ سید اح

زندہ ہوتے تو ہماری موجودہ حالت پر وہ بھی آنسو بہاتے اور شاید سر سید اللہ میاں کے ہاں اکبر صاحب سے کہتے ہوں کہ بھائی! تم نے اسّی سال قبل آج کا حال خوب سمجھ لیا تھا! افسوس میں نہ سمجھ سکا، اور اکبر جواب دیتے ہوں کہ نہیں سیّد صاحب! آپ سے زیادہ میں کیا سمجھتا۔ آپ آنے والے طوفان کو روکنے کے لیے بند بھی تو باندھا کرتے تھے۔ میرا تو شعر ہے ؎

شعر اکبر کو سمجھیے داستانِ انقلاب　　　یہ اُسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی

یہ تو ہونا تھا، اور لازماً ہونا تھا، لیکن انشاء اللہ یہ بھی ہونا ہے کہ مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں گی اور مسلمان بُرائی بھلائی اور دوست دشمن میں تمیز کریں گے۔ آپ انھیں تعلیم سے آراستہ کر گئے ہیں اور اس قابل بنا گئے ہیں کہ دماغ سے کام لے سکیں۔ آخر دماغ سے کب تک کام نہیں لیں گے۔ (اس نوٹ کے لیے میں نے حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی کے ایک مضمون سے مواد لیا ہے)۔

اللہ کو جانتے ہو؟

(اللہ) وہ ہے جس نے تمھارے واسطے آسمان سے پانی اُتارا۔ اُس (پانی) میں سے (کچھ) پینے (کے کام) کا ہے اور (کچھ ایسا ہے کہ) اُس سے درخت (اور کھیت) اُگتے ہیں (جن سے تم بھی غذا حاصل کرتے ہو اور) جن میں (اپنے مویشیوں کو بھی) چراتے ہو۔ (ہاں) وہ پانی سے تمھارے واسطے (ہرے بھرے) کھیت اور زیتون اور کھجور (کے درخت) اور انگور (کی بیلیں) اور ہر قسم کے پھل (پھول) پیدا کرتا ہے۔ بے شبہ ان (چیزوں) میں غور (و فکر) کرنے والے لوگوں کے لیے (اللہ کی قدرت اور عظمت کی) نشانی (موجود) ہے۔ (سورہ ۱۶۔ آیات ۱۰ و ۱۱)

اسلامی برتاؤ

مسلمانوں کو لوگوں سے کیسا برتاؤ برتنا چاہیے۔ اس کے متعلق کچھ اسلامی ہدایات حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے پہلے لکھی جا چکی ہیں، کچھ آج لکھتا ہوں۔

(۱) کسی پر تہمت نہ لگاؤ۔ تہمت تراشی الگ گناہ ہے اور تہمت لگنے سے جو بدگمانی پھیلتی ہے وہ گناہ الگ ہے۔ بدگمانی پھیلانے کے موجب اور ذمہ دار بھی تم قرار دیے جاؤ گے اور اس کی سزا تمھیں ملے گی۔ تہمت لگا کر انسان دوہرا اور تہرا گناہ کماتا ہے۔ دوسروں کے گناہ کا باعث اور محرک بننے والا دوسروں کے گناہ کا حصہ دار بن جاتا ہے۔

(۲) ایک دن حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے پوچھا، وہ شخص تمہارے نزدیک کیسا ہے جو اپنے ماں باپ کو گالیاں دیتا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا، ایسا بھی کوئی شخص ہو سکتا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا، جو دوسروں کے ماں باپ کو گالیاں دیتا ہے وہ اپنے ماں باپ کو گالیاں کھلواتا ہے۔ دوسروں سے ماں باپ کو گالیاں کھلوانا کیا خود گالیاں دینے سے کم بات ہے۔

(۳) کسی کی سفارش کر سکتے ہو تو سفارش سے دریغ مت کرو۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا:- بعض اوقات میرے دل میں ہوتا ہے کہ فلاں شخص کی حاجت روائی کر دوں، لیکن منتظر رہتا ہوں کہ سفارش آ جائے تاکہ سفارش کرنے والے کو بھی ثواب مل جائے۔ سفارش کرو اور سفارش کا ثواب لو۔ کوئی صدقہ زبان کے صدقے سے افضل نہیں ہے۔ زبان کا صدقہ یہ ہے کہ زبان ہلا کر کسی کی تکلیف دُور کر دی جائے۔

(۴) جب دیکھو کہ غیر موجودگی میں کسی کو بُرا بھلا کہا جا رہا ہے اور نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا جا رہا ہے تو غیر موجود شخص کی مدد کرو اور اُسے نقصان نہ پہنچنے دو۔

(۵) جب دیکھو کہ ایک شخص بُری صحبت میں پھنس گیا ہے تو اُسے اُس صحبت سے نکالنے کی کوشش کرو، لیکن کوشش احسن طریقے سے کی جائے۔ بُرائی کا مقابلہ احسن طریقے سے ہونا چاہیے۔ حدیث میں ہے کہ بدقماشوں کی زبان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا بھی ثواب کا کام ہے۔

(۶) ایسے آدمی نہ بنو کہ لوگ تمہارے شر سے ڈریں اور ڈر کر تمہارے ساتھ مراعات برتیں۔ ایک دفعہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: اے عائشہ! اللہ کے نزدیک وہ بدترین انسان ہے جس کے شر سے لوگ ڈرتے ہوں اور ڈر کر اُس کے ساتھ مراعات برتتے ہوں۔

(۷) اہل اللہ کے ساتھ نشست و برخاست رکھو۔ امیروں کی ہم جلیسی سے پرہیز کرو۔ حضورؐ نے ایک روز فرمایا، مُردوں سے ملت نہ بڑھاؤ۔ صحابہ نے سوال کیا۔ حضورؐ، مُردے کون ہیں۔ فرمایا، امرا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں شکستہ دلوں کے قریب رہتا ہوں۔

(۸) حاجتمندوں کی حاجت برآری میں لگے رہا کرو۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ حاجت برآری ہو یا نہ ہو، تمہاری نیت کا صلہ اتنا ملے گا جیسے تم نے دو مہینے مسجد میں اعتکاف کر لیا، بلکہ اور زیادہ۔ اور فرمایا کہ مغموم کو خوش کرنے کا بڑا اجر ہے۔ پھر فرمایا، مظلوم کو ظلم سے بچاؤ اور ظالم کو ظلم

کرنے سے بچاؤ۔ یہ ظالم کی مدد ہے۔ ظالم کو ظلم سے باز رکھنے کا ثواب الگ دیا جائے گا۔ پھر فرمایا۔ دو گناہ بدترین گناہ ہیں۔ ایک شرک، دوسری ایذا رسانی، اور دو نیکیاں بہترین نیکیاں ہیں۔ ایک ایمان قبول کرنا، دوسرے لوگوں کو آرام اور آسائش دینا۔ پھر فرمایا۔ جو مسلمان کے غم سے نہیں کڑھتا وہ میرا ساتھی نہیں ہے۔

(۹) جس کے ہاں جاؤ۔ بات کرنے سے پہلے اُسے سلام کرو اور اُس سے ہاتھ ملاؤ، مصافحہ کرو۔ حضور فرماتے ہیں، جو شخص سلام سے پہلے باتیں شروع کر دے اُس کی باتوں کا جواب نہیں دینا چاہیے۔ حضورؐ کی خدمت میں ایک صاحب حاضر ہوئے اور سلام کرنا بھول گئے۔ باتیں کرنے لگے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ باہر جاؤ اور دوبارہ آؤ، اور آ کر سلام کرو۔ اُس کے بعد باتیں کرنا۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ اپنے گھر میں گھسو تو گھر والوں کو سلام کرو۔ اور گھر سے باہر چلو تو گھر والوں کو سلام کر کے چلو، حضورؐ فرماتے ہیں کہ جب دو مسلمان مصافحہ کرتے ہیں تو ستر میں سے اُنھتّر حصے اللہ کی رحمت اُس پر نازل ہوتی ہے جس کا چہرہ مصافحے کے وقت کھلا ہوا ہوتا ہے۔

(۱۰) چھینک آئے تو کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰہ اور دوسرے کہیں یَرْحَمُکُمُ اللّٰہ۔ پھر تم کہو یَغْفِرُ اللّٰہُ لِی وَلَکُمْ۔ حضورؐ کو جب چھینک آتی تھی تو حضورؐ آواز کو پست کر لیتے تھے، اور مُنھ پر ہاتھ رکھ لیتے تھے۔ تمھیں بھی یہی کرنا چاہیے۔

(۱۱) جس سے برائے نام بھی رسم اور واسطہ ہو اس کی بیمار پُرسی کی جائے۔ بیمار عیادت کرنے والے کے سامنے بیماری کا شکوہ نہ کرے، اور سمجھے کہ بیماری اُس کی غلط کاریوں کا نتیجہ اور کفارہ ہے۔ بیمار پُرسی کرنے والے کو بیمار کے پاس جم کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے اور سوالوں کی بوچھار نہیں کر دینی چاہیے۔ بیمار پُرسی کرنے والا بیمار کو دیکھ کر زیادہ غمگین صورت بھی نہ بنائے اور مکان میں اِدھر اُدھر نظریں بھی نہ دوڑائے۔

(۱۲) جنازوں کے ساتھ جانا مسلمان کا مسلمان پر حق ہے۔ جنازے کے ساتھ چلو تو ہنسی مذاق کا کوئی کلمہ زبان سے مت نکالو، بلکہ ممکن ہو تو خاموش رہو۔ حضرت عمش رضؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ جنازوں کے ساتھ جاتے تھے تو سب کو اتنا یکساں غمگین پاتے تھے کہ سمجھ نہیں سکتے تھے، پُرسہ کسے دیں اور تعزیت کس سے کریں۔

اُس وقت سوچنا چاہیے کہ موت کبھی نہ کبھی ہمیں بھی آنی ہے۔ مرنے والا موت کی

گھاٹی سے گزر گیا۔ مرنے کا خوف جو اُسے ستایا کرتا تھا اُس سے اُسے رہائی مل گئی لیکن ہمارے لیے موت کی تلخی چکھنا باقی ہے۔

(۱۳) جنازوں کے ساتھ جانے کے علاوہ بھی قبرستان جایا کرو اور قبور سے سبق لیا کرو، اور اہل قبور کے لیے دعائے مغفرت کیا کرو۔

کل مخلوق خالق کا پتہ بتا رہی ہے!

اللہ کے سوا کوئی شے ایسی نہیں ہے جس کا مماثل اور مقابل موجود نہ ہو۔ یہ بھی اللہ کی وحدت کی نشانی ہے اور اللہ کی قدرت کا اظہار ہے۔

سورہ یٰسین کی آیات ۳۶ تا ۴۰ ملاحظہ فرمائیے:

"پاک ہے وہ ذات جس نے ہر شے کا مماثل اور مقابل بنایا ہے، شے خواہ از قسم نباتات ہو، زمین سے اُگنے والی، خواہ خود انسان کا اپنا وجود ہو، یا اُس قسم کی چیزیں ہوں جن کا انسان کو علم نہیں ہے۔ (انسانوں کے بھی مماثل اور مقابل ہیں، حیوانوں کے بھی اور نباتات وغیرہ کے بھی، جیسے مرد عورت، گھوڑا گھوڑی، روشنی تاریکی، سفیدی سیاہی۔ یہ جوڑے جوڑے ہونا اللہ کی وحدت کی نشانی بھی ہے اور اللہ کی قدرت بھی ظاہر کرتا ہے کہ بجز ذات باری تعالےٰ کوئی شے نہیں ہے کہ اُس کا مماثل، مقابل اور جوڑا نہ ہو۔ انسان اللہ کو سمجھنا، پہچاننا اور جاننا چاہے تو بڑے سامان ہیں، کُل مخلوق خالق کا پتہ بتا رہی ہے۔ سمجھنے، پہچاننے اور جاننے کے خواہاں کے لیے) ایک نشانی رات ہے۔ (رات کے متعلق ارشاد ہے کہ) ہم اُس پر سے دن (کا اُجالا) کھینچ لیتے ہیں اور لوگ ناگہاں اندھیرے میں رہ جاتے ہیں، اور (سورج وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں اُسے پہنچنا ہوتا ہے' اور پھر وقت معین پر واپس آتا ہے) سورج (بھی ایک نشانی ہے کہ) اپنے مقررہ ٹھکانے کی طرف رواں ہے، (اور تعمیل میں بال برابر فرق نہیں کرتا۔) یہ خداوند غالب و دانا کی ٹھہرائی ہوئی اور اندازہ کی ہوئی باتیں ہیں۔ علیٰ ہذا (ایک نشانی) چاند ہے۔ اس کے واسطے بھی اللہ نے منزلیں قرار دے دی ہیں، حتیٰ کہ (چاند) کھجور کی سوکھی ہوئی شاخ کے مانند ہو جاتا ہے (خمدار، باریک اور مرجھایا مرجھایا۔ پھر ان سیاروں کا عجیب و غریب نظام دیکھو کہ) نہ سورج کی مجال ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے

آگے بڑھتی ہے۔ (سورج چاند کی نور افشانی میں خلل نہیں ڈالتا اور رات دن کا حصہ نہیں کترتی) اور سب ستارے آسمان (کے سمندر میں مچھلی کی طرح) تیر رہے ہیں (اور اپنے اپنے مدار میں چکّر کھا رہے ہیں۔ اُس سے ذرّہ بھر اِدھر اُدھر نہیں ہٹتے اور ایک دوسرے سے ٹکراتے نہیں۔)

اپنی بات

۱۷ رمضان المبارک ۱۳۸۲ ہجری سے میری عمر کا اٹھتّرواں سال شروع ہو گیا۔ عمر کی زیادتی خوبی کی بات نہیں ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے زیادہ عمر نہیں پائی، لہٰذا میں زیادتی عمر کو خوبی کی بات نہیں خیال کرتا، تاہم اگر زیادتی عمر سے انسان اپنی گزشتہ زندگی کی غلطیوں کا کسی قدر مداوا کر سکے تو یہ ضرور اللہ کا کرم ہے۔

میری زندگی کی ابتدا جنگل میں ہوئی تھی، جہاں والد ماجد بحیثیت اسسٹنٹ انجنیئر، محکمۂ انہار مقیم تھے اور زندگی کی انتہا بھی جنگل میں ہو رہی ہے۔ تقدیر نے پھر جنگل میں لا بٹھایا ہے۔ والد کا مکان بالکل تنہا تھا، نہر کے کنارے، گاؤں تک سے الگ؛ یہاں اور مکان ہیں اور سیکڑوں مکان ہیں، مگر بہت دُور دُور۔ اور کسے را با کسے کارے نہ باشد۔ مجھے اللہ تعالےٰ نے موقع دیے دیا ہے کہ زبان غیبت اور یاوہ گوئی سے محفوظ رہے۔ کان فضول باتیں نہ سنیں اور آنکھیں نہ دیکھنے کی چیزیں نہ دیکھیں۔ الحمد للہ صبح سے شام تک پڑھنے لکھنے پر صرف کرتا ہوں۔ دماغ دو ہی طرف جاتا ہے۔ ایک دلّی کی طرف، دوسرے مکّے مدینے اور مکّے مدینے والوں کی طرف۔ دلّی آہستہ آہستہ دل سے نکلتی جاتی ہے اور مکّہ مدینہ دل میں سماتا جاتا ہے۔ مشقِ نام لیلےٰ میں صبح سے شام کر دیتا ہوں۔

جو کچھ لکھتا ہوں، اپنے لیے لکھتا ہوں۔ لکھ کر سوچنے کی عادت ہے۔ تو گویا لکھتا نہیں ہوں، سوچتا ہوں۔ "تاثرات" میں دوسروں کا ذکر کیا ہوتا ہے، میرا ہی ذکر ہوتا ہے، میری ہی قلبی واردات ہوتی ہیں۔ گفتہ آید در حدیث دیگراں۔ دوسروں کو نہیں سمجھاتا، اپنے آپ کو سمجھاتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ

میرے بچے میرے تاثرات کے مخاطب ہوتے ہیں۔ جو بچے انھیں آج نہیں پڑھتے، ممکن ہے میرے مرنے کے بعد پڑھیں۔ میں نے بچوں کو زبان سے نصیحت بہت کم کی ہے، تحریر ہی میرے پاس نصیحت کا ذریعہ ہے۔ بچوں نے سبق لیے ہیں تو میرے عمل سے لیے ہیں، زبان سے نہیں لیے۔ تحریر اس نقص اور کمی کی تلافی کرتی ہے۔ یہ تحریریں نواسے وقت آپ کو بھی پڑھوا دیتا ہے۔ اس کی مہربانی ہے، ورنہ میں نصیحت اپنی اولاد کو تحریر کے ذریعہ کرکے بھی اللہ کے سامنے شرماتا ہوں۔ کس مُنھ سے نصیحت کروں۔ لاہور کی ایک ذی علم اور صاحبِ تصنیف خاتون نے عرصہ ہوا تحریر فرمایا تھا کہ "آپ اوروں کو جہاد پر آمادہ کرتے رہتے ہیں، مگر خود زندہ بیٹھے ہیں اور اتنی طویل عمر تک پہنچ گئے ہیں۔ آپ نے جہاد کیوں نہیں کیا۔" جہاد پر ایک آدھ مضمون لکھ دینے کے معنی اگرچہ جہاد پر آمادہ کرتے رہنے کے نہیں ہیں، جہاد کا کون سا زمانہ آیا تھا جس میں جہاد پر آمادہ کرتا رہتا تاہم میں خاتونِ موصوفہ کے توجہ دلانے سے اللہ کے سامنے شرمندہ ہو گیا، کیوں کہ میں واقعی صاحبِ سیف نہیں ہوں، اور صاحبِ قلم بھی برائے نام ہوں۔ حالات نے قلم پکڑوا دیا ہے۔ عمر بھر گو صحافت کا مشغلہ رکھا، لیکن لکھتا برائے نام تھا، لکھواتا تھا۔ اپنے ہاتھ میں قلم جب پکڑا ہے جب اور مشاغل نہیں رہے۔ لکھنے کی زندگی زبردستی اختیار کی ہے اور سولہ سترہ برس لکھنے پڑھنے کی زندگی گزار لی تو اب بے شک دوسرے کاموں کا نہیں رہا۔

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، اُس نے ستر سال راحت و آسایش اور سکون و اطمینان کے ساتھ گزروائے۔ راحتیں اور آسایشیں شریفانہ دیں، امیرانہ نہیں دیں، کہ مرنا مشکل ہو جاتا۔ مرنے کے تصوّر سے بفضلہٖ مسرّت ہے، گھبراہٹ نہیں ہے۔ ناظرین دعا کریں کہ مرتے وقت بھی گھبراہٹ نہ ہو، ایمان نہ ڈگمگائے اور ایمان کامل لے کر اپنے خالق اور رب کے حضور میں حاضر ہوں اور وہ میری تقصیروں کو معاف فرمائے اور مجھ کمزور و ناتوان پر رحم کرے۔

جو صاحبان میرے خاتمہ بالخیر کی دعا کریں گے۔ میں انھیں فلاح دارین کی دعائیں دوں گا۔ مرنے کے لیے تیار تو ہوں، مگر اعمال کا توشہ سڑا بسا ہوا ہے مخلصوں کی دعاؤں کا محتاج ہوں۔

آزادیٔ نسواں اور اسلام

یہ عجیب ماجرا ہے کہ مغربیوں کے جن مصائب کو مشرقی اپنا رہے ہیں، مغربی تجربے کے بعد اب انھیں چھوڑنا چاہتے ہیں۔ اہلِ مشرق نے سب سے زیادہ تقلید اہلِ مغرب کی عورت کے معاملے میں کی ہے۔ عورتوں کے متعلق چند یورپین علما کے خیالات ملاحظہ فرمائیے جو فرید وجدی مصری کی کتاب "مسلمان عورت" مترجمہ ابوالکلام آزاد سے اخذ کر رہا ہوں۔

علومِ مادیہ کا افضل ترین عالم اور یورپ کا سربرآوردہ مصنف ژول سیمان لکھتا ہے:۔

"عورت کو چاہیے کہ عورت رہے، ہاں بے شک عورت کو چاہیے عورت رہے۔ اسی میں اس کے لیے فلاح ہے، اور یہی وہ صفت ہے جو اسے سعادت کی منزل تک پہنچا سکتی ہے۔ یہ قدرت کا قانون ہے اور یہ قدرت کی ہدایت ہے۔ عورت جس قدر اس سے قریب تر ہوگی اسی قدر اس کی حقیقی قدر و منزلت بڑھے گی اور جس قدر دور ہوگی اسی قدر اس کے مصائب بڑھیں گے۔ بعض فلاسفہ انسانی زندگی کو پاکیزگی سے خالی بتاتے ہیں، مگر میں کہتا ہوں کہ انسانی زندگی بے حد دل فریب اور پاکیزہ ہے، بشرطیکہ ہر مرد اور ہر عورت اپنے اُن مدارج سے واقف ہو جائے جو قدرت نے ان کے متعلق قرار دیے ہیں۔"

یہی ژول سیمان ایک اور موقع پر رقم طراز ہے: "جو عورت اپنے گھر سے باہر کی دنیا کے مشاغل میں شریک ہو جاتی ہے، اِس میں شک نہیں کہ وہ ایک عالم بسیط کا فرض پورا کرتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ عورت نہیں رہتی۔"

مشہور مصنف پروفیسر فریرو، اطوارِ انسانی پر جس کی تحریر سند مانی جاتی ہے، نہایت درد انگیز الفاظ میں اُن عورتوں کا نقشہ کھینچتا ہے جو مردوں کے مشاغل میں شریک ہو گئی ہیں:۔ "اِن عورتوں کو معاشرت کے اصلی اصول زوجیت سے سخت نفرت ہے۔ قدرت نے جن کاموں کے لیے انھیں جسمانی اور دماغی قوے عطا کیے ہیں۔ اُن کاموں کو وہ بھول گئی ہیں۔ اس قسم کی عورتوں میں ویسا طبعی حاسّہ اور جنسی امتیاز نہیں پایا جاتا جیسا کہ فطرتاً ہونا چاہیے، اور جیسے اور عورتوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

درحقیقت اب انھیں عورت کہنا مشکل ہے، اور وہ مرد بھی نہیں ہیں، ایک تیسری جنس کا نمونہ بن گئی ہیں۔

علمائے یورپ اس عظیم نقص مدنیت پر غور کر رہے ہیں، جو قوانین قدرت کے منافی اور اس کے حدود کو توڑنے والا ہے۔ اگر عورتوں کی یہ افسوسناک حالت اسی طرح کچھ عرصے قایم رہی تو سمجھ لینا چاہیے کہ عنقریب تمدّن اور معاشرت کی بنیادیں متزلزل ہونے والی ہیں۔"

مشہور سوشلسٹ فلاسفر علامہ پروڈن لکھتا ہے: "جس طرح ہمارے زمانے میں عورتوں کی سوشل حالت کے متعلق گمراہیاں رونما ہو رہی ہیں اسی طرح تغیر نظامِ تمدّن اور آداب معاشرت کے ہر دور میں رونما ہوئی ہیں، مگر وہ قانونِ قدرت جو جنسِ نازک (عورت) کو منزلی زندگی کے لیے مختص رکھنا چاہتا ہے، کبھی نہیں بدلا اور کبھی نہیں بدلے گا۔ یہ قانونِ قدرت اور قانونِ الٰہی اس درجہ صحیح اور محقّق ہے کہ گو اس کی مخالفت میں سیکڑوں باطل خیالات پیدا ہوتے رہے لیکن یہ بغیر کسی تغیّر یا نقصان کے سب پر غالب آتا رہا ہے۔ میری رائے ہے کہ جنس عامل (مرد) اور جنس نازک (عورت) کے مادی فرائض کی تعیین اور حد بندی جلد از جلد کر دی جائے۔"

مغربی علما کی اور بہت سی رائیں جمع کرنے کے بعد علّامہ فرید وجدی مصری فرماتے ہیں کہ اسلام اور اسلام کی خاص مدنیت نے عورتوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے وہ مصنّفوں اور مورّخوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ آج یورپ میں حدِ اعتدال سے گزری ہوئی آزادئ نسواں نے جو نتائج دکھائے ہیں انھیں سامنے رکھ کر یورپ کے افاضل وہی طریقہ اختیار کرنا چاہتے ہیں جو اب سے چودہ سو سال پیشتر اسلام نے دنیا کو بتلایا تھا۔

مسلمان اگر اسلام کے مجموعہ تعلیم و ہدایت میں عورتوں کی حُرّیت اور عدمِ حرّیت کے مناقشے کا قولِ فیصل تلاش کریں اور ڈھونڈیں کہ اسلام نے عورت کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے، کہاں تک اُسے آزادی دی ہے، کس درجے تک اس کے حقوق طے ہیں۔ غلامی اور مفرد آزادی، دونوں خرابیوں کا کیوں کر علاج فرمایا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ مسلمان یورپ کی راہ نمائی کے محتاج نہ رہیں۔ انسانوں کے بنائے ہوئے

تمام قانون اور تمام طریقے الٰہی اور رُوحانی قانون کے آگے ہیچ ہیں۔

ہمیں تسلیم ہے کہ عورت غلامانہ زندگی بسر کرنے کے لیے مخلوق نہیں ہوئی ہے۔ قدرت نے اُس کو کچھ حدود مقرر کرکے آزادی عطا کی ہے۔ اُسے قطعی حق ہے کہ اپنی معتدل آزادی حاصل کرنے کے لیے مرد کا مقابلہ کرے، مگر اُن ہتھیاروں سے نہیں جو عورت کے دوست نما دشمن اسے دکھلا رہے ہیں اور جو تمدن اور معاشرت کے میدانِ کارزار میں اس کو ہمیشہ ناکام رکھیں گے، بلکہ اُن ہتھیاروں سے مرد کا مقابلہ کرے جو قدرت نے اُسے دیے ہیں، جن کی مدافعت مرد کر ہی نہیں سکتا۔ اُن کی مدافعت مرد کی طاقت سے باہر ہے۔

عورت اپنے اِن قدرتی ہتھیاروں سے کام لے گی تو اس کی حکومت دلوں کی سلطنت پر قایم ہو جائے گی اور وہ انسانی احساسات کی قلمرو کی ملکہ بن جائے گی۔ اُس کے قبضے میں ہوگا کہ ملکی حکومت کا پانسہ جس طرف چاہے پلٹ دے۔ اس کے ایک اشارے سے شخصی حکومت جمہوری حکومت میں بدل جائے گی۔ اُس کی ذراسی کوشش سے سوشلسٹ اور جمہوری حکومت کا رُخ خود مختار شاہی حکومت کی طرف پھر جائے گا۔ یہ جملہ کامیابیاں عورت کو قدرتی ہتھیاروں کی بدولت کس طرح حاصل ہوں گی؟ اس طرح کہ عورت اپنی خواہش کے مطابق بچوں کی تربیت کرے گی اور اُن کے دلوں میں یہ خیالات نقش کا لحجر کردے گی۔ بچے جوان ہو کر ان خیالات کو اپنا نصب العین بنالیں گے اور بڑی بڑی سلطنتوں میں انقلاب کر دکھائیں گے۔ انسان کا پہلا مدرسہ ماں کی گود ہے۔ اِس مدرسے میں زندگی کے جو اصول سکھائے جاتے ہیں انسان اُن کو عمر بھر دستور العمل بنائے رہتا ہے۔

اختیار کا استعمال

انسان اپنے جسم کے اندر کی مشینری کو بھی اللہ کے دیے ہوئے اختیار سے بگاڑ اور سنوار سکتا ہے۔ ہم جو ناجائز اور مضرِ صحت چیزیں کھاتے ہیں اور ناجائز اور مضرِ صحت اعمال کرتے ہیں وہ اندر کی تمام مشینری بگاڑے رکھتے ہیں اور جو جائز اور مفید صحت چیزیں کھاتے ہیں اور جائز اور مفیدِ صحت اعمال کرتے ہیں وہ اندر کی تمام مشینری سنوارے رکھتے ہیں۔ ولن تجد

لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلاً ۔ اور اللہ کی سُنّت میں تم کبھی فرق نہیں پاؤ گے۔
اللہ کے قوانین اٹل ہیں، جو اِن قوانین سے ٹکراتا ہے، پاش پاش ہو جاتا ہے، قوانین خواہ وہ ہوں، جنھیں قوانین فطرت کہا جاتا ہے اور خواہ وہ جو انبیا کے ذریعہ آتے رہے ہیں۔ انبیا کے ذریعے آئے ہوئے قوانین سے لاپرواہی برت کر ہم مسلمانوں کا جیسا بد حال بنا ہے سب کے سامنے ہے، اور اِن قوانین سے غیر مسلموں کی سرکشی کا نتیجہ انھیں معلوم ہے جنھوں نے زوال پذیر غیر مسلموں کا دَورِ اقبال مندی دیکھا ہے۔ ساٹھ ستّر برس قبل انگریزوں سے بڑھ کر کسی قوم کو عروج حاصل نہیں تھا۔ آج انگریزوں کی جگہ امریکنوں اور روسیوں نے لے لی ہے۔ ساٹھ ستّر برس بعد نہ جانے کون امریکنوں اور روسیوں کی جگہ لے گا۔

مغربی اقوام اللہ کا قانون کہے بغیر، انبیا کے لائے ہوئے بہت سے قوانین کی ہم مسلمانوں سے زیادہ پیروی کرتی ہیں، اقبال اسی پیروی سے یاور ہوتا ہے اور بہت سے قوانین کی مغربی اقوام خلاف ورزی کرتی ہیں، تباہی اس خلاف ورزی سے آتی ہے۔

انسان کو اندرونی اعضا کے بگاڑنے اور سنوارنے کا اختیار حاصل ہے تو بیرونی اعضا پر تو اُس کا کنٹرول بہ درجہ اولےٰ ہونا چاہیے۔ انسان بیرونی اعضا سے چاہے جائز کام لے، چاہے جائز اور ناجائز کی پرواہ نہ کرے اور اُنھیں بے مُہار چھوڑ دے۔ لیکن اوپر آپ پڑھ چکے ہیں کہ بیرونی اعضا کا ناجائز استعمال اندرونی اعضا کا ناس کر ڈالتا ہے۔ اب سُنیے کہ اندرونی اور بیرونی اعضا کا ناجائز استعمال ہی روح میں بے چینی پیدا کرتا ہے اور رُوح کی نشوونما اور ترقّی روکتا ہے۔ کبھی سوچنے کا وقت نکل سکے تو سوچیے کہ ہر قسم کی آسایش میسر ہونے کے باوجود رُوح بے چین کیوں رہتی ہے اور روح سکون کیوں نہیں پاتی۔ سوچیے کہ آپ کی قوّتِ اختیار کہیں اللہ کے مقرر کردہ حدود تو نہیں توڑ رہی، اللہ کے قوانین کی خلاف ورزی تو نہیں کر رہی۔

قوّتِ اختیار ایک نعمتِ عظمےٰ ہے جو اللہ تعالےٰ نے اپنی کل مخلوق میں فقط انسان کو عطا فرمائی ہے، لیکن اس قوّت کا غلط استعمال انسان کو تباہ بھی

کر دیتا ہے۔ انسان کی روح، انسان کے بیرونی اعضا اور انسان کے اندرونی اعضا سب کا برا حشر کرتا ہے۔

صراطِ مُستقیم کی جُستجو

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کہتے کہتے عمر گزر جاتی ہے لیکن صراطِ مستقیم ہاتھ نہیں لگتا۔ بھلا کوئی بات ہے کہ اللہ وعدہ تو کرے کہ جو ہماری طرف آنا چاہے گا اُسے ہم اپنا راستہ ضرور دکھائیں گے (وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا) اور وعدہ پورا نہ کرے۔

صمیم قلب سے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کہا جائے اور اللہ تعالےٰ صراطِ مستقیم نہ دکھلائے، یہ ناممکن ہے۔

کم از کم سورہ فاتحہ کو تو سمجھ کر ہی پڑھنا چاہیے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ کہیے تو اللہ کے احسانات کا تصوّر کیجیے کہ اُس نے ہمیں لاشے سے شے بنایا۔ عدم سے وجود دے دیا۔ اُسی کی عنایت سے ہم زندہ ہیں اور بالآخر وہ ہمیں پاس بُلائے گا، وہ حمد و ثنا کا مستحق نہیں ہے تو پھر مستحق حمد و ثنا اور کون ہے۔

اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کہیے تو سوچیے کہ یہ اظہار غلط تو نہیں کیا جا رہا۔ اللہ کی بجائے یا اللہ کے علاوہ کسی اور کو تو معبود نہیں بنا رکھا ہے اور کسی اور سے تو اُمیدیں نہیں باندھ رکھی ہیں۔

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کی درخواست پیش کیجیے تو درخواست کی طرح پیش کیجیے، حکم مت دیجیے۔

"الٰہی! سیدھا راستہ دکھا اور سیدھے راستے پر چلا" زبان سے کہنا کافی نہیں ہے، دل میں سیدھے راستے کی تڑپ ہونی چاہیئے، سیدھے راستے پر چلنے کا عزم ہونا چاہیئے، سیدھے راستے کی جُستجو اور تلاش ہونی چاہیئے۔ نیت، خواہش اور عزم کے بغیر سیدھا راستہ ہاتھ آنا مشکل ہے۔ جسے جستجو نہیں ہوتی وہ کچھ نہیں

رہا تا، حتے کہ قرآن جیسے ہدایت نامے سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ قرآن وہ کتاب ہے کہ اس کے ہدایت نامہ ہونے میں مطلق شک و شبہ نہیں ہے، لیکن اللہ خود فرماتا ہے کہ یہ کتاب ہدایت انھیں دیتی ہے جو بُرے کاموں کے کرنے سے فطرتاً گریز کرتے ہیں اور نیک کاموں کے کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اپنی آنکھوں اور اپنی عقل کو معیار بنا کر نہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ بتانے سے ایسی چیزوں کے وجود کا یقین کر لیتے ہیں جنھیں انھوں نے نہیں دیکھا ہے اور جن تک بغیر بتائے اُن کی عقل نہیں پہنچتی ہے (مگر بتائے جانے اور ہدایت پانے کے بعد عقل پہنچ جاتی ہے) اور یہ ہدایت نامہ اُنھیں ہدایت دیتا ہے جو محض زبان ہی سے اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہتے، عمل بھی مسلمانوں کے سے کرتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، اور جو مال اللہ نے دے رکھا ہے اُس سے حاجتمندوں کے کام نکالتے ہیں۔ اور اے رسولؐ! یہ کتاب ہدایت اُنھیں دیتی ہے اور صراطِ مستقیم اُنھیں دکھاتی ہے جو تمھیں واقعی پیغمبر مانتے ہیں اور جو احکام تم پر نازل ہوئے ہیں اُن کی تعمیل میں لگے رہتے ہیں، اور جو کچھ تم سے قبل نازل ہو چکا ہے اُس کے نزول کے قایل ہیں، جنھیں واقعی یقین ہے کہ اللہ نبی اور رسول بھیجتا رہا ہے اور جنھیں واقعی یقین ہے کہ مرنے کے بعد اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ ایسے لوگ اللہ کے فضل سے راہِ ہدایت اور صراطِ مستقیم قطعی پالیتے ہیں اور منزلِ مقصود تک پہنچ جاتے ہیں اور من مانی مرادیں حاصل کرتے ہیں۔ (سورۃ ۲- آیات ۱ تا ۵)

ہدایت پانے کی جتنی شرطیں اوپر بیان کی گئی ہیں، یہ سب اہلِ جستجو کی علامات ہیں۔ صراطِ مستقیم اِن سے آگے کی چیز ہے۔ یہ علامات بھی صراطِ مستقیم میں شامل رہیں گی لیکن اِن ہی پر صراطِ مستقیم ختم نہیں ہو جاتی۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری اتباع کا نام صراطِ مستقیم ہے۔

قرآن مجید کی چند آیات کا مفہوم

(انسان) ہماری بابت باتیں بناتا ہے (انسان نے ہمیں عاجز تصوّر کر لیا ہے) اور یہ بھی بھول گیا ہے کہ وہ پیدا کس طرح ہوا تھا۔ (کیسی جرأت کے ساتھ) کہتا ہے کہ گلی (سٹری، بوسیدہ) ہڈیوں کو بھلا کون زندہ کرے گا۔ (اسے) بتا دو کہ اُنھیں وہ زندگی بخشے گا جس نے تجھے پہلی بار پیدا کیا تھا۔ (وہ پیدا کرنا اور پیدا شدہ کو دوبارہ زندگی

دینا، دونوں کام جانتا ہے) وہ پیدائش کے جملہ طریقوں سے واقف ہے۔ (یہ ہڈیاں تھیں کہاں۔ پہلے تو گوشت کا بوٹا بنایا گیا تھا اور پھر اُسی بوٹا بنانے والے نے بیچ میں ہڈیاں لگائیں اور جڑیں۔ آہستہ آہستہ بتدریج تجھے مضبوط کیا اور آخر جان ڈال دی۔ دوبارہ جان ڈالنا اُسے کیا مشکل ہے۔ نقش ثانی تو نقش اوّل کی نسبت آسان ہوتا ہے) وہ ایسا قادر ہے کہ لوگو!) اُس نے تمھارے واسطے سرسبز (اور تروتازہ) درخت سے آگ پیدا کی ہے اور تم درخت سے ایندھن کا کام لیتے ہو۔ (تمھارے نزدیک کیا یہ عجوبہ نہیں ہے۔ فقط موت وحیات کا اُلٹ پھیر عجوبہ ہے) کیا وہ، جس نے آسمانوں کو اور زمین کو (ایک مرتبہ) وجود دے دیا اِس کی قدرت نہیں رکھتا کہ ان جیسے آسمان وزمین اور تیار کردے۔ یقیناً قدرت رکھتا ہے۔ وہ خلاقِ عالم ہے اور دانائے راز ہے۔ اُس کا علم کام کرتا ہے۔ جب کوئی شے وجود میں لانی چاہتا ہے تو فرماتا ہے، ہوجا، وہ فوراً ہوجاتی ہے۔ (گلیاں چھانٹنے اور فقرے کسنے سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ انسان اپنا نقصان کرتا ہے) وہ ذات عجز سے پاک ہے، جس کے ہاتھ میں کُل اشیا کی حکومت ہے اور جو تم سب کا مرجع ہے (تمھیں ایک نہ ایک دن اُس کے پاس جانا ہے۔)

(سورہ ۳۶۔ آیات ۷۸ تا ۸۳)

مسلمانوں کا سربراہ

مجھے علم نہیں ہے کہ ہندوستان میں خطیب صاحبان جمعہ اور عیدین کے خطبے پڑھتے وقت خلفائے ٹرکی کے نام ہمیشہ شامل کرتے تھے، یا سلطان عبدالحمید ہی کے زمانے سے اُن کا نام لیا جانے لگا تھا، لیکن سلطان عبدالحمید کا نام لیا جانا خوب یاد ہے حکومت انگریزوں کی تھی، اور دعائیں سلطان عبدالحمید کے لیے مانگی جاتی تھیں۔ انھیں امیرالمومنین یعنی اپنا حاکم کہا جاتا تھا۔ سلطان عبدالحمید خلافت کے بجھتے ہوئے چراغ کی آخری بھڑک تھے۔ انھوں نے خلافت کا خاصا زور دکھایا تھا۔ غالباً ساری دنیا کے خطیب ان کا نام لیتے تھے اور سلطان عبدالحمید کو سارے مسلمانوں کی فکر رہتی تھی۔ ایسا تعلق اُن کے اور مسلمانانِ عالم کے درمیان ہوچلا تھا کہ یورپ اُن سے لرزتا تھا اور اُن کے انتقال کے بعد یورپ نے تہیہ کیا کہ خلافت کا قصّہ ختم کرایا جائے۔

خیر سلطان عبد الحمید کا ذکر ضمناً آ گیا، کہنا مجھے کچھ اور ہے۔ سلطان عبد الحمید کا انتقال ہو گیا، لیکن ہمارے خطیبوں نے اُن کا نام لینا نہ چھوڑا۔ یا تو خطیب اتنے بے خبر تھے کہ انھیں خلیفہ کے بدل جانے تک کی خبر نہیں ہوئی یا اتنے جاہل تھے کہ سمجھ نہیں سکتے تھے کہ پڑھ کیا رہے ہیں سلطان عبد الحمید کے یورپ پر غلبہ پانے کی دعا مانگ رہے ہیں یا سلطان عبد الحمید کی مغفرت کی دعا کر رہے ہیں۔ پاکستان میں خطیبوں کی تربیت کا کبھی کبھی چرچا سُنتا ہوں تو مندرجہ بالا واقعہ یاد آ جاتا ہے۔ خطیب یقیناً اتنے بے خبر اور جاہل نہیں ہونے چاہئیں۔ مساجد کے امام تو جانشینانِ محمدؐ رسول اللہ ہیں۔ اُنھیں واقعی جانشینِ رسول بننا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خطبے پڑھتے نہیں تھے، زبانی تقریر کرتے تھے اور ہمیشہ نئی باتیں کہتے تھے، باتوں کو دوہراتے نہیں رہتے تھے۔ وقت اور حالات کے مطابق ہدایتیں دیتے تھے۔ آجکل بھی ائمہ مساجد سے ہمیں ہدایت ملے تو کیا کہنے ہیں۔ اس خبر سے میری روح خوش ہو گئی کہ ڈائرکٹر، بورڈ آف ایجوکیشن، مغربی پاکستان نے مساجد کو ملّی مرکز بنانے کی تجویز پیش کی ہے۔ خدا کرے منظور کرنے والے تجویز منظور کر لیں، مگر مساجد ملّی مرکز تب ہی بن سکتی ہیں جب شہنشاہ جہانگیر اور حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ میں یک جہتی پیدا ہو جائے۔

گریجویٹ امام مقرر کرنے کا خیال بھی بڑا اچھا خیال ہے۔ لیکن گریجویٹ پورا مولوی نہ ہو تو اسے دین سے رغبت اور دین سے اتنا اخلاص ضرور ہونا چاہیئے جتنا سابق گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین اور سابق وزیر اعظم چودھری محمد علی کو ہے۔ وہ صرف ملازمت یا سیاست کی خاطر اسلام اسلام کی رٹ نہ لگائے۔

حقیقتاً ہمارا سربراہِ مملکت ہی ہمارا امام صلوٰۃ ہے بشرطیکہ اُس میں امامت کے اوصاف موجود ہوں اور ہمارا امام صلوٰۃ ہی ہمارا سربراہ ہے بشرطیکہ اُس میں سربراہی کی قابلیت ہو۔ مسلمانوں کی دنیا و دین کا سربراہ واحد تھا۔ دنیا کو اللہ کے احکام کے مطابق بسر کرنا دین ہے۔ اسلام میں دنیا و دین کی تفریق نہیں ہے۔

مساجد کی تنظیم کے بغیر پاکستان کے خواب کی تعبیر نکلنی محال ہے۔ ہمارے انتخابات کی بنیاد مساجد میں پڑنی چاہیے۔ اصلی بنیادی جمہوریت مساجد سے حاصل

کی جا سکتی ہے۔ محلّے کی چھوٹی چھوٹی مسجدیں اپنے نمازیوں میں سے نمایندے چنیں اور پھر وہ نمایندے بڑی مسجد میں جمع ہوں اور اپنا نمایندہ منتخب کریں، حتیٰ کہ ان ہی میں سے صدر اور وزرا چھانٹ لیے جائیں۔ ہلدی لگے نہ پھٹکڑی رنگ چوکھا آجائے۔ انتخابات میں لکھوکھا روپے برباد جاتے ہیں۔ مساجد کے ذریعے انتخاب کرانے میں خرچ غالباً روپے کا ایک آنہ رہ جائے گا اور انتخاب ایمان دارانہ ہوگا۔

میری عیدیں کراچی میں

سولہ سال سے یعنی جب سے کراچی آیا ہوں، عیدین کی نماز محبّ قدیم خان بہادر حبیب الرحمٰن صاحب دہلوی کے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ اب اُن کے اور میرے درمیان دس میل کا فاصلہ ہے، مناسب نہیں سمجھا کہ موٹر کے چار پھیرے کراؤں۔ اُنھوں نے پوچھا تو تکلفاً کہہ دیا، نماز قریب کی مسجد میں پڑھوں گا، حالاں کہ جی یہی چاہتا تھا کہ بڑے مجمع میں نماز ہو۔ بڑے مجامع میں توقع زیادہ کی جاتی ہے کہ اللہ والا کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا، اس کے طفیل شاید ہم گنہگاروں کی نماز قبول کر لی جائے۔ خیر اللہ تعالےٰ نے میرے ایک اور کرم فرما، ڈاکٹر محمد الیاس صاحب اسسٹنٹ ڈائرکٹر جنرل، ہیلتھ سروسز کے دل میں ڈالا کہ نماز کے لیے چلیں تو مجھے لے لیں۔ ڈاکٹر صاحب بالکل نزدیک رہتے ہیں۔ چناں چہ اس دفعہ اُن کے ساتھ عید کی نماز ادا کی۔

صف میں ڈاکٹر صاحب کے برابر بیٹھا تھا اور ہوش سنبھالنے کے بعد سے جتنی عیدیں دیکھی ہیں، سب چشمِ تصوّر کے سامنے تھیں۔ ہائے، کس کس کے ساتھ عید منائی ہے، ایک ایک کر کے گل کے کل دوسری دنیا میں جا بسے۔ پُرانے ساتھی دو چار ہیں، سو نت نت بتر ہیں۔

اپنی عیدوں اور مغل بادشاہوں اور پٹھان بادشاہوں کی عیدوں کا تصوّر کرتے کرتے پہلی عید تک پہنچ گیا، جس کے امام حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم تھے۔ اُس نمازِ عید کی کیا شان ہوگی جو غزوہ بدر کی فتح کے شکرانے میں، یادگار کے طور پر نہیں، اوّل مرتبہ پڑھی گئی تھی۔ یادگار تو یہ اب ہے۔ غزوہ بدر ماہ رمضان میں ہوا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ روزے پورے کرلو۔ پھر روزے پورے ہونے اور غزوے میں فتح پانے، دونوں کا جشن منانا۔

ہمارا جشن یہی ہے کہ اللہ کے قدموں پر سر رکھ دیں اور پیشانی رگڑیں۔ دوسری پاکیزہ خوشیاں کرنے کی بھی اجازت ہے، لیکن قیام وجود کی خوشی عید کی خوشیوں کا اہم ترین جزو ہے، جس کے بغیر عید منتی ہی نہیں، جس کا منانا لازمی ہے۔ یہ خوشی نہ منائی جائے تو جواب دہی کرنی پڑے گی۔ ہاں یہ خوشی کی چیز ہے۔ یہ لطف اُٹھانے کی چیز ہے۔ کاش ہم اس خوشی اور لطف کا احساس کر سکیں۔

رائے مان اور سونا

چاندنی چوک، دلی میں باغِ جہاں آرا کے سامنے ایک کوچہ ہے، رحمان کا کوچہ۔ یہ دراصل رائے مان کا کوچہ تھا۔ اس کوچے میں عرصہ دراز سے مسلمان آباد تھے، انھوں نے کوچے کو مسلمان کر لیا اور رائے مان کی بجائے رحمان نام رکھ دیا۔ اب اسلام دوستی بس اسی نوع کی رہ گئی ہے۔

رائے مان شاہجہان کے زمانے میں لال قلعے کے فراشوں کا افسر تھا۔ ایک دفعہ قلعے کے صحن میں دریاں اور قالین بچھوا رہا تھا کہ چھت پر سے کوئی شاہزادہ کھیلتے کھیلتے گرا اور اپنی اور رائے مان کی خوش بختی سے دری یا قالین پر آپڑا۔ رائے مان اُسے لے کر شاہجہان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شاہجہان نے رائے مان کا ہم وزن سونا منگوایا اور رائے مان کو دے دیا۔ رائے مان نے اُس سونے سے اپنے واسطے اتنا بڑا مکان بنوایا کہ مکان تو خیر باقی نہیں ہے، لیکن مکان کی جگہ کوچہ رائے مان موجود ہے۔

آدمی کے ہم وزن سونا تولنے کے واقعات بہت ہیں۔ مغل بادشاہ جس سے ناخوش ہوتے تھے اُسے حج کرنے بھیج دیتے تھے اور جس سے خوش ہوتے تھے اُس کے ہم وزن سونا تلوا کر اُسے عطا کرتے تھے۔ مغلوں کے زمانے میں آدمی سے سونے کو تولا جاتا تھا۔ انگریزوں کے زمانے میں سونے سے آدمی کو تولا جانے لگا۔ جس کے پاس جتنا سونا اُتنا بڑا وہ آدمی۔ معیارِ آدمیت، معیارِ عزت اور معیارِ تکریم سونا ہو گیا۔

امریکا سے ایک خط

ایک خاتون کے خط کی چند چیدہ چیدہ سطریں پڑھیے، جو انھوں نے امریکا سے اپنے

ممدوح کو لکھا تھا۔ یہ خاتون مغربی علوم میں درک کامل رکھتی ہیں اور مزید تعلیم حاصل کرنے امریکا گئی ہوئی ہیں، لیکن جن کے نام خط ہے، اُن کے درس نے اِن کے اندر اسلام کے ساتھ لگاؤ پیدا کر دیا ہے۔ پورا خط کچھ عرصہ گزرا ممدوح نے شائع کیا تھا۔

تحریر فرماتی ہیں:-

"آپ کا درس سننے سے پیشتر، قرآن کا پڑھنا صرف کارِ ثواب تھا، آپ کے درس نے اُس کے الفاظ میں مفہوم اور زندگی پیدا کی۔ یہاں آن کر جو دیکھا تو قرآنی تعلیم کے بیشتر گوشے سراپا عمل آنکھوں کے سامنے ہیں۔ کائنات کی ہر قوت اُن کے آگے سربسجود ہے۔ یہیں آن کر اندازہ ہوتا ہے کہ انسان بیسویں صدی میں سے گزر رہا ہے۔ اِس خطۂ زمین پر اب مادی ترقی کی گنجائش باقی نہیں رہی، اسی لیے تو چاند تک پہنچنے کے راستے ڈھونڈے جا رہے ہیں۔"

"اپنے ہاں لوگوں کو قرآن پڑھتے، سجدے کرتے اور تسبیح کے دانے گنتے دیکھ کر اور اُن کی زندگی کو اس عبادت کے مقصود سے یکسر مختلف پا کر مسجدوں سے جی بھر گیا تھا، یہاں ہر گوشے میں کائنات کی قوتوں کو انسان کے آگے جھکا دیکھتی ہوں تو خالق برحق کے سامنے سجدہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔" (فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ - واحدی)

"دو چار مرتبہ یہاں کی لڑکیوں کے ساتھ گرجا بھی چلی گئی، یہ دیکھنے کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ یہاں مذہبی تعلیم سکولوں میں نہیں دی جاتی۔ ہر شخص کسی نہ کسی چرچ کا ممبر ہوتا ہے اور اکثر و بیشتر لوگ اتوار کے روز چرچ ضرور جاتے ہیں۔ سارے دن گرجوں میں کوئی نہ کوئی پروگرام چلتا رہتا ہے۔ کسی پروگرام کو SUNDAY SCHOOL کہتے ہیں، کسی کو MORNING PRAYER۔ کالج اور یونیورسٹی کے طالب علم بھی اِن پروگراموں میں حصہ لیتے ہیں۔ کہیں کہیں عورتیں بچوں کو ساتھ لاتی ہیں، جہاں بچوں کے لیے خاص پروگرام علیحدہ ہوتا ہے۔ گرجا کے پادری کو اعلا سے اعلا ڈگری لینی پڑتی ہے۔ شام کے گرجا میں میٹنگ کی جاتی ہے یا ڈنر (DINNER) دیا جاتا ہے۔ ان تمام پروگراموں کے دوران میں پیالے گھومتے رہتے ہیں اور لوگوں سے چندہ جمع کیا جاتا ہے۔ اللہ کا گھر تو بہرحال مسجدوں ہی کو کہنا چاہیے جہاں ایک اللہ کا نام لیا جاتا ہے، لیکن ان عیسائیوں نے گرجوں سے وہ کام لینا شروع کر دیا جو مسلمانوں کو مسجدوں سے لینا تھا۔ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ قرآن اِن کو دوں اور کہوں کہ تم اسے مسلمانوں کی نہیں اپنے

خدا کی کتاب سمجھ کر پڑھو۔ مسلمانوں کو اس کے محض وظیفے سے کچھ نہیں مل رہا۔ تمھارے عمل سے یہ قرآن دنیا پر چھا سکتا ہے۔ مگر گویا امریکا میں سب ہی بچوں کو مذہبی بنانے کا انتظام ہے اور وہاں کے بچے گلیوں میں گالیاں بک کر اور مارے مارے پھر کر اپنے مذہب کو سبک نہیں کرتے۔ (واحدی)

"ایک سکول میں نویں جماعت کے لڑکے نے مجھ سے پوچھا کہ پاکستان میں COMMUNISM کا رجحان کیسا ہے۔ میں نے کہا مسلمانوں کے پاس اپنا CODE OF LIFE اتنا بلند اور مکمل ہے کہ وہ COMMUNISM کی طرف جا ہی نہیں سکتے، یہ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا، لیکن جب اس نے حیرت سے میرا منہ دیکھا اور سوال کیا کہ پاکستان میں کیا وہی نظام رائج ہے تو سمجھ میں نہیں آیا کہ جواب کیا دوں۔ بے شک کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا تھا۔ (واحدی)

"کھانے کی اس افراط کے باوجود میں نے کسی شخص کو کبھی خدا کا شکر ادا کیے بغیر اور دعا پڑھے بغیر کھانا کھاتے نہیں دیکھا۔ نہ بڑی سے بڑی محفل میں، نہ چھوٹے سے چھوٹے گھر میں۔" (وہ اللہ کے شکر گزار بندے ہیں تو اللہ انھیں کیوں نہ نوازے۔ واحدی)

"یہاں ۳/۴ کام مشین کرتی ہے اور ۱/۴ کام انسان کرتا ہے، مگر ۱/۴ کام بھی اتنا ہوتا ہے کہ ہر شخص کام کرتا ہے اور کوئی امر ان کے کاموں میں مانع نہیں بنتا۔ جس جگہ میں ہوں، یہاں سال میں پانچ مہینے برف پڑتی ہے۔ ہمارے ہاں پہاڑی لوگ مہینوں کا راشن لے کر گھر کے ایک کمرے میں، جہاں گائے، بھینس بھی ہوتی ہے، گھس جاتے ہیں اور سوکھی روٹی کے ساتھ اگر نمک کھانے کو مل جائے تو اُسے اللہ کی دین سمجھتے ہیں۔ یہاں برف گرتی رہتی ہے اور کسی کو خیال بھی نہیں آتا کہ کام بند کر دوں۔ یونیورسٹی یہاں رات کے نو بجے تک کھلی رہتی ہے اور پڑھنے پڑھانے کا کام مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ ہر شخص کو اپنا کام، اپنا مقام، اپنا حق اور اپنا فرض معلوم ہے۔ کوئی اپنے فرض سے غافل نہیں اور کوئی کسی کے راستے میں حائل نہیں۔" (اُن کی مستعدی اور محنت اور با اصولی کا ثمرہ ہی انھیں مل رہا ہے۔ واحدی)

"بہت سی باتیں یہاں کی بُری بھی ہیں، اور جو باتیں بُری ہیں، وہ بھی انتہا کو پہنچی ہوئی ہیں۔ امریکن جو کام بھی کرتے ہیں، اُسے انتہا ہی کو پہنچا دیتے ہیں۔ یہ لوگ سور کا گوشت کھانا چھوڑ دیں تو شاید وہ جنسی بے حیائی ان میں کم ہو جائے جو اس وقت عروج پر ہے۔" اور دنیا بھر کے مسلمان امریکنوں کی مندرجہ بالا اچھی باتوں کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے، ایک بات یہ

آخری ہی ہے جس میں وہ امریکنس سے بازی لے جانے والے ہیں۔ (واحدی)

"مسلمانوں کے ہاتھ سے دین و دنیا دونوں نکل گئے، دل خون کے آنسو روتا ہے۔ کبھی کبھی بڑی بے چین ہو جاتی ہوں۔ امریکن قوم نہ کافر ہے نہ مومن، سمجھ میں نہیں آتا اسے کیا کہوں۔ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی یہ سب کچھ ہے، اور ہم اللہ کے پیارے اور اس کے پیارے نبی کی پیاری امت ہونے کے مدعی، اپنے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہیں۔ کاش ہمیں عمل کی توفیق مل جائے یا اُن لوگوں کو قرآن۔" اُن لوگوں کو قرآن مل جائے۔ یہی دعا کافی ہے، ہمیں توفیق عمل ملتی دکھائی نہیں دیتی۔ ہمارے چند افراد اپنی اپنی حالت تھوڑی بہت درست کر لیں تو کر لیں، قوم کی حالت درست ہونی دشوار ہے۔ دنیا دارالاسباب ہے، بغیر اسباب فراہم کیے دعا قبول نہیں کی جاتی ؎

بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائے نہیں بنتی!

ہے اِس سے یہ ظاہر کہ یہی حکمِ خدا ہے!

موجودہ مسلمانوں کو نہ مخلص لیڈر میسر آئیں گے، نہ موجودہ مسلمانوں کی حالت سنورے گی۔ ساری قوم کی فکر میں اپنے آپ کو نہ بھولنا چاہیئے، اپنے آپ کو بُرے انجام سے ضرور بچانا چاہیئے۔

اِس خط کے پڑھتے وقت صرف ایک بات بار بار کھٹکتی رہی کہ زندگی کے ہر پہلو کو دیکھنے کا معیار امریکا اور یورپ بن گیا ہے۔ لیکن کیا کیجیے امریکا اور یورپ کے علاوہ اور کوئی معیار سامنے ہے ہی نہیں۔ ہمارے اپنے نمونے تو قبروں میں سو رہے ہیں ؎

مسلماناں در گور و مسلمانی در کتاب! (واحدی)

دو خرابیاں

دو خرابیاں مسلمانوں میں ایسی گھس آئی ہیں، جنھیں تمام خرابیوں کی جڑ کہنا مناسب ہے۔ جب تک اِن کا سدِّ باب نہ ہوگا، مسلمان من حیث القوم پنپیں گے نہیں۔

ایک خرابی تو ہے عیسائیوں کی طرح چرچ اور اسٹیٹ میں بنٹ جانا کہ مولوی صاحبان الگ حکم چلاتے ہیں اور گورنمنٹ الگ حکم چلاتی ہے۔ گورنمنٹ غیر مسلموں کی ہو تو خیر مجبوری ہے، ورنہ اسلامی مملکت میں اِس تقسیم کا کیا کام۔ اسلامی مملکت میں تو اللہ کا حکم چلتا ہے۔

حاکم اُسے بنایا جاتا ہے جو اللہ کے احکام کو خوب جانتا اور سمجھتا ہو اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا پورا پیرو ہو۔ جیسے خلفائے راشدین تھے۔ اور امیر معاویہؓ نے بھی صرف انتخاب سے اعراض کیا تھا، باقی نافذ وہ اللہ ہی کے احکام کرتے تھے۔ رہے بعد کے مسلمان بادشاہ وہ خود پابند ہوں یا نہ ہوں، انھوں نے بھی اللہ کے احکام وقوانین میں اپنی خواہشات کو اتنا گڈمڈ نہیں کیا تھا جتنا سوسوا سو برس سے کیا جارہا ہے۔ اب بیروں میں گٹھلیاں نہیں طائی جائیں، بیر بالکل غائب ہیں۔ نظامِ خلافت کی بجائے نظامِ نفسانیت کا دور دورہ ہے۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ مسلمان حکام تو دو طبقوں میں بٹے ہیں، ایک طبقہ بادشاہوں کا اور ایک طبقہ مذہبی پیشواؤں کا، مگر مسلمان عوام سینکڑوں طبقوں اور سینکڑوں فرقوں میں بنٹ گئے ہیں، اور محض تفقہ اور اخذ مطالب قرآن وحدیث کا اختلاف نہیں ہے، دلوں کا اختلاف ہے ہر فرقہ بس اپنے آپ کو مسلمان قرار دیتا ہے، اور مسلمانوں کی تعداد ساٹھ کروڑ سے گھٹا کر چند لاکھ کیے دیتا ہے، بلکہ چند ہزار۔ نگاہیں جب اُٹھتی ہیں فروعی اختلافات کی طرف اُٹھتی ہیں۔ بنیادی اصولوں میں جو اتحاد ہے اُسے نہیں دیکھا جاتا۔

دوسری خرابی کی وجہ بھی حقیقتاً پہلی خرابی ہے۔ بیڑا تب ہی پار ہو سکتا ہے کہ پھر خلفائے راشدین کی شان کے انسان پیدا ہوں، جنھیں اللہ بادشاہت اور فقر، دونوں نعمتیں عطا کرے۔ مسلمان اُن سے صرف ڈریں ہی نہیں، اُن سے عقیدت بھی رکھیں۔ اُن کی بابت یقین کریں کہ ہمارے خیر خواہ ہیں اور اللہ کے مخلص بندے ہیں۔

خلفائے راشدین کی شان کے انسان پیدا ہونے ناممکن نہیں ہیں۔ نبوت ختم ہو چکی ہے، ولایت ختم نہیں ہوئی ہے۔ ولایت تو سچے مسلمانوں کی لازمی صفت ہے۔ اللہ تمام مسلمانوں کو اپنا ولی فرماتا ہے۔ ارشاد ہے: یاد رکھو، اولیاء اللہ (اور مقربین بارگاہ) کی تعریف یہ ہے کہ اُن پر (کسی آنے والے کھٹکے سے) خوف طاری نہیں ہوتا، اور نہ کسی گزرے ہوئے واقعے کا) انھیں غم لگتا ہے۔ اور اولیاء اللہ ہیں کون، کن پر خوف طاری نہیں ہوتا اور کنھیں غم نہیں لگتا؟ وہ ہیں وہ جو (اللہ اور اللہ کے رسولؐ پر) ایمان لاتے ہیں۔ اور (اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی نافرمانی سے) خوف کھاتے ہیں (اور ایمان لاکر بیٹھے نہیں جاتے، نیک عمل کرتے ہیں۔ احکام وقوانین اسلام کے متبع رہتے ہیں۔ مومن کامل بنتے ہیں۔ ان تقوےٰ شعار اور مطیع وفرماں بردار) مومنوں کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی (راحت و

آسائش کی) بشارت ہے اور آخرت میں بھی ۔ (اُن کی دنیا و عقبےٰ دونوں خوش حالی سے گزریں گی) اللہ کے وعدوں میں ردوبدل نہیں ہوا کرتا (اللہ کے وعدے اٹل ہیں، اور) یہ (دنیا و عقبےٰ میں راحت و آسائش کا حصول اور خوف و حزن سے نجات پانا) بہت بڑی کامیابی ہے۔ (سورہ ۱۰۔ آیات ۶۲ تا ۶۴)

ایمان صحیح اور ولایت ایک ہی چیز ہے۔ ایمان صحیح اور ولایت کے مدارج ضرور ہیں، لیکن صحیح ایمان والے کی ولایت کی نفی کہیں نہیں ہے۔ نفی تو خطرناک ہے۔ ولی نہ ہونے کے معنی ایمان صحیح نہ ہونے کے ہیں۔

ولی کا لفظ خاص بزرگوں کے ساتھ اُن کے ایمان اور ولایت کے بلند ترین درجے کی باعث اصطلاحاً اور عرفاً مختص ہو گیا ہے۔ عام مسلمان از راہ کسر نفسی اپنے واسطے ولی کا لفظ استعمال نہیں کرتے۔ ولی ہونے کا دعوےٰ نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم مسلمانوں کو بھولنا نہ چاہیئے کہ اللہ سارے مسلمانوں کو مومن کامل اور ولی دیکھنا چاہتا ہے۔

ایمان اور نیک اعمال

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ .... هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

(سورہ ۲۔ آیت ۲۵) جو ایمان لے آئے ہیں اور اچھے عمل کر رہے ہیں (اللہ کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں) انھیں بشارت دے دو کہ (اُن کی دنیا بھی جنت کا نمونہ بن جائے گی اور عقبےٰ میں) اُن کے واسطے (ایسے) باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ جب وہاں کے باغوں کا کوئی پھل کھانے کو ملے گا تو مومنین کہیں گے، ارے یہ تو بالکل ویسا پھل ہے جیسا ہمیں دنیا میں ملا کرتا تھا۔ (عقبےٰ میں واقعی دنیا کے پھلوں سے ملتی جلتی شکل کے پھل دیئے جائیں گے۔ (تاکہ مومنین پھل کو پھل سمجھ سکیں۔ ذائقہ ایک ایک پھل میں کئی کئی قسم کا ہو گا۔ بلکہ ہر پھل میں ہر دفعہ نیا ذائقہ آئے گا۔ ایک پھل بار بار کھانے سے دل نہیں بھرے گا) اور عقبےٰ میں اُن کے واسطے (بڑی) پاکیزہ بیویاں ہوں گی (ظاہری اور باطنی تمام نجاستوں سے پاک) اور (یہ سب نعمتیں دنیا کی طرح عارضی نہیں ہیں) وہاں وہ (خود بھی) ہمیشہ ہمیشہ قیام کریں گے (اور سب نعمتیں بھی ہمیشہ ہمیشہ پائیں گے)

مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی تو چوں کہ اس سے قبل کی آیت میں کفار کو چیلنج کیا گیا

تھا کہ قرآن کی مثل ایک چھوٹی سی چھوٹی سورۃ تصنیف کرکے دکھاؤ۔ کفار نے چیلنج کا یہ جواب دیا کہ قرآن میں تو باغوں اور پھلوں کے اذکار اور تشبیہیں اور تمثیلیں ہوتی ہیں، اس بات کو ہم اللہ کے شایانِ شان نہیں مانتے۔ اللہ بھلا تمثیلوں سے کام لے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَۃً فَمَا فَوْقَھَا ۔۔۔۔۔ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ٥ (سورہ ۲ - آیات ۲۶-۲۷)

(مثال دینے کا موقع ہو تو) اللہ مچھر کی اور مچھر سے بھی زیادہ حقیر چیز کی مثال دینے سے نہیں شرماتا۔ (جن کے دل کا زنگ اُتر چکا ہے اور) جو ایمان لا چکے ہیں اُن کی سمجھ میں (بلا شک و شبہ کے اور بے تامل) آجاتا ہے کہ اللہ نے (بالکل) ٹھیک (اور برمحل) مثال دی ہے، اور (جن کے دل زنگ آلود ہیں اور جو ایمان نہیں لائے ہیں وہ یہی کہتے ہیں (اور یہی کہے جائیں گے) کہ اس مثال سے اللہ کا منشا و مقصد کیا ہے (اُن کی سمجھ میں مثال نہیں آئے گی) اللہ (اُسی) مثال سے بہتوں کو گمراہ کر دیتا ہے اور (اُسی مثال سے بہتوں کو راہِ راست دکھا دیتا ہے۔ گمراہ انھیں کرتا ہے جن کے دلوں میں کھوٹ ہے (جنھوں نے اللہ کی عطا کردہ قوت اختیار کا استعمال غلط کیا ہے اور بدکرداریوں کی مداولت سے اپنی عقل کو مسخ کر لیا ہے اور اُسے غلط راستے پر چلنے کا عادی بنا لیا ہے) جنھوں نے اللہ سے پختہ عہد باندھ باندھ کر توڑے ہیں۔ اور جس رشتہ (انسانیت) کے برقرار رکھنے کا اللہ نے حکم دیا تھا اُس (رشتے) کو کاٹ پھینکا ہے اور جو ملک میں فساد پھیلاتے ہیں (اور فساد کو امن کہتے ہیں یہ لوگ اللہ کی تمام ہی باتوں کا اُلٹا اثر لیں گے۔ انھوں نے حق کی طرف آنے کی صلاحیت کھو دی ہے) یہی لوگ ہیں ٹوٹا (اور گھاٹا) اُٹھانے والے۔ (ان کی خود غرضیاں اور مفاد پرستیاں ایک نہ ایک دن رنگ لائیں گی)

مغربی زندگی اور اسلام

گناہ حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے زمانے کے مسلمان بھی کیا کرتے تھے، لیکن اوّل تو گناہوں کی اتنی کثرت نہیں تھی کہ فضا گناہ آلود نظر آنے لگتی، دوسرے جو اِکا دُکا مسلمان گناہ کر بیٹھتا تھا اُسے فوراً احساس ہو جاتا تھا کہ میں نے کیا کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہیں سزا بھگت لوں۔ اللہ کے ہاں کی سزا کا قصہ نہ رکھوں۔

یہاں کی سزا کے مقابلے میں اللہ کے ہاں کی سزا سے ڈرتا تھا اور حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر خود کہتا تھا کہ سزا دیجیے اور مجھے پاک کیجیے۔

اور یہ بات تو میں نے اپنے زمانے تک دیکھی ہے کہ گناہ کرنے والے گناہ کو گناہ سمجھتے تھے اور گناہوں کا خیال کر کے بعض مسلمان رو پڑتے تھے۔

لیکن اب نہایت عجیب و غریب دور چل رہا ہے۔ مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ کوشاں ہے کہ گناہوں کو اسلامی لباس پہنا دیا جائے۔ اس طبقے کے نزدیک اچھائی یا برائی کا معیار اہلِ مغرب کا عمل ہے، اِسے ایسا اسلام چاہیے جو اہلِ مغرب کے عمل سے مطابقت کھائے۔

میں نے مغرب زدہ کا لفظ استعمال کیا ہے، جدید تعلیم یافتہ نہیں کہا۔ ہر جدید تعلیم یافتہ اس رنگ میں رنگا ہوا نہیں ہے۔ علامہ اقبال اور مولانا محمد علی سے بڑھ کر جدید تعلیم یافتہ کون ہوگا، علامہ اقبال مولانا حسین احمد مدنی کی دینی لغزش پکڑ سکتے تھے اور مولانا محمد علی جمعیت العلما کی رہنمائی کر سکتے تھے۔ آج بھی مولانا عبدالماجد دریا بادی اور ڈاکٹر رفیع الدین جیسے جدید تعلیم یافتہ موجود ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ایم-اے- پی- ایچ- ڈی نے ہمیں بتایا ہے کہ اس نوعیت اور اِس پیمانے کا فتنۂ ارتداد اسلام کی ساری تاریخ میں کہیں نہیں ملتا جس نوعیت اور جس پیمانے کا فتنۂ ارتداد موجودہ زمانے میں رونما ہے۔

ایک طرف پاکستان میں، پاکستان کے کسی وزیرِ داخلہ کے حسبِ بیان ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے وقت عیسائی تیئیس فی صدی زیادہ نکلے تھے، اور کناڈا کے رسالہ اسپکیٹر کا تو دعوےٰ ہے کہ پاکستان میں روزانہ ستر عیسائیوں کا اضافہ ہو جاتا ہے، دوسری طرف رسالہ ترجمان القرآن، لاہور میں اس قسم کے سوال چھپتے رہتے ہیں کہ "وضو میں پانچ مرتبہ پاؤں دھونا اہلِ یورپ کے لیے کیسے ممکن ہے، خصوصاً سردی کے موسم میں۔ یورپ کے شہروں میں خاک مٹی نہیں اڑتی اور پسینے نہیں بہتے، لہٰذا انہیں بھی دن ایک دفعہ دھونا (یعنی دن میں ایک دفعہ وضو کرنا) کافی ہے۔ گویا قرآن مجید کے صریح احکام میں بھی رد و بدل کرنا چاہیے۔"

"انشورنس کے مسئلے میں تردد لاحق ہے۔ اِسے ترک کرنا فوائد سے محروم ہونا ہے، تمام دنیا میں انشورنس کا کاروبار جاری ہے۔ تمام قومیں انشورنس کی تنظیم کر چکی

ہیں اور فائدے اٹھا رہی ہیں۔ مگر ہمارے ہاں ابھی اس بارے میں تامل اور تذبذب کیوں پایا جاتا ہے ؟" مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جواب دیتے رہتے ہیں، مگر کب تک اور کہاں تک جواب دیں گے۔ مقابلہ بے حد سخت ہے۔ مغربی جراثیم غیر تعلیم یافتہ لوگوں تک میں پھیلتے جاتے ہیں۔

علما اور اہلِ دول

جس شخص کے نمونے کی عامۃ المسلمین تھوڑی بہت بھی تقلید کرتے ہوں، اُس کی بڑی مشکل ہے۔ مثلاً عامۃ المسلمین پر نمبر ایک اثر علما و مشایخ کا ہے۔ خدا معلوم خدا اُن سے کس کس غلطی کی باز پرس کرے گا۔ دوسرا اثر انداز گروہ اہلِ دول اور اہلِ اقتدار کا ہے۔ اِس گروہ کے نقال خاصۃ الناس ہوتے ہیں۔ انھیں بھی جواب دینے پڑیں گے۔ اپنے ہی اعمال کی جواب دہی کیا کم ہے جو دوسروں کے اعمال کی جواب دہی کا بوجھ انسان اپنے سر لے۔ مگر لوگوں کو پیشوا بننے کا کچھ ایسا شوق ہے کہ پیشوا اور بڑا بننے کا ذرا سا موقع مل جاتا ہے تو اُسے چھوڑتے نہیں۔

اللہ کے ہاں کی جواب دہی تو خیر مرنے کے بعد ہوگی۔ یہاں بھی پیشوائی اور بڑائی کیا ملتی ہے، فریب کھایا جاتا ہے۔ اچھا ان لوگوں کو صرف وہ کہتے ہیں جنھیں ان کی تعریف کرنے اور اچھا کہنے سے ذاتی فائدہ ہوتا ہے۔ باقی خلقت تو گالیاں ہی دیتی رہتی ہے اور محبت کی بجائے نفرت کرتی ہے۔

عیش و عشرت اور عذاب

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ۝ وَأُمْلِي لَهُمْ ۚ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ۝ جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا ہے اُن پر اگر عیش و عشرت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں تو یہ نہ سمجھو کہ وہ ہمیشہ عیش و عشرت ہی کیے جائیں گے۔ یہ عیش و عشرت درحقیقت عذاب ہے۔ ہم ظاہری سزا دینے میں عموماً جلدی نہیں کرتے۔ انھیں خوب دلیر ہونے دو اور سزا کا مستحق کامل بننے دو) ہم انھیں بہ تدریج ہلاکت (و بربادی) کی طرف لے جا رہے ہیں، اس طرح کہ اُن کو خبر بھی نہ ہو (کہ کیا ہو رہا ہے) ہم اُن کو ڈھیل دے رہے ہیں (تاکہ جتنا کھل کھیل سکتے ہیں کھیل لیں) یقیناً ہماری تدبیر اور گرفت

زبردست ہے۔ (سورہ ۷۔ آیت ۱۸۳) مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُّرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُومًا مَّدْحُورًا ٥ (جن ناعاقبت اندیشوں کی ہمتیں دُنیا ہی تک محدود ہیں اور) جو (صرف) دنیا (ہی کے عارضی نفع کے طلب گار ہیں (اور آخرت سے بے نیاز ہیں، ہم اُن میں سے) جس شخص کو (دینا) چاہتے ہیں فی الفور اس دُنیا میں دے دیتے ہیں (لیکن دُنیا کوئی مستقل شے تو ہے نہیں، مرنے کے بعد) پھر ہم نے اُس کے لیے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔ اُس میں وہ شخص بدحال (اور) راندۂ (درگاہ) ہو کر داخل ہو گا (اور اپنے کیفر کردار کو پہنچے گا) (سورہ ۱۷۔ آیت ۱۸)

اِس آیت کا حاشیہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی علیہ الرحمہ نے حسبِ ذیل لکھا ہے:۔

"ضروری نہیں کہ ہر عاشق دنیا کو فوراً ہلاک کر دیا جائے۔ نہیں، ہم اُن لوگوں میں سے جو صرف متاعِ دُنیا کے لیے سرگرداں ہیں، جس کو چاہیں اور جس قدر چاہیں اپنی حکمت و مصلحت کے موافق دُنیا کا سامان دے دیتے ہیں تا اُن کی جد وجہد اور فانی نیکیوں کا فانی پھل مل جائے اور اگر آخری سعادت مقدر نہیں تو شقاوت کا پیمانہ پوری طرح لبریز ہو کر نہایت ذلت و رسوائی کے ساتھ دوزخ کے ابدی جیل خانے میں دھکیل دیے جائیں۔"

مومن کی تعریف

مومن کی تعریف یہ ہے کہ وہ اللہ سے ڈرتا بھی ہے کہ نہ معلوم کس لغزش پر پکڑ لیا جاؤں اور اللہ سے توقع بھی کرتا ہے کہ اللہ مجھے اپنی رحمت سے نوازے گا۔ اچھے عمل ہی کافی نہیں ہیں۔ عمل کا اللہ کے ساتھ کنکشن ضروری ہے۔ عمل اللہ کے لیے ہونا چاہیئے۔ نیت کا ذرا سا پھیر اچھے عمل کو بُرا عمل بنا دیتا ہے۔ اچھے عمل اور اچھی نیت کے بعد ڈرنے اور توقع کرنے کا حکم ہے۔ اچھے عمل اور اچھی نیت میں جھول پڑ سکتا ہے۔ لہٰذا اللہ جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب کرے، اُسے ہر بات کا اختیار ہے۔ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاءُ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ٥ (سورہ ۲۔ آیت ۲۸۴)

با ایں ہمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ میرے بتائے ہوئے نگنلوں پر چلو گے تو میں تمھاری دنیا ٹھیک گزروا دوں گا اور عقبیٰ میں اس کا انعام دوں گا کہ تم نے دنیا ٹھیک گزاری۔ لیکن،

"جس نے میری یاد سے مُنہ موڑا (مجھے اور میری ہدایات کو بھلایا اور میرے احکام اور قوانین کی پرواہ نہ کی) اُس کی زندگی (اس دنیا میں بھی) تنگی سے کٹے گی اور قیامت کے دن ہم اُسے (قبر سے اندھا کر کے) اُٹھائیں گے۔ (کہ تو نے دنیا میں ہمارے احکام اور قوانین کی طرف سے آنکھیں بند رکھی تھیں سو اب عقبے میں اندھا رہ۔) (سورہ ۲۰ - رکوع ۱۶)

تعمیلِ احکام

اللہ کے احکام اور قوانین کو بھلانے کی سزا اگر معیشت کی تنگی اور قیامت کے دن اندھا اُٹھنا ہے تو اللہ کے احکام اور قوانین کو یاد رکھنے کی جزا معیشت کی فراخی اور قیامت کے دن صحیح الاعضا اٹھنا ہے۔ یعنی اللہ کے احکام اور قوانین کی پابندی سے دنیا جنّت بن سکتی ہے اور عقبے میں جنّت مل سکتی ہے۔

اللہ کی یاد سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ انسان ہر وقت نماز پڑھتا رہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ نماز، زکواۃ، روزہ اور حج کے ساتھ ساتھ باقی تمام احکام و قوانین الٰہی کی تعمیل کی جائے۔ اللہ کو خالی خولی سجدے ہی نہ کیے جائیں، اللہ کے اخلاق سے بھی متّصف ہوا جائے۔ خالی خولی سجدے کر کے تو انسان چھوٹا سا کھیت نہیں اُگا سکتا، پوری زندگی کو کیا سرسبز کرے گا اور اللہ کے احکام اور قوانین کے مطابق زندگی کو سرسبز کیے بغیر نجات اُخروی خطرے میں ہے۔ آیت مندرجہ بالا کا مطلب یہ ہے کہ جنّتی معاشرہ قایم کرنے والے جنت پا سکتے ہیں اور جنّتی معاشرہ قایم ہوتا ہے طبیعی قوانین کی پابندی سے حاصل کی ہوئی نعمتوں کو اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے سے۔

آپ شاید فرمائیں کہ معاشرہ تو اہلِ حکومت اور اہلِ اقتدار بدل سکتے ہیں۔ ہم میں اتنی طاقت کہاں ہے جو ہم معاشرے کو درست کریں۔ یہ ٹھیک ہے جن کے رُتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے، لیکن بہر حال آپ کا اور میرا بھی کوئی نہ کوئی مقام ہے۔ انسان ہم عوام بھی ہیں۔ ہم عوام بھی جانور نہیں ہیں، ذمہ داری سے ہم بھی نہیں بچیں گے۔ ہم فرداً فرداً تو حالت درست کر ہی سکتے ہیں۔ اہلِ حکومت اور اہلِ اقتدار میں طاقت ہے کہ پورے ملک اور پوری دنیا میں انقلاب لے آئیں تو ہم کم از کم اپنی ذات میں تو انقلاب لا سکتے ہیں۔ اپنی دنیا تو سنوار سکتے ہیں۔ تنہا اپنے آپ کو صحیح مسلمان بنا کر ہم اپنے اندر ایسی طاقت پیدا کر سکتے ہیں جو

اہلِ حکومت کے اندر نہیں ہے۔ ہم اہلِ حکومت پر حکومت کر سکتے ہیں۔

جنتی معاشرہ اسے مت سمجھ لیجئے گا کہ آپ بہت بڑے دولت مند ہو جائیں۔ روپیہ واقعی بڑی چیز ہے، مگر اللہ کے اخلاق کی پیروی روپے سے زیادہ بڑی چیز ہے۔ آپ سچے مسلمان بن جائیں تو روپیہ تو روپیہ ساری دنیا آپ کے قدموں میں آگرے گی۔ آپ کی دنیا میں جنت اُتر آئے گی۔

مسلمان جاگ اُٹھیں

اہلِ دولت دنیا میں جنت اُتار سکتے تو امریکا سے بڑھ کر دولت کس کے پاس ہے اور اہلِ اقتدار دنیا کو جنت بنا سکتے تو روس سے بڑھ کر بم کس کے قبضے میں ہیں۔ اہلِ دولت اور اہلِ اقتدار نے تو دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے اور مسلمان جب تک نہیں جاگیں گے دنیا جہنم ہی بنی رہے گی۔ دنیا جنت بننے کے لیے مسلمانوں کے مسلمان بننے کی منتظر ہے۔ اسلام چند عقیدوں کا نام نہیں ہے۔ وہ عقیدہ عقیدہ کیا ہوا جو عقیدے کے مطابق عمل نہ کرائے۔ مسلمان کو تو ڈائنامیٹ ہونا چاہیئے کہ پہاڑ کو اُکھاڑ پھینکے اسلام تو ہر نوع کی غلامی کے حق میں پیغام موت ہے ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں!

لوگ بدحالی اور زوال اسے خیال کرتے ہیں کہ انسان بے زر ہو۔ بے شک بے زری بھی زوال اور بدحالی کی علامت ہے، بلکہ اُم الجرائم ہے، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر کوئی شخص فقط روپیہ کما لے تو وہ فلاح پا گیا۔ اُس کی دنیا جنت بن گئی اور اُسے آیت مندرجہ بالا کے بموجب عقبےٰ میں جنت ملے گی۔

جس طرح یہ خیال غلط ہے کہ جنت بے زر لوگوں کا حصہ ہے، اُسی طرح یہ خیال غلط ہے کہ جو روپے والا ہو گیا وہ فلاح یاب ہو گیا۔ انسان کو کوشش یقیناً کرنی چاہیئے کہ اُس کی زندگی تنگی سے نہ گزرے لیکن محض زندگی کے تنگی سے نہ گزرنے کا نتیجہ یہ نہیں ہو گا کہ اُسے قیامت کے دن بینا اُٹھایا جائے گا۔ بینا اُٹھنے کا حق دار تو وہ ہے جو یہاں ہر معاملے میں بینا رہا ہے، جس نے یہاں اللہ کی نشانیوں کو پرکھا ہے۔ جس نے یہاں اللہ کی حکومت محسوس کی ہے،

اور اللہ کی حکومت مان لی ہے اور اپنے آپ کو اللہ کی محکومی میں دے دیا ہے جو ہر وقت ایسے کام کی تلاش میں رہتا ہے جسے اللہ پسند کرے اور ہر کام کے کرتے وقت سوچتا ہے کہ اسے اللہ ناپسند تو نہیں کرے گا۔

حلال خور کے ساتھ چائے

عرب جو کسی زمانے میں اسلامی حکومت کا مرکز تھا، اب اُس کے بہت سے ٹکڑے ہو گئے ہیں مجھے یاد نہیں، جن صاحب کا بیان نیچے لکھ رہا ہوں، وہ عرب کے کس ٹکڑے کا ذکر کرتے تھے، بہر حال عرب کا کوئی ٹکڑا تھا۔ اُنھوں نے بیان کیا کہ جہاں میں مقیم تھا، وہاں دوپہر سے کچھ پہلے روزانہ مرد حلال خور صفائی کرنے آتا تھا۔ عورت حلال خوریوں کا وہاں رواج نہیں ہے۔ ایک دن تیسرے پہر میں چائے پینے ریسٹورنٹ میں گیا تو دیکھا، وہی مرد حلال خور نہایت ستھرا اور شریفانہ لباس پہنے کرسی پر بیٹھا چائے پی رہا ہے۔ مجھے پہچان کر بولا:۔ یا ضَیفی تعالُ۔ اے میرے مہمان! تشریف لائیے۔ میں حلال خوروں کے ساتھ چائے پینی کیا جانوں۔ ہندُستان کا باشندہ۔ ہندؤں کی صحبت سے متاثر۔ میں نے ٹالنا چاہا۔ مگر وہ نہ مانا۔ بازو پکڑ کر زبردستی پاس بٹھالیا اور فوراً آرڈر دیا کہ فلاں فلاں چیزیں لاؤ۔

صفائی اور مین ہول

یورپ اور امریکا کے متعلق تو سُنا تھا کہ صفائی کرنے والے اپنی ذاتی موٹروں میں سوٹ بوٹ ڈانٹے آتے ہیں۔ نیلیکن سوٹ کے اوپر چڑھایا اور جھاڑ پونچھ شروع کر دی۔ جھاڑ پونچھ کر چکے تو نیکپن اتار دیا اور یہ جا وہ جا۔ کوئی پہچان نہیں سکتا کہ صفائی کرنے والا جا رہا ہے یا صفائی کرانے والا۔ لیکن کسی عرب سلطنت کے متعلق حال ہی میں سنا ہے کہ وہاں بھی آدمی کی قدر ہے۔ ہم بھارتی اور پاکستانی مسلمان تو بس قرآن مجید کی یہ آیت پڑھ لیتے ہیں کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ تحقیق انسان کو ہم نے بہترین قوام سے پیدا کیا ہے۔ (سورہ ۹۵۔ آیت ۴) انسان ہماری اشرف المخلوقات ہے۔ مگر میرے سامنے اس وقت یہ منظر ہے کہ دو ہاتھ اور دو پاؤں والا، بالکل مجھ جیسا ایک انسان "مین ہول" میں گھسا کھڑا ہے۔ صرف اُس کا سر باہر ہے، باقی سارا جسم غلاظت

کے اندر ہے۔

"مین ہول" پر ڈھکنا ڈھکا ہوا نہ تھا۔ بچوں نے اینٹ پتھر، اور بڑوں نے گندے کپڑے ڈال ڈال کر پانی کا راستہ بند کر دیا، اور پانی سڑک کے اوپر بہنے لگا۔ غریب "اشرف المخلوقات" پانی کا راستہ کھول رہا ہے۔

"مین ہولوں" پر ڈھکنے ڈھکے جائیں اور پانی اتنی زور سے بہے کہ غلاظت کو کہیں رُکنے نہ دے تو شاید انسانیت کی یوں توہین نہ کرنی پڑے۔ یورپ اور امریکا میں تو انسان غلاظت بھرے "مین ہول" میں شاید نہ اُترتے ہوں گے۔

اللہ کے نیک بندے

(خدائے) رحمٰن (ورحیم) کے اچھے بندے وہ ہیں کہ (تواضع اور انکساران کا شعار ہے) زمین پر سادگی اور رسان سے چلتے ہیں (کبر ونخوت سے نہیں چلتے) اور جب (کج بحث اور) جاہل لوگ اُن کے ساتھ (جہالت کی) گفتگو کرنے لگتے ہیں (اور کج بحثی سے پیش آتے ہیں) تو وہ (جھگڑا نہیں بڑھاتے، بلکہ) سلام کرتے ہیں (اور بردباروں کی طرح پیچھا چھڑا لیتے ہیں)

اور (خدائے رحمٰن ورحیم کے اچھے بندے وہ ہیں) جو اپنی راتیں اپنے پروردگار کے حضور سجدے اور قیام کر کے گزارتے ہیں اور جو (گڑگڑا گڑگڑا کر) کہتے ہیں (کہ) اے ہمارے پروردگار! عذاب جہنم کو ہم سے دور رکھیو۔ (اس میں کچھ) شک نہیں کہ جہنم بدترین ٹھکانہ اور (بدترین) مقام ہے۔

اور خدائے رحمٰن ورحیم کے اچھے بندے وہ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی اور بخل (دونوں سے) بچتے ہیں۔ اُن کا خرچ (چلن کا اور) بیچ کی راس کا ہوتا ہے۔

اور خدائے رحمٰن ورحیم کے اچھے بندے وہ ہیں) جو (اللہ کے سوا کسی کو معبود اور مطاع نہیں مانتے، اور) اللہ کے ساتھ کسی کو عبادت اور اطاعت کا شریک و حصّہ دار نہیں بناتے۔ نیز جس کی جان (لینے) کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے خواہ مخواہ اُس کی جان نہیں لیتے۔ (اُن کے جہاد اللہ کے احکام کے مطابق ہوتے ہیں) نیز وہ زنا نہیں کرتے۔ جو ایسے (بُرے) فعل کرے گا، وہ گناہوں کا خمیازہ (دنیا میں بھی) بھگتے گا (اور) قیامت

کے دن اُسے ڈبل عذاب دیا جائے گا، ہمیشہ اُسی (عذاب) میں ذلیل (وخوار) ہو کر (پڑا) رہے گا، مگر (وہاں) وہ مسلمان جو (بداعمالیوں سے) تائب ہو گیا اور (باز آ گیا) اور (واقعی خدا و رسول پر) ایمان لے آیا اور نیک اعمال کرنے لگا، تو اللہ ایسے اشخاص کے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دے گا۔ اللہ غفور رحیم ہے۔ جو مسلمان (گناہوں سے) توبہ کرلے، اور (توبہ کے بعد) نیک عمل بھی کرے، وہ حقیقتاً اللہ کی طرف (سچے دل سے) متوجہ ہوتا ہے۔

اور (خدائے رحمٰن ورحیم کے اچھے بندے وہ ہیں) جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ اور جب کبھی (اتفاق سے کہیں بے ہودگیاں ہوتے دیکھتے ہیں، یا) بیہودہ کھیل تماشوں کے پاس سے گزرتے ہیں تو بردباری کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں (وہاں رُکتے نہیں)

اور (خدائے رحمٰن ورحیم کے اچھے بندے وہ ہیں کہ) جس وقت اُن کے پروردگار کی آیتوں کے ذریعے اُنھیں نصیحت کی جاتی ہے تو اُن پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں گرتے (سنجیدگی سے) اور غور کر کے اُن سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

اور (خدائے رحمٰن ورحیم کے اچھے بندے وہ ہیں) جو دعائیں مانگتے ہیں کہ اے پروردگار! تو ہمیں گھریلو جھگڑوں سے بچا) ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے ہمیں آنکھوں کی ٹھنڈک (اور دل کا چین) بخش، اور ہمیں متقیوں کا بزرگ بنا۔ (ہم سے جو نسل چلے وہ نیکوکار اور متقی ہو)۔ (سورہ ۲۵۔ آیات ۶۳ تا ۷۴)

یہ چند معمولی سے وصف ہیں جو اللہ تعالےٰ مسلمانوں میں دیکھنا چاہتا ہے، دوسرے وصفوں کا بیان قرآن مجید سے کبھی پھر نقل کیا جائے گا۔ فی الحال صرف اس پر غور کیجیے کہ یہ معمولی وصف بھی آجکل کے مسلمانوں میں ہیں یا نہیں ہیں۔ غریب طبقے کے، بے پڑھے لکھے مسلمانوں کو چھوڑیے، اونچے طبقے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان بھی ان معمولی اوصاف سے متصف ہیں یا نہیں۔

یہودی مدینے سے نکل گئے

مکے کے غریب مسلمانوں کو مکے کے امیر مشرکوں نے دق کر رکھا تھا، مکے سے ہجرت کر جانے کے بعد مسلمانوں کا سابقہ مدینے کے دولتمندوں یہودیوں سے پڑا۔ یہودی بھی مسلمانوں کو خاطر میں

نہیں لاتے تھے۔ گو بظاہر اُنھوں نے مسلمانوں کو تھپک رکھا تھا، مگر سمجھتے تھے کہ مسلمان گھاس پھونس ہیں، جس دن چاہیں گے دیا سلائی دکھا دیں گے۔ چناں چہ ایسا ہی کیا۔

ہجرت کے چار سال بعد کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یہ سوچ کر کہ یہودیوں کا قبیلہ بنو نضیر ہمارا حلیف ہے، اُس قبیلے سے کسی مشترک کام کے لیے چندہ وصول کرنے تشریف لے گئے۔ بنو نضیر نے حضورؐ کو دیوار کے سائے تلے بٹھایا اور سازش کرنے لگے کہ کوئی شخص مکان کی چھت سے حضور کے اوپر اتنا بھاری پتھر پھینک دے کہ حضور وفات پا جائیں۔ حضورؐ نہ رہیں گے تو پھر مسلمانوں کی کیا حیثیت ہے کہ ہم سے آنکھ ملا سکیں۔ اللہ تعالےٰ نے وحی کے ذریعے حضور کو مطلع فرمایا۔ حضورؐ دیوار کے نیچے سے ہٹ گئے اور یہودیوں کا وار خالی گیا۔ حضورؐ نے بنو نضیر سے کہا کہ اب خیر اسی میں ہے کہ تم دس روز کے اندر اندر مدینے سے خیبر چلے جاؤ اور ہتھیاروں کے سوا اپنا جس قدر مال و متاع اور سامان لے جا سکتے ہو لے جاؤ۔ یہودیوں نے پہلے تو تھوڑی سی ہیچر میچر کی، لیکن بالآخر چھے سو اونٹوں پر سامان لادا اور خیبر میں جا بسے۔ اپنے گھر توڑ توڑ کر کواڑ، کڑیاں اور تختے تک لے گئے۔

یہودی، جو مسلمانوں کو پست اور ذلیل خیال کرتے تھے، اور جنھیں وہم بھی نہیں تھا کہ مسلمان کبھی ان کی سرکوبی کریں گے اور اُنھیں جڑ بنیاد سے اُکھیڑ پھینکیں گے، اس کا ذکر قرآن مجید میں بہ ایں الفاظ کیا گیا ہے:۔

"اللہ وہ ہے، جس نے اہلِ کتاب میں سے اُن لوگوں کو جو (اسلام کے) منکر ہیں (لشکر اسلام) کے پہلے ہی اجتماع (اور حملے) پر اُن کے گھروں سے نکال باہر کیا (حالاں کہ مسلمانو!) تم بھی سوچتے تھے کہ وہ (مدینے سے) نہیں نکلیں گے اور یہودی بھی یہی گمان کیے ہوئے تھے کہ اللہ (کی پکڑ) سے اُنھیں اُن کے (مال و اولاد کی کثرت اور مضبوط مضبوط) قلعے بچا لیں گے۔ (مگر اُن کا اور تمھارا، دونوں کا گمان غلط رہا) اور اُن پر اللہ کا عذاب ایسی جگہ سے آ پہنچا، جہاں سے (آنے کا) اُنھیں اندیشہ نہیں گزرتا تھا۔ (اللہ نے) یہودیوں کے دلوں میں مسلمانوں کی دھاک بٹھا دی (اور یہ نوبت آگئی کہ یہودیوں نے) اپنے ہاتھوں سے اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو ڈھوایا۔ اے آنکھوں والو! (اس واقعے سے) عبرت پکڑو (اور یاد رکھو کہ غریبوں کو گھاس پھونس سمجھنا نادانی ہے۔)

(سورہ ۵۹-آیت ۲)

بہادر شاہ اور انگریز

آلِ بابر کی حالت شاہ عالم کے زمانے میں کیا تھی، حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم۔ پالم آپ سمجھے؟ پالم دہلی کا ایرپورٹ ہے۔ اکبر ثانی کے زمانے میں حکومت پالم تک بھی نہ رہی ہوگی۔ اور ابوظفر بہادر شاہ کے زمانے میں تو حکومت صرف لال قلعہ کے اندر تھی۔ اِس کے باوجود قلعہ کے اندر ریزیڈنٹ بہادر شاہ کے سامنے کرسی پر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ بہادر شاہ نے اس وضع کو رنگون کی قید میں بھی نبھایا۔ چند بڑے بڑے انگریز اُن سے ملنے وہاں پہنچے اور اُنھوں نے بہادر شاہ کے پلنگ کے پاس کرسیاں ڈلوائیں کہ قیدی بادشاہ کو کرسیوں پر بیٹھ کر دھرائیں گے، مگر بہادر شاہ نے بحالت قید بھی اُنھیں کرسیوں پر بیٹھنے کا موقع نہ دیا۔ انگریزوں کے پہنچنے سے پہلے پلنگ سے اُتر کر زمین پر بیٹھ گئے۔ انگریز اتنے کمینے نہیں تھے کہ بہادر شاہ زمین پر بیٹھے ہوں اور وہ کرسیوں پر بیٹھ جائیں۔

خیر بہادر شاہ کے زمانے میں مغل سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ بہادر شاہ اپنی ذات سے ہمہ صفت موصوف آدمی تھے، باپ اور دادا اور پردادا سے مختلف طبیعت کے، ۱۸۵۷ کی تحریک پروان چڑھ جاتی تو بڑی اچھی بادشاہت کرتے، لیکن قلعے کے دوسرے ساکنین کا معیارِ اخلاق گرچکا تھا۔ قلعے کے متوسلین میں اتنی غیرت تھی کہ ان کی خواتین نے کنوؤں میں ڈوب ڈوب کر جانیں دے دیں، مگر شاہزادیوں میں ایک بھی ایسی نہ نکلی۔ شاہزادیوں نے جان بچانے کی خاطر ادنیٰ سے ادنیٰ آدمیوں سے نکاح پڑھوالیے، دلّی میں ایک باورچی تھا، اُس کی ماں ، ۵۷ء کی ماری ہوئی شاہزادی تھی۔ کھانا پکانا اُس نے ماں سے سیکھا تھا، بے مثل کھانے پکاتا تھا۔

مغلوں کا زوال

قلعے کے شاہزادوں اور شاہزادیوں کی بپتا میں نے بپتا دیکھنے والوں سے سُنی تھی اور اس بپتا کے لانے میں جن لوگوں کا ہاتھ تھا اُن کا زوال آنکھوں سے دیکھا، زوال ہی نہیں، عروج و زوال، دونوں دیکھے۔

اورنگ زیب کے بعد سے بادشاہ بھی مرنا بھول گئے تھے اور بادشاہوں کی اولاد

بھی مرنا بھول گئی تھی۔ کوئی موت کا تصور سامنے نہیں آنے دیتا تھا حتیٰ کہ قلعے میں سورہ لیٰسین پڑھنا، نعوذ باللہ منحوس قرار دے لیا گیا تھا۔ موت سے غفلت اور یہ دھوکا کہ ہمیشہ یہیں رہنا ہے اور حاکم بن کر رہنا ہے، مغلوں کے اِس حشر کا باعث ہوا کہ شاہزادیاں دیہاتیوں اور باورچیوں کی بیویاں بنیں، لیکن مستحق سزا مغلوں کا ایسا بُرا حشر کرانے میں جو شریک تھے، اللہ نے انھیں بھی معاف نہیں فرمایا۔ انھیں عروج دے کر جلد از جلد بگاڑ دیا۔ عروج جس کی سرحدیں بگاڑ کی سرحدوں سے متصل ہوں، وہ عروج بھی سزا ہے۔ اَللّٰھُمَّ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْکَوْرِ۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دعا مانگا کرتے تھے کہ کہ یا اللہ! بن کر بگڑنے سے مجھے بچائیو۔

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے کیا خوب کہا ہے ؎

خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ
نہیں ممکن امیری بے فقیری

بے فقیری کی امیری کے مناظر کیا آپ ملاحظہ نہیں کر رہے ہیں؟

بیتُ المال کا ہار

حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہ کے زمانہ خلافت کا واقعہ ہے۔ بیت المال میں موتیوں کا ایک ہار رکھا تھا۔ عید قریب آئی تو حضرت امیر المومنین کی دختر نیک اختر نے ابن ابی رافع افسرِ اعلا بیت المال کو کہلا بھیجا کہ ہار مجھے صرف تین دن کے لیے دے دو، تیسرے دن واپس کر دوں گی۔ عید کے دن حضرت امیر المومنین نے ہار بیٹی کے گلے میں دیکھا اور پہچان لیا کہ بیت المال والا ہے۔ پوچھا، ہار کہاں سے آیا؟ عرض کیا، ابن ابی رافع سے مستعار منگایا تھا۔ ابن ابی رافع بلائے گئے، اُن سے کہا۔ تم نے مسلمانوں کے مال میں خیانت کی ہے۔ آیندہ اس قسم کی غلطی مت کرنا، ورنہ سخت سزا دوں گا۔ میں اپنی بیٹی سے بھی ناخوش ہوں۔ اُس نے تین دن میں واپسی کی شرط نہ لگائی ہوتی تو وہ ہاتھ کاٹے جانے کے لائق تھی۔ ہار فوراً واپس لو اور بیت المال میں داخل کرو۔

بیٹی سے فرمایا۔ تم اپنے نفس سے مغلوب اور حق و انصاف سے منحرف نہ ہو۔ کیا اور مہاجرین و انصار کی بیٹیاں بھی عید کے دن اس قدر قیمتی ہار پہن سکتی ہیں۔ اپنے سربراہ کی بیٹی کے گلے میں ایسا

بار دیکھ کر مہاجرین و انصار کی بیٹیوں کے دل پر کیا اثر ہوگا۔

اللہ کی قدرت اور قیامت

(انھیں شاید اپنے پیدا ہونے اور عدم سے وجود پانے کا علم نہیں ہے اور یہ شاید اپنے مرنے اور وجود سے محروم ہو جانے کو بھی نہیں جانتے) عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ ۝ کس چیز کے متعلق ایک دوسرے سے سوال جواب کرتے پھر رہے ہیں؟ عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ ۝ الَّذِي هُمْ فِيهِ مُخْتَلِفُونَ ۝ اُس عظیم خبر (یعنی قیامت) کے متعلق جس میں انھیں (شروع سے) اختلاف ہے (جس کا انھیں کسی طرح یقین نہیں آتا) كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ۝ (ان کے نزدیک پیدا کرنے والے اور موت دینے والے کے لیے موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنا مشکل ہے۔ بحث سے کچھ فائدہ نہیں) عنقریب ان کو پتہ چل جائے گا۔ (آنکھوں سے دیکھ لیں گے) اور اس بات میں دیر نہیں ہے، بہت جلد پتہ چل جائے گا۔ أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا ۝ .... مَعَاشًا ۝ (ارے نادانو!) کیا ہم نے زمین کو فرش اور پہاڑوں کو (زمین کی) میخیں نہیں بنا دیا۔ (زمین کا فرش کی طرح بچھا ہونا اور پہاڑوں کا زمین پر میخوں کی مانند گڑھ جانا اور باوجود بلندیوں کے جما رہنا کیا معمولی کام ہے، کیا اس سے ہماری قدرت ظاہر نہیں ہوتی) اور ہم نے تم کو نر اور مادہ بنایا (جسے چاہا نر کر دیا جسے چاہا مادہ کر دیا) اور نیند کے ذریعہ تمھیں راحت بخشی اور رات کے ذریعہ تمھاری پردہ پوشی کی اور دن کو تلاش معاش کے لیے رکھا۔ وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝ وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا ۝ اور ہم نے تمھارے (سروں کے) اوپر سات مضبوط آسمان بنائے (کہ چھت کی طرح قائم ہیں لیکن چھت کی طرح ٹوٹتے پھوٹتے نہیں) اور (اوپر ہی آفتاب جیسا) روشن چراغ جلا دیا (یہ سب چیزیں ہمیں سمجھنے کے لیے کافی ہیں) وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا ۝ لِنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا ۝ وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا ۝ اور ہم نے (بھرے ہوئے اور) نچڑنے والے بادلوں سے موسلا دھار مینہ برسانے کا انتظام کیا، تاکہ اس سے (قسم قسم کے) اناج اور (قسم قسم کی) جڑی بوٹی گھانس پات اور گنجان باغ نمودار کریں۔ (کیا ان میں سے کسی چیز سے بھی ہماری شان نظر نہیں آتی۔ جس نے ان تمام چیزوں کو جو معدوم محض تھیں

خلعتِ وجود عطا فرما دیا، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ انھیں مٹا کر دوبارہ وجود دینے پر وہ قادر ہو) اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ کَانَ مِیْقَاتًا ۙ۔ (یہ کارخانہ آپ ہی آپ نہیں بن گیا، اور اس کے بنانے والے نے اسے یوں ہی بے نتیجہ نہیں بنایا ہے۔ اس کا کچھ نتیجہ نکلنا ہے اور اس کا کچھ انجام ہونا ہے۔ اُسی انجام کا نام قیامت ہے۔ وہ کھوٹے اور کھرے کی چھٹائی کا دن ہے، اور) وہ چھٹائی کا دن یقیناً آئے گا، اس کا وقت مقرر ہے۔ (اُس دن کھوٹا کھرا ملا جلا نہیں رہے گا، الگ الگ کر دیا جائے گا۔ وہ صحیح معنوں میں انصاف کا دن ہوگا)

جذبات کا اثر روح پر

دل پاکیزہ جذبات و خیالات سے اوپر تک پُر ہو اور دل میں غیر پاکیزہ جذبات و خیالات کی جگہ باقی نہ رہے تو اللہ کا کتنا عظیم احسان ہے۔ دن ہم جن جذبات و خیالات کے ساتھ گزارتے ہیں، وہ جذبات و خیالات ہمارا ساتھ رات کو سوتے میں بھی نہیں چھوڑتے۔ بہت سے امراض جن کا جاگنے سے زیادہ سونے سے تعلق ہے صرف جذبات و خیالات کی پاکیزگی سے دور کیے جا سکتے ہیں۔ جذبات و خیالات کا اثر روح پر تو پڑتا ہی ہے، جسم پر بھی پڑتا ہے۔ آپ کسی سے عداوت کیجئے، دوسرے کو نقصان پہنچا سکیں یا نہ پہنچا سکیں۔ اپنی صحت کو ضرور نقصان پہنچا لیں گے، اور رفاقت و محبت کے جذبات آپ کے اندر ہوں گے تو آپ کی روح و جسم کی صحت بڑھے گی۔ اندر ہی اندر بُرے جذبات کی سزا ملا کرتی ہے اور اندر ہی اندر اچھے جذبات کی جزا ملتی ہے۔ عداوت کے جذبات والے کا خون ہر وقت کھولتا رہتا ہے اور رفاقت و محبت کے جذبات والے کی تیوری ہماری ہیں بھی نہیں بگڑتی۔ عداوت کے جذبات لطفِ زندگی کھو دیتے ہیں۔ زندگی کا لطف تو بس محبت و رفاقت کرنے ہی میں ہے۔

آپ نے مال دار لوگوں کو تمام آسائشوں کے باوجود غریبوں کی نسبت اکثر بیمار ہوتے دیکھا ہوگا۔ اُس کی اور وجہیں بھی ہیں لیکن بڑی وجہ یہ ہے کہ انھیں اُن کے ذکر چاکر مسلسل مشتعل رکھتے ہیں اور اُن کے ہم درجہ اور ہم حیثیت انھیں حاسد بنا دیتے ہیں۔ غصّہ اور حسد سے مال دار لوگوں کی صحت تباہ ہو جاتی ہے، اور غصّہ اور

حسد غریب میں ہو تو اُس پر ڈبل مصیبت آجاتی ہے۔

جو کہتے ہو کرتے کیوں نہیں

بیان بازی میں مغربی سیاست کے مشرقی پیرو مغربی سیاست دانوں سے آگے ہیں اور زبان بے قابو ہونے کے باعث اس قسم کے فقرے زبان سے نکال جاتے ہیں جو نہیں نکالنے چاہئیں۔ مسلمانوں کو ایسا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:
یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ہ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ہ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ہ اے مسلمانو! جو کرنا نہیں تھا اُسے زبان پر کیوں لائے تھے۔ اللہ کے نزدیک (یہ) بڑی بیزاری کی حرکت ہے کہ کہو اور کرو نہیں۔ (لڑائی لڑائی پکارنے سے کیا فایدہ ہے) اللہ تو ایسے آدمیوں کو پسند کرتا ہے جو (زبانی جمع خرچ کی بجائے) اُس کی راہ میں (واقعی اور عملاً) صف باندھ کر (اتنی ثابت قدمی سے) لڑتے ہیں، گویا سیسہ پلائی دیوار ہیں۔ (جو آہنی دیوار کی طرح ڈٹ جاتے ہیں اور مقابلے سے نہیں ہٹتے)

(سورہ ۶۱۔ آیات ۲ تا ۴)

تاثرات کے متعلق

مُلّا واحدی کے چھوٹے بھائی کے نواسے

سید اوصاف علی۔ بی۔ اے کا تھوڑا سا تاثر

پہلے اپنے "تاثرات" کے متعلق خود بڑے نانا جان (مُلّا واحدی صاحب) کا خط پڑھ لیجیے جو انھوں نے مجھے لکھا تھا۔ یہ خط بھی تاثر ہی ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

"میاں اوصاف! مغفرت اور نجات اللہ کی رحمت پر منحصر ہے۔ ہاں، اچھے اعمال مغفرت اور نجات کا بہانہ ضرور بن جاتے ہیں، لیکن میرا قصد روزِ حشر "تاثرات" کا حوالہ دینے کا نہیں ہے۔

ایک خواب کسی کتاب یا رسالے میں پڑھا تھا اور اسے بیاض میں نقل کر لیا تھا:۔

قاضی یحییٰ بن اکثم رحمۃ اللہ علیہ تیسری صدی ہجری کے شروع کے بزرگوں میں گزرے ہیں۔ صحیح بخاری کے راویوں میں ان کا نام آتا ہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے کسی دوست نے انھیں خواب میں دیکھا اور حسب توقع اچھی حالت میں پایا۔ پوچھا، کیوں کر نمٹی؟ فرمایا، پیش تر اس کے کہ سوال وجواب کیے جاتے، میں بہ اطمینان مسکرایا۔ دریافت کیا گیا کہ عین سوال وجواب کے وقت یہ تبسم کیسا؟ میں بولا، مجھ سے حدیث روایت کی فلاں نے، فلاں راوی سے، اور اس راوی نے فلاں صحابی سے اور صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے اور جبریل علیہ السلام نے تجھ تبارک وتعالیٰ سے کہ تو نے فرمایا ہے "مجھے بوڑھے مومن سے جرح کرتے مروت مانع ہوتی ہے۔" میں سفید بال تو بہرحال لایا ہوں۔ بس اس کے باعث اطمینان ہے۔" معاً ارشاد ہوا، "سچ کہا جبریل نے اور سچ کہا، ہمارے رسول نے اور سچ کہا فلاں فلاں نے۔ اچھا جاؤ اسی باعث تمھیں بخشا۔"

کاش مجھ سے سوال وجواب کی نوبت نہ آئے اور میری مغفرت ونجات محض رحمت ہی کے صدقے میں فرمادی جائے۔ قاضی یحییٰ بن اکثم کا سا جواب بھی تو ہر شخص کے بس کا نہیں ہے۔

دلّی کے ایک اچھّی شاعر مرزا فخرو نے کیا خوب کہا ہے ؎

میں سر جھکا کے ہوئے جہنم چلا ہی تھا
کچھ رحم آ گیا مرے پروردگار کو

کاش میرا احساسِ گناہ گاری اور یقینِ رحمت پروردگاری وجہ مغفرت و نجات ہو جائے۔ رحمت پر الحمد للہ کامل ایمان ہے۔ تو قع لگائے بیٹھا ہوں کہ حقوق العباد تک معاف کرا دیے جائیں گے۔ عدل کا تقاضہ ہے کہ بندوں کے قصور کی معافی بندوں کے ہاتھ میں رہے، لیکن بندوں کو معافی کے لیے آمادہ کر لینا اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

دعاگو

واحدی

۵ ربیع الاول، ۱۳۹۰ مطابق ۱۲ مئی، ۱۹۷۰ء

معلوم نہیں بڑے ناناجان نے "دینی تاثرات" کی تخصیص کیوں کی ہے۔ تاثرات تمام کے تمام دینی ہیں۔ بعض میں البتہ دین بہت نمایاں ہے۔ بعض میں دین بقدرِ چاشنی یا بقدرِ مٹھاس ہے۔ دین سے الگ تو ناناجان کی زبان اور قلم سے الفاظ بہت کم نکلتے ہیں۔ دین بڑے ناناجان کا محبوب ہے۔ دین کو ناناجان کس حسن اور دلکشی کے ساتھ ہمارے سامنے لاتے ہیں، اس کی بابت عرض کرنا فضول ہے۔ تاثرات آپ کے سامنے ہیں، ملاحظہ کیجیے اور اندازہ کر لیجیے۔

بڑے ناناجان کے "مجموعۂ خطوط" سے ان کا کردار ظاہر ہوتا ہے۔ خطوط کا مجموعہ بھی انشاء اللہ کبھی نہ کبھی چھپے گا۔ خطوط میں میرے نام کے علاوہ قبلہ خواجہ فضل احمد شیدا مرحوم کے نام کے بے شمار خط ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۶ء تک کے۔ غالباً ایک ہزار سے اوپر۔ سب شیدا صاحب نے مجھے دے دیے تھے اور میرے پاس محفوظ ہیں۔ انھیں میں نے بغور پڑھا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۶ء تک بڑے ناناجان کے کردار میں کہیں ارق فرق اور جھول نہیں ملا۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے کردار کے دلّی والے گواہ ہیں اور ۱۹۴۷ء کے بعد کا یہ خطوط ریکارڈ ہیں۔

بڑے ناناجان کی کتابیں "میرے زمانے کی دلّی" اور "ناقابلِ فراموش لوگ اور ناقابلِ فراموش باتیں" اگلے مورخوں کی مدد کریں گی اور بڑے ناناجان کے "تاثرات" سے اگلی

نسلیں بلا تشبیہ حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات کی طرح مستفید ہوں گی۔
بڑے نانا جان نے "تاثرات" میں اپنی جانب سے کچھ نہیں لکھا ہے۔ جو کچھ لکھا ہے، قرآن مجید کی ترجمانی ہے۔ بڑے نانا جان کے قریبًا سب "تاثرات" قرآنی آیات کی تضمینیں ہیں۔ آیت یا آیات تلاوت کرتے کرتے مفہوم ذہن میں ابھر آتا ہے اور بہ شکل مضمون لکھ لیا جاتا ہے۔ اور اس میں آیت یا آیات اس طرح جڑ دی جاتی ہیں جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ آیت یا آیات سے بڑے نانا جان اپنے مضمون کی تائید کرا دیتے ہیں اور مضمون کے ذریعے آیت یا آیات کا مفہوم ایسا ذہن نشین ہو جاتا ہے کہ پھر وہ آیت یا آیات پڑھ کر قاری بے اختیار پکار اٹھتا ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

"تاثرات" کی دل کشی کا عالم آپ نے دیکھا ہوگا۔ کیا کتاب شروع کر دینے کے بعد آپ اسے ختم کیے بغیر رہ سکے؟

خاکسار
اوصاف علی
۳۰ مئی ۱۹۷۰ء

"یہ تاثرات" کی پہلی جلد ہے۔ ابھی اتنے تاثرات باقی ہیں کہ ایسی ایسی کئی جلدیں انشاء اللہ اور شائع ہوں گی

تأثرات

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کی نظر میں

حکیم محمد سعید نام ہی کے "سعید" نہیں، سعادتوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کرنا، ان کی تلاش، ان کی فراہمی، اپنا طریقہ، بلکہ پیشہ بنالیا ہے!

اور ایک نئی اور بڑی سعادت اُن کی اِن "تاثرات" کی ترتیب و تدوین اور طبع و اشاعت ہے۔

ان صفحات میں ہے کیا؟ خیر و حکمت، شرافت و لطافت، روح کی بلندی و بالیدگی۔

ان صفحات میں نہیں کیا ہے؟ — شر و انانیت، نفس کی پستی اور پلیدی، بد ذوقی اور دنائت۔

ہر زمانے کی آب و ہوا مختلف اور ہر دور کے امراض اور فتنے الگ الگ ہوتے ہیں۔ حکمتِ الٰہی اسی مناسبت سے ہر دور کے معالج نئے نئے بھیجتی رہتی ہے اور علاج کے طریقے بھی نئے نئے سمجھاتی رہتی ہے۔

غزالی کی اہمیت اپنے مقام پر قطعی اور مسلّم، لیکن ان کی ساری تحقیقات کا لفظی ترجمہ کوئی انگریزی یا اُردو میں پیش کرنا شروع کر دے تو اس بیسویں صدی کے دل و دماغ میں فی صد نہیں، فی ہزار بھی کتنے اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے؟ اور کتنے ان کی بولی بھی سمجھ سکیں گے؟

قدرت نے آج کے ماحول اور عصری تقاضوں کی مناسبت سے بالکل ہی دوسرے کینڈے کے لکھنے والے، سوچنے والے، بولنے والے پیدا کر دیے۔ واحدی دہلوی ثم کراچوی کی ہستی انھی ہستیوں میں سے ہے منتخب اور منتظم۔

واحدی صاحب اصطلاحی معنوں میں عالم فاضل ہوں یا نہ ہوں، بہرحال اللہ نے ان کے دل میں اخلاص، دماغ میں فہم سلیم، طبیعت میں اعتدال و توازن اور قلم میں اثر پیدا کر دیا ہے۔ وقت کے فرعونوں کو گھلا دینے، پگھلا دینے کی برکت ان کے عصائے موسوی میں رکھ دی ہے۔

اللہ کا فضل جس کو چاہے اس نعمت سے نواز دے۔ اس میں نہ کسی کا اجارہ، نہ کسی کو گلہ شکوے کا یا رشک و حسد کا موقع!

دین اللہ کی ہے۔ اس میں اجارہ کیا ہے۔ واحدی صاحب سے نیازمندی مجھے دیرینہ

حاصل ہے۔ یہ جانتا تھا کہ وہ بڑے اچھے اور کامیاب صحافی، تاجر کتب اور خوش ذوق ہیں نیز دہلی میں صبح کی نہاری کے وقت ان کا سلیقہ میزبانی بھی دیکھ چکا تھا، مگر دہلی سے جلاوطنی کے بعد تو وہ کچھ اور ہی ہو گئے!

دلّی کا فراق ہی ان کے دل دردمند کے لیے کیا کم تازیانہ تھا کہ پھر اپنے ساتھ بے شمار دوسرے مسلمانوں کی بے دست و پائی اور ملّت کی تباہی نے انھیں اسلام کا دیوانہ بنا دیا اور دنیا سے کٹ کر اُمّت ہی کے کام کے ہو کر رہ گئے۔ کون جانتا تھا کہ ان کی ساری آزمائشیں اور مصیبتیں دل کے اسی گداز کو پیدا کرنے کی خاطر تھیں۔

ریاض تھی جو مقدّر میں بازگشت شباب

جوان ہونے کو پیری میں لکھنؤ آئے!

جسم کے کُٹنے پٹنے اور زخموں سے لہولہان ہونے کے بعد ہی یہ جا کر کھُلا کہ یہ سب تمہید کسی کو سیّد الشہدائی کے مرتبے پر پہنچانے کی تھی۔

معنویت کی بلندیوں کو چھوڑ دیے، محض ادبی حیثیت سے دیکھیے تو واحدی صاحب کا شمار بے تکلف ان ادیبوں کی صف میں ہو سکتا ہے جو ایک طرزِ خاص کے مالک ہیں۔ ادب کے بے درد اور ناانصاف تاریخ نگاروں نے اگر انھیں اب تک اس جگہ پر نہیں رکھا تو انھوں نے مولانا ابوالکلام کی قدرشناسی کب کی؟ مولانا سیّد سلیمان ندوی کی پرستش کب کی؟ خواجہ حسن نظامی کو کب پوچھا؟ دنیا اگر شپرہ چشمی میں مبتلا ہو جائے تو آفتاب کی نورانیت کو اس سے کیا ضرر پہنچ سکتا ہے۔

واحدی صاحب کی تحریروں کی خصوصیات مختصراً حسبِ ذیل ہیں:-

۱- شرافت، سلاست، دل نشینی میں آپ اپنی نظیر ہوتی ہیں۔

۲- لفظوں اور ترکیبوں کی صحت کا خاص لحاظ ہوتا ہے۔

۳- عوامی ہونے کے باوجود عامیانہ نہیں ہونے پاتیں۔

۴- طبیعت میں رقّت و گداز پیدا کرتی ہیں۔

۵- پستی کے بجائے بلندی، سطحیت کے بجائے پُرمغزی اور قساوت کے بجائے لینت و ملاطفت کی طرف لے جاتی ہیں۔

۶- قل و دل ہونے کے باوجود خشک ذرا بھی نہیں ہوتیں۔ ہلکی شوخی کے ساتھ بڑی جاندار ہوتی ہیں۔

۷- آورد اور تکلف ان میں ذرا بھی نہیں ہوتا۔ آمد اور بے ساختگی سے بھری ہوتی ہیں۔

اللہ ایسے لکھنے والے کا سایہ دل و دماغ کی پوری صحت کے ساتھ مدتوں ہم پر قائم رکھے اور جب بھی اس دنیائے فانی سے اٹھائے تو اپنی رحمت بے نہایت کے آغوش میں لے کر۔

مُلّا واحدِی (متوفی 1974)

مُلا واحدی کا نام برسوں سے سننے میں آ رہا تھا، بحیثیت خواجہ حسن نظامی کے ایک مرید اور مُبلّغ اور رفیق وشریک ہونے کے۔

ملاقات غالباً 1923 کے آخر میں ہوئی۔ اکتوبر 1924 سے مولانا محمد علی نے اپنا روزنامہ ''ہمدرد'' دہلی سے از سر نو جاری کیا۔ واحدی صاحب اسی کوچہ چیلان میں ہمدرد سے فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر رہتے تھے اس وقت سے میرا دہلی بار بار جانا ہونے لگا، جب ہی سے واحدی صاحب سے پینگ بڑھے۔ جاڑوں کے موسم میں صبح ان کے ہاں نہاری کی دعوت ہوتی تھی۔ دہلی کی نہاری یوں بھی مشہور تھی، واحدی صاحب اس کی مرچ کی تیزی رفع کرنے کو گھر میں ایک بار پھر گھی سے (اور اس وقت تک خالص گھی نایاب نہیں تھا) بگھار دیتے تھے، مجھ سے کھلنے لگے بڑے مخلص حلیم، خوش تدبیر، متواضع اور بڑی سوجھ بوجھ کے نکلے۔

اگست 1947 کے انقلاب عظیم نے ان کے سے دہلی پرست کے بھی پاؤں دہلی سے اکھاڑ دیے۔ اور وہ دہلوی سے پاکستانی ہوگئے۔ دہلی میں پرانے میونسپل کمشنر تھے۔ اور اپنے حلقے کے مسلمانوں ہی میں نہیں، ہندوؤں میں بھی خوب مقبول رہے۔ دہلی کی اینٹ اینٹ سے انھیں وابستگی اور محبت تھی، خدا جانے کن مجبوریوں سے انھوں نے وطن چھوڑا ہوگا اور وطن چھوڑتے وقت ان کے دل پر کیا گزری ہوگی۔

پاکستان جا کر اُن کے قلم میں مزید توانائی آ گئی اور توانائی ہی نہیں رہنمائی بھی خوب خوب باتیں کام کی لکھنے لگے، دنیا و آخرت دونوں میں کام آنے والی نصیحت کی باتیں بڑوں اور چھوٹوں، مردوں اور عورتوں سب کے لیے اور بڑے ہی دلچسپ اور شیریں انداز میں، خشکی کا نام ونشان

نہیں۔ گویا شیخ سعدی گلستاں لکھ رہے تھے! زبان دہلی کی ٹکسالی۔ اور اندازِ بیان دلفریب و دلگداز دونوں۔ ایک سے زائد پرچے بھی نکالے، مگر سب بند ہو گئے۔ اور پاکستان کی ڈاک تو ادھر چار برس سے بند ہے۔ ان کے مضمون ماہنامہ منادی (دہلی) میں نظر آ ہی جاتے ہیں۔

ان کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے ادیبوں میں ہونا چاہیے۔ مگر بدقسمتی سے نہ وہ کسی پارٹی میں شامل اور نہ کسی تاریخ ادب کے صفحات میں ان کا نام آتا ہے، یہ بڑی حق تلفی ان کی ہو رہی ہے، اور وہ یقیناً مظلوموں میں ہیں۔ مظلوم ان سے بھی بڑھ کر خواجہ حسن نظامی دہلوی اور آغا حیدر حسن دہلوی اور مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی بھی تھے۔ زبان ان سب کی سند اور ان کا ہر قول انشا پردازی کے دربار میں مُستند ہے۔

خدائے واحد واحدی کا دم قائم رکھے دین و اخلاق دونوں کی خدمت وہ اپنے میٹھے بولوں سے کر رہے ہیں۔

ملاّ واحدی، سید محمد ارتضیٰ

ملاّ واحدی ۱۷ رمئی سنہ ۱۸۸۸ء کو اپنے آبائی مکان واقعہ کوچۂ چیلان، دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بزرگوار سید محمد مصطفےٰ محکمۂ انہار میں سب ڈویژنل افسر تھے اور روڑا (ضلع کانپور) میں تعینات تھے۔ یہیں ان کا انتقال ہوا اور یہیں آسودہ خاک ہیں۔ ملاّ واحدی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پہلے انہوں نے قرآن ختم کیا اور ساتھ ہی اردو فارسی بھی پڑھی پھر پرائمری اسکول میں داخل ہوئے۔ پرائمری اسکول کی تعلیم لینے کے بعد ان کو سینٹ اسٹیفنز مشن ہائی اسکول کے پانچویں درجے میں داخلہ مل گیا۔ اس زمانے میں انگریزی اسکولوں میں سینٹ اسٹیفنز مشن ہائی اسکول، جو اس وقت چاندنی چوک میں واقع تھا، سب سے بہتر اسکول شمار ہوتا تھا۔ اس اسکول سے آٹھویں کلاس پاس کر کے ملاّ واحدی اینگلو عربک ہائی اسکول چلے گئے۔ پڑھنے لکھنے میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے تین مرتبہ میٹرک کا امتحان دیا لیکن تینوں مرتبہ فیل ہوئے۔ اس زمانے میں ملاّ واحدی شعر بھی کہتے تھے اور محمد مرزا مشتاق سے مشورہ کرتے تھے۔ مرزا مشتاق چاندنی چوک میں دکان کرتے تھے۔ ایک دن ملاّ واحدی مرزا مشتاق کی دکان میں بیٹھے ہوئے تھے تو اسی وقت خواجہ حسن نظامی تشریف لے آئے۔ خواجہ حسن نظامی کو دیکھ کر ملاّ واحدی چونک پڑے اور دل میں خیال کیا کہ یہ وہی غوطہ خور ہے جسے میں نے ایک دن خواب میں دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنے خواب کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح لکھا ہے:
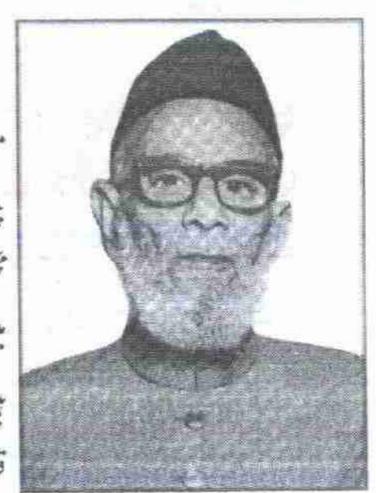
"میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ اپنے مکان کے صحن میں لیٹا ہوں۔ رات کا وقت ہے اور چاند کا نظارہ کر رہا ہوں۔ یکا یک چاند میں ایک سمندر نمودار ہوا۔ تھوڑی دیر میں سمندر میں سے ایک غوطہ خور کچھ چیزیں لے کر برآمد ہوا اور یہ سب فتوحات لے کر میرے گھر میں اُتر آیا۔" ابھی ملاّ واحدی اپنے خواب پر غور کر ہی رہے تھے کہ اسی موقعے پر مرزا مشتاق نے ملاّ واحدی کو خواجہ حسن نظامی سے متعارف کرا دیا۔ چنانچہ یہ تو خواجہ حسن نظامی سے تعارف کا قصہ ہے لیکن ان سے قریب ہونے کا واقعہ اس

ملاقات کے بعد پیش آیا- ملاّ واحدی جب تیسری مرتبہ بھی میٹرک میں فیل ہو گئے تو انہیں بڑا دکھ اور ملال ہوا- وہ اسی پریشانی میں چاندنی چوک میں گھنٹہ گھر کے کے پاس کھڑے ہوئے تھے کہ خواجہ صاحب آ گئے اور انہوں نے ملاّ واحدی سے پوچھا' کچھ پریشان ہیں آپ؟ انہوں نے اپنے فیل ہونے کا قصہ بتایا تو خواجہ صاحب نے انہیں تسلی دی اور اپنے ساتھ اپنے کمرے پر لے گئے اور اس طرح تسلی دی کہ ملاّ واحدی بالکل مطمئن ہو گئے-

سنہ ۱۹۰۸ء میں خواجہ حسن نظامی نے حلقۂ نظام المشائخ قائم کیا- اس کا مقصد یہ تھا کہ درگاہوں' خانقاہوں اور اوقاف میں جو آمدنی ہوتی ہے اسے منتظمین خُرد بُرد نہ کر سکیں- چنانچہ جن لوگوں نے ان اداروں پر قبضہ جما رکھا تھا انہوں نے حلقۂ نظام المشائخ کی بھرپور مخالفت کی اور کہنے لگے کہ خواجہ حسن نظامی اپنے بزرگوں کے مسلک سے پھر گیا اور وہابیت کی تقلید میں درگاہوں کی مخالفت کرنے لگا ہے- اس سلسلہ میں خواجہ صاحب نے اپنا نقطۂ نظر لوگوں تک پہنچانے کے لیے جولائی ۱۹۰۹ء میں ماہنامۂ نظام المشائخ جاری کر دیا- خواجہ صاحب اس کے ایڈیٹر اور ملاّ واحدی نائب ایڈیٹر تھے- یہ ماہنامہ اِن دونوں حضرات کی شراکت میں جاری ہوا تھا- کچھ ہی دنوں میں یہ ماہنامہ خود کفیل ہو گیا تھا- ابتدا میں اس کا دفتر خواجہ صاحب کے کمرے میں رہا لیکن بعد میں ملاّ واحدی کے مکان میں منتقل کر دیا- اس عرصے میں خواجہ صاحب بھی بیوی بچوں کے ساتھ ملاّ واحدی کے گھر مقیم رہے اس لیے کہ درگاہ سلطان اولیاء میں خواجہ صاحب کی بہت مخالفت تھی اور وہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا- جب درگاہ میں ان کی مخالفت ختم ہو گئی تو اپنے مکان میں واپس جانے کا فیصلہ کیا اور ماہنامہ نظام المشائخ کی ملکیت سے بھی دست بردار ہو گئے-

سنہ ۱۹۱۱ء میں خواجہ صاحب مصر و شام و حجاز کے سفر پر روانہ ہو گئے- خواجہ صاحب مختلف منازل سے سفر کے حالات و تاثرات باقاعدہ بھیجتے رہے جو ماہنامہ ''نظام المشائخ'' میں چھپتے رہے- اس سے پرچے کی ہردلعزیزی میں بہت اضافہ ہوا- اس طرح ملاّ صاحب نے نشر و اشاعت کو اپنا پیشہ بنا لیا- یوں بھی اللہ کے فضل سے انہیں اپنے بزرگوں سے ترکے میں اتنا کچھ ملا تھا کہ نہ انہیں ملازمت کی ضرورت تھی نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی حاجت تھی- ان کی محنت اور نئی نئی منصوبہ بندیوں نے ان کے کام کو خوب چمکایا- انہوں نے اپنا ذاتی مطبع قائم کیا جس میں خواجہ صاحب کی کتابوں کے علاوہ اپنے دوستوں اور دہلی

کے دوسرے ادیبوں سے کتابیں لکھوائیں- اب ان کا شہر کے معززین میں شمار تھا- وہ دہلی میونسپل کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے اور اس حیثیت میں دوسرے احباب کے ساتھ مل کر اہلِ شہر کی بہت خدمت کی-

سنہ ۱۹۴۷ء میں آزادی تو مل گئی لیکن آزادی مانگنے والوں کی جو بربادی ہوئی اس کی کوئی مثال نہیں- جب دہلی کے حالات مخدوش سے مخدوش تر ہو گئے، انسانیت نے دم توڑ دیا اور بربریت کا دور دورہ شروع ہوا تو صدیوں سے آباد لوگ نقلِ مکانی کرنے لگے- اسی دور میں جناب ملاّ واحدی نے رختِ سفر باندھا اور اپنے بیوی بچوں سمیت ہجرت کر کے پاکستان آ گئے- ابتدا میں وہ راولپنڈی میں مقیم ہوئے پھر لاہور اور پھر کراچی آ گئے- ہجرت کر کے امن امان کا سانس تو ضرور لیا لیکن بہت دنوں تک ذریعہ معاش کے لیے پریشان رہے- جس شخص کی دہلی جیسے شہر میں جائداد، کاروبار اور نوکر چاکر ہوں اسے مہینوں تک جھونپڑی میں گزارا کرنا پڑے تو اس پر کیا گزرے گی- کراچی میں روزنامہ ''انجام'' کے مالک عثمان آزاد صاحب ملاّ واحدی کا پرانا زمانہ دیکھے ہوئے تھے- انہوں نے بڑی مہربانی کی اور اپنے اخبار کی منیجری ان کے سپرد کر دی- کچھ دنوں کے بعد ان کے منجھلے بیٹے کو ملازمت کے استحقاق کے مطابق رہائش مل گئی اور یہ خاندان وہاں منتقل ہو گیا-

ملاّ واحدی نے خواجہ حسن نظامی کے اشتراک کے نظام المشائخ اکتوبر ۱۹۰۸ء میں جاری کیا تھا- جب تک وہ ہندوستان میں رہے یہ ماہنامہ بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا- کراچی کے ابتدائی دنوں نومبر دسمبر کے دو شمارے تو نہیں نکل سکے لیکن ذرا حالات بہتر ہوئے تو انہوں نے اسے جنوری ۱۹۴۸ء میں پھر دوبارہ جاری کر دیا- ان کی صحت بالعموم اچھی رہی لیکن کراچی کی افتاد نے البتہ بُرا اثر ڈالا- سب سے پہلے آنکھوں نے جواب دیا پھر عمر کے ساتھ ساتھ صحت دن بدن گرتی گئی- آخر میں ان پر فالج کا اثر ہوا اور اسی میں ۲۲/اگست ۱۹۷۶ء کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے- پاپوش نگر کے قبرستان میں محوِ خوابِ ابدی ہیں-

انہوں نے ایک کتاب ''میرے زمانے کی دلّی'' شائع کی تھی- اس کے علاوہ ان کی تصنیفات میں حیاتِ سرورِ کائنات، جاماسپ نامہ (فارسی سے ترجمہ) بزمِ فرید (حضرت بابا فریدالدین گنجِ شکر کے ملفوظات: راحت القلوب مرتبہ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء کا ترجمہ) مجالسِ حسنہ،- کراچی کے دورانِ قیام قرآن اور اسلام کے بارے میں کثرت سے لکھا ہے-

--••☆••--